

اللہ کے ولی



خان آصف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے ولی

خان آصف

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-7668958, 042-7652546

www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول مارچ 2009ء

بار دوم مئی 2009

بار سوم جنوری 2010ء

مطبع نیر اسد پریس لاہور

ڈیزائن عبید اللہ

کمپوزنگ کلائمکس گرافکس

قیمت -/450 روپے

وَلِی اللہ کون؟

وَلِی اللہ بننے کے لئے اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا حاصل کرنا پڑتی ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خالصتاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہونا پڑتا ہے۔

وَلِی ہونا آسان نہیں۔ یہ بوریا نشین دنیا کی ہر نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ ایسے فقیر ہوتے ہیں جن کی خانقاہوں میں بادشاہ وقت برہنہ پا حاضر ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں سے حاجت مندوں کی جھولیاں مُرادوں سے بھر دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے، ان کے ہاتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور دوسروں کے لئے پھیلتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو شکر کی ایسی کیفیت کو جانتے ہیں جو نعمتوں کو دوام بخشتی ہے۔ یہ شکر اور صبر جیسی عظیم نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کی کسی منزل اور ماحول کی کسی کشمکش میں بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و خوشنودی کی شاہراہ سے ڈانواں ڈول نہیں ہونے دیتے۔ انہیں کوئی نعمت دی جاتی ہے تو اللہ کے اس احسان کا شکر ادا کرتے ہیں اور کوئی آزمائش آتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی صبر اور شکر کرنے والا بنائے۔

دعاؤں کا طالب
(محمد علی قریشی)

فہرست

7	حضرت منصور حلاجؒ
129	حضرت سید علی ہجویریؒ
157	حضرت معین الدین چشتیؒ
339	حضرت لال شہباز قلندرؒ
397	حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ
521	حضرت میاں میر لاہوریؒ
567	حضرت سلطان باہوؒ
609	حضرت پچل سرمستؒ



حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

244ھ

ولادت

309ھ

وفات

فارس کے شہر ”بیضا“ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی حسین تھا اور والد کا نام منصور حلاج۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ کو والد کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں عظیم و جلیل صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ طویل سیرو سیاحت کی اور تین بار حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔ آپ صوفیائے کرام کی طویل تاریخ میں سب سے زیادہ متنازع شخصیت ہیں۔

سر عام ”انا الحق“ (میں حق ہوں) کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ بالآخر اسی نعرے کی بنیاد پر علمائے بغداد نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ دیا اور 18 ذی قعدہ 309 ہجری کو آپ قتل کر دیئے گئے۔ مغربی مصنفین اور بہت سے غیر ذمہ دار فارسی اردو شاعروں نے ”انا الحق“ کے نعرے کو بہت اچھا لانا کہ بے خبر اور کم علم مسلمانوں کے ذہن منتشر ہو جائیں۔

یہ اس جاں سوزِ عشق کی داستانِ حیات ہے جو ایک معمولی باپ کا بیٹا تھا۔ وہ سولہ سال کی عمر میں گھر سے نکلا۔ سینے میں عشق کی چنگاری بچپن سے موجود تھی۔ پھر یہی چنگاری شعلہ بنی اور اس شعلے نے ایک عاشق کے پورے وجود کو پھونک ڈالا۔ اس کا معاملہ ”تاریخِ عشاق“ کا بڑا عجیب اور اذیت ناک باب ہے۔ ہر سطر آتشِ فراق سے جلی ہوئی اور ہر سطر تمناؤں کے خون سے رنگی ہوئی۔ وہ عاشقوں کی طویل فہرست میں سب سے زیادہ متنازع عاشق ہے۔ ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ وہ شعبدہ باز تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ملمع چڑھالیا تھا اور عشق کا مصنوعی لباس پہن کر شہر در شہر گھومتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو ایک دھوکا تھے اور اس کی فغان نیم شب ایک فریب تھی۔ وہ عشاق کی قبا میں ایک دنیا دار انسان تھا۔ وہ عشق کا نام لے کر جذبوں کا جھوٹا کاروبار کرتا تھا۔ وہ اپنے عشق کی جانبازیوں کے افسانے سرعام سنایا کرتا تھا۔ مگر حقیقتاً وہ ایک آرام طلب عاشق تھا۔ عشق کی جانگداز مشقوں سے نا آشنا..... اور دیارِ عشق میں نارسیدہ۔ اردو شاعر میر تقی میر کے بقول۔

ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

وہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کے لئے کھوکھلے نعرے لگایا کرتا تھا۔ اس کے دل سے کبھی آہِ جگر گداز نہیں اُبھری۔ وہ اپنے قول میں سچا نہیں تھا۔ بس زبانی باتیں کرتا تھا۔

اس کے برعکس دوسری جماعت اُسے عاشقِ جانباز تسلیم کرتی ہے۔ اس کے نزدیک موت جیسی خوفناک حقیقت، عاشق کے ایک رنگین و پر کیف خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ خاردار راستوں کو مخمل و ریشم کی رہ گزر سمجھتا تھا۔ جب آفات و مصائب کی آتش سوزاں اس کے جسم کو چھوتی تھی تو وہ اس چھیڑ چھاڑ کو بادِ صبا کے جھونکوں کی شرارت کہتا تھا۔ جب محبت نا آشنا لوگ اس پر سنگ باری کرتے تھے تو اس جابرانہ کھیل کو گل پاشی سے تعبیر کرتا تھا۔ پھر جب اسے ایک تاریک زنداں کے حوالے کیا گیا تو اس نے اپنے عشق کی آگ سے دوسرے قیدیوں کی زنجیروں کو پگھلا دیا۔ آہنی دروازے اس کے جذبہ سوزدروں

سے پکھل کر موم ہو گئے۔ پھر اس نے تمام اسیروں سے کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ اس کے فیض عشق کے سبب سارے قیدی چھوٹ گئے۔ اسیروں نے زنداں سے رخصت ہوتے وقت اپنے محسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں رہائی دینے کے بعد آپ خود زنجیریں پہنے کیوں بیٹھے ہیں؟“

عاشق جانباز اس وقت وصال کی لذتوں سے مخمور تھا۔ زنجیروں کو بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ آہن فولاد، عاشق کا زیور ہیں۔ اگر انہیں اتار پھینکوں تو پھر میں عاشق کہاں رہوں گا؟ عشق سر بازار عالم رُسا ہو جائے گا اور میں عشق کی رُسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔“

قیدیوں نے کہا۔ ”آپ نے ہمیں آزادی کا پروانہ بخش دیا مگر خود یہاں سے کیوں نہیں نکلتے۔“ عاشق جاں سوز پر انتہائی سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ جذب و کیف کے لہجے میں بولا۔ ”یہ زنداں تو میرا گھر ہے۔ تم نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو خوشی سے اپنا گھر چھوڑ کر چلا جائے۔“

پھر جب داروغہ زنداں کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی وجہ سے تمام قیدی فرار ہوئے ہیں تو وہ غضب ناک ہو کر کہنے لگا۔ ”تجھے معلوم ہے کہ تُو نے قانون شکنی کی ہے۔ اس جرم کی پاداش میں زنداں کے اندر میرے اور بڑے حادثے جائیں گے۔“

عاشق جانباز نے قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم مجھے تاریکیوں سے ڈراتے ہو۔ اگر تمام زمانے کے اندر بھی لا کر یہاں جمع کر دو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ روشنی تو میرے اندر ہے۔ میں اس روشنی سے زندانِ وقت میں چراغاں کر لوں گا۔“

اہل ستم کو شدید حیرت تھی اور جفا کار پریشان نظر آ رہے تھے کہ وہ کس مزاج کا عاشق ہے؟ مرزا غالب کے بقول۔

اسدِ بسل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

تُو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ہاں! وہ اسی انداز کا مقتول تھا کہ اس نے قتل ہونے سے پہلے اپنے قاتلوں کو معاف کر دیا۔ اس کے عشق پر گواہی دیتے ہوئے اپنے وقت کے بڑے بڑے عارفوں نے کہا تھا۔

”وہ سرمستِ ازل تھا اور بڑی نرالی شان کا عاشق تھا۔ اس کے بعد اُس جیسا کوئی دوسرا عاشق نہیں آیا۔“

اُسے اس بے فائدہ اور ناپائیدار دنیا سے گئے ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی ہیں مگر وہ آج بھی سرمست و بے خود عاشقوں کی محفل میں میرِ مجلس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ عشقِ گزیدہ صوفی ہوں یا اُردو اور فارسی زبانوں کے شاعر، جب بھی بے خودی عشق کے معیار کا حوالہ دیا جاتا ہے تو سب کی زبانوں پر بے اختیار اسی کا نام آتا ہے

موسمِ آیا تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا!

یہ عاشق جانباز تھے، حضرت حسین بن منصور حلاجؒ جو اپنے جذب و کیف اور سرور و مستی کے لئے ایران و عراق اور برصغیر پاک و ہند میں عجیب شہرت رکھتے ہیں۔



آپؒ کا اسم گرامی حسین تھا۔ باپ کا نام منصور حلاج تھا۔ حلاج عربی زبان میں جلا ہے کو کہتے ہیں۔ چونکہ شیخ حسینؒ کے والد زوی دھننے کا کام کرتے تھے، اس لئے پیشہ اُن کے نام کا حصہ بن گیا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن مؤرخ خطیب بغدادی نے اس روایت کی نفی کی ہے۔ بغدادی شیخ ابو عبد الرحمنؒ کے حوالے سے تحریر کرتا ہے کہ حسین بن منصور کو ”حلاج“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار عراق کے شہر واسطہ میں ایک دھن (جلا ہے) کی دکان پر پہنچے اور اسے کسی کام کے لئے بھیجنا چاہا۔

دھن نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپؒ کا کام کر دیتا ہوں مجبوری یہ ہے کہ مجھے شام تک زوی دھن کر دینا ہے۔ اگر میں آج یہ کام نہ کر سکا تو مجھے اجرت نہیں ملے گی۔“ حضرت شیخ حسینؒ بن منصور نے اس دھن سے فرمایا۔

”تم میرا کام کر دو، میں تمہارا کام کر دوں گا۔“

آپؒ کی بات سن کر جلاہا چلا گیا۔ پھر جب وہ کام کر کے واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دکان میں موجود ساری زوی دھنی ہوئی رکھی تھی۔ یہ زوی کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اُسے دو چار ماہ میں بھی دھنا دُشوار تھا۔ پھر اس جلاہے نے دوسرے لوگوں پر یہ راز فاش کر دیا۔ نتیجتاً حضرت حسین بن منصورؒ ”حلاج“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بعض روایتوں کے مطابق حضرت حسین بن منصور اپنی ابتدائی حالت میں اسرار پر گفتگو کرتے تھے۔ لوگوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیتے اور مریدوں کے دلوں کی باتیں بتا دیتے تھے۔ اس لئے پہلے آپؒ کا نام ”حلاج الاسرار“ پڑ گیا۔ بعد میں حلاج کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ بہر حال تاریخ کا یہ بھی بڑا عجیب زاویہ ہے کہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کے نام سے شہرت دوام حاصل کی۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی معتبر روایت موجود نہیں۔ بعض مؤرخین نے صرف اندازے اور قیاس کے سہارے 244ھ کو آپؒ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی کنیت ”ابومغیث“ ہے مگر مشہور مؤرخ طبری اور خطیب بغدادی کے نزدیک ابو عبد اللہ..... آپؒ کے دادا کا نام محی تھا جو اپنے عقائد کے اعتبار سے مجوسی (آتش پرست) تھا۔ محی ”بیضا“ کا رہنے والا تھا جو فارس (ایران) کا شہر ہے۔ حضرت شیخ حسینؒ کے والد منصور کے حالات کا کسی کو علم نہیں مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ انہوں نے آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔

مؤرخ خطیب نے تاریخ بغداد میں حضرت شیخ حسینؒ کے صاحب زادے احمد سے روایت کیا ہے کہ ان کے والد حسین بن منصورؒ بیضا کے موضع ”طور“ میں پیدا ہوئے مگر نشوونما ”تستر“ میں ہوئی۔

حضرت حسین بن منصورؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا..... مگر جب وہ سولہ سال کے ہوئے تو مشہور بزرگ حضرت بہل بن عبد اللہ تستریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گردش

وقت نے حضرت منظور حلاجؒ کو ایک متنازع شخصیت بنا دیا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کا ذکر ضروری ہے، جن کی نگرانی میں حضرت حسین بن منصورؒ کی روحانی تربیت ہوئی تھی۔



حضرت سہل بن عبد اللہ تسریؒ کا شمار صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ آپؒ تین سال کی عمر ہی سے اپنے ماموں شیخ محمد سار کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت سہلؒ نے ابتداء میں قرآنی تعلیم حاصل کی اور سات سال کی عمر سے روزہ رکھنے لگے۔ پھر جب بارہ سال کی عمر میں ایک فقہی مسئلہ پیش آیا تو آپؒ مشہور بزرگ حضرت شیخ حبیب حمزہؒ کی خدمت میں بصرہ حاضر ہوئے۔ حضرت شیخؒ نے چند لفظوں میں وہ مشکل ترین مسئلہ حل کر دیا۔ آپؒ حضرت حبیب حمزہؒ کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر کچھ دن بصرہ میں رہ کر حضرت شیخؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور بعد میں اپنے شہر تسر لوٹ آئے۔ پھر آپؒ کا یہ معمول بن گیا کہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو جو کی دو ٹکیاں کھا کر شکم کی آگ بجھا لیتے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سہلؒ نے سات سات دن تک کچھ نہیں کھایا۔ آپؒ ممنوع ایام کے سوا ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور راتیں یاد الہی میں گزارتے تھے۔

پھر ایک ایسا نازک وقت بھی آیا کہ اہل تسر نے حضرت سہل بن عبد اللہؒ پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیا۔ آپؒ لوگوں کی اس تنگ نظری سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور یہ عہد کر لیا کہ آئندہ کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ پھر جب آپؒ مسلسل فاقہ کشی کرتے ہوئے کوئٹہ پہنچے تو آپؒ کے نفس نے سوال کیا۔

”سہل بن عبد اللہ! تم نے مجھ پر بہت مظالم ڈھائے ہیں۔ پھر بھی اگر تم مجھے مچھلی اور روٹی کھلا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مکہ معظمہ تک کوئی شے طلب نہیں کروں گا۔“

اپنے نفس کی آواز سن کر حضرت سہل بن عبد اللہؒ مچھلی اور روٹی کی تلاش میں نکلے۔ ایک جگہ آپؒ نے دیکھا کہ ایک اونٹ چکی چلا رہا ہے اور چکی کا مالک قریب ہی بیٹھا ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہؒ اس شخص کے پاس پہنچ کر فرمانے لگے۔ ”دن بھر کی محنت کے بعد تم اونٹ والے کو کیا دیتے ہو؟“

چکی کے مالک نے حیرت سے ایک مفلوک الحال شخص کو دیکھا اور بے پرواہی سے کہا۔ ”میں اونٹ کے مالک کو دو دینار دیتا ہوں۔“

حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے فرمایا۔ ”تمہاری بڑی مہربانی ہوگی کہ اگر تم اونٹ کو کھول کر اس کی جگہ مجھے باندھ دو۔ میں تم سے دن بھر کی محنت کے بعد صرف ایک دینار طلب کروں گا۔“

الغرض حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے پوری توانائی کے ساتھ چکی چلائی اور شام کو ایک دینار لے کر مچھلی اور روٹی خریدی۔ پھر جب کھانا کھا چکے تو آپؒ نے اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”جب بھی تو مجھ سے بھوک کی شکایت کرے گا تو اس طرح محنت کرنی پڑے گی۔“

اس کے بعد حضرت سہل بن عبد اللہ تسریؒ نے ارکان حج ادا کئے اور مشہور صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصریؒ کے حلقہ اہلاد میں شامل ہو گئے۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ کی یہ خاص عادت تھی کہ نہ تو آپؐ کبھی دیوار سے ٹیک لگاتے، نہ پاؤں پھیلاتے اور نہ کبھی کسی کے سوال کا جواب دیتے۔ ایک بار مسلسل چار ماہ تک آپؐ کے پاؤں کی انگلیوں میں شدید درد رہا۔ حضرت سہلؒ نے کسی کے سامنے اس درد کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے اپنے پاؤں پر پٹی باندھ لی۔ پھر جب ایک شخص نے اس کا سبب پوچھا تو حضرت سہل بن عبداللہؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دن بعد وہی شخص مصر پہنچ کر حضرت ذوالنونؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سہل بن عبداللہؒ کی طرح حضرت شیخؒ کے پاؤں کی انگلیوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”شیخ! یہ کیا ہے؟“ اس شخص نے حضرت ذوالنون مصریؒ سے پوچھا۔

”میں چار مہینے سے پاؤں کے درد میں مبتلا ہوں۔“ حضرت ذوالنون مصریؒ نے جواب دیتے ہوئے

فرمایا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔“ اس شخص نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے مرید سہل بن عبداللہؒ کے پاؤں میں بھی پٹی بندھی ہوئی ہے۔“

یہ سن کر حضرت ذوالنون مصریؒ کے چہرہ مبارک پر محبت کا ایک خاص رنگ ابھر آیا، پھر آپؒ نے نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔

”سہل کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو میرے درد کو محسوس کرتے ہوئے اس طرح پیروی کرے۔“ اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہؒ کو اپنے پیرومرشد سے کس قدر محبت تھی۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ حضرت سہل بن عبداللہؒ بیٹھے بیٹھے رونے لگے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو آپؒ نے حسب معمول کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر دوسرے دن حاضرین مجلس نے خلاف معمول آپؒ کو دیوار سے پشت لگائے اور پاؤں پھیلائے ہوئے دیکھا۔ لوگوں کو حضرت سہلؒ کے اس طرز عمل پر بڑی حیرت تھی مگر ادب و احترام کے پیش نظر کوئی بھی اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کر سکا۔ یکا یک آپؒ حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

”تم لوگ مجھ سے بہت سوال کیا کرتے تھے۔ اب تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھ لو۔“

ایک شخص نے بے حد احترام کہا۔ ”شیخ! یہ کیسا انقلاب ہے کہ آپ کل تک کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے مگر آج فرما رہے ہیں کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔“

”پیرومرشد کا اتنا احترام تو لازم ہے کہ ان کی زندگی میں مرید کسی سوال کا جواب نہ دے۔“ حضرت

سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا۔

لوگوں نے اس واقعے کو اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیا۔ پھر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی وقت تھا جب ایک دن پہلے حضرت ذوالنون مصریؒ نے انتقال فرمایا تھا۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ اپنے پیرومرشد کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب تک حضرت ذوالنون مصریؒ حیات رہے، آپؒ نے کسی مجلس میں نہ دیوار سے پشت لگائی اور نہ لوگوں کے سامنے پاؤں پھیلائے۔

ایک جابر حاکم عمرو لیث ایک بار ایسا بیمار ہوا کہ طبیعوں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ پھر ہر

طرف سے مایوس ہو کر اس نے حضرت سہل بن عبد اللہؒ سے درخواست کی کہ وہ اس کی صحت کے لئے دعا فرمادیں۔

آپؐ نے نہایت جرأت مندانہ لہجے میں فرمایا۔ ”دعا اس شخص کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو اپنے گناہوں سے تائب ہو چکا ہو۔ اس لئے تم زندگی بھر کی معصیت سے توبہ کرو۔ پھر میں دعا کروں گا۔“
عمرولیث نے با آواز بلند اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور حق تعالیٰ سے مغفرت کا طالب ہوا۔
پھر حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے عمرولیث کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اب تم ان تمام قیدیوں کو رہا کرو جو تمہارے جبرنار واکو برداشت کرتے رہے ہیں۔“
عمرولیث نے کسی حیل و حجت کے بغیر تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔

اس کے بعد حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”اے اللہ! جس طرح تُو نے اس شخص کو اپنی نافرمانی کی ذلت عطا کی، اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی اسے دکھا دے۔“
ابھی حضرت سہل بن عبد اللہؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ عمرولیث نے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر علالت سے اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی بیمار ہی نہیں تھا۔ پھر حضرت شیخؒ رخصت ہونے لگے تو عمرولیث نے نذر کے طور پر ایک کثیر رقم پیش کی۔ آپؐ نے شانِ بے نیازی کے ساتھ نذر قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عمرولیث کے محل سے نکل کر اپنی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔
حضرت سہل بن عبد اللہؒ کا ایک مرید بھی آپؐ کے ہمراہ تھا۔ اس نے حریصانہ لہجے میں عرض کیا۔

”شیخ! اگر آپ نذر قبول فرما لیتے تو میں قرض سے سبکدوش ہو جاتا۔“

”میں اتنی معمولی رقم کس طرح قبول کر لیتا؟“ مرید کی بات سن کر حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے فرمایا۔
”معمولی رقم؟“ پیر و مرشد کے ارشاد گرامی پر مرید کو شدید حیرت تھی۔

”تُو نے ابھی دولت کہاں دیکھی ہے؟“ یہ کہہ کر حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے اپنے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”دولت اسے کہتے ہیں۔“

مرید نے نظر اٹھائی تو ہر طرف سونا ہی سونا تھا۔

”خلاقِ عالم نے جسے مرتبہ عطا کیا ہو، اسے دولت کی تمنا کیسے ہو سکتی ہے؟“ حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے فرمایا۔

روایت ہے کہ آپؐ پانی پر بھی اسی طرح چلتے تھے جیسے عام راستے پر۔ کسی شخص نے کشتی کے بغیر آپؐ کو دریا عبور کرتے دیکھ لیا۔ پھر جب آپؐ کی اس کرامت کا شہرہ ہوا تو لوگوں نے برسرِ مجلس پوچھا۔
”شیخ! ہم نے سنا ہے کہ آپ کو دریائی سفر میں کشتی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

جواب میں حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے فرمایا۔ ”اب میں اپنی زبان سے کیا کہوں؟ میرے بارے میں مسجد کے مؤذن سے پوچھ لو، وہ جھوٹ نہیں بولتا۔“

پھر جب لوگوں نے مؤذن سے پوچھا کہ کیا اس نے حضرت سہل بن عبد اللہؒ تشریف کو پانی پر چلتے ہوئے دیکھا ہے تو مؤذن نے حیران ہو کر کہا۔

”اس کا تو مجھے علم نہیں مگر ایک بار ایسا ضرور ہوا تھا کہ شیخ ”حوض پر نہاتے ہوئے پھسل کر گرنے لگے تو میں تیزی سے آگے بڑھا اور انہیں تھام لیا۔“

لوگ مؤذن کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو علی دقاقؒ فرماتے ہیں۔

”حضرت سہل بن عبد اللہ صاحب کرامت ولی تھے مگر خود کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتے تھے۔“

ایک بار حضرت سہل بن عبد اللہؒ کو ریگستان میں ایک شکستہ حال بڑھیا ملی۔ آپؒ نے ضعیف خاتون کی مدد کرنی چاہی تو اس نے زمین سے کچھ ریت اٹھا کر اپنی مٹھی بند کر لی۔ حضرت سہل بن عبد اللہؒ نے دوبارہ بوڑھی عورت سے اس کی ضرورت کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مٹھی کھول دی جو سونے سے بھری ہوئی تھی۔ پھر وہ حضرت سہل بن عبد اللہؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”تم تو اپنی جیب سے رقم نکالتے ہو مگر مجھے غیب سے ملتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بوڑھی عورت یکا یک غائب ہو گئی۔

پھر جب حضرت سہل بن عبد اللہؒ مکہ معظمہ پہنچ کر طواف کعبہ میں مصروف تھے تو اچانک آپؒ نے دیکھا کہ وہ بوڑھی عورت بھی طواف کر رہی ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہؒ کو اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ ایک ضعیف خاتون دور دراز کا سفر طے کر کے بیت اللہ تک کس طرح پہنچی؟ ابھی آپؒ یہ سوچ رہے تھے کہ بوڑھی عورت کی رفتار سست ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد فاصلے کم ہو گئے اور جب حضرت سہل بن عبد اللہؒ ضعیف خاتون کے نزدیک پہنچ گئے تو اس نے دیکھا۔

”جو اختیاری طور پر یہاں آتے ہیں انہیں سواری کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اضطرار کی کیفیت میں سفر کرتے ہیں، خدا غیب سے انہیں اسباب فراہم کرتا ہے۔“

حضرت سہل بن عبد اللہ تدریؒ کے بہت سے اقوال مبارکہ مشہور ہیں مگر ہم اختصار کے سبب چند اقوال ہی تحریر کرتے ہیں تاکہ قارئین حضرت منصور حلاجؒ کے پہلے پیر و مرشد کے عقائد و نظریات سے آگاہ ہو سکیں۔

آپؒ نے فرمایا۔ ”جس وجد و حال کے لئے قرآن و حدیث میں دلیل موجود نہ ہو، وہ لغو اور باطل ہے۔“

ایک دوسرے موقع پر آپؒ نے فرمایا۔ ”دوسروں کی بہ نسبت عالم کا درجہ زیادہ بلند ہے مگر عالم کی شناخت یہ ہے کہ روزِ ازل جو مقدرات طے ہو چکے ہیں، ان پر مطمئن اور خوش رہے۔“ پھر فرمایا کہ ”علماء کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلا وہ عالم جو اپنے علم ظاہری کو عام لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ دوسرا وہ عالم جو علوم باطنی کو اہل باطن کے روبرو بیان کرے..... اور تیسرا وہ عالم جس کے علم کو اس کے اور اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا ہو۔“

ایک بار فرمایا۔ ”سب سے بڑی معصیت جہالت ہے۔“

حضرت سہل بن عبد اللہؒ کا مشہور قول ہے کہ اسلام کے زریں اصول تین ہیں۔ (1) اعمال میں سرور کو نین حضور اکرم ﷺ کا اتباع (2) رزقِ حلال کا استعمال (3) اور افعال میں اخلاص۔

ان اقوال مبارکہ کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ اپنی تمام تر روحانیت کے باوجود جس قدر باہوش بزرگ تھے۔ حضرت حسین بن منصورؒ سب سے پہلے اسی مردِ جلیل کی صحبتوں سے دو سال تک فیض یاب ہوئے۔

پھر ایک دن تستر کے باشندوں نے دیکھا کہ حضرت منصورؒ حلاجؒ اپنے پیرومرشد کی خانقاہ سے نکل کر بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب انہیں نئے مرشد یا شیخ کی تلاش تھی۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو نہایت پرسوز لہجے میں فرمایا۔

”یہاں میرے قلب کو سکون حاصل نہیں ہوا۔“

دراصل حضرت حسین بن منصورؒ فطرتاً ایک بے قرار طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کی صحبتوں سے پرسکون نہ ہو سکے..... اور اس وقت حضرت منصورؒ حلاجؒ کی عمر بھی صرف اٹھارہ سال تھی۔ شاید اسی نوعمری نے انہیں کسی ایک جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔



الغرض حضرت منصورؒ حلاجؒ اٹھارہ سال کی عمر میں مشہور بزرگ حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم پر صرف دو رنگین کپڑے تھے۔ ایک چادر اور ایک تہبند۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کا شمار اکابر صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپؒ صاحبِ علم بھی تھے اور صاحبِ تقویٰ بھی۔ صحیح بخاری کی روایت کرتے تھے اور آپؒ کو اس دور کے محدثین میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بڑے بڑے مشائخ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے مگر حقیقتاً آپؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے اور ہمیشہ اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ انہوں نے جنیدؒ جیسے مردِ باصفا سے روحانی فیض حاصل کیا ہے۔ آپؒ ایک عرصہ دراز تک مکہ معظمہ میں معتکف رہے جس کے سبب ”پیر حرم“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضرت منصورؒ حلاجؒ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے محمد علی بن کنانی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب منصورؒ حلاجؒ مکہ معظمہ پہنچے تو ایک گدڑی میں ملبوس تھے۔ ہم لوگوں نے قریب جا کر دیکھا تو ان کی پوری گدڑی جوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ بعض جوئیں منصورؒ کا خون پیتے پیتے غیر معمولی جسامت اختیار کر گئی تھیں۔ انہیں اپنی ریاضت کی وجہ سے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ لباس بدل ڈالیں یا کپڑوں کو جوؤں سے صاف کر لیں۔

دوسرے بزرگ ابو یعقوب نہر جوریؒ بیان کرتے ہیں کہ حسین بن منصورؒ پہلی بار مکہ معظمہ میں آئے تو سال بھر تک مسجد حرام کے صحن میں بیٹھے رہے۔ وضو اور طواف کے سوا کسی وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے تھے۔ انہیں نہ بارش کی پرواہ تھی اور نہ دھوپ کی۔ شام کے وقت حسین بن منصورؒ کے لئے ایک روٹی اور ایک کوزے میں پانی لایا جاتا تھا۔ آپؒ کھانے سے پہلے ایک گھونٹ پانی پیتے تھے، پھر روٹی کے چاروں

طرف سے ایک ایک نوالہ توڑ کر کھاتے تھے۔ اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پیتے تھے اور باقی روٹی کو پانی کے کوزے پر رکھ دیتے تھے جسے بعد میں ان کے سامنے سے ہٹالیا جاتا تھا۔

ان ریاضتوں سے گزر کر حضرت منصور حلاجؒ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ حضرت سہل بن عبد اللہ تستریؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ضرور ہوئے تھے مگر بیعت نہیں کی تھی۔ اس روایت کی روشنی میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ ہی ان کے مرشد اول تھے۔

بہر حال حضرت شیخؒ کی اجازت سے حضرت منصور حلاجؒ نئی ریاضتوں اور مجاہدات میں مشغول ہو گئے۔

اسی زمانے میں ایک دن مشہور بزرگ عبد اللہ مغربیؒ اپنے مرید خاص ابراہیم بن شیبانؒ کے ساتھ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کے سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ دونوں بزرگوں میں بہت دیر تک مختلف مسائل پر بات چیت ہوتی رہی۔ اچانک گفتگو کے دوران ہی میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہاں جبل ابوقبیس پر ایک جوان بیٹھا ہے جو زیارت کے قابل ہے۔“

حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ غائبانہ طور پر اس جوان کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے بزرگ نے اس جوان کی تعریف کی تھی۔ الغرض کچھ دیر بعد حضرت عبد اللہ مغربیؒ، ابراہیم بن شیبانؒ کے ہمراہ خانقاہ سے اٹھے اور پہاڑ ابوقبیس کی طرف جانے لگے۔

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ نے بعد احترام عرض کیا۔ ”شیخ! کس طرف کا ارادہ ہے؟“

حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ نے فرمایا۔ ”تم نے سنا نہیں کہ کچھ دیر پہلے شیخ عمرو بن عثمانؒ کسی جوان کی تعریف کر رہے تھے؟ پھر میں اس کی زیارت سے کس طرح محروم رہ سکتا ہوں؟“

مرشد کا جواب سن کر حضرت ابراہیم بن شیبانؒ خاموش ہو گئے۔

پھر جب حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ پہاڑ ابوقبیس پر پہنچے تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ آپؒ نے ایک جوان کو دیکھا جو تپتے ہوئے پتھر پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے سے پسینہ بہہ کر پتھر پر ٹپک رہا تھا۔ حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ چند لمحوں تک اس جوان کو بہت غور سے دیکھتے رہے جس کی آنکھیں بند تھیں اور جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ پھر آپؒ نے اپنے مرید خاص کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”ابراہیم! واپس چلو۔“

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ”آپؒ نے پہاڑ پر چڑھنے میں اس قدر مشقت برداشت کی۔ کیا اس جوان سے ملاقات نہیں کریں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ نے فرمایا اور پہاڑ سے اترنے لگے۔ حضرت ابراہیم شیبانؒ

راستے بھر پیرو مرشد کے اس عمل پر حیران رہے۔

پھر نیچے آ کر حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”ابراہیم! اگر تم زندہ رہے تو

اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ اس شخص کے ساتھ کیا سانحہ پیش آئے گا؟“
حضرت ابراہیم بن شیبان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ نے بعد احترام عرض کیا۔ ”پیر و مرشد بہتر جانتے ہیں۔“

حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ نے فرمایا۔ ”تم دیکھتے نہیں کہ یہ بے عقل انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھا رہا ہے۔ خلاق عالم نے سایہ پیدا کیا اور یہ شخص جلتی دھوپ میں بیٹھا ہے۔ اسی حماقت کی وجہ سے حق تعالیٰ اسے ایسی بلا میں مبتلا کریں گے جسے یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔“

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ فرماتے ہیں کہ دوسرے دن ہم نے لوگوں سے جوان کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ منصور حلاجؒ ہیں۔

پھر آنے والے زمانے نے حضرت ابو عبد اللہ مغربیؒ کی پیش گوئی کو درست ثابت کر دیا مگر اس سلسلے میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ قطعاً بے قصور تھے۔ وہ جاں سوختہ عشق تھے۔ ان کے اپنے سینے میں جو آگ کا شعلہ بھڑک رہا تھا، اس کے سامنے سورج کی گرمی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

حضرت منصور حلاجؒ اٹھارہ ماہ تک حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور اس عارف کامل سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی عادت تھی کہ اپنے پیر و مرشد سے عجیب عجیب سوال کرتے تھے مگر حضرت عمرو بن عثمانؒ ہمیشہ یہی تلقین فرماتے تھے۔

”حسین! معرفت کے راستے میں صبر و استقامت پہلی شرط ہے۔ جوش اور اضطراب سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے حضرت منصور حلاجؒ اور پیر و مرشد حضرت عمرو بن عثمانؒ کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی۔ واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت شیخؒ کے سامنے ابو یعقوب قطع کی لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے واضح الفاظ میں فرمایا۔

”حسین! یہ شادی تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی۔ تم اور بے قرار ہو جاؤ گے۔“

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی اس ہدایت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت منصور حلاجؒ جیسے انسان کے لئے شادی مناسب نہیں تھی یا پھر ابو یعقوب قطع کی لڑکی ان کے لئے ناموزوں تھی۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا اور پیر و مرشد کی مرضی کے بغیر شادی کر لی۔ اگرچہ شادی سنت ہے لیکن معرفت کے راستے میں حضرت منصور حلاجؒ حکم شیخؒ سے روگردانی کے مرتکب ہوئے۔ یہ حضرت عمرو بن عثمانؒ اور حضرت منصور حلاجؒ کے درمیان کشیدگی کی ابتداء تھی۔

پھر یہ کشیدگی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب حضرت عمرو بن عثمانؒ کا ایک قلمی رسالہ کسی نے چرا لیا۔ یہ رسالہ تصوف کے ان اسرار و رموز پر مشتمل تھا جسے ایک عام انسان تو کیا، بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ اس رسالے کو بڑی حفاظت کے ساتھ چھپا کر رکھتے تھے مگر

ان ساری احتیاطوں کے باوجود وہ نسخہ چوری ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی نایاب رسالہ تھا جس کے گم ہو جانے پر حضرت عمرو بن عثمان مکی بہت افسردہ نظر آ رہے تھے۔ پھر آپؐ نے اپنے تمام مریدوں اور شاگردوں کو جمع کر کے پوچھا۔

”تم میں سے وہ کون شخص ہے جس نے میرے حجرہ خاص میں داخل ہو کر رسالہ چرایا ہے؟“
تمام لوگ خاموش رہے۔ اس وقت حضرت منصور حلاجؒ بھی مجلس میں موجود تھے۔
حضرت عمرو بن عثمانؒ نے دوبارہ وہی سوال کیا مگر جواب میں کسی کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔
دراصل وہ رسالہ حضرت منصور حلاجؒ نے پیر و مرشد کے حجرے سے اٹھالیا تھا مگر حضرت شیخؒ کے مسلسل پوچھنے کے بعد بھی آپؐ خاموش رہے۔

آخر حضرت عمرو بن عثمانؒ برہم ہو گئے اور آپؐ نے انتہائی غضب کے عالم میں بددعا دی۔ ”تم سب لوگ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ جس شخص نے بھی میرا رسالہ چرایا ہے، اس کے دست و پا قطع کر کے اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ پھر اسے نذرِ آتش کر کے اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے گی۔“

بڑی خوفناک بددعا تھی۔ حاضرین مجلس لرز کر رہ گئے۔ مگر حضرت حسین بن منصور حلاجؒ سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھے رہے۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی نیت چوری کی نہیں تھی۔ اپنے ذوق و تجسس سے مجبور ہو کر انہوں نے وہ رسالہ حضرت شیخؒ کے حجرے سے اٹھالیا تھا۔ پھر اس کی نقل کرنے کے بعد پیر و مرشد کو واپس کر دیا تھا۔ حضرت منصور حلاجؒ کے اعتراف کے بعد بھی حضرت عمرو بن عثمانؒ کا دل ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ جب منصور حلاجؒ نے رسالہ واپس کیا تو پیر و مرشد نے انتہائی ناگوار لہجے میں فرمایا۔

”حسین! تجھے اس رسالے کی نقل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ معرفت کے وہ اسرار ہیں جن تک تیری رسائی ممکن نہیں۔“

کسی معتبر تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے اس فعل پر ندامت محسوس کرتے ہوئے پیر و مرشد سے معافی مانگی ہو۔ ہم اس نازک موضوع پر رائے زنی کا کوئی استحقاق نہیں رکھتے مگر ظاہری طور پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے دو مرتبہ پیر و مرشد کے حکم سے اختلاف کیا۔ اب یہ ان کی جذب و مستی کا عالم تھا یا ہوش مندی کا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بعض بزرگوں نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کو ان کے اضطرابی عمل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ چونکہ حضرت شیخؒ کو رسالے کی چوری سے شدید اذیت پہنچی تھی، اس لئے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا رنگ لا کر رہی اور حضرت منصور حلاجؒ کو قدم قدم پر اسی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑا۔

اکثر تاریخ نگاروں نے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی ناراضگی کا تیسرا سبب بھی بیان کیا ہے۔ روایت ہے

کہ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ کچھ تحریر کر رہے تھے۔ اسی دوران میں حضرت عمرو بن عثمان مکی تشریف لے آئے اور اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”حسین! کیا لکھ رہے ہو؟“

حضرت حسین بن منصورؒ نے عرض کیا۔ ”ایسی عبارت تحریر کر رہا ہوں جو قرآن کا مقابلہ کر سکے۔“ یہ سنتے ہی حضرت عمرو بن عثمانؒ نے غضب ناک ہو کر فرمایا۔ ”پہلے تیرے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے۔ پھر سولی پر چڑھا کر نذر آتش کیا جائے گا۔ اس کے بعد تیرے جسم کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے گی۔“

بعد میں آنے والے محققین نے اس روایت کو ضعیف اور مجہول قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم کا جواب لکھنا کھلا ہوا کفر ہے اور حضرت منصور حلاجؒ سے تمام اختلافات کے باوجود ان پر کفر کا الزام ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنے جذب و مستی کے باوجود صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کا تعلق قرآن کا جواب لکھنے سے نہیں، رسالے کی چوری سے تھا۔

الغرض اس واقعے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ پھر یہی وحشت انہیں حضرت جنید بغدادیؒ کے آستانہ عالیہ پر لے گئی۔

معاذ اللہ! اگر حضرت منصور حلاجؒ قرآن کریم کا جواب لکھنے کی کوشش کرتے تو حضرت جنید بغدادیؒ انہیں اپنے حلقہ بیعت میں کس طرح شامل فرماتے؟ چونکہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد تھے، اس لئے وہ اپنے استاد گرامی کو حضرت منصور حلاجؒ کے عقائد و نظریات سے آگاہ کر سکتے تھے۔ اور پھر حسین بن منصورؒ پر درس گاہ جنید یہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے مگر تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے نہ صرف انہیں اپنے مکتب میں داخل ہونے کی اجازت دی بلکہ بیعت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا جواب لکھنے کی روایت سراسر مہمل اور جھوٹ ہے، اختراع اور بہتان ہے۔

اگرچہ حضرت منصور حلاجؒ کی شادی کو بھی بہت دن ہو گئے تھے اور انہوں نے شیخ کا رسالہ بھی واپس کر دیا تھا مگر ان کی طرف سے حضرت عمرو بن عثمانؒ کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ جب بھی حسین بن منصورؒ کا ذکر آتا تو آپؒ کی پیشانی مبارک پر شکن پڑ جاتی۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرو بن عثمانؒ ہمیشہ انتہائی ناخوشگوار لہجے میں اپنے شاگرد کا ذکر کرتے۔ پھر حضرت عمرو بن عثمانؒ کے شاگرد خاص ابو یعقوب نہر جوریؒ بھی منصور حلاجؒ کی مخالفت پر اتر آئے اور جوش غضب میں انہیں نازیبا کلمات کے ساتھ یاد کرنے لگے۔ حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ سے اس اذیت ناک سلوک کی شکایت کرتے تو آپؒ انہیں صبر و سکون کی تلقین فرماتے۔

”حسین! وہ تمہارے استاد ہیں، تم ان کی خاطر داری کرتے رہو۔“

حضرت منصور حلاجؒ تقریباً ایک سال تک حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں رہے۔ پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ایک سال مجاور مکہ رہے۔ اس دوران حضرت منصور حلاجؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔

ایک بار کچھ فاقہ کش اور شکستہ حال لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔ ”شیخ! ہماری مدد کرو۔“

”میں تمہاری کیا مدد کروں؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میں تم سے بھی زیادہ مفلوک الحال ہوں۔ تم میرا چہرہ اور لباس نہیں دیکھتے؟“

ضرورت مندوں نے عرض کیا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔ اگر ظاہری طور پر کچھ نہیں دے سکتے تو پھر ہمارے حق میں دعا فرما دیجئے۔“

حضرت منصور حلاجؒ مختلف بہانوں سے انہیں ٹالتے رہے مگر جب وہ لوگ کسی طرح بھی نہیں مانے تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر عرض کیا۔

”جب آپ نے اپنے بندوں کو میری طرف متوجہ کیا ہے تو پھر خود ہی ان کی ضرورت کا سامان فراہم کیجئے۔“

یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنا ہاتھ نیچے کیا تو اس میں درہم موجود تھے۔ پھر آپ نے وہ درہم حاجت مندوں میں تقسیم کر دیئے۔ ان تمام درہموں پر ”قل ھو اللہ احد“ لکھا ہوا تھا۔

کسی شخص نے پوچھا۔ ”شیخ! یہ کیا ماجرا ہے؟ اور ان سکوں پر آیت قرآنی تحریر ہونے کا کیا مفہوم ہے؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”یہ خالص قدرت کا عطیہ ہے۔ اس لئے ہر درہم پر ”قل ھو اللہ احد“ تحریر ہے۔“

پھر یہ ایک معمول سا بن گیا۔ جب بھی کوئی ضرورت مند پریشان کرتا تو آپ اسی طرح فضا میں ہاتھ بلند کر دیتے اور پھر مٹھی میں بھرے ہوئے درہم اس کے حوالے کر دیتے۔ یہ کرامت اس قدر تواتر کے ساتھ ظاہر ہوئی کہ پڑھے لکھے مسلمان بھی حضرت منصور حلاجؒ کو شعبہ باز کہنے لگے۔ پھر جب کسی شخص نے مشہور بزرگ حضرت ابن عطاء سے ان واقعات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔

”منصور حلاجؒ کے قبضے میں جن ہیں اور یہی جن آنا فانا ان کا کام کر دیتے ہیں۔“

ایک دن حسین بن منصور حلاجؒ اپنی ریاضت میں مشغول تھے۔ اسی دوران ایک عقیدت مند ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت منصورؒ کو استغراق کے عالم میں دیکھ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ کو آواز دے کر مخاطب کر سکے۔ چنانچہ وہ اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ حضرت شیخ آنکھیں کھولیں تو عرض حال کرے۔ آخر بہت دیر گزر گئی مگر حضرت منصور حلاجؒ مراقبے کی کیفیت سے باہر نہ آئے۔

اچانک اس شخص نے ایک بہت بڑا بچھو دیکھو جو حضرت منصور حلاجؒ کے عقب سے برآمد ہوا اور پھر آپ کے گرد چکر لگانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ شخص بے اختیار چیخ اٹھا۔ انسانی چیخ سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے فرمایا۔

”میرے بھائی! تمہیں کیا تکلیف پہنچی ہے جو اس طرح چیخ رہے ہو؟“

”شیخ! ایک بہت زہریلا اور خوف ناک بچھو آپ کی عبا میں چھپ گیا ہے۔“ ابھی وہ شخص اپنے چیخنے کا

سبب بیان ہی کر رہا تھا کہ وہ بچھو دو بارہ حضرت منصور حلاجؒ کے عقب سے نکلا۔
”وہ دیکھئے!“ یہ کہہ کر وہ شخص اٹھا اور اس نے غیر معمولی جسامت رکھنے والے بچھو کو مارنے کی کوشش کی۔

”خبردار! اسے ہاتھ نہ لگانا۔“ حضرت منصور حلاجؒ کی پر جلال آواز گونجی۔
وہ شخص رک گیا اور عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! یہ ایک نہایت موذی اور زہریلا کیڑا ہے۔ اس کی موجودگی کے سبب کسی وقت بھی آپ کو نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔“
”ٹو کیا جانے کہ یہ کون ہے؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”یہ بارہ برس سے ہمارا ندیم (دوست) ہے۔ اور اسی طرح ہمارے گرد گھومتا رہتا ہے۔“
اس شخص نے یہ واقعہ دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کیا تو بعض افراد نے بے ساختہ کہا۔ ”حضرت منصور حلاجؒ با کرامت ولی ہیں اور یہی ان کی ولایت کی پہچان ہے کہ ایک زہریلا کیڑا اپنی فطری تاثیر کھو چکا ہے۔“

مگر جب مکہ معظمہ کے علمائے ظاہر نے یہ بات سنی تو نہایت برہم لہجے میں کہا۔ ”یہ طلسمی داستان ہے۔ خرافات سے لبریز ایک افسانہ ہے۔ فرضی باتیں ہیں، ٹو جھوٹ بولتا ہے۔“
اس شخص نے قسم کھا کر کہا۔ ”یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“
علمائے ظاہر نے جواب دیا۔ ”تو پھر تیری نظروں کو دھوکا ہوا ہے۔ منصور حلاجؒ ولی با کرامت نہیں، ایک شعبہ باز ہیں۔“

ایک ایسی ہی کرامت دیکھ کر مشہور بزرگ حضرت شیخ ابن عطاء نے فرمایا تھا۔ ”منصور حلاجؒ کے قبضے میں جن ہیں۔“ مگر اب علمائے ظاہر برملا کہنے لگے تھے کہ منصور حلاجؒ شعبہ باز ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آپؒ کی مخالفت کا آغاز ہوا۔

ایک دن حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ بات ہی ایسی تھی۔ جب لوگوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو اُن کے حجرہ مبارک میں تلاش کیا تو وہ غائب تھے۔ اگر عام حالات میں حضرت منصورؒ موجود نہ ہوتے تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی..... مگر جب کسی کمرے کا دروازہ بند ہو اور دروازے پر ایک دربان کی طرح کئی خدمت گار حاضر ہوں اور اس کے باوجود ایک شخص اپنے کمرے سے غائب ہو جائے تو پھر حیران ہونے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

تمام مرید اور خدمت گار ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ”شیخ کہاں تشریف لے گئے؟“ مگر کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے ایک ناقابل یقین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ شیر پر سوار تشریف لا رہے تھے۔ حاضرین سوچ رہے تھے کہ وہ خواب کی حالت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہ خواب نہیں، ایک زندہ حقیقت تھی۔

حضرت منصور حلاجؒ شیر سے اترے اور اس درندے کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”بس، اب تم جاؤ!“

شیر نے حضرت منصور حلاجؒ کی طرف دیکھا، سر جھکایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ وہاں موجود لوگوں پر شدید خوف کی کیفیت طاری تھی۔ پھر جب وہ شیر چلا گیا تو بعض خدام نے عرض کیا۔ ”شیخ! یہ کیا تھا؟“

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”مجھے ایک سفر درپیش تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے بندے کو غیب سے ایک سواری فراہم کر دی۔ اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اسی کے فضل و کرم سے ان تمام چیزوں پر اس کے بندوں کا حق ہے۔ پھر تم اس بات پر حیرت زدہ کیوں ہو؟“

حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں نے عوام کے سامنے اس واقعہ کو بیان کیا تو لوگوں نے با آواز بلند اقرار کیا۔ ”یہ حضرت شیخ کا منصب خاص ہے۔ آپ ہی اس طرح کی کرامت کا اظہار کر سکتے ہیں۔“

پھر جب ذی ہوش لوگوں تک یہ خبریں پہنچیں تو ان حضرات نے بیک زبان کہا۔ ”یہ بات انسانی ذہن سے بالاتر ہے، ہمیں یقین نہیں آتا۔“

بعض علماء نے اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ”منصور حلاجؒ ایک ساحر ہیں، وہ اپنی جادوگری کے کرتب دکھا کر مخلوق خدا کو متاثر کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں اپنے شعبدوں کے مظاہرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

بہر حال یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت منصور حلاجؒ شدید مشقتیں اور ریاضتیں کر رہے تھے اور ابتداء ہی میں ان کی شخصیت متنازع بن گئی تھی۔ صاحبان عقیدت و خدمت انہیں ولی کامل قرار دیتے تھے..... اور صاحبان علم و فضل حضرت منصور حلاجؒ کے کمالات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں غیر معتبر قرار دیتے تھے۔ یہ ان لوگوں کا طرز عمل تھا جو اظہار کے سلسلے میں محتاط رویہ رکھتے ہیں..... اس کے برعکس علماء کی وہ جماعت جو مذہب کے معاملے میں زیادہ جذباتی تھی، اس نے کھلے الفاظ میں حضرت منصور حلاجؒ کو ساحر اور شعبہ باز قرار دے دیا تھا۔



الغرض مکہ معظمہ میں ایک سال گزارنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ بغداد واپس تشریف لائے تو ان کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ درویشوں کی ایک بڑی جماعت ان کے ہمراہ تھی اور وہ تمام درویش حضرت منصور حلاجؒ کو اپنا مخدوم تصور کرتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اہل بغداد نے اندازہ کر لیا کہ اب منصور حلاجؒ طالب معرفت نہیں رہے بلکہ خود منصب ”مشیت“ پر فائز ہیں اور ولایت کے مدعی ہیں۔

لوگوں کی یہ قیاس آرائی اس وقت درست ثابت ہوئی جب حضرت منصور حلاجؒ درویشوں کی جماعت کے ساتھ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم اپنے ایک مضمون میں حضرت جنید بغدادیؒ کے سلسلے میں یہ بات بہت تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ حضرت شیخؒ اپنی علمی مجلسوں میں ہر کس و ناکس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے..... مگر چونکہ حسین بن منصور حلاجؒ حاضر ہوئے تھے، اس لئے انہیں فوری اجازت مل گئی۔ پھر جب منصور حلاجؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو ان کے ہمراہ درویشوں کی ایک جماعت

تھی..... اور یہ درویش اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر کر رہے تھے کہ منصور حلاجؒ ان کے پیشوا ہیں۔ بعض معتبر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک سال تک مجاور مکہ رہنے کے بعد حضرت حسین بن منصور حلاجؒ پیر و مرشد کی بارگاہ معرفت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ ان کے چہرے، لباس اور رفتار سے ”مخدومانہ“ شان ظاہر ہوتی تھی اور خدا مانہ ادار خست ہو چکی تھی۔

یہ حضرت جنید بغدادیؒ کی درویشانہ تواضع تھی کہ آپؒ اپنے شاگرد کے ساتھ اسی محبت سے پیش آئے..... اور بہت دیر تک منصور حلاجؒ سے ان کے گزشتہ حالات پوچھتے رہے۔ پھر جب حضرت جنید بغدادیؒ نے سکوت اختیار فرمایا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے پیر و مرشد سے معرفت کا ایک مسئلہ دریافت کیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے مختصر سے سکوت کے بعد اپنا سوال پھر دہرایا۔

اس بار بھی حضرت جنید بغدادیؒ نے خاموشی اختیار کی اور منصور حلاجؒ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے تیسری بار بھی وہی سوال کیا اور حضرت جنید بغدادیؒ نے اسی طرح بے توجہی کا مظاہرہ کیا۔

آخر منصور حلاجؒ کے چہرے پر ناخوشگاری کا رنگ اُبھر آیا اور وہ اپنے درویشوں کو لے کر خانقاہ سے چلے گئے۔

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ طرزِ عمل سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس بات کو حاضرینِ مجلس میں سے ایک ایک فرد نے محسوس کر لیا تھا..... مگر حضرت منصور حلاجؒ پیر و مرشد کی اس ناراضگی کو کیوں محسوس نہیں کر سکے حالانکہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں حضرت شیخؒ کے زیادہ مزاج آشنا تھے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اکثر اوقات جذب و مستی کے عالم میں رہا کرتے تھے مگر اس روز وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو منصور حلاجؒ عقل و خرد کے حوالے سے ایک نازک سوال نہ کرتے۔ پھر جب وہ ہوش میں تھے تو انہوں نے پوری شدت کے ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ کی ناراضگی کا احساس کیوں نہیں کیا؟ اور اگر احساس کیا تو مجلسِ شیخؒ سے اٹھ کر کیوں چلے گئے؟ پیر و مرشد کے قلب مبارک پر ناخوشی کا جو غبار آ گیا تھا، اسے صاف کیوں نہیں کیا؟ اگر حضرت جنید بغدادیؒ اپنے شاگرد سے خفا تھے تو منصور حلاجؒ نے پیر و مرشد کو منایا کیوں نہیں؟ کیا منصور حلاجؒ کے نزدیک شیخؒ کی ناراضگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی؟

ہم اس موقع پر حضرت امیر خسروؒ اور سلطان علاء الدین خلجی کے حوالے سے ایک تاریخی واقعے کا ذکر کرتے ہیں جسے پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ شیخؒ کی خوشی یا ناخوشی کیا ہوتی ہے۔ مشہور روایت ہے کہ فرمانروائے ہند سلطان علاء الدین خلجی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا جبکہ محبوب الہیؒ ہر بار ملاقات سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر ایک وہ منزل بھی آئی کہ سلطان علاء الدین نے اپنے قاصد کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا اور اپنی درخواست

میں واضح طور پر تحریر کر دیا۔

”اگر حضرت شیخ مجھے باریابی کا شرف نہیں بخشیں گے تو میں ایک دن اجازت کے بغیر ہی حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔“

والی ہندوستان کا خط پڑھ کر حضرت محبوب الہی نے ان الفاظ میں اپنا جواب تحریر کرایا۔ ”علاء الدین! میرے گھر کے دو دروازے ہیں، اگر تو ایک دروازے سے داخل ہو گا تو میں دوسرے دروازے سے نکل کر چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد بھی تنگ کرے گا تو میں تیرا ملک ہی چھوڑ دوں گا کیونکہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔“

علاء الدین نے مایوس ہو کر حضرت امیر خسروؒ سے رجوع کیا۔ امیر خسروؒ نے سلطان سے وعدہ کیا کہ وہ کسی دن مناسب موقع دیکھ کر فرما روئے ہند کو حضرت محبوب الہی کی خدمت میں لے کر چلیں گے۔ پھر جب حضرت امیر خسروؒ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپؒ نے ایک روز خلوت میں علاء الدین سے معذرت کر لی۔

”سلطان معظم! میں اس حکم کو بجالانے سے قاصر ہوں۔“

”تمہارا انکار نافرمانی کے مترادف ہے۔“ علاء الدین نے برہم لہجے میں کہا۔ ”خسرو! تم اس نافرمانی کی سزا جانتے ہو؟“

”جانتا ہوں سلطان معظم!“ حضرت امیر خسروؒ نے ایک مطلق العنان حکمران کے ہیبت و جلال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ”آپ کی نافرمانی کی زیادہ سے زیادہ یہ سزا ہوگی کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا اور میری دنیا خراب ہو جائے گی..... مگر پیر و مرشد کی نافرمانی کی کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ میری آخرت خراب ہو جائے گی..... اور میں اتنا کم عقل ہرگز نہیں ہوں کہ دنیا کے بدلے میں آخرت کا سودا کر لوں۔“ اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرید کے لئے پیر و مرشد کی رضا اور خوشی کیا حیثیت رکھتی ہے؟

بہر حال حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کی خانقاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ منصورؒ کے جانے کے بعد کسی شاگرد نے عرض کیا۔ ”شیخ! کیا حلاج کا سوال جواب طلب نہیں تھا؟“

”حسین کا سوال جواب طلب تھا۔“ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ”مگر دشواری یہ تھی کہ حسین خود مدعی بن کر آئے تھے۔ تحقیق و جستجو ان کا مقصد نہیں تھا۔“

حضرت جنید بغدادیؒ کے قول مبارک کی تشریح یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے حضرت منصور حلاجؒ ایک طالب کی حیثیت سے درس گاہ میں داخل ہوتے تھے مگر اس بار ان کی آمد اور سوال کرنے کا انداز مدعیانہ تھا یعنی وہ خود استادانہ شان کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

دوسرے یہ کہ جب حضرت منصور حلاجؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو خرقہ پہنے ہوئے تھے اور ان کی شان مشائخ جیسی تھی۔ نظام خانقاہی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کوئی مرید، شیخ کی مرضی کے بغیر خرقہ خلافت نہیں پہن سکتا اور اسی طرح کسی سے بیعت بھی نہیں لے سکتا۔ بعض مؤرخین نے واضح طور پر اس

طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کی اجازت کے بغیر نہ صرف خرقہ پہن لیا تھا بلکہ لوگوں کو اپنے حلقہٴ ارادت میں شامل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے حضرت جنید بغدادیؒ کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی تھی..... مگر آپؒ نے زندگی بھر اس کا اظہار نہیں کیا۔ صرف سوال کا جواب نہ دینے کے واقعہ سے بعض صوفیاء نے اندازہ کر لیا کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت منصور حلاجؒ سے ناراض تھے۔

اس کے برعکس حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے اپنا رسالہ چرانے والے کو بدعادی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں، پھر جسم کو نذر آتش کر کے اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی جائے۔ اگرچہ حضرت شیخؒ کو چوری کرنے والے کا نام معلوم نہیں تھا لیکن ان کی بددعا کا ہدف حضرت منصور حلاجؒ ہی تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی درس گاہ سے اٹھ جانے پر بعض مؤرخین نے اس طرح تبصرہ کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ، اپنے مرشد حضرت جنید بغدادیؒ سے متوحش اور آزرده خاطر ہو گئے۔ اس وحشت اور آزرده گی کا ایک ہی سبب تھا کہ حضرت جنید بغدادیؒ، حسین بن منصورؒ کے سوالوں کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ یہ سوالات کیا تھے، کسی مؤرخ یا محقق نے ان کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ بس قیاس کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عشق کے اضطراب اور خلش نے انہیں وحشت زدہ بنا دیا تھا اور پھر اسی عالم میں وہ اپنے اساتذہ سے عجیب عجیب سوال کرتے تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں حالات کا ایک ہی رخ سامنے آتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے پہلے استاد حضرت بہل بن عبد اللہ تیسریؒ کی اجازت کے بغیر حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ان کے اضطراب کی ابتداء تھی۔ منصور حلاجؒ کا خیال تھا کہ وہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی صحبت میں سکون پا جائیں گے اور ان کی وحشت ختم ہو جائے گی مگر یہاں پہنچ کر تو معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا۔

اٹھارہ ماہ کی صحبت اور رفاقت بھی ان کے پیچ و تاب اور خلش کو دور نہ کر سکی۔ پھر جب حضرت منصور حلاجؒ اپنے دوسرے استاد حضرت عمرو بن عثمانؒ کی درس گاہ سے اٹھے تو مرشد کی بددعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ اہل نظر سمجھتے تھے کہ حضرت جنید بغدادیؒ ان کی بے قراریوں کا علاج کر دیں گے مگر مشیت الہی نے منصور حلاجؒ کے لئے کچھ اور ہی رقم کر لیا تھا۔ وہ اپنے تیسرے استاد اور مرشد کے آستانہ عالیہ سے بھی شدید اضطراب کے عالم میں اٹھے۔ پھر یہ خلش ایک آگ بن گئی اور حضرت منصور حلاجؒ زندگی بھر اس آگ میں جلتے رہے۔

بعض مؤرخین نے حضرت جنید بغدادیؒ کی ناراضگی کے واقعے کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر غیر ذمہ دارانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ ”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ لکھتے ہیں۔

”منصور حلاجؒ ایک سال تک مجاور مکہ رہے۔ پھر بغداد پہنچ کر اپنے مرشد حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تصوف و معرفت کے حوالے سے چند سوالات کئے جنہیں سن کر حضرت شیخؒ خاموش رہے۔ منصور حلاجؒ نے اپنے سوالات دہرائے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔

حسین! تم بہت جلد لکڑی کے ٹکڑے کو سرخ کرو گے۔“ مطلب یہ تھا کہ پھانسی کا تختہ منصور حلاجؒ

کے خون سے سرخ ہو جائے گا۔

بعد میں آنے والے محققین نے اس روایت کو غلط ثابت کر دیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے شاگرد سے ناراض ضرور تھے مگر آپؒ نے منصور حلاجؒ کو نہ بد عادی تھی اور نہ ان کے مصلوب ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ یہ افسانہ طرازوں کا ستم ہے کہ ان لوگوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو بدنام اور مطعون کرنے کے لئے غلط حوالے پیش کئے۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کے استاد تھے۔ اس سلسلے میں ہماری نظروں سے کوئی تفصیل نہیں گزری مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ حسین بن منصورؒ، حضرت شیخ نوریؒ کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے صاحبزادے احمد کی روایت ہے کہ میرے والد حضرت جنید بغدادیؒ کی درس گاہ سے نکل کر تستر چلے آئے۔ اس سفر میں میری والدہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

تستر پہنچ کر حضرت منصور حلاجؒ کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس شہرت کی وجہ آپ کی وہ مسلسل کرامات تھیں جن کے اظہار نے عوام سے لے کر خواص تک کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

ایک دن حضرت منصور حلاجؒ اپنے خدمت گاروں اور عقیدت مندوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھے تھے۔ اچانک کسی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا اور حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔
”حسین! تم یہ احمقوں اور جاہلوں کا مجمع لگائے کیا بیٹھے ہو؟“

”آؤ! تم بھی بیٹھ جاؤ۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ”تمہارے لئے بھی جگہ خالی ہے۔“
”تم ان ہی بے خبر لوگوں کو متاثر کر سکتے ہو۔“ اس دریدہ دہن شخص نے کہا۔ ”ولایت کا دعویٰ کرتے ہو مگر میں جانتا ہوں کہ تم کچھ نہیں جانتے۔“

”میں ولایت کا مدعی ہوں اور نہ آگہی کا دعویٰ کرتا ہوں مگر مجھے تیرے حال کی خوب خبر ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مخاطب کو گزرے ہوئے حالات بتانا شروع کر دیئے۔ پھر جب اس کے خفیہ اور پوشیدہ امور پر پڑا ہوا پردہ ہٹنے لگا تو وہ شخص بے اختیار پکار اٹھا۔
”بس کرو حسین! میں تمہاری قوت کشف کا قائل ہو گیا۔“

تمام معتبر کتابوں میں یہ بات درج ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ پر وہ زمانہ بھی گزرا ہے، جب آپؒ لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپی ہوئی باتیں بھی بتا دیا کرتے تھے..... مگر یہ دور زیادہ طویل نہیں تھا۔ لوگ تنگ کرنے لگے تو آپؒ نے خاموشی اختیار کر لی اور مستقبل کا حال بتانا چھوڑ دیا۔

جب آپؒ کی شہرت زیادہ بڑھی تو مخالفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور حاسدوں نے عجیب عجیب انداز سے آپؒ کو ستانا شروع کر دیا۔ تستر کے کچھ بااثر لوگوں نے ایک شخص کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب منصور حلاجؒ راستے میں جا رہے ہوں تو ان کے سر پر ایک تھپڑ مار دیا جائے۔ الغرض وہ شخص آپؒ کی تلاش میں رہنے لگا۔ ایک دن حضرت منصور حلاجؒ غسل کر کے حمام سے باہر نکلے اور اپنے گھر کی طرف جانے لگے۔ یہ ایک عام گزرگاہ تھی اور اس وقت لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ شخص خاموشی سے آپؒ کے پیچھے پیچھے

ہولیا۔ پھر جب حضرت منصور حلاجؒ اس مقام پر پہنچے جہاں انسانی بھیڑ زیادہ تھی، اس نے آپؐ کی گدی پر ایک زوردار ٹھٹھارا۔

حضرت منصور حلاجؒ اس بے ہودگی کی توقع نہیں رکھتے تھے، اس لئے برہم لہجے میں فرمانے لگے۔ ”اے شخص! تُو نے مجھے کیوں مارا ہے؟ کیا میری ذات سے تجھے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟“ اجنبی شخص نے نفی میں جواب دیا۔

”جب میں نے تجھے کوئی اذیت نہیں پہنچائی ہے تو پھر تُو نے یہ ناشائستہ اور غیر انسانی حرکت کیوں کی؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے پوچھا۔

اس شخص نے بڑی بے شرمی کے ساتھ جواب دیا۔ ”یہ حرکت میں نے اپنے ارادے سے نہیں کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔“

یہ ظالمانہ جواب سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”اگر حق تعالیٰ نے تجھے اس کام کا حکم دیا ہے تو دوبارہ مجھے مار اور حکم کی تعمیل کر۔“

وہ شخص اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھ رہا تھا۔ اس نے حضرت منصور حلاجؒ کو مارنے کے لئے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا مگر وہ اپنے ارادے کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ چند لمحوں میں خون کی گردش رک گئی اور اجنبی کا ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ اپنے گھر کی طرف تشریف لے گئے۔ اور وہ شخص تکلیف کی شدت سے چیختا رہا۔ پھر اہل ستر نے دیکھا کہ چند دنوں میں اس کا ہاتھ سوکھ کر کاٹا ہو گیا۔



حضرت منصور حلاجؒ کی ایک کرامت گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے کہ جب ضرورت مند لوگ ان سے نقد رقم کا سوال کرتے تھے تو وہ آسمان کی طرف ہاتھ بڑھا کر درہم لے آتے تھے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ بہت سے حاجت مند جمع ہو جاتے تھے اور حضرت منصور حلاجؒ سے سوال کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر آپؐ کا عجیب عمل ہوتا تھا۔ دونوں ہاتھ اوپر کی جانب اٹھا دیتے تھے اور انہیں زور زور سے حرکت دیتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دینار درہم کی بارش شروع ہو جاتی تھی۔ حاضرین کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے خلاء میں کوئی درخت موجود ہے جسے حضرت منصور حلاجؒ ہلارہے ہیں اور پھلوں کی طرح سکے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر رہے ہیں۔ پھر جب سکوں کا ڈھیر لگ جاتا تو حضرت منصور حلاجؒ اپنے ہاتھ روک دیتے اور ضرورت مندوں سے مخاطب ہو کر فرماتے۔

”ان سکوں کو آپس میں برابر سے تقسیم کر لو..... مگر خبردار ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی نہ کرنا۔“

حضرت منصور حلاجؒ کی اسی قسم کی کرامات کو علماء اور مخالفین کی جماعت ”شعبہ بازی“ اور ”ساحری“ سے تعبیر کرتے تھے۔

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت حسین بن منصور ”تستر“ میں سکونت پذیر تھے۔ ایک دن درویشوں کی ایک جماعت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مالی امداد کی درخواست کرنے لگی۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک معمولی اور شکستہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔

خوراک اور دوسرے اسباب ضرورت سے بھی بے نیاز رہا کرتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی شخص انہیں اس حالت میں دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک نہایت مفلس انسان ہیں..... مگر درویشوں کی جماعت آپؒ کی روحانی شخصیت سے واقف تھی، اس لئے مالی امداد کا سوال کیا گیا تھا۔ تاہم حضرت منصور حلاجؒ نے ان لوگوں کو ٹالنے کے لئے عرض کیا۔

”دوستو! تم تو میرا ظاہری حال دیکھ رہے ہو کہ میں کتنا شکستہ اور مجبور ہوں۔“

”ہم آپ کے ظاہر کی نہیں، باطن کی بات کر رہے ہیں۔“ ایک درویش نے کہا۔ ”آپ اپنی اسی باطنی طاقت کو استعمال کر کے ہماری مشکل دور فرمائیے۔“

”تمہیں میری باطنی طاقت کی کیا خبر؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے گریز سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔ ”میں تو ایک عام انسان سے بھی زیادہ کمزور ہوں۔ اگر مشکل کشائی کی طاقت رکھتا ہوتا تو خود یہ آزار کیوں جھیلتا؟ سب سے پہلے اپنی آسائش کا سامان جمع کرتا۔“

حضرت حسین بن منصورؒ مسلسل گریز کرتے رہے اور درویش پیہم اصرار کرتے رہے۔ واقعتاً وہ لوگ ضرورت مند تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت منصور حلاجؒ کوئی صاحب ثروت انسان نہیں ہیں۔ پھر ان کی کفالت کس طرح کریں گے؟ دراصل واقعہ یہ تھا کہ درویشوں کی جماعت حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا شہرہ سن کر تستر پہنچی تھی اور اب وہ لوگ اپنی آنکھوں سے حضرت منصور حلاجؒ کا روحانی کمال دیکھنا چاہتے تھے۔

بالآخر منصور حلاجؒ مجبور ہو گئے۔ پھر آپؒ نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ ”اس شہر میں ایسا کون آسودہ حال شخص ہے جو ہمارے مہمان درویشوں کی مالی ضرورتیں پوری کر سکے۔“

حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گار اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ پھر ایک خادم کھڑے ہو کر نہایت ادب سے عرض کرنے لگا۔ ”تستر میں ایک آتش کدہ ہے جہاں مجوسی لوگ قیمتی نذریں اور کچھ تحائف پیش کرتے ہیں۔“

حضرت منصور حلاجؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر مہمان درویشوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”میرے ساتھ آؤ! اب یہ آتش پرست ہی تمہاری ضروریات پوری کریں گے۔“

حضرت منصور حلاجؒ کی بات سن کر درویشوں کی جماعت حیران رہ گئی۔

رات کا وقت تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ اپنی خانقاہ سے باہر آئے اور آتش کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔ درویشوں کی جماعت آپؒ کے پیچھے پیچھے تھی مگر اس پر شدید حیرت و سکوت کا عالم طاری تھا۔ مختصر یہ کہ طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ آتش کدے کے قریب پہنچے۔ دور دور تک سناٹا طاری تھا مگر آتش کدے کے دروازے پر ایک محافظ پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے کچھ مسلمانوں کو اپنی عبادت گاہ کی طرف آتے دیکھا تو اونچی آواز میں بولا۔

”تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

”ہم لوگ آتش کدے کے اندر جانا چاہتے ہیں۔“ جواب میں حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”تم لوگ تو اپنی ظاہری حلیے سے مسلمان معلوم ہوتے ہو۔ پھر ہماری عبادت گاہ میں داخل ہو کر کیا کرو گے؟“ آتش کدے کے محافظ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ہم اس آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جو تمہارے بقول صدیوں سے روشن ہے اور جس کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ آگ کبھی نہیں بجھتی۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

”مگر اس وقت تم آگ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔“ آتش کدے کے محافظ نے کہا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے سبب پوچھا تو محافظ نے بتایا کہ آتش کدہ بند ہے۔

”تم ہمارے لئے اپنی عبادت گاہ کا دروازہ کھول دو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”میں مجبور ہوں۔“ آتش کدے کے محافظ نے کہا۔ ”اس لئے کہ معبد کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔“

حضرت منصور حلاجؒ نے دروازے کی طرف دیکھا جس پر ایک بھاری تالا پڑا تھا۔ ”پھر چابی کس کے پاس ہے؟“

”آتش کدے کی چابی بڑے پجاری کی تحویل میں رہتی ہے۔“ محافظ نے جواب دیا۔

”تمہارا بڑا پجاری کہاں ہے؟ اس سے چابی لے آؤ۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”آدمی رات ہو چکی ہے۔ بڑے پجاری آرام کر رہے ہوں گے۔“ آتش کدے کے محافظ نے کہا۔

”ان کو اس وقت جگایا نہیں جاسکتا اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم لوگ دن کے اُجالے میں کسی وقت آنا۔ میں تمہیں آگ کا دیدار کرا دوں گا۔“

”ہم لوگ طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔“ محافظ کا جواب سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”جب ہم نے اس قدر مشقت اٹھائی ہے تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم آگ کا مشاہدہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔“

”تو پھر مجبوری ہے۔“ آتش کدے کے محافظ نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”مگر ہم بفضل خدا مجبور نہیں ہیں۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ اس وقت آپؒ ایک لمبی عبا پہنے ہوئے تھے۔ دروازے کی طرف دیکھا اور عبا کی آستین کو جھٹکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تالا کھل گیا۔ اس تالے کی ظاہری ساخت ایسی تھی کہ اگر تین چار مزدور مل کر ضرب لگاتے تو وہ تالا بہت دیر میں ٹوٹ پاتا۔

یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کے محافظ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کبھی وہ کھلے ہوئے تالے کی طرف دیکھتا اور کبھی حضرت منصور حلاجؒ کی طرف کہ جن کی آستین کی ایک جنبش سے یہ ناقابل یقین واقعہ پیش آیا تھا۔

”تالا کھل گیا، اب تم دروازہ کھول دو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

محافظ پر خوف طاری تھا۔ وہ لرزرتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے معبد کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ درویش ساتھیوں کو لے کر آتش کدے میں داخل ہو گئے۔

آگ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بھڑک رہی تھی۔

”اس آگ کی کیا حقیقت ہے؟“ حضرت حسین بن منصورؒ نے محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”یہ اس آگ کا حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے گئے تھے۔“ آتش کدے کے
 محافظ نے حضرت منصور حلاجؒ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ اس آگ سے برکت
 حاصل کرتے ہیں اور مجوسی اسی آگ کو لے کر مختلف ممالک میں جاتے ہیں اور نئے آتش کدے آباد
 کرتے ہیں۔“

”یہ آگ بجھتی بھی ہے یا اسی طرح روشن رہتی ہے؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ سے دوسرا سوال
 کیا۔

”یہ آگ ہمہ وقت روشن رہتی ہے۔“ محافظ نے جواب دیا۔ ”ہمارے بزرگوں (پیشواؤں) کا کہنا
 ہے کہ یہ آگ اس وقت بجھے گی جب زمین پر قیامت کا نزول شروع ہو جائے گا۔“
 حضرت منصور حلاجؒ نے بھڑکتی ہوئی آگ پر ایک نظر کی اور محافظ سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہاری
 روایتوں کے مطابق کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اس آگ کو بجھانے کی قدرت رکھتا ہے؟“
 ”ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی ہستی اس آگ کو بجھانے کی
 طاقت نہیں رکھتی۔“ آتش کدے کے محافظ نے جواب دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ نے دوبارہ آگ پر نظر کی اور اپنی آستین کو جھٹک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھڑکتی
 ہوئی آگ بجھ گئی اور حضرت حسین بن منصورؒ کے ہمراہ آنے والے درویش حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کا محافظ چیخنے لگا۔ ”قیامت آگئی..... قیامت آگئی۔“
 حضرت منصور حلاجؒ نے محافظ سے پوچھا۔ ”تو کس قیامت کی بات کر رہا ہے؟“
 ”وہی قیامت جسے ایک دن آنا ہے۔“ محافظ کی چیخوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ”اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ
 وہی قیامت کی گھڑی ہوگی جب مشرق و مغرب میں مجوسیوں کی آگ بجھادی جائے گی۔“

”تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو مگر ہمارے نزدیک ابھی قیامت نہیں آئی ہے۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے
 محافظ کی چیخیں سن کر فرمایا۔ ”کیا اس آگ کو دوبارہ روشن کیا جاسکتا ہے؟ اس ذیل میں تمہاری کتابیں کیا
 کہتی ہیں؟“

”ہماری کتابوں میں واضح طور پر تحریر ہے کہ اس آگ کو وہی شخص دوبارہ روشن کر سکتا ہے جو اسے
 بجھانے کی قدرت رکھتا ہو۔“ آتش کدے کے محافظ نے خوف و دہشت سے لرزتے ہوئے کہا۔
 ”پھر تم اس شخص کو پکارو جو بھی ہوئی آگ کو روشن کر سکے۔“ یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ واپس
 جانے لگے۔

آتش کدے کے محافظ نے گھبرا کر حضرت حسین بن منصورؒ کا دامن پکڑ لیا اور گریہ و زاری کرنے لگا۔
 ”یہ آگ تمہارے ہی ایک اشارے سے بجھی تھی اور تم ہی اسے دوبارہ روشن کر سکتے ہو۔“
 حضرت منصور حلاجؒ محافظ کی آہ و فغاں سن کر خاموش رہے۔

آتش کدے کا محافظ زار و قطار رو رہا تھا۔ آخر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”تیرے پاس کوئی ایسی

چیز ہے جو ان درویشوں کو پیش کی جاسکے؟“

”ہاں! میرے پاس دیناروں سے بھرا ہوا ایک صندوق ہے۔“ آتش کدے کے محافظ نے کہا۔
 ”تو پھر وہ صندوق اٹھالا اور میرے مہمانوں کی خدمت میں پیش کر دے۔“ حضرت حسین بن منصور نے فرمایا۔ ”تو پھر میں تیرے معبد کی بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کر دوں گا۔“
 محافظ خوشی خوشی دوڑتا ہوا گیا اور صندوق اٹھا لیا۔ واقعتاً وہ دیناروں سے بھرا ہوا تھا۔ ”اس کے سوا معبد میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو تمہارے مہمانوں کو پیش کی جاسکے۔“ محافظ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”بس! یہ دینار کافی ہیں۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا اور اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے آستین کو جھٹک دیا۔ مجوسیوں کے معبد کی آگ اسی شدت کے ساتھ دوبارہ بھڑکنے لگی۔
 یہ منظر دیکھ کر آتش کدے کا محافظ حضرت منصور حلاجؒ کے قدموں پر گر پڑا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں شکر یہ ادا کرنے لگا۔

درویشوں پر شدید حیرت و سکوت کا عالم طاری تھا۔ وہ اس واقعے کو اپنے کسی خواب کا حصہ سمجھ رہے تھے۔

”ان تمام دیناروں کو سمیٹ لو۔ تمہاری ضرورت پوری ہو گئی۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے مہمان درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اور آتش کدے سے باہر نکل آئے۔

بعض تاریخوں میں ”آگ“ کے بجائے قندیل کا لفظ استعمال ہوا ہے..... یعنی مجوسیوں کے معبد میں ایک ”قندیل“ صدیوں سے روشن تھی اور اسی قندیل کو حضرت منصور حلاجؒ نے ہاتھ کے ایک اشارے سے بجھا دیا تھا اور دوسرے اشارے سے اسے دوبارہ روشن کر دیا تھا۔ بہر حال وہ مجوسیوں کی آگ ہو یا قندیل حضرت منصور حلاجؒ نے آتش پرستوں پر یہ بات ثابت کر دی تھی کہ وہ جس آگ کو خدا سمجھ رہے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مردِ مومن کی ایک جنبش چشم اس آگ کو نہ صرف بجھا سکتی ہے بلکہ اسے روشن بھی کر سکتی ہے۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کی ایک عظیم الشان کرامت تھی جسے تصوف کے دشمنوں نے شعبہ بازی اور جادو سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں مگر قارئین کو اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ شعبہ بازی محض نظر کا فریب ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی شعبہ باز نہ آگ روشن کر سکتا ہے اور نہ اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کا تصرف روحانی تھا جس نے آتش کدے کے محافظ کو حیران و عاجز کر دیا تھا۔

بعض مخالفین نے حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اعتراض بھی وارد کیا ہے کہ آپؒ نے دینار حاصل کرنے کے لئے جبر سے کام لیا۔ پہلے آگ کو بجھایا اور پھر اسے روشن کرنے کے لئے محافظ سے معاوضہ طلب کیا۔ ہمارے نزدیک حضرت منصور حلاجؒ کا یہ عمل ”جبر“ اور ”زبردستی“ نہیں۔ دراصل یہ عقائد کی جنگ تھی اور آتش پرست جنگ ہار گیا تھا۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی اصول رہا ہے کہ جنگ ہار جانے والے کو خراج ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس مجوسی نے بھی ایک اعتبار سے حضرت منصور حلاجؒ کو خراج ہی

ادا کیا تھا۔



”خرق عادت“ یا ”کرامت“ اسے کہتے ہیں جس کے اظہار پر عام انسان قادر نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل دانش اور علمائے ظاہر کسی ولی کی کرامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی ذہنی رسائی کے مطابق کمالات روحانی کا انکار کرتے ہوئے منطق و استدلال کا سہارا لیتے ہیں اور عوام الناس کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کرامت حقیقت نہیں، محض افسانہ طرازی ہے۔ بعض انتہا پسند اپنے انکار میں شدت پیدا کرنے کے لئے کرامت کو جادوگری کا نام دے دیتے ہیں اور انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک مسلمان بزرگ پر کفر کا الزام عائد کر رہے ہیں کیونکہ ”جادو“ حرام ہے اور اس کا کرنے والا کافر۔ جب حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا شہرہ عام ہوا تو کچھ مخالفین نے انہیں بھی ”ساحر“ قرار دے دیا۔

مشہور مؤرخ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ خلیفہ معتضد باللہ نے اپنے ایک معتمد کارندے کو چند باتوں کی تحقیق کے لئے ہندوستان بھیجا۔ جب کشتی روانہ ہوئی تو خلیفہ کے کارندے نے ایک شخص کو دیکھا جو خاموش بیٹھا سمندر کی لہروں کا نظارہ کر رہا تھا۔ بحری سفر کی طوالت سے اکتا کر خلیفہ کے کارندے نے اس شخص سے گفتگو شروع کر دی۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ وہ حسین بن منصورؒ تھے۔

خلیفہ کا کارندہ اس سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”حسین بن منصورؒ کی معاشرت بہت اچھی اور صحبت نہایت پاکیزہ تھی۔ پھر جب سفر تمام ہوا اور کشتی کنارے پر پہنچی تو ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ میں نے حسین بن منصورؒ سے پوچھا کہ تم کس ارادے سے ہندوستان آئے ہو؟

”میں یہاں جادو سیکھنے آیا ہوں تاکہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے سکوں۔“ حسین بن منصورؒ

نے جواب دیا۔

مقامی مزدور کشتی سے سامان اتار رہے تھے اور ہمارے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک بوڑھا نظر آیا جو

سمندر کے کنارے آباد ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

”تمہاری کیسی ایسے شخص سے شناسائی ہے جو سحر (جادو) جانتا ہو۔“ حسین بن منصورؒ نے بوڑھے

سے پوچھا۔

ہندوستانی بوڑھے نے ایک نظر حسین بن منصورؒ کو دیکھا۔ پھر اپنی جیب سے سوت کے دھاگے کا لچھا

نکالا اور اس کا ایک سرا حسین بن منصورؒ کے ہاتھ میں دے کر لچھے کو ہوا میں اچھال دیا۔ ہمارے دیکھتے ہی

دیکھتے حد نظر تک دھاگے کا ایک تار بن گیا۔ بوڑھا چند قدم آگے بڑھا اور دھاگا پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔ ہم

بڑی حیرت سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھتے رہے۔ ہندوستانی بوڑھا دھاگے پر چڑھتے چڑھتے بہت بلندی

تک چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد اسی طرح واپس آ گیا۔ زمین پر قدم رکھنے کے بعد اس نے حسین بن منصورؒ

سے پوچھا۔

”کیا تم ایسے ہی کسی شخص سے ملنا چاہتے ہو؟“

خلیفہ کے کارندے کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو گئے۔ پھر بغداد میں حسین بن منصورؒ

سے ملاقات ہو گئی۔

خطیب بغدادی تک یہ روایت کئی حوالوں سے پہنچی ہے۔ علمائے تحقیق کے نزدیک اس کا کوئی راوی بھی معتبر نہیں بلکہ ایک راوی علی بن احمد کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ وہ جھوٹا اور شیخی باز تھا۔

حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”یہ روایت سند کے لحاظ سے قابل اعتبار نہیں۔ جن لوگوں نے جادو گروں کو دیکھا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ تمام ساحر نہایت ناپاک، غلیظ اور گندے ہوتے ہیں۔ انہیں حسن معاشرت اور صحبت کی پاکیزگی سے کیا واسطہ؟ جبکہ راوی نے واضح الفاظ میں حسین بن منصورؒ کی یہ صفات بیان کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی جادوگر مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت نہیں دیتا۔“

آتش کدے کی ”آگ“ یا ”قدیل“ بجا دینے کا واقعہ اس قدر مشہور ہوا کہ عام لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے۔

”حضرت منصور حلاجؒ ایک ولی کامل ہیں اور ان کی عارفانہ شان یہ ہے کہ ایک اشارے سے آتش کدے کی آگ بجھ گئی اور ان ہی کے دست مبارک کی جنبش نے بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔“ اور جن علماء کے نزدیک ”خرق عادت“ یا کرامت شعبہ بازی کے مماثل تھی، انہوں نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا۔ وہ پہلے بھی حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے مخالف تھے اور ان کے روحانی تصرف کو علی الاعلان شعبہ بازی قرار دیتے تھے۔ پھر جب آتش کدے کے واقعے نے عام شہرت حاصل کی تو علماء کے اسی گروہ نے حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو بڑا شعبہ باز کہہ کر پکارا۔

علماء کا ایک مخصوص گروہ جو حضرت منصور حلاجؒ سے بہت زیادہ ناراض تھا، اس کے نزدیک حضرت حسین بن منصورؒ ساحر تھے۔ آتش کدے کے حوالے سے ان علماء نے نہایت سخت لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اس شخص کی جادوگری میں اگر اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو مخلوق خدا ایک نئے فتنے میں مبتلا ہو جائے گی۔“

یہ تو مخالفین کا حال تھا مگر چند لوگ جو حضرت منصور حلاجؒ سے اپنی بے پناہ عقیدت کا دعویٰ کرتے تھے، انہوں نے حضرت حسین بن منصورؒ کی عظمت و تکریم میں اس قدر غلو کیا کہ نہ صرف بات الجھ کر رہ گئی بلکہ ایک نئے فتنے کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ یہ مخصوص افراد جو ہمہ وقت حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ رہا کرتے تھے، آپؒ کی کرامتوں کے ایک نئے انداز کے ساتھ عوامی حلقوں میں پیش کرنے لگے۔ ان میں سے بعض لوگ اس وقت بھی موجود تھے جب حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی آستین کی جنبش سے آتش کدے کا آہنی نفل کھول دیا تھا اور مجوسیوں کی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو کر اس قدیل کو بجا دیا تھا جس سے دنیا بھر کے آتش پرست استفادہ کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے ان مخصوص عقیدت مندوں نے آتش کدے کے محافظ کی گفتگو کو بنیاد بنایا اور پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے جو تحقیق کے میدان میں اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں، حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔

اس الزامات میں ”شعبہ مازی“ اور ”ساحری“ کے ساتھ یہ الزام بھی نمایاں ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ ”مہدی“ ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ بعض مؤرخین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی تشبیہ دیا کرتے تھے۔

جب حسین بن منصورؒ سے دریافت کیا گیا کہ تم عیسیٰ علیہ السلام ہو یا مہدی ہو؟ تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”معاذ اللہ! یہ تو مجھ پر ایک سنگین تہمت ہے۔ میں تو ایک گناہ گار عاجز بندہ ہوں۔ اس کے سوا میرا کوئی کام نہیں کہ میں اپنے رب کی پاکی بیان کرتا ہوں اور صبح و شام اسی کی عبادت کرتا ہوں۔“

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ واشگاف الفاظ میں اپنے آپ کو اس الزام سے بری الذمہ قرار دیتے تھے مگر مخالفین نے آپؒ کی ذات سے ایک ایسے عمل کو وابستہ کر دیا جو کھلا ہوا کفر تھا۔ آخر اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ انکار کر رہے ہیں اور لوگ اپنی ضد پر قائم ہیں کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام تھے..... اور مہدی علیہ السلام تھے۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے آتش کدے کے محافظ سے پوچھا کہ اس آگ کو بجھانے اور روشن کرنے والا کوئی شخص ہے؟ تو محافظ نے اپنی کتابوں کے حوالے سے کہا تھا کہ اس آگ کو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی بجھا سکتے ہیں اور وہی اسے دوبارہ روشن کر سکتے ہیں۔ محافظ کا یہ دعویٰ سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی کرامت کا اظہار کیا۔ نتیجتاً مجوسیوں کے معبد کی آگ بجھ بھی گئی اور دوبارہ روشن بھی ہو گئی۔ اس واقعے کے رونا ہونے کے بعد دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو آتش کدے کا محافظ حضرت منصور حلاجؒ کے سامنے خم ہو گیا اور آپؒ کی بزرگانہ شان کا اعتراف کرنے لگا۔

”آپ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔“ (معاذ اللہ)

اور اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ آتش پرستوں کی کتاب میں صاف صاف لکھا گیا ہے کہ اس آگ کو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی بجھا سکتے ہیں۔ پھر جب محافظ نے آگ بجھانے والے کو دیکھا تو اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ بیٹھا۔

اگر یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا تو پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ جو عقیدت مند اور درویش موجود تھے، ان لوگوں نے محافظ کی گفتگو سنی تھی، اس لئے بعض لوگوں نے جوش عقیدت میں یا ایک سازش کے تحت حضرت منصور حلاجؒ سے یہ الفاظ منسوب کر دیئے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام یا مہدی علیہ السلام ہونے کے مدعی تھے۔ مختصر یہ کہ اس الزام کی ایک بنیاد موجود ہے مگر اس معاملے میں حضرت منصور حلاجؒ بے قصور تھے۔ اپنے کیف و جذب کے باعث انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے گرد کیسی خوف ناک سازش کا جال بچھایا جا رہا ہے۔ فارسی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے۔

”پیراں نمی پرند، میراں می پرانند (پیر نہیں اڑتے ہیں بلکہ ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں)

حضرت منصور حلاجؒ کے بعض مرید یا تو سخت جاہل اور بے خبر تھے یا پھر نہایت عیار و مکار کہ ایک عاشق جانباز کو رسوا کرنے کے لئے انتہائی شرم ناک منصوبہ تیار کر رہے تھے۔

الغرض، حضرت منصور حلاجؒ تستر کے باشندوں کی اس جاہلانہ عقیدت سے بیزار ہو کر بصرہ تشریف لے گئے۔



بصرہ پہنچ کر حضرت منصور حلاجؒ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ یہاں بھی آپؒ کے مجاہدات اور مشقتوں کا وہی عالم تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ صوفیاء آپؒ کی ریاضتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور برملا اپنی رائے کا اظہار کرتے۔

”منصور حلاجؒ ایک عاشق جاں سوز ہیں۔ عشق کی تپش اور حرارت ان کے جسم و جاں کو جلانے ڈالتی ہے..... اور اسی وجہ سے ان پر جذب و کیف کا غلبہ ہے۔“

اس کے برعکس بصرہ کے علمائے ظاہر کا وہی فتویٰ تھا کہ منصور حلاجؒ شعبدہ بازی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور فطرت کے اصولوں سے جنگ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔

بے شک! حضرت منصور حلاجؒ ایک عاشق جاں باز تھے اور انہیں اس بات کی ہرگز پرواہ نہیں تھی کہ علمائے ظاہر ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے انداز سے منزل عشق کا سفر طے کر رہے تھے۔ عشق کی سرمستی نے انہیں اس قدر بے باک بنا دیا تھا کہ وہ اپنے اساتذہ اور مرشد سے بھی عجیب عجیب سوالات کرتے تھے۔ پھر جب انہیں اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا تو اسی اضطراب کے عالم میں شیخ کی بارگاہ سے اٹھ جاتے تھے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ بھی ان کی اسی بے باکی کی وجہ سے اس قدر ناراض ہو گئے تھے کہ شدید عالم غضب میں اپنے شاگرد کو دنیا کی خوف ناک ترین بددعا دے ڈالی تھی۔ (میں اپنی کم علمی اور بے نظری کے سبب اس واقعے پر رائے زنی کا حق نہیں رکھتا مگر ہزار غور و فکر کے بعد بھی میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ عارف کامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے اکابر صوفیاء میں نمایاں حیثیت بھی رکھتے تھے۔ پھر آپؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کو اتنی سنگین بددعا کیوں دی؟ عارف کا کام تو دعائیں دینا ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر ہم حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بددعا کو تسلیم کر لیں تو شدت غضب کے اظہار کے لئے اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ خدا سے ہلاک کر ڈالے..... مگر بددعا میں یہ اہتمام کیوں کہ اس کے دست و پا کاٹے جائیں..... پھر اسے نذر آتش کیا جائے..... اور آخر میں اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی جائے۔ حالانکہ قتل کے سلسلے میں سرورِ کونین ﷺ کی یہ حدیث پاک موجود ہے کہ ایک ہی وار میں قتل کیا جائے خواہ وہ پاگل کتے کا قتل ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام جسمانی اعضاء کو مرحلہ وار کاٹنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر حضرت منصور حلاجؒ کو یہ بددعا کیوں دی گئی؟ میرے خیال میں اس روایت پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ واقعتاً حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ کی بددعا ہے یا حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے زیب داستان کے لئے اس بددعا کو حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے عظیم و جلیل بزرگ کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا ہے؟)

اگرچہ اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ حیات تھے لیکن حضرت منصور حلاجؒ ایک بار مرشد کے آستانے

سے اٹھے تو دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ بعض لوگوں نے حسین بن منصورؒ کے اس عمل کو ان کی سرکشی سے تعبیر کیا ہے..... لیکن صاحبانِ نظر کہتے ہیں کہ یہ منصورؒ کی آشفۃ سری نہیں، عشق کی شوریٰ کی تھی جو انہیں کسی لمحے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت منصورؒ حلاجؒ مستقل طور پر بصرہ میں سکونت پذیر ہو جائیں گے..... مگر ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ وہ بے قرارِ عشق اس سرزمین سے بھی بیزار ہو گیا۔ اس نے اپنا بوریا کاندھے پر ڈالا اور بصرہ سے کسی دوسرے مقام کی طرف کوچ کر گیا۔ یہ بیزاری علمائے ظاہر کے مخالفانہ طرزِ عمل کے سبب نہیں تھی۔ اب کی بار اس کے عقیدت مندوں کی انتہا پسندی نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

ابوالحسن محمد بن عمر قاضی فرماتے ہیں۔ ”ایک دن میرے ماموں مجھے حضرت حسین بن منصورؒ کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ بصرہ کی جامع مسجد میں مشغولِ عبادت تھے۔ میں ان دنوں بچہ تھا۔ اس لئے خاموشی سے دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔

بات چیت کے دوران حضرت حسین بن منصورؒ حلاجؒ نے میرے ماموں سے فرمایا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ اب میں زیادہ دن بصرہ میں قیام نہیں کر سکوں گا۔“
میرے ماموں نے عرض کیا۔ ”یہ تو اہلِ دل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ وہ ایک مردِ خدا کی زیارت سے محروم ہو جائیں گے۔“

”میں بھی کیا کروں؟“ حضرت منصورؒ حلاجؒ نے آزرده لہجے میں فرمایا۔ ”یہاں کے لوگوں نے میری ذات کو ایک طلسمی افسانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ جس سے میرا دل تنگ ہے اور مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی ہے۔“

”آخر ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ہے جس سے آپ کی طبیعت میں تکدر اور وحشت کے اثرات پائے جاتے ہیں۔“ میرے ماموں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں کے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ اپنی خیال آرائی میں گم رہتے ہیں۔“ حضرت منصورؒ حلاجؒ نے انتہائی افسردہ لہجے میں فرمایا۔ ”یہ لوگ بہت سے افعال و احوال کو میری طرف منسوب کر دیتے ہیں اور سوچے سمجھے بغیر اعتقاد کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں کام میں نے کئے ہیں۔ نہ کوئی ذاتی طور پر تحقیق کرتا ہے اور نہ کوئی مجھ سے دریافت کرتا ہے۔ خواہ مخواہ یہ بات مشہور کر دی جاتی ہے کہ حلاجؒ مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامت ہیں۔ حالانکہ تم میرے بارے میں خوب جانتے ہو۔ میں کیا چیز ہوں جو یہ درجہ اور مرتبہ مجھے حاصل ہو۔“

”آپ ان باتوں پر دھیان ہی کیوں دیتے ہیں؟“ میرے ماموں نے عرض کیا۔

حضرت حسین بن منصورؒ حلاجؒ نے میرے ماموں کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ابھی کل کا واقعہ ہے کہ ایک متمول شخص نے کچھ درہم میرے پاس بھیجے تھے اور درخواست کی تھی کہ میں ان سکوں کو فقراء میں تقسیم کر دوں۔ اتفاق سے اس روز کوئی ضرورت مند نہیں آیا۔ میں نے وہ درہم بورے کے نیچے ڈال دیئے۔ دوسرے دن چند فقراء میرے پاس آئے تو میں نے بورے کے نیچے سے درہم نکال

کر ان کے حوالے کر دیئے۔ اب میں اپنے بارے میں عجیب عجیب باتیں سن رہا ہوں۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ حلاج مٹی پر ہاتھ مارتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔“

اس کے بعد حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اسی قسم کے بہت سے واقعات سنائے۔ میرے ماموں خاموشی سے حضرت منصور حلاجؒ کی گفتگو سنتے رہے۔ پھر جب منصورؒ خاموش ہوئے تو میرے ماموں نے رخصت کی اجازت چاہی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ابوالحسن محمد بن عمر قاضی فرماتے ہیں۔ ”میرے ماموں دوبارہ حضرت منصور حلاجؒ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ ایک دن مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”اس شخص کا حال مشتبہ ہے اور عنقریب تم دیکھو گے کہ منصور حلاجؒ ایک خاص شان کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔“ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ منصور حلاجؒ بصرے سے چلے گئے اور پھر ان کے بارے میں عجیب عجیب واقعات شہرت پانے لگے جیسا کہ میرے ماموں نے اشارتاً مجھ سے کہا تھا۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ اپنے بعض عقیدت مندوں سے عاجز و پریشان تھے۔ یہ لوگ آپؒ کی صفات بیان کرتے وقت بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا کرتے تھے۔ اسی روایت کی بنیاد پر اس دور کے بہت سے علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات سے انکار کیا ہے اور اپنی شدت پسندی کے باعث انہیں شعبہ باز اور ساحر قرار دے دیا ہے۔ یہ حضرت حسین بن حلاجؒ کی عاجزی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ گار اور مجبور انسان ظاہر کرتے تھے مگر جہاں تک آپؒ کی کرامات کا تعلق ہے، وہ اسی طرح روشن تھیں جیسے خورشید ضیاء بار۔

حضرت منصور حلاجؒ کی بنیادی محرومی یہ تھی کہ اہل ظاہر نے ان کے عشق کی سرمستیوں اور بے قرار یوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک عاشق جانباز کو ظاہری آنکھ سے دیکھا اور ظاہری علم کا سہارا لے کر ان پر مختلف قسم کے فتوے لگا دیئے۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں علماء اور فقہاء بھی بے قصور تھے کہ احکام شریعت کا اطلاق ظاہری اعمال ہی پر ہوتا ہے۔

اور جہاں تک حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کا معاملہ ہے تو شروع میں صاحبان نظر بھی یہی کہتے تھے کہ ”جنات“ ان کے تابع ہیں اور وہی آتشیں مخلوق ان کے کام سرانجام دیتی ہے۔ بعد میں جب کچھ اہل علم حضرات نے گہرائی کے ساتھ ان واقعات کا مشاہدہ کیا تو ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔ اس ذیل میں ہم مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ کی گواہی پیش کریں گے جو حقیق کے میدان میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔

اس شہادت کو پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ حضرت شیخ ابن عطاءؒ کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے تاکہ ہمارے قارئین کو حضرت ابن عطاءؒ کی عارفانہ شان کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔

”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطاءؒ فرماتے ہیں۔ ”حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوسعید خرازیؒ نے حضرت ابن عطاءؒ کے بہت سے اوصاف بیان کئے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ ابوسعید خرازیؒ آپ کے مقابلے میں کسی دوسرے کو صوفی

ہی تصور نہیں کرتے تھے۔“

آگے چل کر حضرت شیخ فرید الدین عطاء فرماتے ہیں۔ ”ایک دن لوگوں نے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کو گریہ وزاری کرتے ہوئے دیکھا اور جب اس کا سبب پوچھا تو حضرت ابن عطاء نے فرمایا۔
”میں نے اپنی کم سنی کے مقابلے میں ایک شخص کا کبوتر پکڑ لیا تھا۔ اپنے اس جرم کے معاوضے میں کبوتر کے مالک کو آج تک ایک ہزار دینار دے چکا ہوں لیکن پھر بھی نہیں جانتا کہ مجھے اس جرم کی کیا سزا دی جائے گی؟“

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء قرآن کریم کی تلاوت بہت ذوق و شوق کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک دن کسی دوست نے سوال کیا۔ ”شیخ! آپ روزانہ کتنی تلاوت کر لیتے ہیں؟“
حضرت ابن عطاء نے فرمایا۔ ”آج سے چودہ سال پہلے ایک قرآن یومیہ ختم کر لیتا تھا مگر اب یہ حال ہے کہ چودہ سال قبل میں نے جو قرآن شروع کیا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہو سکا ہے، صرف سورہ ”انفاق“ تک پہنچا ہوں۔“

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کے دس صاحبزادے تھے۔ ایک بار آپ اپنے تمام فرزندوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ جب ایک ویران جنگل سے گزر رہا تھا تو اچانک کچھ ڈاکو برہنہ شمشیریں لئے ہوئے نمودار ہوئے اور حضرت ابن عطاء کے صاحبزادوں کو پکڑ لیا۔ پھر ایک ایک کر کے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ قزاقوں کا خیال تھا کہ حضرت ابن عطاء اپنے صاحبزادوں کو قتل ہوتے دیکھ کر گریہ وزاری کریں گے اور ان سے رحم کی بھیک مانگیں گے..... مگر آپ کے صبر و استقامت کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہر بیٹے کے قتل پر آسمان کی طرف دیکھتے اور مسکرانے لگے۔

پھر جب دسویں صاحبزادے کے قتل کی باری آئی تو ڈاکوؤں نے اپنی شمشیریں روک لیں اور حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ہم نے آج تک ایسا بے حس اور سنگدل باپ نہیں دیکھا کہ اپنے بیٹوں کی جان بچانے کے لئے کوئی تدبیر کرنے کی بجائے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرارہا ہے۔“
حضرت ابن عطاء نے انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ”تمہاری کیا مجال کہ تم میرے بیٹوں کو قتل کر سکو۔ فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ خلاق ازل نے میرے صاحبزادوں کا مقدر اسی طرح رقم کیا تھا۔ مسکراتا اس لئے ہوں کہ میں اس کی رضا میں راضی ہوں۔ کاش! وہ بھی راضی ہو جائے۔“

حضرت ابن عطاء کی گفتگو سن کر قزاقوں پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنی شمشیر نیام میں کر لی اور معذرت خواہانہ لہجے میں افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم یہ بات پہلے کہہ دیتے تو تمہارے تمام بیٹے قتل ہونے سے بچ جاتے۔“

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء نے فرمایا۔ ”جب خالق کسی کو مٹانا چاہتا ہے تو پھر کون ہے جو اس کو قائم رکھ سکے۔“ یہ کہہ کر حضرت ابن عطاء نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔ پھر قزاقوں کے ساتھ مل کر اپنے نو بیٹوں کی تدفین کی اور شمشیر قضا سے بچ جانے والے صاحبزادے کو ہمراہ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کے چند مشہور اقوال حسب ذیل ہیں۔

”ظاہر میں مخلوق سے اور باطن میں خالق سے وابستگی گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔“

”عمدہ گناہ وہی ہے جس سے توبہ کی توفیق نصیب ہو..... اور بدترین ہے وہ عبادت جس میں خود

بنی (غرور) نمایاں ہو جائے۔“

”دنیا کچھ لوگوں کے لئے سرائے ہے، کچھ کے لئے تجارت گاہ۔ بعض کے لئے شہرت و عزت حاصل کرنے کی جگہ، بعض کے لئے درس عبرت اور کچھ کے لئے باعث عیش و نشاط۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق دنیا سے دلچسپی رکھتا ہے۔“

”اللہ تعالیٰ ناواقف لوگوں کے گناہ کبیرہ بھی معاف کر دے گا لیکن عارفین سے گناہ صغیرہ کی بھی باز پرس ہوگی۔“

”قرآن و حدیث سے بلند کوئی مقام نہیں۔“

”مجھے آتش دوزخ میں جلنے کا اتنا خوف نہیں جتنا حق تعالیٰ کی عدم توجہی سے خائف رہتا ہوں۔“

ان اقوال مبارکہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کس شان کے بزرگ تھے۔ اسی مرد حق سے کسی شخص نے سوال کیا۔ ”شیخ! آپ کا حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”منصور ایک جانباز صوفی ہیں۔“ حضرت ابن عطاء نے فرمایا۔

”منصور حلاجؒ سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن کی عقلی توجیہ ممکن نہیں۔“ اس شخص نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

حضرت ابن عطاء نے فرمایا۔ ”جنات منصور حلاجؒ کے تابع ہیں۔ اسی لئے ان کے کام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔“

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت شیخ ابن عطاء جیسے بزرگ بھی حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات کو جنوں کی کارکردگی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء اسے شعبدہ بازی قرار دیتے تھے۔

ایک سال بعد کسی شخص نے حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں وہی سوال کیا تو حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء نے فرمایا۔ ”حسین بن منصورؒ کی کرامات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔“

اس شخص نے عرض کیا۔ ”پہلے تو آپ نے فرمایا تھا کہ جنات منصور حلاجؒ کے تابع ہیں۔“

جواب میں حضرت شیخ ابن عطاء نے فرمایا۔ ”اس وقت مجھے منصور حلاجؒ کے حالات کی تفصیل تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں تھی مگر اب میں اس حقیقت سے آگاہ ہو گیا ہوں اور صحیح بات وہی ہے جو تم نے اب سنی ہے۔“

اس واقعے کو مشہور مؤرخ خطیب بغدادی نے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر علماء اور فقہاء تحقیق کرنے کی بجائے سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا کرتے تھے اور پھر حضرت منصور حلاجؒ ان کے

اعتراضات کا نشانہ بن جاتے تھے۔



الغرض حضرت منصور حلاج اہل بصرہ کے جوش عقیدت سے بیزار ہو کر دوبارہ تستر چلے گئے۔ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی، حضرت منصورؒ کے بیٹے احمد بن حسین کے حوالے سے لکھتا ہے۔ ”بصرہ سے واپس آنے کے بعد میرے والد کچھ دنوں تک تستر میں مقیم رہے۔ ایک بار پھر عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے گرد سمٹ آیا۔ وہ جدھر جاتے تھے، ہزاروں انسان دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر بہت سے صوفیاء اور علماء میرے والد سے حسد کرنے لگے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ تو مسلسل خوزستان والوں کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ ان خطوط میں میرے والد کے متعلق بری بری باتیں تحریر ہوتی تھیں۔ آخر وہ ان تمام باتوں سے تنگ آ گئے اور انہوں نے صوفیانہ لباس اتار پھینکا۔ پھر اہل تستر نے میرے والد کو سپاہیانہ لباس میں دیکھا۔ اب وہ مشائخ کی صحبت چھوڑ کر عام دنیا داروں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

پھر ایک دن میرے والد تستر سے روانہ ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے میری والدہ کو بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ پانچ سال تک ہم سے دور رہے۔ بس لوگوں کی زبانی خبریں ملتی رہیں کہ میرے والد خراسان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر کہنے والوں نے کہا کہ وہ ماوراء النہر کے علاقے میں دیکھے گئے ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد یہ خبر ملی کہ وہ بستان اور کرمان کی سیاحت میں مصروف ہیں۔ پھر بتانے والوں نے بتایا کہ میرے والد فارس (ایران) میں موجود ہیں اور اپنی پرانی روش پر لوٹ آئے ہیں۔ انسانی ہجوم کے سامنے عارفانہ گفتگو کرتے ہیں۔ مجالس منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فارس (ایران) میں ان کی شہرت اس قدر بڑھی کہ لوگ انہیں ”عبداللہ زاہد“ کے لقب سے پکارنے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ پھر میرے والد فارس سے ”اہواز“ چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو تستر بھیجا پھر اس شخص نے مجھے اور میری والدہ کو ”اہواز“ پہنچا دیا۔ یہاں میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی مجالس دیکھیں۔ وہ لوگوں میں بے پناہ مقبولیت رکھتے تھے۔

”اہواز“ میں میرے والد کی کشف کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں ”حلاج الاسرار“ کہہ کر پکارنے لگے۔ پھر ”حلاج“ لقب مشہور ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد مجھے ”اہواز“ میں اپنے دوستوں کے پاس چھوڑ کر بصرہ تشریف لے گئے۔ پھر میں نے لوگوں سے سنا کہ بصرہ میں مختصر قیام کرنے کے بعد میرے والد مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ اس بار ان کا عجیب حال تھا۔ وہ ایک گدڑی کے ساتھ بہت اونچا پا جامہ پہنے ہوئے تھے (پا جامہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تھا تا کہ شریعت کے مطابق ستر پوشی ہو سکے) اس سفر میں مخلوق خدا کی بہت بڑی بھیڑ ان کے ساتھ تھی۔ میرے والد کے ساتھ لوگوں کی یہ عقیدت دیکھ کر ابو یعقوب نہر جوریؒ حسد کی آگ میں جل اٹھے۔“

حضرت ابو یعقوب نہر جوری کا شمار اس دور کے بڑے مشائخ میں ہوتا ہے۔ ابو یعقوب، حضرت عمرو بن عثمان مکی کے مرید تھے۔ بہت سی روایتوں میں واضح طور پر درج ہے کہ جب حضرت ابو یعقوب نہر جوری نے حضرت منصور حلاج کی بے پناہ مقبولیت دیکھی تو شدت غضب سے لوگوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایک شعبہ باز کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہو۔ منصور حلاج کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے۔“

بعض روایتوں میں اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ درج ہیں۔ حضرت ابو یعقوب نہر جوری کی مخالفت کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پیر و مرشد حضرت عمرو بن عثمان مکی، حضرت منصور حلاج سے ناراض تھے، اس لئے اپنے شیخ کے اتباع میں ابو یعقوب بھی حضرت منصور حلاج کی مخالفت میں بہت زیادہ شدت اختیار کر گئے تھے۔ بہر حال اس بار حضرت منصور حلاج کا قیام مکہ مختصر تھا۔ آپ چند ماہ قیام کر کے بصرہ واپس لوٹ آئے۔ پھر ایک ماہ بعد ”اہواز“ پہنچے اور وہاں سے اپنے بیوی بچوں کو لے کر بغداد پہنچے۔ حضرت منصور حلاج کے صاحب زادے احمد بن حسین کا بیان ہے کہ سفر بغداد میں بڑے بڑے لوگ میرے والد کے ہمراہ تھے۔ یہ بڑے لوگ کون تھے، اس کی تفصیلات کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔

حضرت منصور حلاج تقریباً ایک سال تک بغداد میں مقیم رہے۔ اس وقت بھی آپ کے پیر و مرشد حضرت جنید بغدادی زندہ تھے مگر کسی روایت سے پتہ نہیں چلتا کہ استاد اور شاگرد میں ملاقات ہوئی ہو۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی، حضرت منصور حلاج سے بدستور ناراض تھے..... اور اس بات کا بھی سراغ نہیں ملتا کہ حضرت منصور حلاج نے اپنے مرشد کی ناراضگی کو دور کرنے کی کوئی کوشش کی ہو..... مگر یہ امر اپنی جگہ طے ہے کہ حضرت جنید بغدادی نے حضرت منصور حلاج کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور کسی موقع پر مجمع عام یا مجلس خاص میں اپنی خفگی کا اظہار نہیں کیا۔

بغداد میں اپنے ایک سالہ قیام کے بعد حضرت منصور حلاج نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ ”تم اس وقت تک میرے بیٹے احمد کی نگرانی کرنا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔“

”شیخ! اب کدھر کا ارادہ ہے؟“ دوست نے پوچھا۔

”میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ میں بلادِ شرک (کفرستان) کی طرف جاؤں اور گم کردہ راہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤں۔“ حضرت حسین بن منصور حلاج نے فرمایا۔

(بلادِ شرک اور کفرستان سے مراد ہندوستان ہے)

حضرت منصور حلاج کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے دوست کے سپرد کر کے میرے والد صاحب نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ وہ ہندوستان میں موجود ہیں اور بت پرستوں کو خدائے واحد کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

حضرت منصور حلاج کے سفر ہندوستان کے بارے میں فرانس کا مشہور مستشرق ”لوئی ماسینون“ کہتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور نے اپنے اس سفر کا آغاز بحری راستے سے کیا اور وہ دریائے سندھ کے ساتھ

ساتھ آگے بڑھے اور ملتان سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے۔ ”اہواز“ کے تجارتی قافلے تستر کا زریفت (کپڑا) کشمیر لاتے اور اس کے بدلے میں بہترین چینی کاغذ جسے ”چاچو“ کہتے تھے، بغداد لے جاتے۔ بعد میں اسی کاغذ پر منصور حلاجؒ کے شاگرد اپنے استاد کی کتابیں لکھا کرتے تھے۔ منصور حلاجؒ کشمیر میں ان ہی تاجروں کے ساتھ ہوئے اور پہاڑوں کے پرچے راستوں سے گزر کر شمالی مشرق کی طرف ”توزمان“ (چین) تک جا پہنچے۔

کسی تاریخ سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ حضرت منصور حلاجؒ ہندوستان میں کتنے دن مقیم رہے۔ ”لونی ماسینون“ کی کتاب سے بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے ہندوستان کے گیانیوں اور پنڈتوں سے ملاقات کی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت منصور حلاجؒ خراسان میں ”مانی“ کے پیروکاروں اور ماوراء النہر کے بودھوں سے بھی ملے تھے۔

حضرت منصورؒ کے صاحبزادے احمدؒ کا بیان ہے کہ جب میرے والد اس طویل سیاحت سے واپس آئے تو ہندوستان کے لوگ ان کے نام کے ساتھ ”مغیث“ لکھتے تھے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے کچھ دن بت پرستوں میں رہ کر انہیں بھی اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس تبلیغی مشن میں یقیناً کچھ ہندو مسلمان بھی ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ حضرت منصور حلاجؒ کی کرامات نے مشرکوں اور دیوتاؤں کے پجاریوں کو بھی متاثر کیا ہوگا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے ہوں گے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے اسی سفر ہندوستان کو بنیاد بنا کر مخالفین نے ان پر یہ الزام تراشی کی ہے کہ وہ جادو سیکھنے کے لئے کفرستان کی طرف گئے تھے۔

بہر حال جب حضرت منصور حلاجؒ اس طویل سفر سے واپس آئے تو مختلف علاقوں کے لوگ انہیں مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ چین اور ترکستان کے لوگ انہیں ”مقیث“ کہتے تھے۔ خراسان کے باشندے ”متمیز“ کے نام سے پکارتے تھے اور فارس کے لوگ ”ابو عبد اللہ زاہد“ کہتے تھے۔

واضح رہے کہ جہاں حضرت منصور حلاجؒ پر شعبہ بازی اور ساحری کے الزامات تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ ان کے ماننے والوں کی ایک جماعت انہیں ”خدا“ سمجھتی تھی۔ اس موضوع پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائے گی مگر یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ مخالفین کے اس الزام کی بنیاد وہ ”لقاب“ بھی ہو سکتے ہیں جو حضرت منصور حلاجؒ کے عقیدت مندوں نے ان کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیئے تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے رہنے والے حسین بن منصور کو ”مغیث“ کے لقب سے پکارتے تھے۔ ”مغیث“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”فریاد کو پہنچنے والا“ مادی دنیا میں ہم ایسے مناظر دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نے فریاد کی اور دوسرے شخص نے فریاد سنی اور فریاد کرنے والے کی مشکل کو دور کر دیا..... مگر حقیقتاً صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو اپنے بندوں کی فریاد کو پہنچتی ہے۔ ممکن ہے اسی لقب کو بنیاد بنا کر مخالفین نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ حضرت منصور حلاجؒ اپنے بعض ماننے والوں کی نظر میں خدا تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ چین اور ترکیستان کے لوگوں میں ”مقیّت“ کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مقدس ہے۔ ”مقیّت“ کے معنی ہیں، توانا، روزی دینے والا اور حاضر۔ ممکن ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے ان ہی القاب سے دھوکا کھایا ہو اور ان پر اپنی پرستش کرا نے کا الزام عائد کر دیا ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو مگر حضرت منصور حلاجؒ برسر عام اس الزام کو جھٹلایا کرتے تھے۔



الغرض حضرت منصور حلاجؒ کی بے قرار یوں اور وحشتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ منزلِ عشق کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور اہل دنیا انہیں مختلف زاویوں سے دیکھ رہے تھے۔ اکثر عقیدت مند ولی کامل سمجھتے تھے مگر بعض ماننے والوں نے انہیں خدا کا درجہ دے دیا تھا۔ دوسری طرف مخالفین کے اعتراضات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے بات شعبہ باز اور جادو گر تک محدود تھی، اب انہیں کافر و زندیق بھی کہا جانے لگا تھا۔ مخلوق خدا کا یہی وہ رویہ تھا جس نے حضرت منصور حلاجؒ کے اضطراب کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

پھر جب 290ھ میں حضرت منصور حلاجؒ تیسرے حج کے لئے حجاز مقدس پہنچے تو سوزِ عشق سے وارفتہ ہو گئے۔ پہلے ضبطِ سخن سے سینہ جلتا تھا، دل پگھلتا تھا اور روح پھٹکتی تھی..... مگر اب زبان بھی جل اٹھی۔ علامہ اقبال کے بقول۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

آخر حج کا دن آ پہنچا۔ حضرت منصور حلاجؒ بھی دوسرے حاجیوں کی طرح ”لبیک اللہم لبیک“ کی صدائیں لگاتے رہے۔ پھر جب میدانِ عرفات میں پہنچے تو رب کعبہ کو مخاطب کر کے گریہ و زاری کرنے لگے۔

”اے خدائے بزرگ و برتر! مجھے اس سے زیادہ بے نوا اور حاجت مند بنادے جیسا کہ میں نظر آتا ہوں۔ اے خلاقِ عالم! مجھے رسوا کر دے تاکہ لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں..... اے میرے رب! لوگوں کو مجھ سے بیزار کر! تاکہ شکر کا ہر کلمہ جو میری زبان سے نکلتا ہے، فقط تیرے لئے ادا کیا جائے..... اے میرے کریم! مجھے اس بات پر استقامت عطا فرمادے کہ میں تیرے سوا کسی کا احسان نہ اٹھاؤں۔“

عجیب دعا تھی۔ شاید ہی بنی نوع آدم میں سے کسی نے اپنے مالک سے ایسی درخواست کی ہو۔

عوام الناس معصوم اور بے قصور تھے۔ انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ پکارنے والا کس مقام سے آواز دے رہا ہے..... مگر جو لوگ باخبر تھے وہ اسے پہچاننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً مشہور کر دیا گیا کہ منصور حلاجؒ ”مجتون“ ہیں۔ بدخواہوں کی یہ تشہیری مہم اپنی جگہ اور حضرت منصور حلاجؒ کی وارثی شوق اپنی جگہ۔ وہ اپنے خالق کو اپنے انداز سے پکارتے رہے۔ شوق کی لے تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی اور آتشِ عشق کے شعلے حصارِ جاں سے نکل کر جسم کی چار دیواری میں بھی بھڑکنے لگے۔

پھر ایک ایسا عجیب واقعہ پیش آیا کہ جس کی گونج دربار خلافت میں بھی سنائی دینے لگی۔ بات یوں ہوئی کہ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا حاجب (امیر) ابن نصر قشوری بیمار ہوا۔ طبیب خاص کو طلب کیا گیا۔ اس نے ابن نصر کا معائنہ کیا۔ مرض تشخیص کیا اور اس کے ساتھ ہی دوا بھی تجویز کر دی۔ ابن نصر قشوری نے طبیب خاص کا نسخہ استعمال کیا مگر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ درباری حکیم کو دوبارہ طلب کیا گیا۔ اس نے ایک بار پھر حاجب کا معائنہ کیا اور نئی دوا تجویز کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر اس مرض میں سیب کھانا بہت مفید ہوتا ہے..... مگر میں نے سیب اس لئے تجویز نہیں کیا کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کہیں سے سیب مل جائے تو آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“

ابن نصر قشوری نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ بغداد کے گوشے گوشے میں سیب تلاش کریں۔ خدام نے اپنے امیر کے حکم پر بغداد اور اس کے مضافات کا ایک ایک چپہ چھان مارا مگر سیب کہیں نہیں ملا۔ آخر ایک خدمت گار نے ابن نصر قشوری سے عرض کیا۔ ”امیر! میں یہاں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ہر حال میں سیب فراہم کر سکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ ابن نصر قشوری نے حیران ہو کر پوچھا۔

بغداد میں ایک درویش منصور حلاج ہیں جو آپ کی اس خواہش کو بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔“ خدمت گار نے کہا۔

”اس کے باوجود کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں ہے؟“ ابن نصر قشوری بدستور حیران تھا۔

”دنیا کے کسی مقام پر تو سیبوں کا موسم ہو گا۔“ خدمت گار نے عرض کیا۔ ”منصور حلاج دنیا کے دور دراز علاقے سے بھی سیب لے آئیں گے۔“

”مجھے یقین نہیں آتا مگر پھر بھی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ابن نصر قشوری نے پرجوش لہجے میں کہا۔

پھر جب ابن نصر کے خدمت گار نے حضرت منصور حلاج سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔ ”چلو! میں خود ہی ابو نصر کی عیادت کو چلتا ہوں۔“

حضرت منصور حلاج اپنی اسی شان قلندرانہ کے ساتھ خلیفہ مقتدر باللہ کے محل میں داخل ہوئے۔ قصر خلافت کے مکینوں نے بڑی حیرت سے اس گدڑی پوش درویش کو دیکھا۔ اس وقت ابن نصر قشوری کی عیادت کے لئے بڑے بڑے عمائدین شہر موجود تھے۔

”امیر! تم جانتے ہو کہ تمہیں بے موسم پھل کی خواہش ہے۔“ حضرت منصور حلاج نے ابن نصر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں بھی یہی کہتا ہوں۔“ ابن نصر قشوری نے عرض کیا۔ ”مگر میرے اس خدمت گار کو آپ کے ساتھ بہت حسن ظن ہے۔“

حاضرین بھی بڑی حیرت سے اس مرد درویش کو دیکھ رہے تھے۔ جس کا لباس بہت بے ترتیب تھا۔ ابن نصر قشوری کی بات سن کر حضرت حسین بن منصور حلاج نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ پھر

دوسرے ہی لمحے آپؐ کے دست مبارک میں ایک تروتازہ سیب موجود تھا۔
حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت پر ابن نصر قشوری کے ساتھ حاضرین بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر وہاں موجود ایک معزز شخص نے اس مرد درویش سے پوچھا۔

”جب اس پھل کا موسم ہی نہیں ہے تو پھر تم یہ سیب کہاں سے لائے؟“

”جنت سے۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

پھر اس سیب کو کاٹا گیا تو اس میں ایک کیڑا موجود تھا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا۔ ”جنت کے پھل میں تو کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیڑا کیسا ہے؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے بے ساختہ فرمایا۔ ”چونکہ یہ پھل ”دارِ بقا“ سے دارِ فنا میں آگیا ہے، اس لئے اس میں یہاں کی بلا کا ایک حصہ شامل ہو گیا ہے۔“

روایت ہے کہ حاجب ابن نصر قشوری اور دیگر حاضرین نے حضرت منصور حلاجؒ کے برجستہ جواب کو ان کے فعل سے بھی زیادہ عجیب سمجھا۔

اس واقعے کے بعد ابن نصر قشوری، حضرت منصور حلاجؒ کی بزرگی کا قائل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی قصر خلافت میں ایک شور مچ گیا۔ عباسی خلیفہ مقتدر بالله کے خاندان کے کچھ لوگ اور بہت سے بااثر افراد آپؐ کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔

اسی طرح حضرت منصور حلاجؒ سے اور بھی کئی کرامات منسوب ہیں۔

حضرت شیخ رشید خرد سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار تقریباً چار سو درویش سفر حج میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے ہمراہ تھے۔ پیدل کا سفر تھا، اس لئے درویشوں کے قافلے پر شدید تھکن کے آثار طاری تھے..... مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ سے کسی قسم کی شکایت کرتا۔ پھر یوں ہوا کہ کئی دن تک راستے میں کھانے کا کوئی سامان میسر نہیں آیا۔ حضرت منصور حلاجؒ تو اس فاقہ کشی کے عادی تھے، اس لئے پیشانی مبارک پر ہلکی سی شکن تک نہیں تھی..... مگر دوسرے درویشوں کے حوصلے جواب دے گئے۔ آخر ایک درویش نے بعد احترام عرض کیا۔

”شیخ! ہم آپ جیسی استقامت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔“

”مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”ہماری طرح آپ بھی کئی دن سے قاتے میں مبتلا ہیں مگر یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ کسی شکایت یا اضطراب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔“ درویش نے عرض کیا۔

”اللہ کے راستے میں گامزن ہو تو ہمت بھی بلند رکھو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”جسے تم استقامت کہہ رہے ہو، اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ استقامت کسی اور شے کا نام ہے۔“

”شیخ کے فرمودات بجا مگر ہم اس استقامت سے آشنا نہیں۔“ درویش نے عرض کیا۔ ”بھوک سے ہماری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اب چند قدم بھی نہیں چل سکتے۔“

”تمہیں صبر بھی کرنا ہو گا اور سفر بھی جاری رکھنا ہو گا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میں اس

ویرانے میں تمہارے لئے غذائی سامان کہاں سے لاؤں؟“

حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھی درویش طویل سفر کی تھکن اور بھوک کی شدت کے سبب تھک کر راستے ہی میں بیٹھ گئے۔ حضرت حسین بن منصورؒ ان لوگوں کو چھوڑ کر تنہا بھی سفر جاری رکھ سکتے تھے مگر آپؒ نے ایسا نہیں کیا۔

”آخر تم کس چیز کے انتظار میں اس طرح سر راہ بیٹھے ہو؟“ ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر حضرت منصور حلاجؒ نے پوچھا۔

”اس انتظار میں کہ شاید اللہ کے بندوں کا کوئی قافلہ ادھر سے گزرے اور اس کے پاس کچھ غذائی سامان موجود ہو۔“ دوسرے درویش نے عرض کیا۔

”مگر اس کے پاس اتنا سامان کہاں ہوگا جس سے اتنے لوگوں کا پیٹ بھرا جاسکے۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے درویشوں کی جماعت پر نظر کی جس میں چار سو افراد شامل تھے۔ حضرت منصورؒ کا تجزیہ درست تھا کہ کوئی بھی قافلہ غذا کے سلسلے میں اتنے لوگوں کی کفالت نہیں کر سکتا تھا۔

آخر جب درویشوں نے تھک کر راستے میں پڑاؤ ڈال دیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”کس کس کے سامنے اپنا سوال دہراؤ گے اور کس کس سے اپنی ضرورت بیان کرو گے؟“

”شیخ! مجبوری ہے۔ اب ہم صرف پانی پی کر یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔“ کئی درویشوں نے بیک زبان کہا۔

حضرت منصور حلاجؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر آپؒ نے ساتھی درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اللہ ہی اپنی تمام مخلوق کا رازق ہے اور اللہ ہی اپنے بندوں کا کارساز ہے۔ تم لوگ کسی انسانی قافلے کا انتظار نہ کرو بلکہ اللہ کے بھروسے پر اپنے اپنے دسترخوان بچھالو۔“

درویشوں نے بڑی حیرت سے حضرت منصور حلاجؒ کی بات سنی۔ ”شیخ! کیا آپ ہمیں کھانا کھلائیں گے؟“

”بندوں کو کھلاتا تو وہی ہے جو سارے خزانوں کا مالک ہے..... مگر آج میں تمہاری میزبانی ضرور کروں گا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

ساتھی درویشوں کو شدید حیرت تھی کہ شیخؒ اس بیابان میں اتنے لوگوں کی غذا کا انتظام کیسے کریں گے مگر پھر بھی تمام درویشوں نے اپنے اپنے رومال زمین پر بچھال لئے۔

”شیخ! جب آپ ہماری میزبانی کر رہے ہیں تو پھر پسندیدہ چیز کھائیے؟“ ایک درویش نے عرض کیا۔

”تمہیں کیا پسند ہے؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے ہم سفر درویشوں سے پوچھا۔

”شیخ! بہت دنوں سے سری نہیں کھائی ہے۔“ بیک وقت کئی درویشوں نے اپنی پسندیدہ غذا کی خواہش کا اظہار کیا۔

”صف بندی کرلو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

اور پھر درختوں کے سائے میں تمام درویش ایک ترتیب کے ساتھ بیٹھ گئے۔

حضرت منصور حلاج پہلے درویش کے پاس پہنچے۔ پھر آپؑ نے اپنا دایاں ہاتھ کمر کے پیچھے کیا۔ تمام درویشوں پر حیرت و سکوت کا عالم طاری تھا۔ چند لمحوں بعد حضرت حسین بن منصورؒ کا ہاتھ سامنے آیا تو سالن کا ایک برتن اور دو گرم روٹیاں موجود تھیں۔ ”بسم اللہ کرو۔“ حضرت منصورؒ نے درویش سے فرمایا۔ پھر اسی طرح اپنا ہاتھ کمر کے پیچھے لے گئے۔ یہاں تک کہ چار سو درویشوں نے شکم سیر ہو کر اپنا مرغوب کھانا کھایا۔ پھر حضرت منصور حلاجؒ سے عرض کیا۔

”شیخ! یہ کیا تھا؟“

”تمہارے پیٹ بھر گئے.....؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے ایک درویش کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

”شیخ! بھوک تو مٹ گئی مگر حیرت بڑھ گئی۔“ دوسرے درویش نے عرض کیا۔

”حیرت کا کیا ہے؟ جب تک زندہ ہو، حیرت تو بڑھتی ہی رہے گی۔“ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ نے اپنے ساتھیوں کو ٹالنے کی کوشش کی مگر جب درویشوں کا اصرار زیادہ بڑھ گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

”یہ اس کی رزاقی کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے۔ وہ اپنے بندوں کو ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

الغرض حاجیوں کا یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تمام درویش اپنی کھلی آنکھوں سے حضرت منصور حلاجؒ کی یہ کرامت دیکھ ہی چکے تھے۔ پھر ایک مقام پر پہنچ کر ان لوگوں نے اپنی دوسری خواہش کا اظہار کیا۔

”شیخ! ہمارا دل تازہ خرموں کو چاہتا ہے۔“

”یہی تو انسان کی کمزوری ہے کہ وہ قناعت نہیں کر سکتا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے درویشوں کی بات سن کر فرمایا۔ ”شکم کی آگ بجھی تو لذت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پھر کوئی اور آگ بھڑک اٹھے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن انسان آخری آگ کا ایندھن بن جائے گا۔“

درویشوں نے حضرت منصور حلاجؒ کی عبرت اثر تقریر سنی مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ درویش یا تو حضرت منصور حلاجؒ کی نئی کرامت دیکھنا چاہتے تھے یا واقعتاً اپنی خواہش سے مغلوب ہو گئے تھے۔

آخر حضرت منصور حلاجؒ ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور درویشوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”مجھے زور زور سے ہلاؤ۔“

درویشوں نے ایسا ہی کیا اور پھر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے جسم کو ہلا رہے تھے اور زمین پر تازہ خرموں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ پھر تمام ہم سفرؤں نے جی بھر کے تازہ کھجوریں کھائیں اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک اسی انداز کا واقعہ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اپنی تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ میں تحریر کیا ہے کہ ایک بار حضرت منصور حلاجؒ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں کے ساتھ کسی جنگل میں جا رہے

تھے۔ خدام نے عرض کیا۔ ”شیخ! انجیر کھانے کو دل چاہتا ہے مگر اس جنگل میں نہ انجیر کے درخت ہیں اور نہ موسم۔“

حضرت منصور حلّاجؒ نے خدمت گاروں کی خواہش سن کر فضا میں اپنا ہاتھ بلند کیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے تازہ انجیروں سے بھرا ہوا ایک طباق موجود تھا۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت منصور حلّاجؒ اپنے مریدوں کے ہمراہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ یہ مقام بغداد سے کئی دن کی مسافت کے فاصلے پر تھا۔ خدمت گاروں نے حلوہ کھانے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت منصور حلّاجؒ نے فرمایا۔

”میں اس بیابان میں تم لوگوں کے لئے حلوہ کہاں سے لاؤں؟“

”شیخ! آپ بے موسم کے انجیر کھلا سکتے ہیں تو حلوہ لانے میں کیا قباحت ہے؟“ خدمت گاروں نے عرض کیا۔

حضرت منصور حلّاجؒ نے حسب عادت اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور حلوے سے بھرے ہوئے تھال اپنے مریدوں کے سامنے رکھ دیئے۔

خدمت گاروں نے وہ لذیذ حلوہ کھانے کے بعد عرض کیا۔ ”شیخ! یہ حلوہ تو بغداد کے بازاروں میں ملتا ہے۔“

حضرت منصور حلّاجؒ نے اپنے مریدوں کی حیرت کے جواب میں فرمایا۔ ”میرے لئے بغداد کے بازار اور جنگل سب برابر ہیں۔“

اسی قسم کی کرامات کا شہرہ سن کر مکہ معظمہ، بصرہ، بغداد اور دیگر شہروں کے لوگ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ حضرت منصور حلّاجؒ سے محتاط عقیدت رکھتا تھا، اس کی نظر میں حسین بن منصورؒ، ولی باکرامت تھے۔ اس گروہ میں اپنے زمانے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ اور حضرت عبداللہ خفیفؒ نمایاں تھے۔

دوسرا وہ گروہ جس نے اپنی عقیدت میں انتہائی مبالغے سے کام لیا تھا۔ یہ لوگ حضرت منصور حلّاجؒ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدیؑ سمجھتے تھے۔ (معاذ اللہ)

تیسرا گروہ اگرچہ علماء پر مشتمل تھا لیکن اس گروہ کے لوگ حضرت منصور حلّاجؒ کو ”شعبہ باز“ اور ”ساحر“ کہہ کر پکارتے تھے۔

چوتھے گروہ میں علماء شامل تھے مگر یہ لوگ کھلی دشمنی پر اتر آئے تھے اور تحقیق کی زحمت اٹھائے بغیر سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر حضرت منصور حلّاجؒ کو زندیق اور کافر کہا کرتے تھے۔

چونکہ حضرت منصور حلّاجؒ مسلمانوں میں انتہائی متنازع شخص ہیں، اس لئے ان کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں، وہ حرف بہ حرف درج کی جا رہی ہیں۔ جس مؤرخ نے سب سے پہلے حضرت منصور حلّاجؒ کا ذکر نہایت گستاخانہ اور جارحانہ لہجے میں کیا ہے، وہ عریب بن سعد ہے۔ اس کی لکھی ہوئی تاریخ ”صلہ طیبی“ کافی شہرت رکھتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسی تاریخ کے ایک باب

کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

”حلاج ایک گمراہ اور خبیث آدمی تھا۔ وہ شہر بہ شہر پھرا کرتا تھا اور جاہلوں کو دھوکا دیا کرتا تھا۔ بعضوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ وہ اہل بیت کا داعی ہے اور بہت سے لوگوں سے کہتا کہ وہ (عقیدتا) سنی ہے۔ شیعوں کے سامنے شیعہ بن جاتا اور معتزلہ کے سامنے کسی معتزلی کا روپ دھار لیتا۔ اس کے علاوہ ہاتھ کا بڑا چالاک اور شعبدہ باز تھا۔ اسے طب کا دعویٰ تھا، کیمیا کا تجربہ رکھتا تھا۔ ہمیشہ شعبدے کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے بہت سے بے وقوفوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ پھر اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور ”حلول“ کا قائل ہوا۔ (اس عقیدے کو ماننے والوں کا خیال ہے کہ خدا کسی خاص انسان کی ذات میں سما جاتا ہے) پھر اس نے اللہ اور رسول ﷺ پر افترا باندھا۔ اس کے بہت سے خطوط ملے جن میں حماقتیں اور الٹی سیدھی باتیں تحریر تھیں۔ بعض خطوط میں تحریر تھا کہ میں ہی قوم نوح کا ڈبونے والا ہوں اور قوم عاد و ثمود کو ہلاک کرنے والا ہوں..... اور اپنے مریدوں سے کہتا کہ تم نوح اور موسیٰ ہو۔ میں نے ان کی رو میں ان کے بدن میں لوٹا دی ہیں۔“

آگے چل کر علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت منصور حلاجؒ کے حوالے سے مشہور مؤرخ ابن ندیم کا ایک اقتباس اس طرح پیش کرتے ہیں:

”حلاج ایک حیلہ گر اور شعبدہ باز تھا۔ اس نے صوفیاء کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ ان کے الفاظ بولتا تھا اور ہر علم کا دعویٰ کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس سے خالی تھا۔ البتہ علم کیمیا کچھ جانتا تھا۔ اپنے مقلدوں میں بیٹھ کر الوہیت کا مدعی اور حلول کا قائل تھا۔ سلاطین کے سامنے اپنا مذہب شیعہ ظاہر کرتا اور عوام کے سامنے صوفیوں کا مذہب..... اور بیچ بیچ میں یہ بھی دعویٰ کرتا جاتا کہ الوہیت اس میں حلول کر گئی ہے..... اور وہ خدا ہے.....“

”تمام تاریخیں اس امر پر متفق اللفظ ہیں کہ حلاج، نیرنگ، شعبدہ بازی اور ہاتھوں کے کھیل میں بہت چالاک اور بہت مشاق تھا۔ روپے برسا دیتا تھا، طرح طرح کے میوے منگوا دیتا تھا..... ہوا پر اڑاتا تھا..... اور بھی کچھ عجائبات دکھاتا تھا۔ بس ایک بار ایک شخص نے کہا کہ تم کوئی ایسا سکھ دکھاؤ جس پر خلیفہ کی بجائے تمہارا نام کندہ ہو..... لیکن یہ بازی گر الوہیت کے دعوے کے باوجود اپنے نام کا ایک سکھ بھی بنا کر نہ دکھا سکا..... اس کے ہم سفر کا بیان ہے کہ حلاج اُس کے ساتھ اس غرض سے ہندوستان آیا کہ یہاں کی مشہور شعبدہ بازیوں کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اُس کے سامنے ایک عورت سے حلاج نے رتی پر چڑھ کر غائب ہو جانے کا شعبدہ سیکھا۔ راہ میں گڑھے کھود کر کہیں پانی، کہیں میوہ، کہیں کھانا پہلے چھپا دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس سمت میں سفر کرتا اور بوقت ضرورت اپنی کرامتوں کے تماشے دکھاتا۔“

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون میں ابو ریحان البیرونی کی کتاب ”آثار الباقیہ“ سے بھی ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ البیرونی، حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں لکھتا ہے۔

”ابن مقفع کے بعد ایک صوفی منش شخص حسین بن منصور حلاجؒ پیدا ہوا۔ نسلایہ ایرانی تھا۔ پہلے یہ

”مہدی“ بنا۔ وہ ایک شعبہ باز اور پُر فریب آدمی تھا۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے آدمی کے سامنے اپنے آپ کو اسی فرقے اور مذہب کا بتاتا تھا۔ پھر یہ دعویٰ کیا کہ اس میں روح الہی حلول کر گئی ہے اور اس لئے اپنے آپ کو خدا کہنے لگا۔ خط میں اپنے پیروکاروں کو لکھا۔ ”خدائے ازیلی کی طرف سے فلاں بندے کے نام۔“ اس کے مرید جواب میں لکھتے۔ ”اے وہ ذات جو ہر زمانے میں مختلف قالب اختیار کرتی رہی ہے اور اب حسین بن منصور کے قالب میں ہے۔“

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا یہ مضمون مشہور رسالے ”معارف“ کے شمارہ اپریل 1917ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ نے جس قدر بھی تاریخی حوالے پیش کئے ہیں، وہ سب کے سب حضرت منصور حلاجؒ کی صوفیانہ شخصیت کی نفی کرتے ہیں۔ خود سید سلیمان ندویؒ کی ذاتی رائے جو حضرت منصور حلاجؒ کے بارے میں ہے، اسے پڑھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے دل میں حسین بن منصورؒ کے لئے کوئی نرم گوشہ موجود نہیں۔ صوفی اور ولی سمجھنا تو درکنار، سید سلیمان ندویؒ، حضرت منصور حلاجؒ کو مسلمان ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ عریب بن سعد، ابن ندیم، ابوریحان البیرونی اور دوسرے مؤرخین کی طرح علامہ ندویؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کو ایک دھوکے باز اور جادوگر سمجھتے تھے۔ سید سلیمان ندویؒ کے خیال میں حسین بن منصورؒ جس فرقے کے لوگوں سے ملتے تھے ان ہی کا مذہب اختیار کر لیتے تھے۔ گویا وہ موقع محل کے اعتبار سے اپنے عقائد اور نظریات کو تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کیا تھے، اس بحث سے قطع نظر، وہ زمانہ ساز انسان نہیں تھے۔ ایک نہیں، ہزاروں شہادتیں موجود ہیں کہ منصور حلاجؒ جس بات کو درست سمجھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے۔ حسین بن منصورؒ کی اسی بے باکی کے سبب ان کے اساتذہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ پھر آٹھ سالہ قید کے دوران اور آخر میں سولی چڑھتے وقت منصور حلاجؒ نے جو استقامت دکھائی وہ کسی شعبہ باز یا جادوگر کے بس کی بات نہیں تھی۔

بعد میں آنے والے محققین نے عریب بن سعد، ابن ندیم، خطیب بغدادی، ابوریحان البیرونی و اسی قسم کے دیگر مؤرخین کی روایتوں کو غلط قرار دیا ہے۔ حضرت شیخ ابو بکر شبلیؒ، حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء اور حضرت شیخ عبداللہ خفیفؒ جیسے اولیائے کرام کے سامنے مذکورہ مؤرخین کی روایتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ تینوں بزرگ نہ صرف حضرت منصور حلاجؒ کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے بلکہ اس زمانے میں موجود بھی تھے جب ایک سوختہ جاں عاشق کو تہمتوں کی آگ میں جلایا جا رہا تھا۔



الغرض مسلسل کرامتوں کا اظہار حضرت منصور حلاجؒ کے لئے وبال جان بن گیا۔ پہلے انہیں شعبہ باز اور ساحر قرار دیا گیا۔ پھر الزام لگایا گیا کہ حضرت منصور حلاجؒ حکومت وقت کے خلاف درپردہ سازشیں کر رہے ہیں اور عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا تختہ الٹ کر تخت خلافت پر متمکن ہونا چاہتے ہیں۔ لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک شخص جسے اپنی جان تک کا ہوش نہ ہو، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کس طرح ملوث ہو سکتا ہے۔ آدمی اقتدار تو اس لئے حاصل کرتا ہے کہ وہ عیاشانہ اور آمرانہ زندگی بسر کرے..... مگر جس

شخص کا یہ حال ہو کہ ایک ہی لباس میں کئی سال گزار دے، کئی کئی دن بھوکا اور پیاسا رہے، اسے تختِ خلافت کی ہوس کس طرح ہو سکتی ہے..... مگر چونکہ ہمارے مورخین حضرت منصور حلاجؒ کو حیلہ باز اور فتنہ گر قرار دیتے ہیں اس لئے علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی ان ہی کے ہم خیال ہیں۔ ذیل میں ان کے مضمون کا ایک اہم اقتباس پیش کیا جا رہا ہے، جس سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی شدید ترین ریاضتیں اس لئے تھیں کہ وہ عوام میں شہرت حاصل کر سکیں اور پھر اس شہرت کا سہارا لے کر منصبِ اقتدار تک پہنچ جائیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر کرتے ہیں کہ منصور حلاجؒ کے واقعہ میں جو اصل حقیقت پوشیدہ ہے، اسے تلاش کرنا چاہئے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ اور بنو عباس کی خلافت کا قیام، صرف اہل عجم کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ابو مسلم خراسانی جو اس انقلاب کا ہیرو ہے، وہ کوہستان اور خراسان میں پہلے ”داعی“ بنا۔ پھر داعی سے ”نبی“..... اور آخر میں نبی سے خدا ہو گیا..... یعنی لوگ اسے خدا کا ”اوتار“ ماننے لگے۔ (ہندوؤں کا بھی یہی نظریہ ہے۔ رام، کرشن اور شکر وغیرہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے) آخر خلافتِ عباسیہ کے قیام کے بعد خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو قتل کرادیا..... لیکن اس کے باوجود ان علاقوں میں اس کی ”خدائی“ کا زور باطل نہیں ہوا۔ مجوسی، پارسی اور اہل عجم اپنی ملکی اور وطنی حکومت کے قیام کی مختلف تدبیریں سوچتے تھے اور یہ سب بے کار ثابت ہوئی تھیں۔ آخر وہی تدبیر کامیاب نظر آئی جو ابو مسلم نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ خلافتِ عباسیہ کے قیام کے ساتھ یہ سازشیں شروع ہو گئیں۔ بابک خرمی اور مقفع خراسانی نے کوہستان، خراسان اور ترکستان کے علاقوں میں سالہا سال تک خدائی کی..... اور خلیفہ کی فوجیں شکست پر شکست کھاتی رہیں اور بڑی مشکل سے یہ فتنہ فرو ہو سکا۔

اہل عجم کا ایک اور گروہ تھا جو ملکی حکومت سے مایوس ہو کر حکمران طبقے میں اثرات پیدا کر کے دخیل کار ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس میں ان لوگوں کو کامیابی ہوئی..... اور خلافتِ عباسیہ کے پہلے خلیفہ سفاح سے لے کر مامون رشید تک تمام کاروباران ہی کے ہاتھوں انجام پاتا رہا۔ پھر جب معتمد بالله تخت نشین ہوا تو اس نے ایرانیوں کی جگہ ترکوں کو دے دی۔ اب عرب و عجم کی بجائے ”ترک و عجم“ میدان میں تھے۔ عام ہر دل عزیزی اور جمہور کی ہمدردی ایران و عراق میں اہل بیت نبوی ﷺ کے ساتھ تھی۔ چنانچہ دونوں طاقتیں اسی عصا کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں۔

معتمد بالله کے بعد عباسیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ایران و ترکستان میں ”دیالمہ“ نے ایک مستقل حکومت قائم کر لی۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ اب خلافت بغداد کی حیثیت ایک قدیم یادگار کی رہ گئی تھی۔ ان رئیسوں اور سلاطین میں سے جس کا قابو چل جاتا، خلافت کے کاروبار پر اپنا قبضہ جمالیتا۔

اسی اثناء میں دو عظیم الشان طاقتیں پیدا ہو گئیں۔ عراق میں قرامطہ کا گروہ پیدا ہوا اور افریقہ میں ایک مہدی کا ظہور ہوا جو فاطمیت کے مدعی بھی تھے۔ ان کے داعی اور جاسوس، درویشوں اور زاہدوں کی صورت میں تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ ”مہدیوں“ کا گروہ بڑھتے بڑھتے مصر پر قابض ہو گیا اور کئی سو

برس تک وہاں بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔

قرامطہ نے جو حقیقتاً مجوسی تھے، دس بارہ سال تک مسلمانوں پر وہ مظالم توڑے کہ ان کے بیان سے اب بھی رو نگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے عین حج کے زمانے میں عرب پر حملہ کیا اور حاجیوں کے قافلے کو لوٹ لیا۔ ہزاروں حاجیوں کو تہ تیغ کیا۔ بیت اللہ سے حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔ پھر ادھر سے فرصت پا کر دار الخلافہ کا رخ کیا۔ دم بہ دم ان کے آگے بڑھنے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خلیفہ بغداد سے فوجوں پر فوجیں بھیج رہا تھا اور وہ شکست کھا کھا کر پیچھے لوٹ جاتی تھیں۔ آخر بڑی مشکل سے کئی سالوں میں جا کر ان کا زور گھٹا اور وہ صرف ایران کے کوہستانی علاقے میں ”باطینہ“ کے لقب سے سمٹ کر رہ گئے۔

301ھ سے 310ھ تک ان فتنوں کے عین عروج اور شباب کا زمانہ تھا۔ ان فرقوں کے ”داعی“ عوام کو فریب دینے والے عجیب و غریب دعوؤں کے ساتھ اُٹھتے تھے۔ طاہری زہد و تقویٰ اور شعبدہ گری کی کرامات دکھاتے ہوئے خاموشی کے ساتھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پھرا کرتے تھے۔ عوام ان کے گرویدہ ہوتے جاتے اور معتقد بن جاتے تھے۔ جب ایک جمعیت پیدا ہو جاتی تھی تو موقع پا کر یہ بازی گر جدھر چاہتے تھے، ان بے وقوفوں کو جھونک دیتے تھے۔

عین اسی ہنگامہ ”رستخیز“ میں حلاج کا ظہور ہوا۔ یہ شخص دنیا کو دکھانے کے لئے بڑی بڑی ریاضت ہائے شاقہ برداشت کرتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر دن بھر دھوپ میں بیٹھا رہتا۔ ہندوستان آ کر یہاں کے ”نٹوں“ سے بہت سے شعبدے سیکھے۔ پھر واپسی میں اس نے عراق کو اپنا مسکن بنایا۔ پہلے ایک داعی کی حیثیت اختیار کی۔ لوگوں کو اپنی کرامتیں دکھاتا ہوا، سرکاری عہدیدار سے نظریں بچاتا ہوا، اس گاؤں سے اس گاؤں اور اس شہر سے اس شہر میں پھرا کرتا تھا۔ لوگوں کا بڑا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اب اس نے نئے نئے دعوے شروع کئے اور اس کے مرید ہر بات پر ”آمینا و صدقاً“ کہتے جاتے تھے۔ آخر خدائی تک نوبت پہنچی۔

سب سے پہلے 299ھ میں سرکاری عہدیداروں پر اس کا راز فاش ہوا۔ عراق میں ایک مقام ”سوس“ ہے۔ ایک دن محکمہ خبر رسانی کا افسر اعلیٰ وہاں کی ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت آپ ہی آپ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

”مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ میں کہہ دوں گی۔“

محکمہ خبر رسانی کے افسر اعلیٰ نے اس بوڑھی عورت کو مشکوک سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ پھر تنہائی میں اس سے پوچھا۔

”تو کیا کہتی جا رہی تھی؟ اور کن لوگوں سے پیچھا چھڑا رہی تھی؟“

شروع میں تو بوڑھی عورت نے کچھ بتانے سے انکار کیا مگر جب افسر اعلیٰ نے اسے ڈرایا دھمکایا تو وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ ”میرے گھر کے پاس حلاج نامی ایک شخص آ کر اُترا ہے، جس کے پاس دن رات لوگوں کا تانا باندھا رہتا ہے۔ وہ چپکے چپکے آتے ہیں اور عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔“

افسرا علی نے اسی وقت سپاہی بھیجے اور حلاج کو اس کے مریدوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ پھر جب حلاج سے باز پرس کی گئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہ میں حلاج ہوں اور نہ اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہوں۔“

محکمہ خبر رسائی کے افسر علی نے بہت کوشش کی مگر حلاج نے اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا کہ وہ حلاج ہے۔ آخر کچھ جاننے والے لوگوں نے گواہی دی کہ وہی حلاج ہے۔ پھر جب مزید تفتیش کی گئی تو بہت سے خطوط اور کاغذات اس کے پاس سے برآمد ہوئے۔ افسر علی نے دربار خلافت کو اطلاع دی اور خلیفہ کے حکم پر حلاج کو زنجیریں پہنا کر بغداد روانہ کیا۔ پھر اسے حوالہ زنداں کر دیا گیا۔

اس زمانے میں اسلامی حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدے دو تھے۔ وزارت اور حجابت۔ اس وقت بغداد میں حامد بن عباس وزیر تھا اور ابن نصر قشوری حاجب۔ حامد بن عباس اور ابن نصر قشوری میں باہم جشمکیں تھیں۔ حامد نے حلاج کو قید کیا تھا۔ حلاج نے اپنا منتر نصر قشوری پر پھونکنا شروع کر دیا۔ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ نام کا مقتدر تھا۔ حکومت کی باگ حرم سراؤں (شاہی خاندان کی عورتوں) کے ہاتھ میں تھی۔ حرم سرا کی بڑی ماما کو ”قہرمانہ“ کہتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں تمام حرم سرا جزو کل ہوتا ہے۔ یہ قہرمانہ سلطنت کے انتظامات میں اس قدر دخیل کار ہو گئی تھی کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاتا تھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں باقاعدہ دربار لگا کر بیٹھتی تھی اور احکام نافذ کرتی تھی۔

عورتوں کو ہر زمانے میں دعا، گنڈے اور دیگر عجائبات و کرامات پر جس قدر جلد یقین آ جاتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ منصور حلاج ان فنون میں طاق تھا اور اس نے ان ہی ہتھیاروں سے ان پر وار شروع کر دیئے۔ یہ وار کارگر ثابت ہوئے۔ حرم کی عورتیں، بہت سے وزراء، آس پاس کے امراء، دار الخلافہ کے بہت سے اعلیٰ عہدیدار اور شہر کے عوام کو اس نے اپنا ہم آہنگ بنا لیا۔ ابن نصر قشوری حاجب بھی اس سے جا کر مل گیا۔ اب حکومت کے خلاف انقلاب کا مسالا تیار تھا۔ حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ سے حلاج کے قتل کا اذن طلب کیا..... اور اس کی کتابیں پیش کیں جن میں بعض باتیں خلاف شریعت تھیں۔ قاضی نے اس کے قتل کا محضر تیار کیا۔

یہ ہے حضرت منصور حلاج کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق جسے ہم نے حرف بہ حرف نقل کر دیا ہے۔ اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ، ابو مسلم خراسانی، بابک خرمی اور مقع خراسانی کی طرح (معاذ اللہ) خدائی کے دعویدار تھے اور ان کی ساری ریاضتیں محض اس لئے تھیں کہ وہ قصر خلافت کی توہم پرست خواتین کو اپنی شعبدہ بازیوں سے اور بغداد کے عوام کو اپنے ساحرانہ کمالات سے متاثر کر کے انقلاب کی فضا تیار کریں اور موقع ملتے ہی عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا تختہ الٹ دیں۔ اس کے بعد یا تو خود خلیفہ وقت بن بیٹھیں یا پھر اپنی طرح گمراہ لوگوں کو برسر اقتدار لے آئیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے اس سیاسی تجزیے کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ”ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے، وہ ابن سعد قرطبی، ابن حوقل بغدادی اور ابن ندیم بغدادی کے بیانات کا لفظی ترجمہ ہے۔ مزید اطمینان کے لئے ہم اصل عبارت نقل کر دیتے ہیں۔“

ابن سعد قرطبی کا بیان ہے کہ حلاج ایک گمراہ اور خبیث آدمی تھا۔ شہر بہ شہر پھرا کرتا تھا اور جاہلوں کو بہکایا کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ امام رضاؑ کا داعی ہے۔ غرض ہمیشہ ان ہی شعبدہ بازیوں سے اس نے بہت سے بے وقوفوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔“

ابن حوقل بغدادی کا بیان ہے کہ حلاج نے شعبدے دکھا کر وزیروں کی ایک جماعت کو اور حکومت کے عہدیداروں کو اور شہروں کے افسروں اور عراق و جزیرہ وغیرہ کے حاکموں کو اپنی طرف مائل کر لیا..... لیکن وہ ادھر ایسا پھنس گیا تھا کہ اس کی واپسی ناممکن ہو گئی تھی اور یہ امید نہ تھی کہ اگر یہاں کے لوگوں کے سامنے آجائے تو وہ اس کے معتقد ہو جائیں گے۔ بہر حال گرفتار ہوا اور قید ہوا اور دارالحکومت بغداد میں اس وقت تک قید رہا، جب تک یہ خوف نہ ہوا کہ دارالخلافہ کے بہت سے لوگوں کو، حاجب کو اور حرم کو بہکا لے گا۔“

ابن حوقل بغدادی کی اس عبارت سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کی نظر میں حضرت حسین بن منصور حلاجؒ محض ایک شعبدہ باز اور ساحر تھے۔ یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت منصور حلاجؒ کسی قسم کے سیاسی عزائم رکھتے تھے اور ایک خاص منصوبے کے تحت ملک میں شورش پیدا کر کے حکومت وقت کے خلاف انقلاب لانا چاہتے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے نظریے کی تائید میں مؤرخ ابن ندیم بغدادی کی تاریخ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ ابن ندیم لکھتا ہے کہ حلاج ایک جاہل، دلیر، زمانہ ساز اور بڑے بڑے ارادوں کا ارتکاب کرنے والا تھا اور چاہتا تھا کہ سلطنتوں کو الٹ دے۔ وہ اپنے پیروؤں کے سامنے الوہیت کا مدعی تھا اور حلول کا قائل تھا۔ امرائے وقت کے سامنے اپنا کوئی اور مذہب ظاہر کرتا تھا مگر عوام کے روبرو یہی کہتا تھا کہ وہ صوفیوں کے طریقے پر چلتا ہے..... پھر وہ دارالخلافہ بھیجا گیا اور وہاں قید کر دیا گیا۔ دارالحکومت کے لوگوں میں اہلسنت کا عقیدہ ظاہر کر کے قربت حاصل کرنے لگا۔ نتیجتاً حکومت کے اعلیٰ عہدیدار سمجھنے لگے کہ یہ شخص پہلے پہلے امام رضاؑ کا داعی تھا۔ لوگوں نے اس کی شکایت کر دی تو وہ ”کوہستان“ میں پکڑا گیا..... اور اس کو کوڑے لگائے گئے۔ ایک ایرانی رئیس ابوہل نو بخشی کو حلاج نے دعوت دی اور اس کے قاصد سے کہا کہ میں ایک مذہب کا امام ہوں۔ میرے پیچھے ہزاروں آدمی ہیں۔ اگر میں ان سے کہہ دوں تو وہ سب کے سب ابوہل نو بخشی کے فرمانبردار ہو جائیں گے۔ پھر نصر حاجب کے سامنے پیش کیا گیا تو حلاج نے اسے بہکا لیا۔ اصل میں جو شخص حلاج کے قتل کے درپے ہوا وہ حامد بن عباس وزیر تھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آ گیا تھا خلیفہ مقتدر باللهؒ اسے آزاد کر دیتا کیونکہ خلیفہ کے محل میں جتنے نوکر چاکر اور عورتیں تھیں ان سب کو حلاج نے اپنی دعاؤں، تعویذوں اور منستروں سے رام کر لیا تھا۔ حلاج کھانا کم تھا، نماز بہت پڑھتا تھا۔ ہمیشہ روزے سے رہتا تھا۔ ان حیلوں سے اس نے سب کو بہکا لیا تھا اور اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ابن نصر قشوری حاجب اس کو شیخ اور زاہد کہنے لگا۔ حالانکہ وہ غلطی پر تھا۔ حامد بن عباس وزیر اس کو ثابت کرتا تھا اور حلاج پر بعض الزام قائم کرتا تھا۔ پھر ایک دن حلاج نے حامد بن عباس سے کہا کہ میں تم سے ”مباہلہ“ کروں گا۔ اس پر حامد بن عباس نے کہا کہ اب ثابت ہو گیا کہ جس کا تم نے ارتکاب کیا، اس

کے مدعی بھی ہو۔ غرض حلاج قتل کیا گیا اور بہت چیخا چلایا۔“

ابن ندیم کی اس تحقیق پر بعد میں آنے والے محققین نے سخت اعتراضات وارد کئے ہیں اور بہت سی روایتوں کو یکسر جھٹلادیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ نے علامہ ابن جوزی کی بھی ایک روایت نقل کی ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں۔ ”حسین بن منصور حلاج شہر ”سوس“ میں گرفتار کیا گیا اور اس کے بہت سے خطوط اور رقعے پکڑے گئے جن میں رمزوں اور اشاروں میں باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ پھر حلاج کو بغداد بھیج دیا گیا۔ ایک اونٹ پر حلاج سوار تھا اور دوسرے اونٹ پر اس کا غلام۔ راستے میں منادی پکارتا جاتا تھا۔ ”لوگو! دیکھ لو! یہ قرمطیوں کا ایک داعی ہے۔“

یہ ہیں وہ تمام تاریخی روایات جن کی بنیاد پر علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی حضرت منصور حلاجؒ کو گمراہ، شعبدہ باز، کافر، جھوٹا اور خدائی کا دعویدار سمجھتے تھے۔ علامہ موصوف نے کسی ایک مقام پر بھی حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت کا دفاع نہیں کیا۔ دوسرے مؤرخین کی طرح علامہ کو حضرت منصور حلاجؒ کے روزوں اور کثرت نماز میں بھی دکھاوا نظر آیا۔ حالانکہ ایک عالم کی حیثیت سے ان کا فرض منصبی تھا کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کی ظاہری عبادات کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے کیونکہ سب سے پہلے اعمال ظاہریہ ہی کسی کے مسلمان ہونے کی شہادت پیش کرتے ہیں مگر چونکہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک خاص زاویے کے تحت مضمون تحریر کیا ہے، اس لئے انہیں حضرت منصور حلاجؒ شروع سے آخر تک بدترین مجرم اور لائق نفرت انسان نظر آتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ علامہ ندویؒ کی مجبوری تھی کہ جب انہوں نے حضرت منصور حلاجؒ کو ابو مسلم خراسانی، بابک خرمی اور مقتع خراسانی کی صف میں کھڑا کر دیا تو پھر یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت میں بے گناہی کا کوئی پہلو تلاش کرتے۔ تاریخ لکھتے وقت غیر جانب دار رہنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جب کوئی مؤرخ یا محقق ایک دعویٰ کرتا ہے تو پھر اس میں رنگ بھرنے کے لئے روایتوں کے انبار میں سے اسی روایت کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے دعوے کو مضبوط ترین بنا سکے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی یہی مجبوری تھی۔

امام الحرمین اپنی کتاب ”الشامل“ میں تحریر کرتے ہیں۔ ”مستند اور ثقہ راویوں میں ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ تین آدمیوں نے باہم فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے اس سلطنت کو الٹ دینا چاہئے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک گوشہ لے لیا۔ جنابی قرمطی نے بحرین کا علاقہ لیا، ابن مقتع خراسانی پرکستان نکل گیا اور حلاج نے بغداد کے صوفے پر نظر جمائی۔ اس لئے حاکم بغداد نے اس پر موت کی سزا کا حکم لگایا۔“

علامہ ابن خلکان نے یہ کہہ کر اس روایت کو مسترد کر دیا ہے کہ ابن مقتع خراسانی، حضرت منصور حلاجؒ سے بہت پہلے گزرا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی علامہ ابن خلکان کی اس دلیل کو درست مانتے ہیں مگر اس کے باوجود اپنی اس بات پر قائم ہیں کہ روایت کا ایک حصہ غلط ثابت ہونے سے پورے واقعے کی تکذیب نہیں ہوتی۔ اس طرح سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں حضرت منصور حلاجؒ بھی اسی تحریک کے داعی

تھے جس کا دعویٰ ابو مسلم خراسانی، بابک خرمی اور ابن مقفع کرتے تھے۔
اب ہم ان لوگوں کی شخصیات کا مختصر جائزہ لیں گے جو خدائی کا دعویٰ کرتے تھے..... اور جن لوگوں کی صف میں حضرت منصور حلاج جیسے ”موحد“ اور جانباز صوفی کو جبراً کھڑا کر دیا گیا ہے۔

ابو مسلم خراسانی ایک ایرانی سپہ سالار تھا جس نے امام ابراہیم بن محمد کے ایماء پر خراسان میں بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ ”مرد“ پر قبضہ کرنے کے بعد ابو مسلم خراسانی نے اموی فوجوں کو پے درپے شکست دی۔ یہاں تک کہ بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا..... اور پہلا عباسی خلیفہ سفاح تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ سفاح کے دور حکومت میں ابو مسلم خراسانی کی طاقت بڑھتی چلی گئی مگر جب سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور خلیفہ ہوا تو اس نے بڑی دشواریوں کے بعد ابو مسلم خراسانی پر قابو پایا اور پھر اس فتنہ گر انسان کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا۔ ابو مسلم خراسانی کے ماننے والے کہا کرتے تھے کہ (معاذ اللہ) خدا اس میں حلول کر گیا ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر ابو مسلم خراسانی خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔

ابو مسلم خراسانی کے بعد بابک خرمی کا نام آتا ہے۔ 813ء اور 842ء کے درمیان عباسی خلیفہ مامون الرشید اور معتصم باللہ کے دور حکومت میں ایک نیم مذہبی اور سیاسی تحریک شروع ہوئی۔ تقریباً 25 سال تک یہ تحریک عالم اسلام کے لئے شدید پریشانیوں کا باعث بنی رہی۔ اس تحریک کا بانی بابک خرمی تھا۔ وہ آذر بایجان میں پیدا ہوا۔ بابک کے باپ کا مہر تھا اور ایک کرائے کا سپاہی تھا۔ بابک اسی سپاہی کی ناجائز اولاد تھا۔ وہ دس سال تک اپنی ماں کے ساتھ رہا۔ 18 سال تک اس نے مویشی چرائے پھر دوبارہ ماں کے پاس آ گیا۔

اس زمانے میں جاویدان بن سہرک خرمی قائد تھا۔ ایک دن جاوید بابک کی ماں سے ملنے آیا۔ اس نے اٹھارہ سال کے جوان کو دیکھا تو بہت زیادہ متاثر ہوا۔ جاویدان اپنی جن عیارانہ صلاحیتوں کے لئے مشہور تھا، وہی صفات بابک خرمی کے چہرے سے بھی روشن تھیں۔ جاویدان نے بابک کی ماں سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کے حوالے کر دے۔ بابک کی ماں قائد کے حکم کو کس طرح ٹال سکتی تھی۔ وہ فوراً رضامند ہو گئی اور جاویدان کی بیوی نے ایک نو جوان کو دیکھا تو وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں تک کہ بابک خرمی اور جاویدان کی بیوی کے درمیان ناجائز تعلقات قائم ہو گئے۔ پھر ایک دن جاویدان بن سہرک اور ابو عمران میں خونریز جنگ ہوئی۔ جاویدان شدید زخمی ہو کر مر گیا۔ جاویدان کی بیوی ایک نہایت عیار اور بوالہوس عورت تھی۔ اس نے شوہر کا دم نکلتے ہی اس تحریک کے حامیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے انتہائی اثر انگیز تقریر کی۔

”لوگو! سنو! تمہارے قائد نے مرتے وقت میرے کان میں کہا تھا کہ وہ دنیا سے جا رہا ہے مگر اس کی روح بابک کے جسم میں حلول کر جائے گی۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ میرے مرنے کے بعد بابک کی اطاعت کرنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں میری روحانی تائید ہمیشہ حاصل رہے گی۔“ جاویدان کی بیوی نے ایسا طلسمی افسانہ تراشا کہ اس گمراہ فرقے نے بابک کے آگے سر جھکا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک آوارہ نو جوان ”خرمیوں“ کا قائد بن گیا۔ پھر 201ھ میں بابک نے علم بغاوت بلند کیا اور آذر بایجان

کی مسلم آبادی پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی املاک کو جی بھر کے لوٹا گیا اور بے شمار مسلم عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کیا گیا۔

اس بزدلانہ فتح کے بعد باقی ”خرمی“ بھی بابک کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے اور مقامی مسلمانوں کو اپنے جان و مال کے خوف سے ”مراغہ“ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے بابک کی بغاوت کو کچلنے کے لئے کئی بار مختلف سالاروں کی قیادت میں فوجیں بھیجیں مگر ہر مرتبہ اسلامی لشکر کو شکست ہوئی۔ مامون الرشید کے انتقال کے بعد خلیفہ معتمد بالله نے اسحاق بن ابراہیم کی قیادت میں فوج روانہ کی جس نے خرمیوں کو شکست دی۔ 220ھ میں معتمد بالله نے اپنے سالار افیشن کو بابک کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ افیشن نے خرمیوں کے مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس گمراہ فرقے کے ہزاروں پرستاروں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ بابک فرار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ ایک دن کسی کسان نے اسے پہچان لیا اور شکار کے بہانے سے بابک کو افیشن کے حوالے کر دیا۔ افیشن بابک کو لے کر بڑی شان سے سامرا میں داخل ہوا اور پھر اس وقت کے دستور کے مطابق عالم اسلام کے دشمن کو ہاتھی پر بٹھا کر پیادوں اور سواروں کے جلوس کے ساتھ مختلف راستوں سے گزر کر خلیفہ معتمد بالله کے دربار میں پیش کیا گیا۔

پہلے بابک کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ بعد میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ خلیفہ معتمد بالله اس معاملے میں اس قدر غضب ناک تھا کہ اس نے بابک کا سر خراسان بھیج کر مختلف شہروں میں تشہیر کرائی اور دھڑ سامرا کی ایک عام گزرگاہ پر لٹکا دیا گیا۔ بابک کی موت کے بعد ”خرمیوں“ میں سے اکثر مسلمان ہو گئے اور بعض نے قرامطہ اور اسماعیلیہ فرقوں کے مسلک کو اپنالیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ بابک خرمی ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔ قتل کرتے وقت جب اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا تو اس نے بہتا ہوا خون اپنے چہرے پر مل لیا۔ بابک کا یہ عمل اس لئے تھا کہ وہ موت کے خوف سے چہرے پر ظاہر ہونے والی زردی پر اپنے خون کا پردہ ڈال دے تاکہ لوگ اسے بہادر کہہ کر پکاریں اور یہ الزام عائد نہ کریں کہ موت کی دہشت سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

ہم نے عقیدہ ”حلول“ کے ماننے والے دو گمراہوں کے مختصر حالات بیان کر دیے۔ ابو مسلم خراسانی بھی ایک بدکار انسان تھا اور بابک خرمی بھی اپنی سنگ دلی اور سیاہ کاری میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن مورخین نے حضرت منصور حلاجؒ کو اس فہرست میں شامل کیا ہے، وہ ایسا کوئی واقعہ ہی پیش کر دیتے جس سے حضرت حسین بن منصورؒ کے قدموں کی لغزش کا اظہار ہوتا ہو۔ حضرت منصور حلاجؒ عین عالم شباب میں بھی پارساتھے اور اس وقت بھی ان کی یہی پاکیزگی برقرار تھی جب کچھ بے خبر اور نادان لوگ انہیں پرستش کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین نے انہیں بدترین القاب سے یاد کیا مگر کسی ایک دشمن نے بھی آپؒ پر سیاہ کاری کا الزام عائد نہیں کیا۔ ابو مسلم خراسانی اور بابک خرمی کے علاوہ اس قسم کی تحریکوں کے تمام داعی انتہائی درجے کے زنا کار، شرابی، سفاک اور قاتل ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسا ظلم ہے کہ ایک مجذوب الحال عاشق کو شیطان صفت لوگوں سے تشبیہ دی گئی؟

اب آخری شخص ابن مقفع خراسانی باقی رہ جاتا ہے جس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی بن

منصور کے عہد حکومت میں ایک شخص ہاشم نے خدائی کا دعویٰ کیا جس کے سبب بڑے ہنگامے کھڑے ہو گئے۔ اس فتنہ گر انسان کا قول تھا:

”خدا کبھی کبھی انسانی جسموں میں حلول کر کے اپنی قدرت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ حضرت آدم اور ان کے بعد آنے والے پیغمبروں میں خدا بحیثیت نور موجود تھا۔ آخری زمانے میں خدا ابو مسلم خراسانی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اب وہی خدا میرے پیکر میں جلوہ گر ہے۔“

ہاشم انتہائی بد صورت انسان تھا۔ اپنی کریہہ المنظری کو چھپانے کے لئے وہ ہمیشہ ایک سنہری نقاب پہنے رہتا تھا۔ اسی لئے مقنع کے لقب سے مشہور ہوا۔ مقنع کا مطلب ہے نقاب پوش۔ مقنع کے آبائی وطن کا تو پتہ نہیں چلتا مگر وہ خراسان میں رہا کرتا تھا، اس لئے اسے مقنع خراسانی کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے خراسانی باشندوں کے سامنے خدائی کا دعویٰ کیا جس کے نتیجے میں ہزاروں سادہ لوح انسان گمراہ ہو گئے۔ پھر مقنع کی تحریک نے بڑی شورشیں برپا کیں۔ خراسان کے علاوہ شام، عراق اور ایران بھی فتنوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مقنع نے اپنے خدائی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے ایک چاند بنایا تھا جو چاندِ خشب سے طلوع ہو کر دو ماہ تک غروب نہیں ہوتا تھا۔ دراصل مقنع ایک کیمیا گر تھا اور اس نے چند کیمیائی مادوں کو ملا کر ایک دائرہ نما چیز تخلیق کی تھی جسے وہ چاند کہا کرتا تھا۔ کم عقل لوگ اس روشن دائرے کو دیکھ کر مقنع کے خدائی دعوے پر ایمان لے آئے تھے۔

عباسی خلیفہ مہدی نے 161ھ میں معاذ بن مسلم اور سعد حشری کو مقنع کی گرفتاری کے لئے بھیجا۔ جب محاصرے نے طول پکڑا اور مقنع خراسانی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے پیروکاروں کو آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ اسی دوران مسلمان سپاہی قلعے میں داخل ہو گئے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ اس کے قریب تھے اور سمجھ رہے تھے کہ آگ روشن کرنے کے بعد مقنع اپنی خدائی کانیا کرشمہ دکھائے گا مگر اس وقت اندھے پجاری حیرت زدہ رہ گئے جب ان کا خدا بھڑکتی ہوئی آگ میں کود گیا۔ مسلمان سپاہی بھی پوری طرح مستعد تھے۔ جیسے ہی مقنع خراسانی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کودا، مسلمان سپاہی بھی آگ میں کود پڑے..... اور خدائی کے دعویدار کا سر کاٹ لیا۔ باقی جسم کو خود اسی کی دہکائی ہوئی دوزخ میں جلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ بعد میں مقنع خراسانی کا سر خلیفہ مہدی کے دربار میں بھیجا گیا..... اور اس طرح یہ خوفناک فتنہ اپنے عبرت خیز انجام کو پہنچا۔

یہ تھا اس شخص کا مختصر احوال جو حضرت منصور حلاج کی پیدائش سے 83 سال پہلے مر چکا تھا۔ پھر بھی ہمارے تاریخ نویسوں نے مقنع خراسانی کو نہ صرف حضرت منصور حلاج کا ہم عصر قرار دیا بلکہ دونوں میں ملاقات بھی ثابت کر دی..... اور اس منصوبے کو بھی ظاہر کر دیا جس کے مطابق مقنع خراسانی اور حضرت منصور حلاج نے اپنی اپنی خدائی کے لئے علاقے تقسیم کر لئے تھے۔

سید سلیمان ندوی نے امام الحرمین کی تصنیف ”الشامل“ کے حوالے سے جس منصوبے کا ذکر کیا ہے، اس میں تیسرا فریق جنابی قریطی تھا۔ مصنف کے بقول جنابی نے اپنی فتنہ انگیزیوں کے لئے بحرین کا علاقہ منتخب کیا تھا۔ جنابی کا نام ابو ظاہر تھا اور وہ 294ھ میں پیدا ہوا۔ اب اس روایت کی ضعیفی کا عالم

دیکھئے۔ تمام معتبر اور غیر معتبر تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کو 301ھ میں حوالہ زنداں کیا گیا تھا۔ اس وقت جنابی قمری کی عمر صرف سات سال تھی۔ کیا ایک کم سن بچہ حضرت منصور حلاجؒ سے مل کر سلطنت بغداد کے خلاف سازش کا منصوبہ بنا سکتا ہے؟ اہل نظر غور فرمائیں کہ یہ کیسی بواجبی ہے؟

ان تاریخی روایات سے قطع نظر، حضرت منصور حلاجؒ 301ھ میں گرفتار ہوئے اور انہیں زنداں کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کی گرفتاری کے حسب ذیل اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

پہلا سبب یہ کہ حضرت منصور حلاجؒ قرآن کے مثل آیت بنانے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مؤرخ خطیب بغدادی نے اس روایت کو ابن باکوہ صوفی شیرازی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ابن باکوہ نے ابو زرہ طبری سے سنا اور ابو زرہ طبری نے محمد بن یحییٰ رازی سے سنا۔ گویا دو واسطے درمیان میں ہیں۔ بعد میں آنے والے محققین نے ابن باکوہ شیرازی محمد بن یحییٰ رازی کے بارے میں چھان بین کی تو یہ دونوں اشخاص غیر ثقہ ثابت ہوئے۔ ابن باکوہ شیرازی کو حکایتیں بیان کرنے میں شہرت حاصل تھی۔ محدثین ان کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح محمد بن یحییٰ رازی بھی کمزور اور ضعیف روایتیں بیان کرتے تھے۔ اس لئے حضرت منصور حلاجؒ پر یہ الزام کہ وہ قرآن جیسی آیات بنانے کا دعویٰ کرتے تھے، محض ایک الزام اور تہمت ہے۔ واضح رہے کہ حضرت منصور حلاجؒ 301ھ میں گرفتار ہوئے اور 310ھ میں آپؒ کو پھانسی دی گئی۔ اس طرح آپؒ کی قید و بند کا زمانہ 9 سال پر محیط ہے۔ اس قدر طویل اسیری کے دوران سینکڑوں بار آپؒ کے مقدمے کی سماعت ہوئی مگر یہ الزام ثابت نہیں کیا جاسکا کہ حضرت حسین بن منصورؒ، قرآن کے مثل کوئی آیت بنانے کا دعویٰ کرتے تھے۔



دوسرا الزام یہ ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے ایک خط کے ذریعے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ابوالقاسم رازی نے ابوبکر بن شاد کے حوالے سے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دینور کے مقام پر ایک شخص آیا جس کے پاس ایک تھیلا تھا۔ عام لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی سا تھیلا تھا مگر اجنبی شخص ہر وقت اس تھیلے کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ لوگوں کو شک ہوا۔ آخر تھیلے کی تلاشی لی گئی تو اس میں سے حضرت منصور حلاجؒ کا ایک خط برآمد ہوا۔ جس کا عنوان اس طرح تھا:

”من الرحمن الرحیم الی فلاں بن فلاں“

(یہ خط رحمن رحیم کی طرف سے فلاں شخص کے نام ہے)

خط برآمد کرنے والے لوگوں نے یہ مکتوب سرکاری کارندوں کے حوالے کر دیا..... اور پھر سرکاری کارندوں نے اس خط کو بغداد پہنچا دیا۔

حضرت منصور حلاجؒ کو طلب کر کے پوچھا گیا کہ یہ خط تمہارا ہے؟..... آپؒ نے اس خط کو بغور دیکھا اور پھر مستحکم لہجے میں فرمایا۔

”ہاں! یہ خط میرا ہی ہے۔“

عباسی خلیفہ مقتدر بالله کا وزیر حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا بدترین دشمن تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حضرت حسین بن منصورؒ پر کفر کا الزام ثابت ہو جائے اور پھر وہ انہیں دار پر کھینچ کر اس فتنے سے محفوظ ہو جائے۔ (واضح رہے کہ حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر کے سامنے حضرت منصور حلاجؒ کو فتنہ ثابت کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی تھی)

جب حضرت منصور حلاجؒ نے اعتراف کر لیا کہ وہ خط ان ہی کا لکھا ہوا ہے تو حامد بن عباس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”کل تک تو تم نبوت کے مدعی تھے، اب خدائی کا دعویٰ بھی کرنے لگے۔“

یہ واقعہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ حامد بن عباس کے الفاظ کی ظاہری ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے دعویٰ نبوت سے باخبر تھا۔ پھر جب اس نے منصورؒ کو خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے سنا تو گرفتار کر لیا۔ قارئین ایک لمحے کے لئے اس روایت کی کمزوری کو ملاحظہ کریں۔ اگر کسی مملکت اسلامی میں کوئی شخص معاذ اللہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کے قتل میں کسی حجت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، خطیب بغدادی کی اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور حامد بن عباس اس دعوے سے باخبر بھی تھا۔ پھر حضرت حسین بن منصورؒ کو اتنے دن زندہ رہنے کی مہلت کیوں دی گئی اور ان کے نئے دعوے کا انتظار کیوں کیا جاتا رہا؟ اس ضعیف روایت سے قطع نظر، وزیر حامد بن عباس کی بات سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے انتہائی واضح الفاظ میں فرمایا۔

”معاذ اللہ! میں نہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ خدائی کا۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں اور اپنے اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ روزہ رکھتا ہوں اور اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔“

اس اقرار کے بعد حضرت منصور حلاجؒ کی بے گناہی کو تسلیم کر لینا چاہئے تھا مگر حامد بن عباس اور اس کے ہم نواؤں نے آپؒ سے مسلسل جرح کی۔ نتیجتاً حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”اللہ کے سوا لکھنے والا کون ہے؟ میں اور میرا ہاتھ تو اس کام میں محض آلے کے سوا کچھ نہیں۔“

یہ ایک بہت مشکل اور طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ بہت سے علمائے وقت نے اپنے طاقتور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے اس خط میں شریعت کے خلاف کوئی بات تحریر نہیں تھی۔ صرف عنوان غیر مناسب تھا۔ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابن عطاء نے اس معاملے میں حضرت منصور حلاجؒ کی مکمل حمایت کی۔ خطیب بغدادیؒ کے بقول حضرت شیخ ابو بکر شبلیؒ نے کہا کہ ایسے شخص کو روکنا چاہئے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد رشید ابو محمد جریر طبریؒ نے فرمایا۔

”ایسا کہنے والا کافر ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے۔“

محققین نے حضرت ابو جریر طبریؒ کے اس فتوے پر شدید اعتراض کیا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے خط کی وضاحت کر دی تھی تو حضرت ابو جریر طبریؒ نے انہیں کافر اور واجب القتل کیوں قرار دیا۔

خطیب بغدادی کہتا ہے کہ اس خط کی وجہ سے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا فرمان جاری ہوا۔ بعد میں آنے والے محققین نے ثابت کر دیا کہ اس خط کے حوالے سے علماء اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت بھی منصور حلاجؒ کو کافر ثابت نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے یہ واقعہ ان کے قتل کی بنیاد نہیں تھا۔ بعض مؤرخین نے خطیب بغدادی کی اس روایت ہی کو غلط قرار دیا ہے۔



حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا تیسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جادو کا علم سیکھنے کے لئے ہندوستان گئے تھے اور وہاں سے واپس آ کر اسلامی مملکت میں جا بجا اپنی جادوگری کے کرشمے دکھایا کرتے تھے۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں حضرت منصور حلاجؒ کی کئی کرامات بیان کی ہیں جنہیں مخالفین ساحری اور شعبدہ بازی سے تعبیر کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت منصور حلاجؒ کے خسر ابو یعقوب قطع کی گواہی کو ثبوت کے طور پر بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کے بعد ابو یعقوب قطع کو طلب کر کے پوچھا گیا۔

”یہ شخص منصور حلاجؒ، تمہارا داماد ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟“

داماد کے سلسلے میں خسر کی گواہی اس لئے طلب کی گئی تھی کہ اس نازک رشتے میں دونوں فریقین اپنے معاملات کے حوالے سے ایک دوسرے پر کم و بیش عیاں ہوتے ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ پر مقدمہ دائر کرنے والوں نے بھی یہی سوچ کر اس تعلق کو استعمال کیا تھا۔

ابو یعقوب قطع نے اراکین سلطنت کے سامنے صاف صاف کہا۔ ”میں نے حسین بن منصور کا عمدہ طریقہ اور اچھا مجاہدہ دیکھ کر اپنی بیٹی کو اس کے نکاح میں دے دیا تھا پھر تھوڑے دن بعد ہی مجھ پر یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ تو حیلہ باز، ساحر، خبیث اور کافر ہے۔“

کسی تاریخ سے یہ تو پتہ نہیں چلتا ہے کہ ابو یعقوب قطع نے یہ بیان صاحبان اقتدار کے خوف سے دیا تھا یا وہ واقعاً حضرت منصور حلاجؒ کی ذات میں مذکورہ خامیاں دیکھ کر بیزاری کی اس منزل پر پہنچے تھے۔ عام طور پر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص حکومت وقت کے عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے تو یار دوست اور عزیز واقارب اسے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قریبی رشتہ دار یہ کہہ کر منہ پھیر لیتے ہیں کہ ”معتوب“ سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں، اگر تھا تو قطع کر لیا گیا۔ پھر بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف ان کے خسر ابو یعقوب قطع کی گواہی کا حقیقی پس منظر کیا تھا؟ پھر بھی بعض محققین نے ابو یعقوب قطع کی شخصیت کو دنیا دار اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ اور ابو یعقوب قطع کی لڑکی کے رشتے کی بات چلی تھی تو حسین بن منصورؒ کے استاد گرامی حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے اس رشتے کی مخالفت کی تھی اور اپنے شاگرد کو صاف الفاظ میں منع کر دیا تھا کہ وہ ابو یعقوب قطع کی دختر سے ازدواجی رشتہ قائم نہ کریں۔ الغرض شادی کے بعد حضرت عمرو بن عثمانؒ اور ابو یعقوب قطع کے تعلقات ختم ہو گئے تھے اور حضرت منصور حلاجؒ کا خسر عام مجلسوں میں حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ جیسے بزرگ کو برا بھلا کہتا پھرتا تھا۔ بعض علماء کی رائے کے مطابق اس واقعے سے

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس نے حضرت عمرو بن عثمان مکیؓ جیسے شیخ طریقت کی رعایت نہیں کی، وہ اپنے داماد حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں اعتدال اور حقیقت بیانی سے کس طرح کام لے سکتا تھا؟ بعض محققین نے اس واقعے کی مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو یعقوب قطع کی لڑکی اپنے شوہر حضرت منصور حلاجؒ سے خوش نہیں تھی۔ ایک اسی پر کیا منحصر ہے، اکثر جوان لڑکیاں اس قسم کے شوہروں سے ناخوش ہی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک عارف کی بیوی بھی عارفانہ شخصیت کی حامل ہو یا دنیا کے ہر سرد و گرم میں اپنے شوہر کا ساتھ دے سکے۔ عام جواں سال لڑکیاں اپنے تارک الدنیا شوہروں سے شاذ و نادر ہی راضی ہوتی ہیں۔ کچھ یہی حال ابو یعقوب قطع کی لڑکی کا بھی تھا۔ وہ اپنے شوہر حضرت منصور حلاجؒ کی شدید ترین ریاضتوں سے نالاں تھی۔ جب عورت کے دل کی تشنگی کا یہ عالم ہو تو کہاں کی ریاضت اور کیسی کرامت؟ اس قسم کی عورتیں اپنے شوہروں کی ریاضتوں کو مکر و فریب اور کرامتوں کو شعبدہ بازی ہی سمجھتی ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی زوجہ نے شوہر کی یہ خرابیاں باپ سے بیان کی ہوں گی اور پھر ابو یعقوب قطع بھی منصور حلاجؒ کے خلاف گواہی دینے والوں میں کھڑا ہو گیا۔ بعض علمائے تحقیق کا بیان ہے کہ اولیائے کرام کی صفوں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بعض مشائخ کی بیویاں ان سے برائے نام بھی عقیدت نہیں رکھتی تھیں بلکہ مریدوں کے سامنے اپنے کامل شوہروں کو برا بھلا کہتی تھیں۔ اگرچہ بیوی کی گواہی قریب ترین گواہی شمار ہوتی ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے ان شہادتوں کو ذرا بھی لائق اعتنا نہیں سمجھا..... اور اولیاء کے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ کثرت ریاضت کے سبب بیویوں کی دنیاوی خواہشیں پوری نہیں ہوتی تھیں، اس لئے تنگ آ کر وہ اپنے شوہروں کو بدنام کیا کرتی تھیں۔

یہاں زیادہ تفصیلات میں جانے کی گنجائش تو نہیں لیکن پھر بھی حضرت امام اعمشؒ کی مثال اس صورت حال کی نزاکت و پیچیدگی کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت امام اعمشؒ کا شمار فقہائے عظام میں ہوتا ہے۔ آپؒ کی جلالت علمی کے لئے یہی ایک مثال کافی ہے کہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ حضرت امام اعمشؒ کے شاگرد تھے۔ امام اعمشؒ کی ازدواجی زندگی انتہائی ناخوشگوار تھی۔ ان کی زوجہ محترمہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

”وہ وقت کب آئے گا جب تجھ بڑھے سے میرا پیچھا چھوٹے گا۔“

مختصر یہ کہ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے اس بگڑی ہوئی صورت حال کو اپنی ذہانت سے سنبھالا اور ایک عظیم و جلیل فقیہ کی گھریلو زندگی کو تباہی سے بچالیا۔ کبھی کبھی حاضرین مجلس حضرت امام اعمشؒ کے علم و فضل کی تعریف کرتے تو آپؒ نہایت تلخ اور آزرده لہجے میں فرماتے۔ ”حدیث و فقہ کی مجلسوں میں تمہارے امام کا یہ حال ہے مگر اپنے گھر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔“

اسی انداز کا واقعہ حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اہل دنیا ان کی عارفانہ عظمت کے آگے خم تھی اور ان کا خسر ابو یعقوب قطع انہیں شعبدہ باز و ساحر اور خبیث و کافر کہہ کر پکارتا تھا۔

اس روایت کو بھی مؤرخ خطیب بغدادی نے ابن باکو یہ شیرازی اور ابو زرہ طبری کے حوالے سے بیان کیا ہے جس میں شک، کمزوری اور عدم صحت کی گنجائش موجود ہے۔



حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا چوتھا سبب ان کا ”زندیقوں“ جیسا کلام تھا۔ مؤرخ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ انہوں نے محمد بن حسین نیشاپوری سے سنا اور نیشاپوری نے ابو بکر غالب سے سنا اور ابو بکر غالب نے اپنے دوستوں سے سنا کہ جب حسین بن منصور حلاجؒ کے قتل کا ارادہ کیا گیا تو ایک مجلس میں اس دور کے اکابر علماء اور فقہاء کو جمع کیا گیا۔ پھر اسی مجلس میں حضرت منصور حلاجؒ کو ایک قیدی کی حیثیت سے طلب کر کے پوچھا گیا۔ اس وقت عباسی خلیفہ مقتدر بالله بھی اس مناظرے میں موجود تھا۔

”حسین بن منصور! تم سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے۔“ ایک عالم اور فقیہ نے حضرت حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”پوچھو!“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میں بساط بھر تمہارے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“

”برہان کسے کہتے ہیں؟“ بغداد کے فقیہ نے حضرت منصور حلاجؒ کی آزمائش کے لئے سوال کیا۔
”برہان“ کے لغوی معنی دلیل کے ہیں۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے جواباً فرمایا۔ ”برہان ان شواہد و دلائل کو کہتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ اہل خلوص کی صورتوں میں پیدا فرماتے ہیں اور جن کی طرف لوگوں کے دل کھینچتے ہیں۔“

حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر تمام علماء اور فقہاء نے بالاتفاق کہا۔ ”یہ تو زندیقوں جیسا کلام ہے۔“

پھر عالموں اور فقیہوں کی جماعت نے عباسی خلیفہ مقتدر بالله کو مشورہ دیا کہ جو شخص ایسا کلام کرے وہ زندیق ہے اور اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ ”زندیق“ کے معنی ہیں، وہ شخص جو ظاہر میں مسلمان ہو اور اندر سے کافر ہو۔ یہ بڑا عجیب معاملہ ہے کہ ایک شخص علی الاعلان اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا ہے مگر ذمے دار علماء کی جماعت دعویٰ کر رہی ہے کہ اس شخص کا ظاہری قول قابل قبول نہیں، وہ اندر سے کافر ہے۔ اب اس بات کی توجیہ کس طرح کی جائے کہ علماء اور فقہاء کے پاس وہ آنکھ کہاں سے آگئی تھی جو انسانی قلب کی گہرائیوں میں اتر کے ثابت کر سکے کہ حضرت منصور حلاجؒ کا ظاہر مسلمان ہے اور ان کا اندرون کافر ہے۔

اگرچہ مؤرخ خطیب بغدادی حضرت منصور حلاجؒ کے حامیوں میں نہیں ہیں لیکن انہوں نے بھی علماء اور فقہاء کے فیصلے پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”منصور حلاجؒ کے جواب میں کفر اور زندقہ کی تو کوئی بات نہیں تھی۔“

اس اعتراض کے ساتھ ہی خطیب بغدادی یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اس روایت کا راوی مجہول

ہے، اس کی بات قابل قبول نہیں۔

بعض علمائے تحقیق کے نزدیک اگر خطیب بغدادی کی روایت درست بھی ہوتی، حضرت منصور حلاجؒ کے جواب سے کفر کا کوئی پہلو ظاہر نہیں ہوتا۔ حسین بن منصورؒ نے یہی تو کہا تھا کہ حق تعالیٰ دلیل کے طور پر اہل اخلاص کو پیدا کرتا ہے جن کی طرف لوگوں کے دل کھینچتے ہیں۔ ان کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے بعض علماء نے تحریر کیا ہے۔

”اہل اخلاص کی صورت دیکھ کر ان کی طرف انسانی دل اس لئے کھینچتے ہیں کہ جاذب باطنی کی وجہ سے ان میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ جیسا کہ سرور کونین حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث مقدس ہے کہ ان کی صورت دیکھ کر اللہ یاد آ جاتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے بھی کم و بیش یہی الفاظ تھے۔ اور عین ممکن ہے کہ انہوں نے اسی حدیث پاک کا مفہوم بیان کیا ہو۔ پھر علماء اور فقہاء کی موجودگی میں انہیں زندیق اور کافر اور واجب القتل قرار دینا بڑی عجیب بات ہے۔



حضرت منصور حلاجؒ کی گرفتاری کا پانچواں سبب وہ کفریہ اشعار تھے جو بعض مواقع پر آپؒ کی زبان سے ادا ہوئے۔ اس واقعے کو بھی مؤرخ خطیب بغدادی نے ابن باکویہ شیرازی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ابن باکویہ کے بقول اس نے عیسیٰ بن بزول قزوینی سے سنا کہ ایک دن وہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند اشعار پڑھنے لگا۔ حضرت ابو عبد اللہ خفیفؒ انتہائی کراہت اور ناگواری کے عالم میں وہ اشعار سنتے رہے۔

پھر عیسیٰ بن بزول قزوینی عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! ان اشعار کا مفہوم کیا ہے؟“
حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیفؒ نے نہایت بے زاری کے عالم میں فرمایا۔ ”ان اشعار کے کہنے والے پر اللہ کی لعنت۔“

عیسیٰ بن بزول قزوینی نے کہا۔ ”یہ اشعار حسین بن منصور کے ہیں۔“
حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیفؒ نے کسی تکلف کے بغیر فرمایا۔ ”اگر حسین بن منصور کا عقیدہ یہی ہے جیسا کہ ان اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے، تو وہ کافر ہے۔“
حضرت ابو عبد اللہ بن خفیفؒ کا جواب سن کر مخالفین نے شور مچا دیا کہ ان جیسے بزرگ کی نظر میں بھی منصور حلاجؒ کافر ہیں۔

بعد میں علمائے تحقیق نے ثابت کر دیا کہ عیسیٰ بن بزول قزوینی ایک مجہول راوی ہے۔ کسی معتبر کتاب میں اس کا برائے نام بھی ذکر موجود نہیں۔ اب یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ابن باکویہ شیرازی کو قصے بیان کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے اس نے حضرت منصور حلاجؒ کی داستانِ خوں چکاں کو مزید رنگین کرنے کے لئے ایک نیا افسانہ تراش لیا۔ جن اشعار کی بنیاد پر حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیفؒ جیسے بزرگ نے حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو کافر قرار دیا تھا، وہ اشعار حضرت منصورؒ کے تخلیق کردہ نہیں تھے.....

اور نہ کسی موقع پر حلاجؒ نے یہ اشعار اپنی زبان سے ادا کئے۔
اگر حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین اپنے تمام تر منطقی دلائل کے ساتھ مذکورہ اشعار کو حضرت منصور حلاجؒ سے منسوب بھی کر دیں، تب بھی اس روایت کی کوئی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ عیسیٰ بن بزول قزوینی کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابو عبد اللہ بن خفیفؒ نے وہ اشعار سن کر حضرت منصور حلاجؒ کو کافر قرار دیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب حکومت وقت کے خوف سے بڑے بڑے علماء اور فقہاء کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں، اس وقت بھی حضرت ابو عبد اللہ بن خفیفؒ علی الاعلان حضرت منصور حلاجؒ کو عارف کامل قرار دیتے تھے۔ پھر مردان تحقیق کی نظر میں اس جھوٹ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔



حضرت منصور حلاجؒ پر چھٹا الزام یہ تھا کہ ان کے مرید و خدمت گار انہیں خدا کہتے تھے۔ مؤرخ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ عباسی خلیفہ مقتدر با اللہ کے زمانے میں منصور حلاجؒ بغداد پہنچے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہ صوفیاء کی محبت میں رہا کرتے تھے اور خود کو بھی صوفی ظاہر کرتے تھے۔ اس وقت حامد بن عباس وزیر تھا اور وہ دربار خلافت میں نہایت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ ایک دن کسی جاسوس نے حامد بن عباس کو خبر دی کہ حاجب ابن نصر قشوری کے علاوہ قصر خلافت کی بیگمات اور کنیریں بھی منصور حلاجؒ نامی ایک شخص کے حلقہ اثر میں شامل ہو گئی ہیں۔

ہم یہ واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حاجب ابن نصر قشوری کی بیماری کے دوران حضرت منصور حلاجؒ نے اسے ایک سیب فراہم کیا تھا۔ اس کرامت کو دیکھ کر ابن نصر قشوری اور دیگر امراء حضرت منصور حلاجؒ کی روحانی عظمت کے قائل ہو گئے تھے۔ پھر جب قصر خلافت میں یہ واقعہ مشہور ہو گیا تو حامد بن عباس کے جاسوس نے اسے خبر کر دی۔

”منصور حلاج کس قسم کے دعوے کرتا ہے کہ لوگ اس کے اسیر ہوئے جا رہے ہیں؟“ حامد بن عباس نے اپنے منہ سے پوچھا۔

”وہ شاہی بیگمات، کنیروں دربانوں اور خدمت گاروں کو اپنی روحانی طاقتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔“ حامد بن عباس کے جاسوس نے کہا۔ ”اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ جنات اس کے تابع ہیں اور ہر وقت اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جنوں سے ایسے ایسے کام لیتا ہے کہ انسانی عقل و فہم عاجز رہ جاتے ہیں۔ حلاج کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس نے بہت سے پرندے زندہ کئے ہیں۔“

حامد بن عباس یہ خبر سن کر پریشان نظر آنے لگا۔

پھر ایک اور شخص ابو علی اوراجی نے دوسرے وزیر علی بن عیسیٰ کو خبر دی کہ درباری منشی محمد بن علی قتائی منصور حلاجؒ کی پرستش کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ سن کر وزیر علی بن عیسیٰ نے فوری طور پر کارروائی کی۔ محمد بن علی قتائی کو گرفتار کر لیا اور اس کی املاک ضبط کر لیں۔ پھر جب درباری منشی زنجیروں میں جکڑا ہوا آیا تو علی بن عیسیٰ نے غضب ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

”حلاج سے تیرا کیا رشتہ ہے؟“

درباری منشی محمد بن علی قتائی نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں حلاج کے اصحاب میں سے ہوں۔“
بعض مؤرخین نے اصحاب سے یہ مطلب لیا ہے کہ محمد بن علی قتائی منصور حلاجؒ کی پرستش کرتا تھا حالانکہ اس لفظ کے معنی بہت وسیع ہیں اور کسی بھی زاویے سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ منصور حلاجؒ خدا تھے اور محمد بن علی بن قتائی ان کا بندہ۔ اصحاب کا لفظ عام طور پر اطاعت گزاروں، صحبت اٹھانے والوں اور شاگردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر جب محمد بن علی قتائی کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے بہت سی کتابیں اور رقعے برآمد ہوئے جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب منصور حلاجؒ کے تحریر کردہ تھے۔

حامد بن عباس کو اس نے ایک بااثر شخص کے ذریعے خلیفہ مقتدر باللہ کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کی کہ منصور حلاجؒ اور ان کے منادیوں (اعلان کرنے والوں) کو اس کے حوالے کیا جائے۔

جب ابن نصر قشوری حاجب کو حامد بن عباس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے وہ درخواست مقتدر باللہ تک پہنچنے ہی نہیں دی اور حامد بن عباس سے ملاقات کر کے کہا۔ ”ایک چھوٹے سے معاملے میں امیر المومنین کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ حلاج کا مسئلہ یہیں حل ہو جائے گا۔“

حامد بن عباس کا منجر پہلے ہی اسے خبر دے چکا تھا کہ ابن نصر قشوری حلاج کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا ہے، اس لئے حامد بن عباس نے بظاہر بات کو ٹال دیا، مگر ایک روز رات کو تنہائی میں اس نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ سے ملاقات کی۔

پھر حامد بن عباس نے ایسی شاطرانہ گفتگو کی کہ مقتدر باللہ کو حقیقی صورت حال کا پتہ ہی نہیں چل سکا اور اس نے فوری طور پر احکام جاری کر دیئے کہ منصور حلاجؒ کو حامد بن عباس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مقتدر نے حامد بن عباس کو بھی ہدایت کر دی کہ منصور حلاجؒ کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مقتدر خود بھی قصر خلافت میں حضرت حسین بن منصورؒ کی کرامات کا شور سن چکا تھا۔

الغرض حامد بن عباس نے حیلہ سازیوں کے ذریعے حضرت منصور حلاجؒ پر قابو پا لیا اور انہیں پابہ زنجیر کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ دیکھ بھال کے لئے اپنے خاص آدمیوں کی ایک بڑی تعداد مقرر کی جو دن رات حضرت منصور حلاجؒ کی اس طرح نگرانی کرتے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک سیاسی مجرم ہوں۔

حامد بن عباس روزانہ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کو اپنی مجلس میں بلاتا اور ان سے نہایت بے ہودہ گفتگو کرتا۔ اس موقع پر بغداد کے دوسرے علماء بھی موجود ہوتے جو منصور حلاجؒ کے جواب کو بغور سنتے اور اس بات کے منتظر رہتے کہ ایک مرد درویش کی زبان کو کوئی لغزش ہو اور پھر اسے واجب القتل قرار دے دیا جائے۔ حامد بن عباس کی بے ہودہ گوئی کی وجہ بھی یہی تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ غصے میں آجائیں اور ان کے منہ سے کوئی غیر معقول بات نکل جائے۔ پھر ایسی بات کو بنیاد بنا کر ان کی گرفت کی جاسکے۔

حامد بن عباس کی منصوبہ بندی اپنی جگہ مگر حضرت منصور حلاجؒ کلمہ شہادت اپنی زبان سے ادا کرنے کے سوا کچھ اور نہ کہتے۔ اگر ان سے مزید جرح کی جاتی تو وہ شرح کے دوسرے مسائل بیان کرنا شروع کر

دیتے۔ حامد بن عباس جھنجھلا کر رہ جاتا..... اور حضرت منصور حلاجؒ کو واپس لے جا کر زنداں کے اندھیروں میں ڈال دیا جاتا۔

پھر دوسرا دن طلوع ہوتا اور ایک مرد درویش کے ساتھ یہی اذیت ناک کھیل شروع ہو جاتا۔ پھر ایک دن حامد بن عباس کے کسی مخبر نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔“

”میں بھی تو یہی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی دن اس کی زبان لڑکھڑا جائے مگر اب تک اس نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔“ حامد بن عباس نے غصے میں آ کر کہا۔ ”یا تو تم لوگ جھوٹے ہو یا پھر حلاج بہت ہوشیار انسان ہے کہ علماء کے سامنے اپنی زبان پر قفل لگائے رکھتا ہے اور چہرے پر نقاب پہنے رہتا ہے۔“

”ہماری اطلاعات غلط نہیں ہیں۔ حلاج بہت ہوشیار انسان ہے۔“ مخبر نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ حامد بن عباس بہت دنوں سے شدید پیچ و تاب میں مبتلا تھا۔

”اس کی خدائی کا اقرار کرنے والے بھی یہاں موجود ہیں۔“ مخبر نے حامد بن عباس کو نئی راہ دکھائی۔

”انہیں طلب کر کے پوچھا جائے کہ وہ حلاج کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟“

حامد بن عباس کے چہرے پر خوشی کی لہر ابھر آئی۔ اس کے نزدیک یہ طریق کار زیادہ آسان تھا۔ اگر حضرت منصور حلاجؒ کے پرستار ان کی خدائی کو تسلیم کر لیتے تو حلاجؒ خود بخود مجرم ثابت ہو جاتے۔

حامد بن عباس نے بلاتا خیر ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جو منصور حلاجؒ کی خدائی کے قائل تھے۔

ان لوگوں سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”ہم لوگ حلاج کے اصحاب اور

منادی ہیں۔“

اصحاب اور منادی کے الفاظ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کے نزدیک منصور حلاجؒ نعوذ باللہ خدا تھے۔ منادی پکارنے والے کو کہتے ہیں اور ”اصحاب“ کا لفظ دوستوں اور اطاعت گزاروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

حامد بن عباس نے دوبارہ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم لوگ اپنے عقیدے کی وضاحت کرو۔ تمہارے نزدیک حلاجؒ کی کیا حیثیت ہے؟“

پھر ان لوگوں نے کھل کر اپنا عقیدہ بیان کیا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ حلاج ہمارے نزدیک خدا ہے۔“

”تم کس بنیاد پر حلاجؒ کو خدا کہتے ہو؟“ حامد بن عباس نے دوسرا سوال کیا۔

”اس لئے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔“ حضرت منصور حلاجؒ کے پرستاروں نے جواب دیا۔

حامد بن عباس بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں اب حضرت منصور حلاجؒ کو خدائی کا دعویٰ ثابت کرنا

بہت آسان تھا۔

دوسرے دن حامد بن عباس نے اپنی مجلس میں حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ ان لوگوں کو بھی طلب کیا جو حسین بن منصورؒ کو خدا تسلیم کرتے تھے۔

جیسے ہی حضرت منصور حلاجؒ زنجیریں پہنے ہوئے مجلس میں داخل ہوئے، حامد بن عباس نے سخت لہجے

میں پوچھا۔ ”ان لوگوں کو جانتے ہو؟“ وزیر حامد بن عباس کا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو منصور حلاجؒ کی خدائی کے قائل تھے۔

اگر حضرت منصور حلاجؒ اس الزام میں ملوث ہوتے تو ان لوگوں کو پہچاننے سے انکار کر کے آسانی کے ساتھ اپنا دامن بچا سکتے تھے..... مگر چونکہ وہ بے قصور تھے، اس لئے کسی جھک کے بغیر فرمانے لگے۔ ”ہاں! میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے۔“

”یہ لوگ تجھے خدا سمجھتے ہیں۔“ حامد بن عباس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”اب تُو بتا کہ تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔“

حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر نہایت غیر مہذبانہ اور ناشائستہ گفتگو کی مگر حسین بن منصورؒ یہی فرماتے رہے۔

”یہ سب کے سب جھوٹے ہیں اور مجھ پر اتر ابا نہ دھتے ہیں۔ اس کے سوا میری کوئی پہچان نہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی کی عبادت کرتا ہوں اور اسی کے لئے روزے رکھتا ہوں۔ مجھے نبوت اور خدائی کے دعوے سے کوئی نسبت نہیں۔ میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، ان جھوٹے اور اتر اساز لوگوں سے۔“

بات واضح ہو چکی تھی مگر حامد بن عباس اپنی ضد پر قائم رہا۔ وہ ہر حال میں حضرت منصور حلاجؒ کو مجرم ثابت کر کے انہیں ان کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا اور وہ انجام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ حضرت منصور حلاجؒ تہ تیغ کر دیئے جائیں۔

اگرچہ مقدمہ یکطرفہ قائم کیا گیا تھا اور دلائل نا کافی تھے لیکن حامد بن عباس نے علماء اور فقہاء کی ایک جماعت سے کہا۔ ”حلاج کے قتل کا شرعی جواز پیدا ہو چکا ہے، اس لئے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا جائے۔“

حکومت کے دباؤ کے باوجود علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ ”اب تک ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہو سکی ہے جو اس شخص کے قتل کی بنیاد بن سکے۔“

”یہ لوگ اسے خدا مانتے ہیں۔“ علماء کا انکار سن کر حامد بن عباس مشتعل ہو گیا۔ ”کیا ان لوگوں کا اقرار حلاج کے قتل کا جواز نہیں بن سکتا؟“

”ان لوگوں نے حلاج کے متعلق جو دعویٰ کیا ہے، وہ اس وقت تک حجت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت نہ کیا جائے۔“ علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف فتویٰ نہ دینے کا جواز

پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یا پھر وہ شخص جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا گیا ہے، خود اس بات کا اقرار کرے۔“

مختصر یہ کہ علماء کا انکار سن کر حامد بن عباس ایک بار پھر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اور حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کے لئے نئے بہانے ڈھونڈنے لگا۔



اس واقعے کی کچھ تفصیلات مؤرخ عریب بن سعد قرطبی نے بھی تحریر کی ہیں۔ عریب بن سعد لکھتا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے منصور حلاجؒ کی اس حالت (یعنی خدائی دعوے) کو ظاہر کیا، وہ بصرہ کا رہنے والا تھا۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے اس شخص کو مجہول قرار دیا ہے کیونکہ کسی تاریخ میں اس شخص کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بہر حال بصرہ کا وہ گناہ سرکاری گواہ بن گیا اور اس نے وزیر علی بن عیسیٰ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”میں حلاج کے اصحاب کو خوب پہچانتا ہوں، جو مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کو حلاج کی خدائی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پہلے میں بھی اس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں جب مجھ پر حلاج کی فریب کاری عیاں ہوئی تو میں اس جماعت سے علیحدہ ہو گیا..... اور حقیقت منکشف ہو جانے پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ نفل نماز پڑھی اور اب تک اپنی اس غلطی پر استغفار کر رہا ہوں۔“ سرکاری گواہ نے حضرت منصور حلاجؒ کی فریب کاری اور اپنی معصومیت اور بے خبری کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ پھر اسی شخص نے ایک اور انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”درباری منشی ابو علی ہارون بن عبدالعزیز اور اجی بھی اسے خدا مانتا ہے۔ منشی نے حلاج کی تعریف میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں حلاج کے بہت سے خوارق اور شعبدوں کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب حلاج کے ماننے والوں کے پاس موجود ہے جو اسے بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔“

عریب بن سعد قرطبی کی روایت کے مطابق منصور حلاجؒ اس وقت شاہی محل میں نظر بند تھے اور ہر خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ ابن نصر قشوری حاجب منصورؒ کا نگہبان تھا اور وہ بھی ان کے مکرو فریب کے پھندے میں پھنس گیا تھا۔ (یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جب ابن نصر قشوری بیمار تھا اور طبیبوں نے اس کے لئے سیب تجویز کیا تھا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد جب سیب نہ مل سکا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے وہ سیب فراہم کر دیا تھا) ابن نصر قشوری کے علاوہ خدام شاہی بھی حلاج کا ذکر عظمت کے ساتھ کرتے تھے۔ عباسی خلیفہ مقتدر نے حلاج کو علی بن عیسیٰ کے حوالے کر دیا۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ سب سے پہلے علی بن عیسیٰ کی سختیوں کا نشانہ بنے۔ علی بن عیسیٰ نے حضرت منصور حلاجؒ کو اپنی مجلس میں طلب کیا اور نہایت جارحانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔

”تو اپنی اس طاقت پر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے کہ زنجیریں پہنے ہوئے مجرموں کی طرح میرے سامنے کھڑا ہے۔“

حضرت منصور حلاجؒ نے علی بن عیسیٰ کے غضب ناک لہجے کو محسوس کیا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی کے ساتھ اس شخص کو دیکھتے رہے جو اقتدار کے نشے میں مست تھا اور گلا پھاڑ کر بول رہا تھا۔

”تو کیسا خدا ہے؟ یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا؟“ علی بن عیسیٰ حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کر کے گرجا۔ ”مجھے بھی تو اپنی خدائی کا کوئی کرشمہ دکھا۔“

اس بار حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ زنجیریں بج اٹھیں جن کے شور سے مجلس کا

سکوت درہم برہم ہو گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ علی بن عیسیٰ کے قریب ہوئے اور نہایت پر جلال لہجے میں فرمانے لگے۔

”علی بن عیسیٰ! میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ تو جس حد تک پہنچ چکا ہے، اس سے آگے نہ بڑھ ورنہ میں تیرے اوپر زمین کا تختہ الٹ دوں گا۔“

خدا ہی جانتا ہے کہ ایک بے دست و پا قیدی کے الفاظ میں کیا تاثیر تھی کہ علی بن عیسیٰ لرز اٹھا۔ عریب بن سعد قرطبی کی روایت کے مطابق علی بن عیسیٰ حضرت منصور حلاجؒ سے مزید گفتگو نہ کر سکا اور وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس معاملے سے الگ ہو گیا۔

اس کے بعد حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ سے درخواست کی اور حضرت منصور حلاجؒ کو اس جابر و سفاک وزیر کے حوالے کر دیا گیا۔



علی بن عیسیٰ کا اس معاملے سے دستبردار ہو جانا، حضرت منصور حلاجؒ کے جلال روحانی کی ایک دلیل ہے۔ ایک طاقت ور آمر نے حضرت منصور حلاجؒ کی شخصیت کا کوئی ایسا زاویہ یقیناً دیکھا ہوگا جس سے وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے قاتلین منصور کی فہرست سے اپنا نام خود ہی کاٹ لیا۔ یہ علی بن عیسیٰ کی سعادت تھی کہ وہ ایک جانباز صوفی کی دل آزاریوں سے محفوظ رہا۔ اس کے برعکس حامد بن عباس دن رات اسی تنگ و دو میں مصروف رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح حضرت منصور حلاجؒ کو کافر ثابت کر دے اور پھر ان کی شرے گ پر خنجر ستم پھیر دے۔

آخر وقت نے حامد بن عباس کو ایک اور موقع فراہم کر دیا۔ مخبروں نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”بغداد میں ایک جوان سال عورت بھی حلاج کے دعویٰ خدائی کی گواہ ہے۔“

حامد بن عباس نے پوچھا۔ ”یہ عورت کون ہے؟“

مخبروں نے بتایا۔ ”سمری نام کا ایک شخص حلاج کے اصحاب میں شامل ہے اور یہ عورت اسی کی لڑکی ہے۔“

حامد بن عباس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس عورت کو بھی طلب کر لیا۔ کسی بھی تاریخ میں سمری کی بیٹی کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہر مورخ اُسے بنت سمری کے نام سے پکارتا ہے۔

جب بنت سمری حامد بن عباس کے پاس آئی تو اُس وقت معززین شہر میں سے ابوالقاسم بن زنجی اور ابوعلی احمد بن نصر بھی موجود تھے۔ ابوالقاسم بن زنجی کا بیان ہے کہ بنت سمری ایک خوب صورت خاتون تھی۔ جب اس نے حامد بن عباس کے کچھ سوالوں کے جواب دیئے تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ خوبصورت ہونے کے علاوہ بنت سمری فصیح البیان اور شیریں گفتار بھی تھی۔

حامد بن عباس نے بنت سمری کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تجھ پر لازم ہے کہ تو کچھ دن حلاج کے ساتھ تنہائی میں گزار اور پھر جو واقعات پیش آئیں، میرے روبرو بیان کر۔“

اس کے بعد بنت سمری کو اہل کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں حضرت منصور حلاجؒ قید تھے۔

ہم کسی تاریخ کے حوالے سے اس مدت کا تعین تو نہیں کر سکتے کہ بنت سمری نے حضرت منصور حلاجؒ کے ساتھ تنہائی میں کتنے دن گزارے مگر حامد بن عباس کے منصوبے کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ خوبصورت عورت چند ماہ خلوت میں ضرور رہی ہوگی۔

پھر ایک مقررہ وقت گزارنے کے بعد حامد بن عباس نے بنت سمری کو طلب کر کے پوچھا۔ ”تو نے اتنے دنوں میں حلاجؒ کو کیسا پایا اور کیا واقعات مشاہدہ کئے؟“

”میں نے انہیں ہر چیز سے بے نیاز پایا۔“ بنت سمری نے صاف صاف کہہ دیا۔

بنت سمری کا جواب سن کر حامد بن عباس کا چہرہ بجھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ خلوت میں بنت سمری کی موجودگی حضرت منصور حلاجؒ کی پاک دامنی کو داغ دار کر دے گی یا کم سے کم ایسی بات ضرور کہے گی جس سے حضرت حسین بن منصورؒ کے کردار کی کمزوری ظاہر ہوتی ہو۔ مگر بنت سمری کے ان الفاظ نے حامد بن عباس کے منصوبے کو خاک میں ملایا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ یہ حضرت منصور حلاجؒ کے متقی اور پرہیزگار ہونے کی دلیل ہے۔

پھر جب حامد بن عباس نے بنت سمری سے مسلسل سوالات کئے تو اس نے صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”حلاجؒ ہمہ وقت اپنے خیالات میں گم رہتے ہیں۔ مگر ایک دن انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں نے تیرا نکاح اپنے بیٹے سلمان سے کر دیا جو مجھے اپنی تمام اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ نیشاپور میں مقیم ہے اور تو عنقریب اس کے پاس پہنچ جائے گی۔“

اس کے بعد حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میاں بیوی میں کوئی نہ کوئی تلخ بات ہو ہی جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ ہی جاتا ہے۔ میں نے تیرے متعلق سلیمان کو ہدایت کر دی ہے۔ اگر تم دونوں میاں بیوی کے درمیان کبھی ناگوار بات ہو جائے تو اس دن روزہ رکھنا اور دن کے آخری حصے میں چھت پر جا کر کھڑی ہونا اور خالص نمک سے روزہ افطار کر کے میری طرف متوجہ ہونا اور جونا گواری پیش آئی ہو اس کا ذکر کرنا۔ میں تیری بات سنوں گا اور تجھے دیکھوں گا۔“

بنت سمری کی بات سن کر حامد بن عباس جوش غضب میں بول اٹھا۔ ”یہ بھی تو خدائی کا دعویٰ ہے کیونکہ خدا ہی اپنے بندوں کے حالات دیکھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے۔“

مجلس میں موجود علماء اور فقہاء نے حامد بن عباس کی اس دلیل کو مسترد کر دیا۔ ”یہ انسانی جذب کی کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔ اس واقعے سے خدائی دعوے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔“

حامد بن عباس بنت سمری کو مجبور کرتا رہا کہ وہ اپنے حافظے پر زور دے کر ایسا کوئی واقعہ بیان کرے جس سے حلاجؒ کا کفر ثابت ہوتا ہو۔ بنت سمری کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے حضرت منصور حلاجؒ کے حوالے سے ماضی کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”میں ایک دن صبح کے وقت چھت سے اتر رہی تھی۔ حلاجؒ کی لڑکی میرے ساتھ تھی اور حلاجؒ مکان کے صحن میں موجود تھے۔ پھر جب ہم دونوں زینے میں اس جگہ پہنچیں جہاں سے حلاجؒ ہمیں نظر آ رہے

تھے اور وہ ہمیں دیکھ رہے تھے تو ان کی لڑکی نے مجھ سے کہا۔
”ان کے آگے سجدہ کرو۔“

میں نے چونک کر حلاج کی لڑکی سے کہا۔ ”کیا اللہ کے سوا بھی کسی کو سجدہ کیا جاسکتا ہے؟“
میری بات حلاج نے سن لی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! آسمان میں بھی معبود ہے اور
زمین میں بھی معبود ہے۔ اللہ وحدہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔“

اس کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ بنت سمری نے حضرت منصور حلاجؒ کو سجدہ کیا یا نہیں؟ البتہ علمائے کرام
نے اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر حضرت منصور حلاجؒ کے قول میں ”لا الہ الا اللہ وحدہ“
نہ ہوتا تو واقعی یہ کلمہ کفر تھا مگر آخری جملے نے مجبور کر دیا ہے کہ ان کے پہلے جملے کو بھی تو حید پر محمول کیا
جائے۔ یہاں سجدے سے مراد سجدہ تعظیسی ہے جو علماء کے درمیان ایک متنازع مسئلہ ہے۔ اگر حضرت
منصور حلاجؒ نے بنت سمری کو سجدہ تعظیسی کا حکم دیا تو یہ ان کی علمی اور فقہی غلطی تھی۔ اس سے ان پر کفر کا
الزام نہیں آتا۔ وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

بنت سمری کے بارے میں بھی علمائے تحقیق کی متفقہ رائے ہے کہ وہ ایک مجہول عورت ہے۔ اس کے
حالات یکسر مفقود ہیں اس لئے اس کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا علم نہیں۔ مزید یہ کہ بنت سمری اس روایت
میں تنہا ہے اور ایک عورت کے بیان سے کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلامی قانون شہادت کے مطابق
کسی معاملے میں دو عورتوں کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے۔

اسی دوران بنت سمری نے حامد بن عباس کو حضرت منصور حلاجؒ کی روحانیت سے متعلق کئی اہم
واقعات سنائے جنہیں ان کی شعبدہ بازی اور جادوگری سے تعبیر کیا گیا۔

ایک دن حلاجؒ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ اس وقت ایک بورے پر بیٹھے ہوئے تھے اور
کمرے میں چاروں طرف بوریوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

”آپ نے مجھے کس لئے یاد کیا ہے؟“ میں نے حلاج سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ.....“ حلاج نے کہا۔ پھر جب میں بیٹھ گئی تو مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں دولت کی
ضرورت ہے؟“

میں نے حیرت سے حلاجؒ کی طرف دیکھا۔ وہ شکستہ حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس وقت بھی
ان کے جسم پر ایک پرانی گدڑی تھی۔ پھر ایسا مفلس و غریب شخص کسی کو دولت کس طرح دے سکتا تھا؟ میں
اسی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ حلاجؒ نے دوبارہ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”تم اپنی ضرورت کا اظہار کرو۔ یہ مت سوچو کہ ایک مفلوک الحال فقیر تمہیں کیا دے سکتا ہے؟“

میں ایک بار پھر شدید حیرت میں مبتلا ہو گئی۔ حلاجؒ نے میرے خیالات پڑھ لئے تھے۔ ”دولت کی
ضرورت کسے نہیں ہوتی؟“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اگرچہ انہوں نے میرے دل کا حال جان لیا تھا لیکن
پھر بھی مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ میری خواہش پوری کر سکیں گے۔

”تو پھر جاؤ اور بوری اٹھا کر جتنی دولت چاہو لے جاؤ۔“ حلاجؒ نے اس قدر پر یقین لہجے میں کہا جیسے

پورا کمرہ دولت سے بھرا ہو۔

میں ہچکچاتی ہوئی کمرے کے ایک گوشے میں گئی اور بوریا الٹ دیا۔ پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دینار اس طرح زمین پر بچھے ہوئے تھے جیسے سارا فرش دیناروں سے تیار کیا گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر دوسرے بورے کو الٹا۔ وہاں بھی دینار بچھے ہوئے تھے۔ پھر دیناروں کی چمک سے میری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔“

جب بنت سمری نے یہ واقعہ بیان کیا تو حامد بن عباس اور وہاں موجود تمام علماء نے بیک زبان حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کو ”ساحری“ قرار دے دیا۔ چونکہ اسلام میں جادو حرام ہے، اس لئے حضرت منصور حلاجؒ کے روحانی کمالات کو پہلے جادوگری کا نام دیا جاتا تھا اور بعد میں اسی حوالے سے ان پر کفر کا الزام عائد کر دیا جاتا تھا۔

اولیائے کرام کے نزدیک دولت کے دریا بہا دینا، ایک ادنیٰ کرامت ہے۔ اگرچہ وہ خود فاقے سے ہوتے ہیں لیکن حق تعالیٰ انہیں بے شمار خزانوں پر قبضہ و اختیار عطا کر دیتا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اراداً جس پتھر پر تھوک دیا کرتے تھے وہ سونا بن جاتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ کے آگے سونے کا دریا بہتا تھا۔ یہ منظر ان امیر زادوں نے کئی بار دیکھا جو حضرت محبوب الہیؒ کو مفلسی اور غربت کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ حضرت سیدی مولہؒ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ ان کے مصلے کے نیچے سیم وزر کا سمندر موجزن تھا۔ وہ بظاہر کوئی کام نہیں کرتے تھے مگر ان کا روزانہ کا خرچ لاکھوں روپے تھا۔ سیدی مولہؒ، سلطان جلال الدین خلجی کے دور حکومت میں گزرے ہیں اور ان کی یہ کرامت تاریخ ہندوستان کا ایک روشن اور ناقابل فراموش باب ہے۔ اس دور کے علماء سیدی مولہؒ کو بھی شعبہ باز اور جادوگر کہتے تھے۔ بعض علماء نے اس معاملے میں احتیاط برتی اور سیدی مولہؒ کو ”جادوگر“ کہنے کی بجائے ”کیمیاگر“ قرار دیا۔ علماء کی اس جماعت کی نظر میں سیدی مولہؒ سونا بنانے کا ہنر جانتے تھے، اسی لئے لاکھوں روپے روزانہ خیرات کیا کرتے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ اکثر علمائے بغداد کی نظر میں یہ جاننا صوفی ایک جادوگر کے عوا کچھ نہیں تھا۔

ابوالقاسم زنجی کا بیان ہے کہ جو خطوط منصور حلاجؒ کے ماننے والوں کے پاس سے ضبط کئے گئے تھے، ان میں عجیب باتیں درج تھیں۔ مزید یہ کہ ان خطوط میں حلاجؒ کی ہدایت بھی تحریر تھی کہ لوگوں کو کس بات کی دعوت دی جائے؟ انہیں کس طرح ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف لایا جائے یہاں تک کہ وہ انتہائی درجے پر پہنچ جائیں۔ ابوالقاسم زنجی کے بقول حلاجؒ نے اپنے اصحاب (پرستاروں) کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہر جماعت کے افراد کے ساتھ ان کی ذہنی سطح کے مطابق اس طرح بات کی جائے کہ وہ اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ جو لوگ حلاجؒ سے خط و کتابت کیا کرتے تھے انہیں خاص رموز میں جواب دیا جاتا تھا جسے کاتب اور مکتوب الیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مخصوص لوگوں کے علاوہ منصور حلاجؒ کے خطوط کا مفہوم کوئی دوسرا شخص سمجھ ہی نہیں سکتا تھا تو پھر حامد بن عباس کے حاشیہ برداروں پر یہ بات کیسے ظاہر ہو گئی کہ حضرت منصور

حلاج ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے یا پھر وہ اسلام سے باغی ہو کر معاذ اللہ خود خدا بن بیٹھے تھے۔ مقدمہ منصور کے سلسلے میں ابوالقاسم زنجی کے نام سے کئی روایتیں منسوب ہیں۔ حضرت منصور حلاج کے مخالفین بڑے زور و شور سے ان روایتوں کو بیان کرتے ہیں مگر علمائے تحقیق نے ابوالقاسم زنجی کو مجہول قرار دیا ہے۔ ابوالقاسم زنجی اور اس کا باپ حامد بن عباس کے درباریوں میں سے تھے۔ جب ان کا آقا قتل منصور کے درپے ہو تو پھر خوشامدی غلام ایک معتبوب شخص کی بے گناہی پر کس طرح گواہی دے سکتے تھے؟ الغرض ان ہی جھوٹی شہادتوں کے ہجوم میں حضرت منصور حلاج کو زنجیریں پہنا کر علماء اور فقہاء کے درمیان تقریباً روزانہ پیش کیا جاتا۔ دن دن بھر، مختلف زاویوں سے جرح ہوتی مگر حضرت حسین بن منصورؒ پر خدائی دعوے اور کفر کا الزام ثابت نہ ہوتا۔

اسی دوران جب حضرت منصور حلاج بیڑیاں پہنے ہوئے زندان کے ایک ایسے کمرے میں قید تھے، جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا، ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے حامد بن عباس کے ہوش اڑا دیے۔ مقتدر باللہ کا یہ جابر و سفاک وزیر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ قید خانے کے ایک دربان نے آکر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”امیر! بڑا غضب ہو گیا کہ حلاج کا ایک مرید اس کے پاس آیا اور ملاقات کر کے واپس چلا گیا۔“
حامد بن عباس نے زنداں کے دربان کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے پوچھا۔ ”تیرے ہوتے ہوئے وہ مرد و حلاج تک کیسے پہنچ گیا؟“

”یہی تو حیرت ہے کہ وہ سخت ترین پہرے میں کس طرح اندر گیا؟“ دربان حامد بن عباس کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ ”میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ وہ شخص حلاج سے بات کر رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور اچانک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“

حامد بن عباس کو دربان کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اس جگہ پہنچا جہاں حضرت منصور حلاج قید تھے۔ پھر اس نے تمام چوکیداروں کو جمع کر کے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا۔
”کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا کہ میری مرضی کے بغیر حلاج سے کوئی ملاقات نہیں کرے گا؟“
”ہم آپ کے حکم ہی کے مطابق حلاج کی نگرانی کرتے ہیں۔“ تمام دربانوں نے بیک زبان کہا۔
”ہم نے کسی شخص کو حلاج سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔“

”پھر یہ نافرمانی کیوں ہوئی؟“ حامد بن عباس بھڑک اٹھا اور اس نے کئی چوکیداروں کی پشت پر کوڑے برسائے۔ بعض دربان لہو لہان ہو گئے مگر اپنے جرم سے انکار کرتے رہے۔ تمام چوکیداروں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ وہ اس معاملے میں یکسر بے قصور ہیں۔ اب حامد بن عباس کو احساس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ اس نے قید خانے کا دروازہ کھلوا یا اور پنچشم خود ایک ایک دیوار، ایک ایک گوشے اور قید خانے کی چھت کا معائنہ کیا۔ وہاں نقب لگانے کا کوئی نشان تھا اور نہ کوئی شکاف جس سے گزر کر باہر سے کوئی آدمی آ سکتا اور پھر اسی راستے سے واپس چلا جاتا۔

آخر حامد بن عباس زچ ہو گیا اور اس نے حضرت منصور حلاج سے پوچھا۔ ”قید خانے کا دربان کہتا

ہے کہ تیرا ایک مرید تجھ سے ملنے یہاں آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا۔“
حضرت منصور حلاج خاموش رہے مگر سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔
حامد بن عباس شدید جھنجلاہٹ میں مبتلا تھا کیونکہ اس کی ساری احتیاطی تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں۔
”ہزاروں بندشوں اور پہروں کے باوجود وہ یہاں کس طرح داخل ہوا تھا؟“
حضرت منصور حلاج نے اسی بے نیازی کے انداز میں فرمایا۔ ”وہ قدرت الہی سے یہاں اُترا اور جس طرح میرے پاس آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔“
”یہ کھلا ہوا جادو ہے۔“ حضرت منصور حلاج کا جواب سن کر حامد بن عباس ایک بار پھر ہذیانی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ ”میں بھی دیکھوں کہ ٹوکب تک اپنے جادو کے کرشمے دکھائے گا۔“
حضرت منصور حلاج نے سکوت اختیار کیا اور حامد بن عباس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔



اگرچہ علمائے تحقیق نے ابوالقاسم زنجی کو مجہول اور جھوٹا قرار دیا ہے لیکن پھر بھی اس کے حوالے سے حضرت منصور حلاج کی ایک عجیب کرامت مشہور ہے۔ ابوالقاسم حامد بن عباس کی تقلید کرنے کے لئے مجبور تھے۔ نتیجتاً ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے دارالعلوم کے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئے اور وہ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ پھر میں اور میرا باپ انتظار کرنے لگے کہ حامد بن عباس کی طرف کب ہمارا بلاوا آتا ہے؟ ابھی ہم دونوں کو بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہارون ابو عمران میرے والد کے پاس تشریف لائے۔ وہ ایک بڑے عالم تھے۔ دونوں میں گفتگو شروع ہو گئی اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔
اچانک میں نے حامد بن عباس کے اس غلام کو آتے ہوئے دیکھا جو حلاج کی نگرانی پر مامور تھا اور اسے کھانا وغیرہ پہنچایا کرتا تھا۔ غلام کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

حامد بن عباس کے غلام نے ہارون ابو عمران کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ پھر انہیں کچھ بتانے لگا۔
فاصلہ زیادہ تھا، اس لئے ہم اس غلام کی گفتگو نہ سن سکے۔ مگر اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے سائے لرز رہے تھے اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر وہ غلام واپس چلا گیا اور ہارون ابو عمران ہمارے پاس آئے مگر ان کے چہرے کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔

”شیخ! کیا بات ہے؟ میں آپ کی حالت کو متغیر پاتا ہوں۔“ میرے والد نے ہارون ابو عمران سے پوچھا۔

”تم اس شخص کو پہچانتے ہو جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا اور مجھ سے بات کر رہا تھا؟“ ہارون ابو عمران نے میرے والد سے کہا۔

”ہاں! یہ وزیر محترم کا غلام ہے اور حلاج کی نگرانی پر مامور ہے۔“ میرے والد نے اثبات میں جواب دیا۔

”یہ غلام کچھ دیر پہلے حلاج کے پاس کھانے کا طبق لے کر گیا تھا۔ یہ اس کا روزانہ معمول ہے۔“

ہارون ابو عمران نے میرے والد کو واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”غلام کہہ رہا تھا کہ وہ جیسے ہی حلاج کے کمرے میں داخل ہوا تو پورا کمرہ اس کے جسم سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ یہ منظر دیکھ کر غلام پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے کھانے کا طباق دروازے میں پھینک دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو وہ بخار میں جل رہا تھا۔“

ابوالقاسم زنجی کا بیان ہے کہ ابھی ہم تینوں اس واقعے پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ حامد بن عباس کا قاصد آیا اور اس نے ہمیں مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔ پھر جب ہم لوگ مجلس میں پہنچے اور ہارون بن عمران نے غلام کا بیان کردہ واقعہ سنایا تو ہماری طرح حامد بن عباس بھی شدید حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ پھر اس نے اسی وقت اپنے غلام کو طلب کر کے اس کی زبانی پورا واقعہ سنا۔ غلام جب حامد بن عباس کی مجلس میں داخل ہوا تو بخار کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

تمام واقعہ سننے کے بعد حامد بن عباس نے غلام کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور نہایت غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”تو بھی حلاج کی نیرنگیوں سے ڈر گیا؟ تجھ پر خدا کی لعنت۔ میرے پاس سے دور ہو جا!“ غلام کانٹے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس چلا گیا..... اور ایک طویل مدت تک بخار میں مبتلا رہا۔ علمائے تحقیق نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں بھی حضرت منصور حلاج کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کرامات اولیاء کے حوالے سے ایسے واقعات کتابوں میں بکثرت درج ہیں کہ کبھی ان کا جسم بڑھ جاتا تھا اور کبھی ایک ایک عضو الگ ہو جاتا تھا..... مگر چونکہ حضرت منصور حلاج کو مجرم ثابت کرنا تھا، اس لئے ان سے منسوب ہر بات کفر تھی یا شعبہ بازی تھی۔



ابوبکر صولی کی روایت ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے حلاج کو گرفتار کیا، وہ ابوالحسن علی بن احمد راسبی تھا۔ اس نے حلاج اور اس کے غلام کو ربیع الآخر 301ھ میں بغداد پہنچایا اور دو اونٹوں پر سوار کر کے گلی گلی تشہیر کرائی اور ان کے ساتھ ایک کتبہ بھی لگوا دیا جس پر تحریر تھا۔ ”میرے پاس شہادت موجود ہے کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور حلول کا قائل ہے۔“ علمائے تحقیق کے مطابق ابوبکر صولی جھوٹا تھا۔ وہ ایک درباری ادیب اور شاعر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر ابوبکر صولی سچا ہوتا تو 301ھ میں ہی حضرت منصور حلاج پر خدائی دعوے کا الزام ثابت ہو جاتا اور وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے..... مگر تاریخ گواہ ہے کہ حضرت منصور حلاج نو سال تک مسلسل گرفتار رہے، ان پر مقدمہ چلتا رہا اور ہزار کوشش کے باوجود ان کے خلاف فتویٰ نہیں دیا جاسکا۔ پھر حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ حامد بن عباس کو حضرت منصور حلاج کی کتابوں میں کچھ ایسے مضامین ملے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسلامی عبادات کا مفہوم بدلنا چاہتے تھے۔ ان روایتوں کے مطابق اگر کوئی شخص تین دن، تین رات متواتر روزے رکھے اور درمیان میں افطار نہ

کرے، پھر چوتھے دن بندیا کے پتوں پر افطار کرے تو اسے رمضان کے روزوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص کسی رات میں شروع سے صبح تک دو رکعتیں پڑھے تو اسے زندگی بھر نماز کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور اگر کوئی شخص کسی دن اپنی ساری مخلوقات کو جو اس وقت اس کی ملکیت میں ہوں، صدقہ کر دے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ کے لئے زکوٰۃ کا قائم مقام ہو جائے گا۔

اور اگر کوئی شخص ایک کمرہ بنا کر چند روزے رکھے، پھر اس کے گرد بے لباس ہو کر طواف کرے تو اسے حج کی ضرورت نہ رہے گی۔

اور اگر کوئی شخص قریش کے قبرستان میں جا کر شہداء کی قبروں کی زیارت کرے اور وہاں دس روز قیام کر کے نماز پڑھے اور دعا کرتا رہے اور متواتر روزے رکھے اور افطار کے وقت جو کی تھوڑی سی روٹی اور خالص نمک کے سوا کچھ نہ کھائے تو اسے تمام عمر عبادت کی ضرورت نہ رہے گی۔

حامد بن عباس نے بغداد کے علماء، فقہاء اور قاضیوں کو جمع کیا۔ پھر حلاجؒ کو ایک کتاب دکھا کر پوچھا۔ ”تم اس کتاب کو پہچانتے ہو؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے با آواز بلند فرمایا۔ ”ہاں! یہ امام حسن بصریؒ کی کتاب ”السنن“ ہے۔“

حامد بن عباس نے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا تم اس کتاب کے مضامین کو نہیں مانتے؟“

”کیوں نہیں؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”یہ تو ایسی کتاب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے موافق معاملہ کرتا ہوں۔“ (یعنی میں اس کتاب کے مضامین کے مطابق اسلامی احکام پر عمل کرتا ہوں)

حضرت منصور حلاجؒ کا جواب سن کر قاضی ابو عمر نے کہا۔ ”یہ کتاب تو سراسر اسلامی احکام کے منافی ہے۔“

اس کے بعد قاضی ابو عمر نے حضرت منصور حلاجؒ سے بہت دیر تک جرح کی اور اسی بحث کے دوران ان کے منہ سے نکل گیا۔ ”حلاج کا خون حلال ہے۔“ یعنی وہ واجب القتل ہیں۔ اس کے بعد قاضی ابو عمر نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ دے دیا اور دوسرے علماء نے اس فتوے پر دستخط کر دیئے۔

علمائے تحقیق نے اس واقعے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کو کتاب کا مضمون نہیں سنایا گیا۔ صرف دور سے کتاب دکھا کر سوال کیا گیا کہ اس کتاب کو مانتے ہو یا نہیں؟ حضرت منصور حلاجؒ نے جواب میں فرمایا کہ یہ کتاب امام حسن بصریؒ کی ہے اور میں اس کے مضامین کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس جواب سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ، حضرت امام حسن بصریؒ جیسے بزرگ اور محدث کی تحریروں پر یقین رکھتے تھے۔ پھر وہ واجب القتل کیوں قرار پائے؟

بعض علماء نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دشمنان اسلام نے فریب کاری کے ساتھ اس کتاب میں اپنی طرف سے کچھ غیر اسلامی باتیں شامل کر دی تھیں اور حضرت منصور حلاجؒ اس تحریف سے بے خبر تھے۔ ہماری رائے میں اگر حضرت حسین بن منصورؒ بے خبر تھے تو قاضی ابو عمر تو باخبر تھے۔ پہلے انہیں تحقیق

کرنی چاہئے تھی کہ حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب اصلی نسخے کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ کتاب امام حسن بصریؒ کی نہیں تھی تو قاضی ابو عمر کو واضح کر دینا چاہئے تھا کہ اس تصنیف کا امام حسن بصریؒ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جن مضامین اور احکام کے ماننے کے سلسلے میں حضرت منصور حلاجؒ کو واجب القتل قرار دیا گیا، انہیں فرداً فرداً پڑھ کر سنانا چاہئے تھا۔ اگر حضرت منصور حلاجؒ ان خلاف شرع احکام کو تسلیم کرتے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا اقرار کرتے تو قاضی ابو عمر کا فتویٰ درست ہو سکتا تھا..... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف قائم کیا جانے والا مقدمہ ایک طلسمی داستان ہے جس کے بیشتر گواہ جھوٹے ہیں اور خود قاضی جانب داری سے کام لیتے ہوئے عجیب سے پراسرار انداز میں فیصلہ کر رہا ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی تالیف ”سیرت منصور حلاجؒ“ میں اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص کئی بار مکہ معظمہ جا کر سالہا سال قیام کرتا ہو، بار بار حج کرتا ہو اور روزانہ ہزار رکعتیں اس حال میں پڑھتا ہو کہ پیروں میں وزنی بیڑیاں پڑی ہوں اور زندگی بھر روزہ رکھنے کا عادی رہا ہو، وہ ایک رات کی دو رکعت کو عمر بھر کی نماز کے برابر..... یا تین دن کے روزوں کو رمضان المبارک کے روزوں کے برابر یا اپنے گھر کے طواف کو حج کا قائم مقام (نعم البدل) کیوں کر کہہ سکتا ہے؟ اگر معاذ اللہ ابن منصورؒ ساحر و زندیق ہوتے تو خود اپنی ذات کے لئے روزانہ ہزار رکعتیں کیوں پڑھتے؟ زندگی بھر روزے کیوں رکھتے؟ بار بار سفر حج کیوں اختیار کرتے؟ اور مکہ معظمہ میں طویل مدت تک قیام کیوں کرتے؟ پس، یقیناً کسی نے یہ مضامین امام حسن بصریؒ کی کتاب ”السنن“ میں اپنی طرف سے شامل کر دیئے تھے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے تبصرے کی روشنی میں یہ قاضی ابو عمر کے عہدہ و منصب کی ذمہ داری تھی کہ وہ پہلے امام حسن بصریؒ کی کتاب کے بارے میں تحقیق کرتے اور پھر حضرت منصور حلاجؒ کو مجرم قرار دیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور ایک جانباز صوفی کے ساتھ عجیب سنگدلانہ سلوک روار کھا گیا۔



مشہور مؤرخ عریب بن سعد قرطبی اور خطیب بغدادی نے حضرت منصور حلاجؒ کے خلاف قتل کے فتوے کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ ان دونوں مؤرخین کے بیان کے مطابق حلاجؒ کے اصحاب اور مریدوں کے گھروں سے دفتر کے دفتر حامد بن عباس کے پاس لائے جاتے تھے جن میں حلاجؒ کے خطوط اور کتابیں شامل ہوتی تھیں۔ ایک دن حامد بن عباس کے سامنے حلاجؒ کی ایک کتاب پڑھی جا رہی تھی جس میں یہ مضمون درج تھا۔

”اگر کوئی شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ سعادت حاصل کرنے سے مجبور ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے گھر کے ایک کمرے کو عبادت کے لئے مخصوص کر لے اور اسے پاک صاف رکھے۔ کسی قسم کی نجاست وہاں نہ پہنچ سکے اور نہ وہاں کوئی دوسرا شخص جاسکے۔ تمام لوگوں کو اس کمرے کی طرف جانے سے روک دے۔ پھر حج کے ایام میں اس گھر کا طواف کرے جیسا کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں..... اور جو مناسک مکے میں ادا کئے جاتے ہیں، سب بجالائے۔ پھر جب یہ کر چکے تو تیس یتیموں کو جمع کر کے اس گھر کے سامنے اپنی استطاعت کے مطابق کھانا کھلائے اور بذاتِ خود ان یتیموں کی خدمت کرے۔ جب وہ

لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھولیں تو ہر ایک کو ایک ایک گرتہ پہنائے۔ پھر ہر ایک کو سات درہم دے۔ یہ عمل اس کے لئے حج کا قائم مقام ہوگا۔“

جس وقت یہ کتاب پڑھی جارہی تھی، اس وقت حامد بن عباس کی مجلس میں قاضی ابو عمر، قاضی ابوالحسن، قاضی ابو جعفر بن بہلول اور علماء کی ایک جماعت موجود تھی۔ جب مضمون ختم ہو گیا تو قاضی ابو عمر نے حلاجؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”تجھ تک یہ مضمون کیسے پہنچا؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”امام حسن بصریؒ کی کتاب ”الاخلاص“ سے۔“

قاضی ابو عمر نے بے ساختہ کہا۔ ”اے حلال الدم! تو جھوٹا ہے۔“ (حلال الدم کا مطلب ہے، وہ شخص کہ جس کا خون (قتل) جائز ہو)

پھر جیسے ہی قاضی ابو عمر کی زبان سے ”حلال الدم“ نکلا، وزیر حامد بن عباس نے اس لفظ کو پکڑ لیا اور زور دے کر کہا۔ ”اس لفظ کو کاغذ پر لکھ دیجئے۔“ حامد بن عباس کا مطلب تھا کہ منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ دے دیا جائے۔

جب قاضی ابو عمر نے حامد بن عباس کی بات سنی تو وہ حضرت منصور حلاجؒ سے دوسرے امور پر گفتگو کرنے لگے۔ دراصل قاضی ابو عمر بات کو ٹالنا چاہتے تھے مگر حامد بن عباس اصرار کرنے لگا۔

”اب مزید گفتگو فضول ہے۔ تم اقرار کر چکے کہ حلاج واجب القتل ہے۔“

قاضی ابو عمر نے یہ تاثر دیا کہ جیسے انہوں نے وزیر کی بات نہیں سنی۔ وہ مسلسل اس معاملے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر حامد بن عباس اس حد تک پہنچ گیا کہ اس نے قلم اور دوات قاضی ابو عمر کے سامنے رکھ دیئے اور چند کاغذ حوالے کرتے ہوئے بولا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو کچھ اپنی زبان سے کہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کر دو۔“

قاضی ابو عمر نے حامد بن عباس کے تیور دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا۔ مجبوراً انہوں نے قلم اٹھا کر لکھ دیا کہ منصور حلاجؒ کا قتل جائز ہے۔ جیسے ہی یہ فتویٰ تحریر کیا گیا اور قاضی ابو عمر نے اپنے دستخط ثبت کئے، حامد بن عباس نے وہ کاغذ دوسرے علماء کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ایک کے بعد ایک، حضرت منصور حلاجؒ کے قتل نامے پر مہریں لگنے لگیں۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت منصور حلاجؒ نے قاضی ابو عمر اور دوسرے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میری پشت شرعاً ممنوع و محفوظ ہے (یعنی مجھے کوڑوں کی سزا بھی نہیں دی جاسکتی) اور میرا خون بہانا حرام ہے۔ تمہارے لئے ہر گز نہیں کہ تم جھوٹی باتیں گھڑ کر میرے قتل کا فتویٰ دو..... حالانکہ میرا عقیدہ اسلام کے موافق ہے..... میرا مذہب سنت کے مطابق ہے..... اور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ (یعنی تمام عشرہ مبشرہ) کی فضیلت کا قائل ہوں۔ سنت کے بیان میں میری تصانیف کتب فروشوں کے پاس موجود ہیں۔ پس میرے خون کے معاملے میں اللہ سے

ڈرو..... اللہ سے ڈرو۔“

حضرت منصور حلاجؒ مسلسل اسی بات کو دہرا رہے تھے اور علماء برابر ان کے قتل نامے پر دستخط کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حسب منشا فتوے کی تکمیل کر لی گئی تو حاضرین مجلس اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت حسین بن منصورؒ کو اسی جگہ بھیج دیا گیا جہاں وہ پہلے سے قید تھے۔

نوسال تک بحث اور جرح کے بعد جس شخص کو خدائی کا دعویدار یا کافر ثابت نہیں کیا جاسکا، قاضی ابو عمر کی زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے اس کی موت کا فیصلہ کر دیا۔ ”حلال الدم“ کا لفظ قاضی ابو عمر کے ممنہ سے شدت جذبات میں ادا ہوا تھا..... مگر حامد بن عباس نے اسے آیت قرآنی اور حدیث سمجھ لیا۔ قاضی صاحب گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑتے رہے، بات کو ٹالتے رہے مگر خلیفہ مقتدر باللہ کا وزیر ایک ہی نقطے پر جم کر رہ گیا۔ یعنی منصور حلاجؒ کا سر..... قاضی ابو عمر فتویٰ لکھنا نہیں چاہتے تھے مگر حامد بن عباس بار بار قلم دوات اور کاغذ ان کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ یہ انصاف تھا یا اقتدار کے جبر کا بے رحم مظاہرہ؟

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں۔ ”سرور کونین حضور اکرم ﷺ نے وجوبی حکم دیا ہے کہ شبہات سے حدود کو رفع کرو۔ یعنی شبہات کے ذریعے سزاؤں کو دور کرو..... مگر یہاں سب سے بڑی حد یعنی قتل میں بس مجرم کو شک کا فائدہ نہیں پہنچایا جاتا۔ یقیناً وزیر حامد بن عباس کا ایک جملے کو پکڑ لینا اور اس کو قرآنی آیت و حدیث سمجھ لینا ہرگز جائز نہ تھا۔ یہ احتمال ہونا ضروری تھا کہ شاید ویسے ہی غصے میں ابو عمر کی زبان سے نکل گیا ہو..... اور اگر بالفرض قاضی نے قصداً یہ بات کہی تھی، جب بھی وزیر کو خود اس پر اصرار کرنے کا کوئی حق نہیں تھا بلکہ ٹالنا واجب تھا..... جب تک خود قاضی اپنی بات پر اصرار نہ کرتا..... مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کہ قاضی اپنی بات سے ہٹنا اور اس کو ٹالنا چاہتا ہے مگر وزیر بضد ہو کر اسے اپنی بات سے ہٹنے نہیں دیتا۔“

آگے چل کر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں۔ ”بعض مؤرخین کا یہ لکھنا بالکل غلط ہے کہ علماء اور فقہاء نے ابن منصورؒ کے قتل کا فتویٰ دیا تھا بلکہ یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وزیر نے بضد ہو کر علماء پر زور ڈالا اور مجبور کر کے ان سے فتویٰ حاصل کیا۔ پس ابن منصور کے قتل کا اصل مفتی وزیر حامد بن عباس تھا۔ نہ علماء تھے، نہ فقہاء اور نہ قاضی۔ کیونکہ جس صورت سے یہ فتویٰ حاصل کیا گیا تھا، وہ ہرگز شرعی فتویٰ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسی لئے حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

”جب قلم کسی غدار کے ہاتھ میں آئے گا تو یقیناً منصور کو دار پر کھینچا جائے گا۔“ (ترجمہ)

(یہاں غدار سے مراد وزیر حامد بن عباس ہے)

آگے چل کر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رقم طراز ہیں۔ ”رہا یہ سوال کہ پھر قاضی نے وزیر کی زبردستی کیوں مانی؟ حامد بن عباس سے صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ ”حلال الدم“ کا لفظ میری زبان سے غصے میں نکل گیا تھا۔ میں نے فتویٰ کے طور پر یہ بات نہیں کہی تھی۔ پھر قاضی اور ابو عمر کے ساتھی علماء نے ایسے جبری فتوے پر دستخط کیوں کئے؟ تو اس کا جواب وہ علماء ہی دے سکتے ہیں۔

مگر جو صورت حال خطیب بغدادی وغیرہ کے بیان سے ہمارے سامنے آئی ہے، اسے دیکھ کر ہم یہ

کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ فتویٰ شریعت کا فتویٰ نہیں تھا بلکہ وزارت اور حکومت کا فتویٰ تھا جو وزیر کے اصرار اور جبر سے لکھا گیا تھا۔

مولانا ظفر احمد عثمانی نے قاضی ابوعمر اور فتوے پر دستخط کرنے والے دوسرے علماء کے بارے میں محتاط رائے کا اظہار کیا ہے اور اس پوری جماعت کو ریاستی جبر کے سامنے بے دست و پا ثابت کیا ہے۔ خطیب بغدادی کی روایت سے بس اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ حامد بن عباس قاضی ابوعمر کے سامنے بار بار قلم دوات رکھ کر کہتا تھا کہ بس یہ الفاظ کاغذ پر رقم کر دو۔ ظاہری طور پر یہ ایک زبانی اصرار ہے، ایک ہی جملے کی تکرار ہے، کوئی کھلا ہوا جبر نہیں جس کے آگے قاضی ابوعمر اور دوسرے علماء اپنی ذاتی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ ایک تنہا واقعہ نہیں تھا۔ حضرت منصور حلاجؒ پر گزشتہ نو سال سے مقدمہ چل رہا تھا۔ بلا مبالغہ وہ ہزاروں بار اسی عدالت کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ پر اس سے بھی زیادہ سنگین الزامات عائد کئے گئے تھے..... اور یہی قاضی ابوعمر تھے جو حضرت حسین بن منصورؒ کا مقدمہ سنا کرتے تھے..... اور ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیتے تھے کہ ان تمام باتوں سے حلاجؒ کے قتل کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ کون سی مجبوری تھی کہ حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب سے ایک ”الحاقی واقعے“ کو بنیاد بنا کر قاضی ابوعمر اور ان کے ہم نواؤں نے قتل منصورؒ کا شرعی حکم جاری کر دیا۔ یہ تسلیم کہ قاضی ابوعمر کی زبان سے اضطراب یا غصے کی حالت میں ایک لفظ نکل گیا تھا..... مگر وہ اس بات پر بھی قادر تھے کہ اپنے بیان کی تردید کر دیتے۔ یا پہلے کی طرح وہی جملہ دہرا دیتے کہ ابھی قتل منصور کا جواز پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پس پردہ ایسی کوئی بات ضرور تھی جس نے قاضی ابوعمر اور علماء کی جماعت کو اپنی مرضی کے خلاف فیصلے لکھنے پر مجبور کر دیا تھا..... اور وہ بات اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ حامد بن عباس نے قاضی ابوعمر اور دیگر فقہاء سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ نہیں دیا گیا تو پھر خود ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ موت کی دھمکی ہی دراصل ایک ایسی تنبیہ ہے جو انسانی ارادے کو بدل دیتی ہے اور قلم کا رخ موڑ دیتی ہے۔ اگر بالفرض حامد بن عباس نے قاضی ابوعمر اور ان کے ساتھیوں پر موت کا خوف مسلط نہیں کیا تھا تو پھر دنیا میں ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ محض قلم دوات آگے بڑھانے سے حضرت منصور حلاجؒ کی داستانِ حیات پر خطِ تینسٹخ پھیر دیا جائے..... یا پھر صاف صاف کہا جائے کہ قاضی ابوعمر اور ان کے ساتھی علماء انتہائی کمزور ارادے کے دنیا دار انسان تھے کہ حامد بن عباس کی پیشانی پر بل آیا اور ان کے قلم نے وزیر کی مرضی کے مطابق اپنے قلم کا رخ تبدیل کر لیا۔ بہر حال وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ قاضی ابوعمر اور دوسرے فقہاء پر کیا گزری تھی کہ وہ لوگ حضرت منصور حلاجؒ کی موت کا شرعی فرمان جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ پھر بھی داستان کا آخری باب پڑھتے ہوئے اتنی خلش ضرور محسوس ہوتی ہے۔

کسی کے منہ سے نہ نکلا ہمارے دُفن کے وقت
کہ ان پہ خاک نہ ڈالو، یہ ہیں نہائے ہوئے



الغرض قاضی ابوعمر اور دوسرے علماء نے قتل کے فتوے پر دستخط کر دیئے اور حضرت منصور حلاجؒ کو اسی کمرے میں بھیج دیا گیا، جہاں وہ پہلے سے قید تھے۔

اسی دوران ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے عباسی خلیفہ مقتدر باللہ اور قصر خلافت کے تمام مکینوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

مقتدر باللہ کے بیٹے ابوالعباس کے پاس ایک خوب صورت اور نایاب طوطا تھا۔ ابوالعباس اس پرندے سے بہت محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن وہ طوطا مر گیا۔ شہزادہ ابوالعباس رونے لگا۔ خدمت گاروں نے کہا کہ اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس مُردہ طوطے کو محل سے باہر پھنکوا دیجئے..... مگر ابوالعباس طوطے کو اپنے آپ سے جدا کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ خدام نے خلیفہ مقتدر باللہ کو اس واقعے کی خبر دی، خلیفہ بیٹے کے پاس آیا اور سمجھانے لگا۔

”فرزند! تم اداس نہ ہو، میں تمہارے لئے اس سے بھی زیادہ خوب صورت طوطے منگوا دوں گا۔“

شہزادہ ابوالعباس کی عمر بمشکل تین چار سال ہوگی۔ اس نے طفلانہ ضد کا مظاہرہ کیا اور باپ کے سامنے مچل گیا۔ ”مجھے یہی طوطا چاہئے۔ آپ اسے زندہ کر دیں۔“

مقتدر باللہ بیٹے کی ضد دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”بیٹے! تمہارے طوطے کو تمام انسان مل کر بھی زندہ نہیں کر سکتے۔ بس وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو اس مُردہ پرندے کے جسم میں دوبارہ روح ڈال سکتی ہے۔“

”تو پھر اللہ سے کہئے کہ وہ میرے طوطے کو زندہ کر دے۔“ شہزادہ ابوالعباس اپنی ضد پر قائم تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

خلیفہ مقتدر باللہ بہت دیر تک مختلف بہانوں سے ابوالعباس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا رہا مگر جب وہ ناکام ہو گیا تو اچانک اسے حضرت منصور حلاجؒ کا خیال آیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کے بارے میں ان کے عقیدت مندوں، مریدوں اور پرستاروں نے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے مُردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی مقتدر باللہ نے اپنے ایک خادم خاص کو قید خانے بھیجا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ شہزادہ ابوالعباس کے طوطے کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے۔

حضرت منصور حلاجؒ خلیفہ مقتدر باللہ کے خادم کی بات بہت غور سے سنتے رہے۔ پھر کوئی جواب دیئے بغیر کمرے کے ایک گوشے میں چلے گئے اور پیشاب کرنے لگے۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر خادم کے پاس آئے اور فرمانے لگے۔

”جو شخص اپنے جسم میں اتنی غلاظت لئے پھرتا ہو، وہ کسی مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا۔“ حضرت منصور حلاجؒ کا مفہوم یہ تھا کہ انسان خود اللہ کا محتاج ہے، اس لئے وہ کسی بے جان جسم میں دوبارہ روح داخل نہیں کر سکتا۔

خادم چپ چاپ کھڑا رہا۔ حضرت منصور حلاجؒ نے مختصر سے سکوت کے بعد فرمایا۔ ”تم نے جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے من و عن خلیفہ کے سامنے دہرا دینا۔“

مقتدر با اللہ کا خادم واپس جانے لگا تو حضرت منصور حلاجؒ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے لئے ایک ایسا بھی ہے جسے میں ادنیٰ اشارہ کر دوں تو وہ پرندے کو اصلی حالت
میں لوٹا دے گا۔“

(علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اشارہ حق تعالیٰ کی
طرف تھا جو اپنے خاص بندوں کی دعا قبول فرماتے ہیں۔ حضرت حسین بن منصورؒ کو حق تعالیٰ کے ساتھ
اپنے معاملات کا علم تھا، اس لئے پورا یقین تھا کہ ان کی دعا قبول ہوگی..... اور یہی بات انہوں نے
اشارتاً خلیفہ مقتدر با اللہ کے خادم سے کہہ دی تھی)

مختصر یہ کہ خادم نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، خلیفہ کے روبرو بیان کر دیا۔ مقتدر با اللہ نے پورا واقعہ بہت
غور سے سنا اور پھر اپنے خادم سے کہا۔

”اس مُردہ طوطے کو حلاج کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ مقصد تو پرندے کا زندہ ہونا ہے۔ وہ
جسے چاہیں اشارہ کر دیں۔“

خادم دوبارہ قید خانے پہنچا اور حضرت منصور حلاجؒ کے سامنے مقتدر با اللہ کی خواہش کا اظہار کر دیا۔
”لا! پرندے کو میرے حوالے کر۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میں اُس سے درخواست کرتا
ہوں کہ اس طوطے کو زندہ کر دے۔“

خلیفہ مقتدر با اللہ کے خادم نے مُردہ طوطا حضرت منصور حلاجؒ کے سپرد کر دیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ
نے ایک نظر بے جان پرندے کو دیکھا پھر اپنے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اسے آستین میں چھپالیا۔
خادم بہت حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

حضرت منصور حلاجؒ زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔ پھر آستین اٹھائی تو مُردہ طوطا زندہ ہو چکا تھا۔
خادم کا چہرہ متغیر تھا اور آنکھیں حیرت سے بھٹی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اسی حالت میں زندہ طوطا لے کر
خلیفہ مقتدر با اللہ کے پاس پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا قصر حضرت منصور حلاجؒ کی اس کرامت کے شور
سے گونج اٹھا۔

مقتدر با اللہ نے اسی وقت حامد بن عباس کو تنہائی میں طلب کر کے کہا۔
”تُو نے جس شخص کو قید خانے میں ڈال رکھا ہے، آج اس نے شہزادہ ابوالعباس کے مُردہ طوطے کو زندہ
کر دیا۔“

یہ سن کر حامد بن عباس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پہلے تو ابن قشوری اور شاہی بیگمات ہی حلاج کے
زیر اثر تھیں، اب خلیفہ بھی حسین بن منصورؒ کے روحانی کمالات کا قائل ہو گیا تھا۔ حامد بن عباس کو اپنی
بچائی ہوئی بساط اُلٹی نظر آئی تو وہ خوشامدانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”امیر المؤمنین! اس شخص کو قتل کر دینا ہی مناسب ہے..... ورنہ لوگ اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ
جائیں گے۔“

حامد بن عباس لہجہ بدل بدل کر، بہت دیر تک مقتدر با اللہ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر عباسی خلیفہ

نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل میں سکوت اور توقف سے کام لیا۔
عرب بن سعد قرطبی کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ طوطے کو زندہ کرنے کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت منصور حلاجؒ کا مقدمہ زیر سماعت تھا اور قاضی ابو عمر نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر نہیں کیا تھا۔



اگرچہ شرعی عدالت کی طرف سے حضرت منصور حلاجؒ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن ابھی خلیفہ مقتدر باللہ کے سامنے مذکورہ فتویٰ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ حامد بن عباس جانتا تھا کہ خلیفہ بھی حلاجؒ کے زیر اثر ہے، اس لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران قید خانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے حامد بن عباس کے ہوش اڑا دیئے۔

ایک رات حضرت حسین بن منصورؒ اپنے کمرے سے نکلے اور زنداں کے اس گوشے کی طرف چلے گئے جہاں تین سو آدمی تھے۔ واضح رہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کو ایک علیحدہ کمرے میں قید کیا گیا تھا جس کے دروازے پر ہمیشہ ایک بھاری تالا پڑا رہتا تھا۔ اس وقت بھی دروازہ مقفل تھا مگر حضرت حسین بن منصورؒ کمرے سے نکل گئے۔ ان کے کمزور پیروں میں تیرہ بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے قیدیوں نے بیڑیوں کی آواز سنی تو چونک کر دیکھا۔ حضرت منصور حلاجؒ ان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر قیدی نے اپنی جگہ حیرت سے سوچا کہ اتنی بندشوں کے باوجود منصورؒ یہاں کیسے آگئے؟
”کیا تم اس قید سے آزاد ہونا چاہتے ہو؟“ حضرت منصور حلاجؒ نے قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

تمام اسیروں نے شدید استعجاب کے عالم میں اس شخص کی طرف دیکھا جو خود پابہ زنجیر تھا مگر دوسرے قیدیوں سے ان کی رہائی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔
”دیکھو! میری اس پیشکش سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے قیدیوں کو ورطہ حیرت میں غرق دیکھ کر فرمایا۔
”ہم تو آزاد ہونا چاہتے ہیں مگر تم ہمیں اس قید سے کس طرح رہائی دلاؤ گے؟“ ایک قیدی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم صرف اپنی خواہش بیان کرو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔
”تم تو خود ہی ہماری طرح قید میں ہو۔ پہلے اپنے آپ کو تو آزاد کرا لو۔“ دوسرے قیدی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”میں اللہ کی قید میں ہوں اور شریعت کا پاس کرتا ہوں۔ اس لئے خود کو رہا نہیں کر سکتا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

قیدی ایک مرد خدا کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ ان لوگوں کو متعجب پا کر دوبارہ گویا ہوئے۔ ”اگر میں چاہوں تو ایک اشارے سے تم سب کی بیڑیاں کھول دوں۔“

یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے تمام اسیرانِ زنداں کی بیڑیاں ان کے پیروں سے الگ ہو گئیں۔

قیدیوں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے سے عالم میں رہے۔ پھر ان کے حواس بحال ہوئے تو کہنے لگے۔ ”بے شک ہمارے جسم زنجیروں کے بوجھ سے آزاد ہیں مگر ہم باہر کیسے جائیں کہ قید خانے کا دروازہ بند ہے؟“

”میں حصارِ زنداں میں تمہارے لئے دوسرا دروازہ بنائے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت منصور حلاجؒ نے اشارہ کیا اور دیوارِ شق ہو گئی۔ ”بس اب تم لوگ چلے جاؤ۔ کوئی چیز تمہارے راستے میں حائل نہیں ہے۔“

قیدی دم بخود بھی تھے اور حضرت منصور حلاجؒ کے شکر گزار بھی۔ ”آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟“ اسیروں نے اس شخص سے درخواست کی جس کے اپنے پیروں میں بیڑیاں موجود تھیں مگر وہ دوسروں کی آزادی کے لئے راستہ ہموار کر چکا تھا۔

”میں تمہارا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ”کیوں؟“ تین سو قیدیوں کا قافلہ جو کچھ دیر بعد کھلی فضاؤں میں قدم رکھنے والا تھا، اپنے نجات دہندہ کا انکار سن کر اُداس ہو گیا۔

”یہ ایک راز ہے جسے تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ”جلدی کرو اور اس مہلت کو غنیمت جانو۔“

قیدی ایک ایک کر کے دیوار میں نمایاں ہونے والے شکاف سے گزرنے لگے۔ اسیروں نے اس راز کو جاننے کی کوشش کی تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”ہمارا اللہ کے ساتھ ایک راز ہے جسے سولی پر چڑھے بغیر فاش نہیں کیا جاسکتا۔“

بے چارے قیدی کیا سمجھتے کہ منصور حلاجؒ کون ہیں اور وہ راز کیا ہے جو فرازِ دار سے گزرے بغیر کہا نہیں جاسکتا۔

جب تمام قیدی حصارِ زنداں سے نکل گئے تو حضرت حسین بن منصورؒ اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ دوسرے دن صبح کو قید خانے کا محافظ آیا تو یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا کہ وہاں ایک بھی قیدی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں پر برسنے لگا..... مگر ماتحت کیا جواب دیتے۔ دروازوں پر قفل موجود تھے۔ انہیں زمین کھا گئی یا پھر وہ فضا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ زنداں کے محافظ نے زیادہ ہنگامہ آرائی کی تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”ان مجبوروں پر کیوں بگڑتے ہو؟ وہ بے چارے بے تصور ہیں۔“

”پھر قصور وار کون ہے؟“ داروغہ زنداں نے اس قیدی سے پوچھا جو حکومتِ وقت کا معتبوب تھا۔

”ہم نے ان قیدیوں کو آزاد کر دیا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

قید خانے کا محافظ خوف زدہ ہو گیا۔ کچھ دن پہلے اسی طرح حضرت منصور حلاجؒ کا ایک مرید بھی

زنداں میں داخل ہوا تھا اور اپنے مرشد سے ملاقات کر کے واپس چلا گیا تھا۔
 ”جب ان قیدیوں کو آزاد کر دیا تو خود یہاں کیوں رہ گئے؟“ داروغہ زنداں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”مجھ پر حق تعالیٰ کا عتاب ہے اور میں اس وقت تک نہیں جاسکتا جب تک عتاب پورا نہ ہو جائے۔“
 حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”محبوب کے عتاب سے بھاگنا عشق کے خلاف ہے۔“
 مشہور فارسی شاعر نے حضرت منصور حلاجؒ کے عشق کی اس کیفیت کو اپنے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

نو شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
 سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
 (یہ دشمن کا نصیب کہاں کہ وہ تیری شمشیر سے ہلاک ہو جائے۔ تیری خنجر آزمائی کے لئے تو تیرے دوستوں ہی کا سر سلامت ہے)



اسی انداز کا ایک واقعہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو عبد اللہ خفیفؒ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ حضرت شیخؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپؒ اپنے زمانے میں شریعت اور طریقت کے امام تھے۔ نامور صوفی حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے بقول حضرت ابو عبد اللہ خفیفؒ یکتائے روزگار صوفی تھے۔ آپؒ کے بعد فارس میں ایسا کوئی دوسرا شیخ پیدا نہیں ہوا۔ حضرت عبد اللہ خفیفؒ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا مگر آپؒ بیس سال تک ٹاٹ کا لباس استعمال کرتے رہے۔ آپؒ نے بہت سے مشائخ سے فیض روحانی حاصل کیا۔ حضرت عبد اللہ خفیفؒ کا معمول تھا کہ ایک رکعت میں دس ہزار مرتبہ سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور پورے سال میں چار چلے کھینچا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؒ کا انتقال بھی چلے کے دوران ہی ہوا تھا۔ آپؒ کو ”خفیف“ کا خطاب اس لئے دیا گیا کہ افطار میں سات منقوں کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک بار ضعف و نقاہت کی وجہ سے آپؒ کے خادم نے سات کی بجائے آٹھ منقے پیش کر دیئے۔ حضرت عبد اللہ خفیفؒ نے شمار کئے بغیر آٹھوں منقشے کھالئے مگر اس رات آپؒ کو عبادت میں وہ کیف حاصل نہیں ہوا جو اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ جب آپؒ کو صحیح واقعے کا علم ہوا تو اس خادم کو برطرف کر کے دوسرا خادم رکھ لیا۔

حضرت عبد اللہ خفیفؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت منصور حلاجؒ سے ملاقات کے لئے قید خانے پہنچا۔ نماز کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے کھڑے ہوتے ہی ساری بیڑیاں خود بخود کھل کر گر پڑیں۔ حلاجؒ نے قید خانے کے کنارے پر وضو کیا۔ اگلے حصے میں ایک رومال لٹکا ہوا تھا جو حسین بن منصورؒ سے بہت دور تھا۔ خدا کی قسم! میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ رومال خود ان کے پاس آ گیا یا وہ رومال کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ رومال ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں وضو کیا تھا۔ ابھی میں حیرت میں مبتلا تھا کہ اچانک حسین بن منصورؒ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ انہیں روتا دیکھ کر میں ان کے قریب پہنچا اور کہنے لگا۔

”حسین! تم اپنے آپ کو اس قید سے رہا کیوں نہیں کرا لیتے؟“
(حضرت عبداللہ بن خنیفؓ کا مطلب یہ تھا کہ جس بات کی وجہ سے قید کئے گئے ہو، اس سے رجوع کرلو، آزاد کر دیئے جاؤ گے)

میری بات سن کر حسین بن منصورؓ نے فرمایا۔ ”ابو عبداللہ! میں قید نہیں ہوں اور نہ قید کی تکلیف سے رو رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہ کہاں جانا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میری خواہش ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے نیشاپور ہو آؤں۔“

حسین بن منصورؓ نے فرمایا۔ ”ابو عبداللہ! اپنی آنکھیں بند کرلو۔“

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھ سے کہا گیا۔ ”ابو عبداللہ! آنکھیں کھول دو۔“
میں نے حسین بن منصورؓ کے کہنے پر آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو نیشاپور کے اسی محلے میں پایا جہاں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ حالانکہ میں نے انہیں محلے کا نام نہیں بتایا تھا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ حسین بن منصورؓ نے پوچھا۔ وہ نیشاپور میں میرے ساتھ موجود تھے۔

میں نے کہا۔ ”مجھے اسی جگہ پہنچا دیں جہاں سے آیا تھا۔“

حسین بن منصورؓ نے دوبارہ آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اسی

قید خانے میں تھا۔

مجھے حیران دیکھ کر حسین بن منصورؓ نے فرمایا۔

”خدا کی قسم! اگر عشاق اس بات پر قسم کھائیں کہ وہ عشق کی وجہ سے مردہ یا مقتول ہیں تو وہ اپنی قسم کو توڑنے والے نہیں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وصال کے بعد ہجر میں مبتلا ہوں تو مر جاتے ہیں.....
اور اس کے بعد وصال سے کامیاب ہو جائیں تو جی اٹھتے ہیں۔ تم عشاق کو منزل محبوب میں پھٹرا ہوا دیکھو
گے جیسے ”اصحابِ کہف“ پھٹڑے ہوئے پڑے تھے کہ ان کو بیداری کے بعد یہ بھی خبر نہیں تھی کہ کتنی مدت
تک سوتے رہے؟“

یہ ہے حضرت منصورؓ حلاجؒ کے بارے میں اس عظیم صوفی کا بیان جس کے علم و فضل اور روحانی عظمت پر اس دور کے تمام مشائخ اور علماء متفق تھے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت منصورؓ حلاجؒ تقریباً نو سال تک وزیر حامد بن عباس کی قید میں رہے۔ اسیری کے دوران حضرت منصورؓ حلاجؒ کا ایک مرید اپنے مرشد سے ملاقات کرنے کے لئے اس طرح قید خانے میں پہنچا کہ درِ زنداں بند تھا اور چاروں طرف سخت پہرے موجود تھے۔ یہ حضرت حسین بن منصورؓ کی بڑی کرامت تھی جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کو ہزار پابندیوں سے گزار کر اپنے آپ تک بلا سکتے ہیں تو خود بھی قید خانے سے باہر جانے کی طاقت رکھتے تھے۔

دوسری بار تین سو قیدیوں کو رہا کر دیا اور زنداں کے محافظان کو اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ جسے
بحکم خدا اسیروں کی اتنی بڑی تعداد کو رہائی دلانے پر قدرت حاصل ہو، وہ خود حکومت کی بنائی ہوئی
چار دیواریں میں کس طرح مقید رہ سکتا تھا؟

ان تمام واقعات سے بڑھ کر حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیفؒ کی گواہی موجود ہے کہ ان جیسے بزرگ کو حضرت منصور حلاجؒ نے چشم زدن میں نیشا پور پہنچا دیا تھا اور اسی طرح دوبارہ قید خانے میں واپس لے آئے تھے۔ ان تمام روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کے لئے حامد بن عباس کی قائم کردہ قید و بند کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ جب چاہتے حصار زنداں سے چلے جاتے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔ عام ذہنوں میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ پھر حضرت منصور حلاجؒ قید خانے سے چلے کیوں نہیں گئے؟ اور طویل عرصے تک یہ مظالم کیوں برداشت کرتے رہے؟

اس سوال کا جواب زنداں کے محافظ کو اس طرح دیا گیا۔ ”ہم اللہ کے قیدی ہیں اور اپنے محبوب کے زیر عتاب ہیں۔ جب تک وہ عتاب پورا نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہم کہیں نہیں جاسکتے..... کیونکہ محبوب کے عتاب سے بھاگنا محبت اور عاشقی کے خلاف ہے۔“

ایک موقع پر فرمایا تھا۔ ”ہمارے اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے جو سولی پر چڑھے بغیر نہیں کہا جاسکتا۔“ ایک بار جب حضرت ابو عبد اللہ بن خفیفؒ نے پوچھا تھا کہ آپ خود کو آزاد کیوں نہیں کرا لیتے، تو فرمایا تھا کہ ہم قید کب ہیں؟ اور پھر دوسرے ہی لمحے حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے دعوے کا ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔

ان تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعد پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ عام صوفی نہیں تھے جو اپنی روحانی طاقت کے ذریعے حصار زنداں سے نکل کر کہیں دور چلے جاتے۔ وہ ایک بہت ہی خاص قیدی تھے..... اور بہت ہی خاص مسئلے پر قید ہوئے تھے۔ ہنگامہ دار برپا ہونا ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ مشیت الہی سے کس طرح گریز اختیار کرتے؟ اور قدرت کی کھینچی ہوئی چار دیواری سے نکل کر کہاں جاتے؟ حضرت منصور حلاجؒ کو معلوم تھا کہ ایک دن وہ اپنے ہی خون میں نہائیں گے تو امر الہی سے بچنے کی تدبیر کیوں نہیں کرتے اور حکام کے سامنے معذرت اپنی زبان پر کیوں نہیں لاتے؟ وہ اپنے عشق میں سچے تھے، اس لئے پوری توانائی کے ساتھ عشق کے مرحلے طے کرتے رہے۔ مخالفین کا کام الزام عائد کرنا تھا..... اور حضرت منصور حلاجؒ کا کام اپنے کام سے کام رکھنا۔ شرعی عدالت سوال کرتی رہی اور حضرت حسین بن منصور صاف صاف جواب دیتے رہے کہ وہ نہ خدا ہیں نہ مہدی ہونے کے دعویدار۔ وہ صرف ایک عاجز اور گناہ گار بندے ہیں..... اور اللہ کی وحدانیت، خاتم النبیین سرور کونین ﷺ کی رسالت اور خدا کے اصحاب عشرہ مبشرہ کی فضیلت کے قائل ہیں۔ (عشرہ مبشرہ ان دس صحابہ کرامؓ کو کہا جاتا ہے جنہیں ان کی زندگی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی۔)

الغرض حضرت منصور حلاجؒ نے اپنی صفائی پیش کر دی اور علمائے بغداد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کہتے رہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں مگر فقہاء کی مہر سے اعلان کرتی رہیں کہ یہ شخص واجب القتل ہے۔



قتل کے فتوے پر قاضی ابو عمر اور دیگر علماء کے دستخط ہو جانے کے بعد حامد بن عباس موقع کی تلاش

میں رہا۔ وہ نہایت عیار انسان تھا۔ اس نے براہ راست خلیفہ مقتدر باللہ کو یہ خبر نہیں دی کہ اس کی 9 سالہ کوششیں بار آور ثابت ہوئیں بلکہ دستخط شدہ کاغذ اپنے ایک درباری مصاحب زنجی کے حوالے کر دیا۔
 ”اسے امیر المومنین کی خدمت میں اس طرح پیش کرنا کہ تاخیر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔“ حامد بن عباس نے زنجی کو ہدایت کی۔ ”جب تک علاج قتل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک میں چین سے سو نہیں سکوں گا۔“

”آپ مطمئن رہیں۔“ زنجی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”مملکت کا ضروری سے ضروری معاملہ بھی التواء میں ڈال دیا جائے گا۔ امیر المومنین پوری شدت کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کریں گے کہ حکومت کے سامنے قتل منصور کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہیں ہے۔“

بظاہر حامد بن عباس، زنجی کی جرب زبانی سے مطمئن ہو گیا تھا مگر حقیقتاً وہ بہت مضطرب تھا۔ اسے ہر وقت ایک ہی فکر بے قرار رکھتی تھی کہ کہیں علاج اپنی شعبہ بازی اور جادوگری سے کام لے کر قید خانے سے فرار نہ ہو جائیں..... اور اس کی تمام محنت اکارت چلی جائے۔ (واضح رہے کہ حامد بن عباس، حضرت حسین بن منصور کی گرفتاری اور پھر ان کے قتل کو اپنا ایک عظیم الشان کارنامہ سمجھتا تھا)

زنجی نے دوسرے ہی دن خلیفہ مقتدر باللہ کے نام دو خط تحریر کئے اور ان خطوط کے درمیان حضرت منصور کے قتل کا فتویٰ رکھ کر وہ لقاؤ امیر المومنین کی خدمت میں بھیج دیا۔ پھر اس نے حامد بن عباس کی خلوت میں پہنچ کر یہ خوشخبری سنائی۔

”میں نے امیر المومنین کو معاملے کی نزاکت اور شدت سے باخبر کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شام تک آپ کی مرضی کے مطابق جواب آجائے گا۔“

حامد بن عباس، زنجی کی اس اطلاع سے بہت خوش ہوا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

پھر جب دو دن تک خلیفہ مقتدر باللہ کی طرف سے زنجی کی عرض داشت کا کوئی جواب نہیں آیا تو حامد بن عباس کے ہوش اڑ گئے۔ ایک رات تو اس نے اس طرح گزاری کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ جاتی تھی اور پھر وہ گھبرا کر اٹھ جاتا تھا..... مگر دوسری رات تو حامد بن عباس کی وحشت کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں تک نہ جھپک سکیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کی آخری رات ہو اور صبح ہوتے ہی حضرت منصور علاج کی جگہ خود اسے دار پر کھینچ دیا جائے گا۔

حامد بن عباس کی بدحواسی کے دو بنیادی اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اگر خلیفہ مقتدر باللہ فتوے کی توثیق نہ کرتا تو حکومتی سطح پر اس کی ساری عزت خاک میں مل کر رہ جاتی۔ وہ جس کھیل کا آغاز کر چکا تھا، اسے انجام تک پہنچانا ضروری تھا..... ورنہ وہ خلافت کا نہیں، علمائے وقت اور معززین شہر کا بھی معتبوب بن جاتا۔ اس لئے قتل منصور بھی حامد بن عباس کے اقتدار کا ضامن تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ مجلس علماء کے فیصلے کی خبر اڑتے اڑتے عوام تک پہنچ گئی تھی اور اہل بغداد کی بڑی تعداد حامد بن عباس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اسے اپنی

جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے حضرت منصور حلاجؒ کی فوری موت ہی میں حامد بن عباس کی بھارتھی۔ مگر جب خلیفہ مقتدر بالله کی طرف سے دو دن تک کوئی جواب نہیں آیا تو وہ زنجی پر برہم ہو گیا۔ ”یہ تو نے امیر المومنین کو کیسا خط لکھا ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے مسئلے پر غور کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔“ ”میں نے معاملے کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لئے بہترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔“ حامد بن عباس کو غضب ناک پا کر زنجی بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”اب میں کیا کروں کہ امیر المومنین نے میری دونوں درخواستوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔“

حامد بن عباس کچھ دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر زنجی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”جس طرح میں کہتا ہوں۔ اس طرح تحریر کر!“

زنجی اپنی جان چھڑانے کے لئے اسی وقت کاغذ اور قلم لے کر تیار ہو گیا۔ پھر حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر بالله کے نام ایک اور خط لکھا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔ ”امیر المومنین! میں نے ایک ہی خواہ کی حیثیت سے خدمت عالیہ میں عرض کر دیا تھا کہ منصور حلاجؒ کا معاملہ عام نوعیت کا نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، صورت حال انتہائی نازک ہوتی جا رہی ہے۔ علماء کی مجلس میں حلاجؒ کے متعلق جو کچھ طے کیا گیا ہے، بغداد کے عوام اس سے باخبر ہو چکے ہیں۔ اب اگر حلاجؒ کو قتل نہیں کیا گیا تو لوگ بہت بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے..... اور پھر اس سے اختلاف کرنے والے دو آدمی بھی باقی نہیں رہیں گے۔“ اس بات سے حامد بن عباس کا مطلب یہ تھا کہ پورا بغداد حضرت حسین بن منصور کا ہم نوا ہو جائے گا۔ پھر حکومت اس حیثیت میں نہیں رہے گی کہ آسانی کے ساتھ اپنے احکام پر عمل کرا سکے..... اور اگر بالفرض جبر سے کام لیا گیا تو عوام سلطنت عباسیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

عیاروں اور سازشیوں کا ہمیشہ ایک ہی طریقہ رہا ہے کہ جب وہ کسی مقبول ہستی کو معتبوب بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہی کہہ کر حکمران کے کان بھرتے ہیں کہ فلاں شخص کی موجودگی سے حاکم کے اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ چنانچہ حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں اسی حکمت عملی سے کام لیا۔ اگر کوئی عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا تو وہ حامد بن عباس ہوتا..... مقتدر بالله کو رعایا کی نفرت کا سامنا نہیں تھا..... مگر حامد بن عباس نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ عباسی خلیفہ مجبور ہو گیا۔

حامد بن عباس کی عیاری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے زنجی کو آلہ کار بنایا۔ اگر وہ چاہتا تو خود بھی مقتدر بالله کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بیان کر سکتا تھا..... مگر حامد بن عباس فطرتاً ایک شاطر انسان تھا۔ مقتدر بالله کو لکھے جانے والے آخری خط میں الفاظ اس کے تھے لیکن قلم ایک دوسرے درباری کا۔ جھوٹا افسانہ حامد بن عباس کا تراشا ہوا تھا مگر تحریر زنجی کی تھی۔ ایک اسی واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں کیسی کیسی چالیں چل رہا تھا۔

پھر اس کے شاطرانہ ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ زنجی سے خط تحریر کرایا اور ایک دوسرے درباری ^{مطلع} کو قاصد بنایا۔ شاید اسے زنجی پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ الغرض ^{مطلع} فوری طور پر وہ خط لے کر مقتدر بالله کی

خدمت میں حاضر ہوا۔

عباسی خلیفہ نے خط ایک طرف رکھ دیا اور دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔
حامد بن عباس نے مفتح کو سختی سے تاکید کی تھی کہ امیر المومنین اپنی عدم الفرستی کا کوئی بھی مظاہرہ کریں، اسے ہر حال میں خط کا جواب چاہئے۔ مفتح نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انتہائی پرجوش انداز میں صورت حال کی عکاسی کی اور بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا۔ نتیجتاً مقتدر باللہ نے زنجی کا تحریر کردہ خط پڑھا اور اسی وقت حکم جاری کر دیا۔ حکم نامے کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

”جب قاضی القضاۃ اور علمائے ہند نے حلاج کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے تو پھر اسے محمد بن عبدالصمد کو توال کے حوالے کر دیا جائے۔ کو توال کی نگرانی میں حلاج کے ایک ہزار تازیانے لگائے جائیں۔ اگر وہ اس سزا کے نتیجے میں مر جائے تو بہتر ہے ورنہ گردن ماردی جائے۔“

حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں جہاں دوسرے لوگوں نے اذیت ناک مذاق کئے ہیں وہاں تاریخ نویسوں نے بھی قتل منصورؒ کو ایک تکلیف دہ افسانہ بنا دیا ہے۔ مقتدر باللہ کے حکم کی تشریح کرتے ہوئے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ نے حضرت منصورؒ کے بارے میں توقف اختیار کیا تھا اور سارا بوجھ قاضی ابوعمر اور دیگر علمائے بغداد پر ڈال دیا تھا۔ چلئے! ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ مقتدر باللہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ منصور حلاجؒ قتل کئے جائیں۔ وہ شرعی عدالت کے بارگراں سے جھک گیا تھا، اس لئے اس نے حضرت منصورؒ کی موت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی..... مگر ذرا مقتدر باللہ کا حکم تو ملاحظہ کیجئے کہ پہلے حلاجؒ کو ایک ہزار تازیانے مارے جائیں..... اور اگر وہ اس سزا کو برداشت کر جائے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ واقعاً اگر مقتدر باللہ، حضرت منصور حلاجؒ کے لئے اپنے دل میں برائے نام بھی نرم گوشہ رکھتا ہوتا تو براہ راست انہیں قتل کر دینے کا حکم جاری کرتا۔ یہ ایک ہزار تازیانوں کی سزا کس حساب میں تھی؟ کیا اس زمانے میں تازیانے گلاب کے پھولوں سے بنائے جاتے تھے؟ بات بالکل واضح ہے کہ مقتدر باللہ بھی حضرت منصور حلاجؒ سے ناراض تھا..... اور اپنی اسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے اس نے ایک ہزار کوڑوں کی سزا تجویز کی تھی تاکہ حضرت حسین بن منصورؒ کو شدید اذیتیں دے دے کر اور تڑپا تڑپا کر مارا جائے۔ اگر بالفرض ایسا نہیں تھا تو ہمارے مؤرخین نے بیشتر واقعات تحریر کرتے وقت غلط بیانیوں اور قیاس آرائیوں سے کام لیا ہے۔

پھر جب حامد بن عباس نے خلیفہ مقتدر باللہ کا حکم نامہ دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ 9 سال تک اس نے جس چچ و تاب کے ساتھ اپنے دن گزارے تھے، آج دربار خلافت سے اس خلش اور اضطراب کا صلہ مل گیا تھا۔ حامد بن عباس کو سر منصورؒ کی ضرورت تھی اور مقتدر باللہ کی مہر اختیار نے اسے حلاجؒ کے سلسلے میں مکمل طور پر با اختیار بنا دیا تھا۔



اس سے پہلے کہ ہم ایک صوفی جانباز اور ایک عاشق جاں سوختہ کی داستانِ حیات کا آخری باب رقم کریں، ضروری ہے کہ ایک اور تاریخی روایت بھی پیش کر دیں جس سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ

اس مقدمے میں کس قدر جھوٹی گواہیاں پیش کی گئی ہیں اور مورخین نے ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو زندیق، کافر اور خدائی دعوے دار ثابت کرنے کے لئے کیسی مہمل روایات کا انبار لگایا ہے۔

پاکستان کے ایک مشہور اشاعتی ادارے نے 1981ء میں ایک کتاب ”حسین بن منصور حلاج“ شائع کی تھی۔ مذکورہ کتاب میں ایک مضمون ”منصور حلاج“ کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جس کے مصنف مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ ہیں اور مترجم خواجہ عبدالحمید یزدانی۔ اسی کتاب کے صفحہ 12 پر یہ عبارت درج ہے جسے ہم حرف بہ حرف نقل کر رہے ہیں۔

”بغداد میں منصور حلاجؒ نے جنیدؒ کی قربت و صحبت اختیار کی۔ جنیدؒ نے اسے خلوت اور سکوت کی تلقین فرمائی۔ کچھ عرصے تک اس کی صحبت میں صبر اختیار کئے رکھا اور آخر وہاں سے حجاز جا پہنچا جہاں ایک برس تک مجاور رہا۔ یہاں سے دوبارہ بغداد آیا اور چند صوفی حضرات کے ساتھ جنیدؒ کی خدمت میں پہنچا۔ ان سے کچھ مسائل پوچھے۔ جنیدؒ نے جواب نہ دیا۔ بس اتنا کہا۔

”جلد ہی لکڑی کے ٹکڑے کو سرخ کر دو گے۔“ (اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت جلد قتل کئے جاؤ گے) تمام معتبر تاریخوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے شاگرد منصور حلاجؒ کا سوال سن کر سکوت اختیار کیا تھا۔ پھر جب حاضرین نے حضرت جنید بغدادیؒ سے خاموشی کا سبب پوچھا تو آپؒ نے فرمایا کہ منصورؒ اس مسئلے میں سائل نہیں، مدعی بن کر آئے تھے۔ کسی مستند تاریخ میں یہ بات درج نہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت حسین بن منصورؒ کے قتل کی پیش گوئی کی تھی۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ تک یہ روایت کس طرح پہنچی؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ جس طرح حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب میں کسی فتنہ گرنے جج کا مضمون اپنی طرف سے شامل کر دیا تھا اور پھر وہی مضمون نقل کرنے پر حضرت منصورؒ کے قتل کا فتویٰ دیا گیا تھا..... اسی طرح حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے مضمون میں بھی اضافہ کیا گیا ہو گا تا کہ حضرت منصور حلاجؒ کی داستانِ حیات میں زیادہ سے زیادہ رنگ آمیزی کی جاسکے۔

اس مضمون کی باقی عبارت حسب ذیل ہے:

جواب میں منصورؒ نے کہا۔ ”جس روز میں سرچوب پارہ (لکڑی کا ٹکڑا) سرخ کروں گا، اس روز تو اہل طاہر کا لباس پہنے گا۔“ چنانچہ جس دن آئمہ نے فتویٰ دیا کہ حسین کو قتل کر دینا چاہئے، جنیدؒ اس دن جلمہ تصوف پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے فتویٰ نہ لکھا۔ جبکہ خلیفہ کا فرمان یہ تھا کہ تحریر جنیدؒ کی ہو۔ نتیجتاً جنیدؒ نے دستار اور جبہ پہنا اور مدر سے پہنچے۔ جہاں انہوں نے فتویٰ لکھا۔

”طاہری حال کے مطابق وہ گردن زنی ہے اور فتویٰ طاہر پر ہے۔ باطن کا حال اللہ جانے۔“

اس سے قطع نظر کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کی پیش گوئی کی تھی یا نہیں، یہ بات تاریخ کے ایک معمولی طالب علم کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ اپنے قلم سے تحریر کیا تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ کے قتل کا فتویٰ 310ھ میں دیا گیا تھا اور حضرت جنید بغدادیؒ 297ھ میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ پہلی بار

301ھ میں قید ہوئے۔ اس وقت بھی حضرت جنیدؒ اس عالم فانی میں موجود نہیں تھے۔ حضرت منصور حلاجؒ کی شہادت کا واقعہ آپؒ کے وصال کے 13 برس بعد پیش آیا۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کو مغالطہ ہوا اور انہوں نے اپنے مضمون میں ایک ایسی روایت نقل کر دی جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا..... حضرت شیخ عطارؒ ایک عالم و فاضل صوفی تھے۔ اس لئے ان سے اس قسم کی غلطی کا سرزد ہونا امر محال ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ حضرت شیخ عطارؒ کے مضمون میں اضافہ کر دیا گیا تھا تاکہ ایک طرف عام مسلمانوں کے ذہن الجھ جائیں اور دوسری طرف حضرت جنید بغدادیؒ جیسے امام شریعت و طریقت کو بھی قتل منصورؒ کے الم ناک واقعے میں ملوث کر دیا جائے۔ جب فتنہ پردازوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی، بہت سی احادیث گھڑ لیں تو پھر ایک بزرگ کے مضمون میں آمیزش کر دینا کون سی مشکل بات ہے؟

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی تالیف ”سیرت منصور حلاجؒ“ میں ایک مقام پر یہ واقعہ درج کیا ہے۔ ”علامہ عبدالوہاب شیرانی اپنی کتابوں میں جا بجا لکھتے ہیں کہ لوگوں نے میری زندگی میں میری کتابوں کے اندر الحاق کر دیا تھا جس کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب علماء نے میرے خلاف فتوے لکھے، اس وقت مجھے خبر ہو گئی۔ پھر میں نے اپنا اصلی نسخہ ان کے پاس بھیجا تو فتنہ فرو ہوا۔“

جب ایک عالم کی زندگی میں مفسدین کی شرارت کا یہ عالم ہو تو پھر حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ ان لوگوں کی فتنہ پرداز یوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں جنہیں اس دنیا سے گزرے ہوئے تقریباً آٹھ سو سال ہو چکے ہیں۔ میرے پاس حضرت شیخ عطارؒ کی مشہور تصنیف ”تذکرۃ الاولیاء“ کا وہ نسخہ موجود ہے جو جنوری 1973ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اسے مولانا زبیر افضل عثمانیؒ نے مرتب کیا ہے۔ میں نے حضرت منصور حلاجؒ کے سلسلے میں تحریر کردہ مضمون کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالا مگر اس نسخے میں قتل منصورؒ سے متعلق حضرت جنید بغدادیؒ کی پیش گوئی اور فتویٰ لکھنے کا واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اب ان حالات میں اللہ ہی علیم وخبیر ہے کہ کس نے جھوٹ بولا ہے اور کون سچا ہے؟ اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔



کو تو ال محمد بن عبد الصمد اپنے سپاہیوں کے ہمراہ بہت احتیاط کے ساتھ زنداں پہنچا۔ پھر اس غلام کو اپنے پاس بلایا جو حضرت منصور حلاجؒ کی نگرانی پر مقرر تھا۔

”امیر المومنین کا حکم ہے کہ حلاج کو قید خانے سے باہر لا کر میرے حوالے کر دے۔“ محمد بن عبد الصمد نے حکم آمیز لہجے میں غلام سے کہا۔

”اب انہیں کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہے؟“ غلام نے کو تو ال شہر سے پوچھا۔

”اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔“ محمد بن عبد الصمد نے کہا۔ ”کل صبح ہوتے ہی حلاجؒ کو پھانسی دے دی جائے۔“

غلام واپس جانے لگا تو کو تو ال نے اسے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ ”خبردار! حلاجؒ کو اس کی خبر نہ ہو۔“

غلام نے سہمے ہوئے انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور واپس چلا گیا۔ پھر اُس نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں حضرت منصور حلاجؒ قید تھے۔ یہ دروازہ کھلنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے حضرت حسین بن منصورؒ نے قدرے تعجب سے اس غلام کی طرف دیکھا۔

”باہر آؤ!“ غلام نے حضرت حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”وزیر کے پاس اس وقت کون ہے؟“ حضرت حسین بن منصورؒ نے غلام سے پوچھا۔

”محمد بن عبدالصمد کو تو ال!“ غلام نے مختصر جواب دیا۔

حضرت حسین بن منصورؒ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ان کے پیروں میں تیرہ بیڑیاں موجود تھیں۔ حضرت منصور حلاجؒ جسمانی طور پر بہت کمزور تھے مگر اتنی وزنی بیڑیاں پہن کر بھی آپؒ نہایت سبک رفتاری کے ساتھ چلتے تھے۔ غالباً یہ بھی آپؒ کی کرامت تھی۔ غلام کا بیان ہے کہ میری بات سنتے ہی منصور حلاجؒ کھڑے ہو گئے اور نہایت سرشاری کے لہجے میں فرمایا۔

”اللہ کی قسم! اب ہم ہلاک ہوئے۔“

پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ غلام کی روایت کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کو اپنی موت کا علم ہو چکا تھا مگر ان کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہے تھے بلکہ ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ روشن و تابناک نظر آ رہا تھا۔ پھر حلاجؒ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔

”میں تیرے دیدار کو حاضر ہو رہا ہوں۔“

غلام کا بیان ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے زنداں کا طویل صحن عبور کیا اور وہ ایک ہی جملہ دہراتے

رہے۔ ”میں تیرے دیدار کو حاضر ہو رہا ہوں۔“

زنداں سے باہر آ کر حضرت حسین بن منصورؒ نے ایک نظر کو تو ال محمد بن عبدالصمد کو دیکھا مگر خاموش رہے۔ پھر انہیں ایک خچر پر سوار کرا دیا گیا۔ وہ سائیسوں کی جماعت کے درمیان میں تھے۔ اس لئے کوئی انہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ آخر سپاہیوں کا یہ پُراسرار قافلہ پل تک پہنچا۔ اس جگہ سے حامد بن عباس کے غلام واپس چلے گئے۔ محمد بن عبدالصمد اور اس کے سپاہی کو تو ال کے میدان میں حضرت منصور حلاجؒ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور ساری رات جاگتے رہے۔

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ کو تو ال رات بھر شدید اضطراب کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں حلاجؒ کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کو اس واقعے کی خبر نہ ہو گئی ہو اور وہ جوش میں آ کر حملہ نہ کر دیں۔ یہ محض کو تو ال کے وسوسے تھے ورنہ بغداد کے سکوت کا یہ عالم تھا کہ تمام شہر انتہائی سکون کے عالم میں گہری نیند سو رہا تھا۔ جاگ تو وہ رہے تھے جنہیں ایک مظلوم کو پھانسی چڑھانا تھا..... یا پھر وہ عاشق جاں سوختہ بیدار تھا جسے منزل دار سے گزر کر اپنے محبوب کے دیار کو حاضر ہونا تھا۔

آخر وہ پُر ہول اور سیاہ رات گزر گئی جو قیامت تک کے لئے ”تاریخ عشق“ کا ایک ناقابل فراموش باب بن کر رہ گئی ہے۔



پھر جب آفتاب طلوع ہوا تو وہ 24 ذیقعد 309ھ منگل کا دن تھا۔ (واضح رہے کہ بعض مؤرخین نے 310ھ تحریر کیا ہے مگر دن اور تاریخ میں کوئی اختلاف نہیں) حضرت منصور حلاجؒ کو کمرے سے نکال کر قید خانے کے میدان میں لایا گیا۔ اس وقت بھی آپؒ کے پیروں میں بیڑیاں موجود تھیں۔ کوتوال محمد بن عبدالصمد کے سپاہیوں کا بیان ہے کہ جب حلاجؒ کمرے سے باہر آئے تو ان کے چہرے پر عجیب و غریب روشنی تھی۔ وہ مستانہ چال کے ساتھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

”پانے والے کے لئے یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی بے یار و مددگار نہیں۔“ (ترجمہ) صبح ہوتے ہی یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ حضرت منصور حلاجؒ کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ نتیجتاً پورے بغداد میں ایک حشر سا برپا ہو گیا اور بے شمار انسان اس میدان کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جہاں ایک عاشق جانباز کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

حضرت منصور حلاجؒ ہر خوف سے بے نیاز اور اپنے انجام سے بے پرواہ، جھومتے ہوئے چل رہے تھے اور یہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔

”میرا ندیم (صحبت میں بیٹھنے والا) ذرا بھی ظالم نہیں۔“

”اس نے مجھے بھی ویسی ہی شراب محبت پلائی جیسی وہ خود پیتا تھا۔“ (ایک مہمان جیسا دوسرے مہمان کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے یعنی کھانے پینے کی چیزوں میں اسے اپنا شریک بناتا ہے)

”پھر جب شراب کا دور چلنے لگا اور نشہ پورا ہو گیا تو میں نشے کی وجہ سے آداب ضیافت بھول گیا۔ پھر اس نے ترکِ ادب پر مجھے سزا دی۔ تلواریں منگوائی اور مجھے چمڑے کے بستر پر بٹھا کر قتل کر دیا۔“

”اس شخص کی یہی حالت ہوتی ہے جو گرمی کے موسم میں اژدھے کے ساتھ بیٹھ کر پرانی شراب پیتا ہے۔“

(ایک تو پرانی شراب کا نشہ، دوسرے گرمی کے موسم کی تیزی اور تیسرے اژدھے کے زہر کا اثر جو گرم دنوں میں شدت اختیار کر لیتا ہے)

بعض علمائے تحقیق نے ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ نے قتل سے پہلے اپنے جس ندیم اور جلیس کو اطب کیا ہے، وہ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ تھے۔ واضح رہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو آپؒ نے انہیں خلوت اور صبر و ضبط کی تلقین فرمائی تھی مگر جب حسین بن منصورؒ سے ضبط نہ ہو سکا اور ان کی زبان سے ایسے کلمات ادا ہونے لگے جو شریعت کی نظر میں قابلِ گرفت تھے تو حضرت جنید بغدادیؒ نے ناخوش ہو کر حلاجؒ کو اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ حضرت منصورؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان ہی کی صحبت میں رہ کر مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی جیسی کہ خود ان پر طاری تھی مگر وہ ضبط کرتے تھے اور مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

اشعار پڑھنے کے بعد حضرت منصور حلاجؒ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی۔

”جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قیامت کو جلدی بلانا چاہتے ہیں اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں

وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقینی آنے والی ہے۔“

اس آیت کی تلاوت سے حضرت منصور حلاجؒ کا مفہوم یہ تھا کہ جو لوگ مظالم پر اصرار کر رہے ہیں وہ گویا قیامت کو جلدی بلانا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ مظالم کی کثرت بھی قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔



تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کئے جانے کی خبر سن کر تقریباً پورا بغداد ہی مقتل کی جانب اُمد آیا تھا۔ میدان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لوگ شاہراہوں پر جمع ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ مقتل کی طرف جانے والے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی روایت ہے کہ انسانی ہجوم میں حضرت جنید بغدادیؒ کے شاگرد خاص حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ بھی موجود تھے۔ اس وقت حضرت منصور حلاجؒ سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے آپؒ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”حسین! تصوف کیا ہے؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”جو کچھ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، وہ تصوف کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔“

”پھر اعلیٰ ترین درجہ کون سا ہے؟“ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے سوال کیا۔

”اس درجے سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سولی نصب کی گئی تھی۔

پھر جیسے ہی حضرت منصور حلاجؒ نے انسانی ہجوم کی طرف رخ کیا، اگلی صفوں میں کھڑے ہوئے لوگوں نے پتھر اٹھا کر مارنے شروع کر دیئے۔ واضح رہے کہ حضرت حسین بن منصور عوامی عتاب کا نشانہ نہیں تھے۔ سنگ باری کرنے والوں میں حامد بن عباس کے غلام اور کوتوال محمد بن عبدالصمد کے سپاہی شامل تھے۔ حکومت کے حاشیہ بردار، حضرت حلاجؒ پر پتھر برسا کر خلیفہ وقت اور دوسرے حکام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تذکرۃ الاولیاء کی روایت کے مطابق حضرت حسین بن منصور پتھروں کی بارش سے لہو لہان ہو گئے مگر آپؒ نے اُف تک نہ کی۔

پھر حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے اتباع شریعت میں ایک چھوٹی سی کنکری ماری تو حضرت منصور حلاجؒ چیخ اُٹھے۔

حضرت منصور حلاجؒ سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں نے پوچھا۔ ”بھاری پتھروں سے پہنچنے والی اذیت پر تو آپ خاموش رہے مگر شیخ ابوبکر شبلیؒ کی پھینکی ہوئی ایک حقیر سی کنکری پر اس طرح چیخ اُٹھے کہ مقتل میں دور تک اس کی گونج سنائی دی۔“

حضرت منصور حلاجؒ نے جواباً فرمایا۔ ”شبلی کی کنکری میرے دل پر لگی ہے، اس لئے تکلیف کی شدت

سے چیختا ہوں۔“

”یہ کیسی تکلیف ہے جسے آپ ضبط نہ کر سکے؟“ لوگوں نے وضاحت طلب کی۔

حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔ ”شبلیؒ کو ان کی تقلید نہیں کرنی چاہئے تھی کہ یہ لوگ مجھے جانتے نہیں..... مگر شبلیؒ خوب پہچانتا ہے کہ میں کون ہوں۔“

یہ واقعہ صرف حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی تصنیف تذکرۃ الاولیاء میں ملتا ہے۔ دوسرے مؤرخین نے اس روایت سے انکار کیا ہے کہ حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ مقتل میں موجود ہی نہیں تھے، پھر وہ لوگوں کی تقلید میں حضرت منصور حلاجؒ پر کنکری کیوں مارتے؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے جن کے اس عمل پر حضرت حسین بن منصورؒ نے شدید تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

البتہ ”صلہ طبری“ میں عریب بن سعد قرطبی نے یہ واقعہ ضرور تحریر کیا ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ مقتل میں داخل ہوئے تو ایک بوڑھی خاتون فاطمہ نیشاپوریہؒ آپ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ ”مجھے شبلیؒ نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسرار میں سے تمہیں ایک راز کا امین بنایا تھا مگر تم نے اس راز کو فاش کر دیا جس کے نتیجے میں تمہیں لوہے کی دھار کا مزہ چکھایا گیا ہے۔“

فاطمہ نیشاپوریہؒ کی یہ بات سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے یہ اشعار پڑھے۔

”تجھ جیسے محبوب کے معاملے میں کیا ہی اچھی بات ہے کہ پردہ ٹوٹ جائے۔“ (یعنی ایسے محبوب کی محبت میں اظہار محبت ہی مناسب ہے۔ اسے راز رکھنا مناسب نہیں)

”اور اگر لوگ مجھے ملامت کریں تو تیرے چہرہ زیبا میں میرا عذر پوشیدہ ہے۔“ (یعنی ایسے چہرے کا عاشق کس طرح ضبط کر سکتا ہے)

”اے بدر حقیقی! یہ بدر ظاہری بھی تیرے ہی چہرے کا محتاج ہے۔“

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تحریر کیا ہے کہ یہ اشعار حسین بن خماک بابلی کے ہیں۔ اپنے عشق کی کیفیت ظاہر کرنے کے لئے حضرت منصور حلاجؒ نے سر مقتل ان اشعار کو با آواز بلند پڑھا۔

اس کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ نے فاطمہ نیشاپوریہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”شبلیؒ سے جا کر کہو کہ اللہ کی قسم! میں نے اس کا کوئی راز فاش نہیں کیا۔“

یہ نعرہ ”انا الحق“ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت منصور بن حلاجؒ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ ”انا الحق“ کہا کرتے تھے۔ یعنی میں حق ہوں۔ اس نعرے کی حقیقت پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فاطمہ نیشاپوریہؒ کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ حضرت حسین بن منصورؒ سے تصوف کی تعریف معلوم کرنا اور ان کے الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا۔ پھر جب فاطمہؒ نے تصوف کے بارے میں سوال کیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”میں اس وقت جس حالت میں ہوں، اسی کا نام تصوف ہے۔ میں نے نعمت اور بلا (خوشی اور غم) میں کسی وقت بھی فرق محسوس نہیں کیا۔“

فاطمہؒ نے واپس آ کر حضرت منصور حلاجؒ کے الفاظ دہرا دیئے۔ اس وقت حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کی خدمت میں کچھ عقیدت مند اور شاگرد موجود تھے۔ آپؒ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”پہلا جواب تم لوگوں کے لئے ہے کہ اس سے زیادہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتا..... اور دوسرا جواب میرے لئے ہے۔ میں اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ ایک عالی ہمت کی نظر میں نعمت اور بلا دونوں برابر ہوتے ہیں۔“

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فاطمہ نیشاپوریہ کو مشہور بزرگ حضرت ذوالنون مصریٰ اپنی استانی کہا کرتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامی بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ فاطمہ نیشاپوریہ 223ھ میں عمرے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئی تھیں۔ راستے ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ 309ھ یا 310ھ میں شہادت منصور کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت فاطمہ نیشاپوریہ کو دنیا سے رخصت ہوئے ستاسی سال گزر چکے تھے۔ پھر وہ سر مقتل حضرت منصور حلاج سے کس طرح ملاقات کر سکتی تھیں؟ یقیناً فاطمہ نام کی کوئی اور بزرگ خاتون ہوں گی جنہیں حضرت شبلیؒ نے حضرت حسین بن منصور کے پاس بھیجا تھا..... اور یہ ملاقات مقتل میں نہیں، قید خانے میں ہوئی تھی۔



جب سنگ باری ختم ہو گئی تو حضرت منصور حلاج کا ایک خادم آگے بڑھا اور زار و قطار روتے ہوئے عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! مجھے آخری نصیحت فرمائیے۔“

حضرت منصور حلاج نے زخمی ہونے کے باوجود انتہائی استقامت کے لہجے میں فرمایا۔ ”اپنے نفس کو دنیا کی تمام نسبتوں (خواہشوں) سے خالی کر لے ورنہ یہ نفس تجھے ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیری برداشت سے باہر ہوں گی۔“

پھر آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے احمد بن حسین نے وصیت کی خواہش ظاہر کی۔ احمد شدت غم سے ٹڈال تھا۔

اولوالعزم باپ نے ایسے سنگین لمحات میں غمزدہ بیٹے سے چند تسلی آمیز کلمات کہے۔ پھر فرمایا۔ ”میرے بیٹے! ساری دنیا اعمالِ صالحہ کی کوشش کرتی ہے مگر تجھے علم حقیقت حاصل کرنا چاہئے کیونکہ علم حقیقی کا ایک نکتہ بھی تمام اعمالِ صالحہ پر بھاری ہوتا ہے۔“ (علم حقیقی اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسانی دل اور روح دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ حضرت منصور حلاج کے قول مبارک میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے)

کو تو ال محمد بن عبد الصمد کے سپاہیوں نے حضرت منصور حلاج کے صاحبزادے احمد کو کھینچ کر دور کر دیا۔

ہجوم میں بہت سے لوگ گریہ و زاری کر رہے تھے مگر ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حضرت منصور حلاج کو مقتل سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر لے جاتے۔ ایک تو یہ کہ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ دوسرے یہ کہ حامد بن عباس نے شورش برپا ہونے کے خوف سے ایک دن پہلے ہی معززین شہر کے ذریعے پورے بغداد میں یہ اعلان کر دیا تھا۔

”حلاج مذہب اسلام کا مجرم ہے۔ اس لئے اس کا قتل ہو جانا ہی عوام الناس کے مفاد میں ہے۔“

عوام نے اپنے علماء کا فتویٰ سن لیا تھا۔ اس لئے ان کی زبانیں خاموش تھیں۔ وہ شریعت کے معاملے میں دم کہاں مار سکتے تھے اور حقیقت حال کی انہیں خبر نہیں تھی..... مگر ان کے دل حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھ تھے۔ اس لئے آنکھیں اشک برسا رہی تھیں اور ہونٹوں سے شور و فغاں بلند ہو رہا تھا۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون کی روایت کے مطابق حامد بن عباس نے مقتل میں بھی معزز گواہوں کو جمع کر لیا تھا جو دار (پھانسی) کے قریب کھڑے تھے اور لوگوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔
”اس کا قتل کرنا مسلمانوں کے نفع میں ہے۔ قتل کر دو، خون ہماری گردنوں پر۔“

اس قسم کے مسلسل اعلانات کے سبب مجمع میں شورش پیدا نہ ہو سکی..... مگر شدت غم سے لوگوں کے چہرے اُداس تھے اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر طرف چیخیں تھیں اور انتشار برپا تھا۔ لوگ صفیں چیرتے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر عقیدت مند اس عاشق جانناز کا آخری دیدار کرنے کے لئے بے چین تھا جسے تھوڑی دیر بعد ایک انتہائی دردناک سزا دی جانے والی تھی۔

کو تو ال محمد عبدالصمد کے سپاہی لاکھوں کے مجمع پر قابو پانے کی تدبیروں میں مصروف تھے۔ اسی ہنگامے کے دوران ہجوم میں سے ایک شخص نے پکار کے کہا۔
”منصور! عشق کسے کہتے ہیں؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”آج اور کل میں تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ عشق کسے کہتے ہیں؟“
پھر کسی نے پوچھا۔ ”آپ کا اپنے ماننے والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”اللہ انہیں ایک اجر عطا کرے گا۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”اور اپنے دشمنوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ دوسرے شخص نے سوال کیا۔
”اللہ مجھ سے اختلاف کرنے والوں کو دہرا اجر دے گا۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے انتہائی پُر جوش لہجے میں فرمایا۔

”یہ کیسی عجیب بات ہے؟ ہمارے ذہن اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔“ اسی شخص نے دوبارہ پوچھا۔
”تمہیں ایک اجر اس لئے ملے گا کہ تم مجھ سے صرف حُسن ظن رکھتے ہو۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”میرے مخالفین دہرا اجر اس لئے پائیں گے کہ وہ قوتِ توحید کا مظاہرہ اور شریعت کی استواری چاہتے ہیں۔ شریعت میں اصل شے توحید ہے اور حُسن ظن فرع۔“ فرع عربی زبان میں شاخ کو کہتے ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ کا پیغام یہ تھا کہ توحید ایک درخت ہے اور حُسن ظن (خوش گمانی) اس کی شاخ۔ درخت اپنی جڑ سے قائم رہتا ہے، شاخوں سے نہیں۔

حضرت منصور حلاجؒ کے صحیح العقیدہ ہونے کے لئے یہی ایک جملہ کافی تھا۔ مگر حامد بن عباس تو انہیں قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ علماء سے جبری فتویٰ لینے والا وزیر کس طرح سنتا کہ منصور حلاجؒ آخری لمحات میں کس بات کا اقرار کر رہے تھے۔ اس نے تقریباً نو سال تک اپنے کان بند رکھے تھے۔ پھر وہ منصوبے کی

تکمیل کے وقت اپنی سماعت کے دروازے کیسے کھولتا؟

اور وہ علماء جو نظام جبر کے سامنے بے دست و پا ہو گئے تھے، منصورؓ کی زبان سے توحید کا بیان سن کر اپنا فیصلہ کیوں بدلتے؟ وہ تو بس اس کام پر مامور تھے کہ عوام کے ذہنوں کو دھوڑالیں اور کسی شورش کے بغیر قتل منصورؓ کی راہ ہموار کر دیں۔ اس لئے وہ مضطرب عوام کو بار بار ایک ہی تلقین کر رہے تھے۔

”مسلمانو! حلاج کا قتل ہو جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

پھر لوگوں نے دیکھا کہ حضرت منصور حلاجؒ پھانسی کو بوسہ دے رہے تھے۔ ان کی وارفتگی قابلِ نظارہ تھی۔ پھانسی کو کئی بار بوسہ دینے کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ مجمع کی طرف متوجہ ہوئے اور با آواز بلند یہ اشعار پڑھے۔

”میرے دوستو! مجھے قتل کر دو کہ موت ہی میری زندگی ہے۔“

”اور دنیاوی زندگی میں میری موت ہے۔“

”اور جو زندہ جاوید ہے اس کی صفات معدوم نہیں ہوتیں۔ (حق تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی

ذات و صفات قدیم ہیں)

”اور میں اسی سے تربیت یافتہ ہوں۔ میں نے تربیت کرنے والوں کی آغوشوں میں پرورش

پائی ہے۔“

”اس لئے قتل سے میری روح اور میری معرفت و محبت فنا نہ ہوگی۔“ (ترجمہ) پھر جیسے ہی حضرت

منصور حلاجؒ خاموش ہوئے، کو تو ال محمد بن عبدالصمد نے جلاد کو اشارہ کیا اس وقت تک منتشر مجمع پر قابو پایا

جا چکا تھا۔

جلاد نے اپنی قوت بازو کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ کثرتِ ریاضت اور زندگی بھر روزہ رکھنے کی عادت

نے بظاہر حضرت منصور حلاجؒ کو تھکا ڈالا تھا اور وہ جسمانی طور پر بہت کمزور نظر آتے تھے۔ اس لئے عوام

کے ساتھ جلاد کا بھی یہی خیال تھا کہ حضرت حسین بن منصورؒ ایک تازیانے کی ضرب بھی برداشت نہیں کر

سکیں گے اور پہلے ہی کوڑے میں کسی شاخ کی طرح ٹوٹ کر زمین پر گر جائیں گے..... مگر کسی کو یہ اندازہ

نہیں تھا کہ حلاجؒ جس شجر سے پیوستہ ہیں اس کے پتے اور شاخیں دنیا کی ہر آندھی کا مقابلہ کر سکتے

ہیں..... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت منصورؒ کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہوتی رہی مگر ان کی زبان سے

اُف تک نہ نکلی۔ بس ہر کوڑے پر ”احد، احد“ کہتے تھے۔ یعنی اللہ کی وحدانیت پر گواہی دیتے تھے۔ یہ

استقامت اور شجاعت کی عجیب مثال ہے۔

پھر جب چھ سو تازیانے لگائے جا چکے تو حضرت منصور حلاجؒ نے کو تو ال محمد بن عبدالصمد کو اشارہ کیا جو

قریب ہی کھڑا تھا۔ جلاد نے ہاتھ روک دیا۔ کو تو ال چند قدم آگے بڑھا اور انتہائی درشت لہجے میں بولا۔

”کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میری بات غور سے سن!“ حضرت منصور حلاجؒ نے محمد بن عبدالصمد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تجھے ایک نصیحت کرتا ہوں جو تیرے فائدے میں ”فتح قسطنطنیہ“ کے برابر ہے۔“

کو تو ال نے گھبرا کر کہا۔ ”مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ تم اس سے بھی بڑھ کر باتیں کرو گے مگر میں تازیانوں کی سزا کو روک نہیں سکتا۔“

محمد بن عبدالصمد کو حامد بن عباس کی ہدایت یاد آ گئی۔ جب اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اگر حلاج تجھے دریائے دجلہ میں سونا چاندی بہتا ہوا بھی دکھا دے تو کوڑوں کی سزا موقوف نہ کرنا۔“
 یہ خیال آتے ہی کو تو ال نے جلا دکوڑا نٹتے ہوئے کہا۔ ”اپنے جسم کی پوری طاقت استعمال کر۔“
 پھر کوڑوں کی سزا پوری ہو گئی..... اور قریب کھڑے ہوئے لوگ ایک ہی صدا سنتے رہے۔
 ”احد..... احد..... احد.....“

حضرت منصور حلاجؒ اپنی زندگی میں والہانہ ترنم کے ساتھ یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔
 ”اللہ تعالیٰ کو خوب خبر ہے کہ میری ذات میں کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس میں اے محبوب! تیری یاد رچی بسی نہ ہو۔“

”میری روح تجھے ساتھ لے کر اپنے حرکت کے مقامات میں حرکت کرتی ہے۔“ (یعنی ٹو ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوتا)

”جب سے ٹو آنکھوں سے جدا ہوا ہے، اگر میری آنکھ نے تیرے سوا کسی کو دیکھا ہو تو خدا کرے، اس کے گوشے اس کو دعا دیں۔“ (اس کا مفہوم ہے کہ آنکھیں پھوٹ جائیں)
 ”تجھ سے بچھڑنے کے بعد اگر میرے نفس نے تیرے سوا کسی مخلوق سے اُلفت کی ہو تو خدا کرے کہ اس کو اس کی مرادیں نصیب نہ ہوں۔“

ان اشعار سے حضرت منصور حلاجؒ کے عشق کی سرشاری بھی ظاہر ہوتی ہے اور وحدانیت پرستی بھی۔ وہ اپنے عہد میں اس قدر سچے ہیں کہ حق تعالیٰ کو فراموش کر دینے کے جرم میں اپنے آپ کو ہلاکت کی دعا دے رہے ہیں۔

جب ایک ہزار تازیانوں کی سزا پوری ہو چکی تو حضرت منصور حلاجؒ نے اسی وارنگی کا اظہار کیا اور وہی اشعار پڑھے جو زندگی بھر کا وظیفہ تھے۔

جس جلاد نے حضرت حسین بن منصورؒ کے ایک ہزار کوڑے لگائے تھے، اس کا بیان ہے کہ میں ہر کوڑے پر دو آوازیں سنتا تھا۔ ایک آواز حضرت منصور حلاجؒ کی تھی جو ”احد..... احد.....“ کہتے تھے۔ اور دوسری آواز غیب کی تھی اور اس میں بڑا جلال تھا۔ جب میں حلاجؒ کے کوڑا مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کرتا تھا تو ایک صدائے غیب ابھرتی تھی۔

”یا ابن منصور لا تخف۔“ (اے ابن منصور! خوف زدہ نہ ہو)

بعض علماء نے اس جلاد کے حوصلے کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ شریعت کے معاملے میں انتہائی بلند ہمت تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ”لا تخف“ کی آواز سن کر مقتل سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

اس واقعے میں حضرت منصور حلاجؒ کی ذات سے وابستہ دو کھلی ہوئی کرامات موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ جلاد نے ہر تازیانے پر ”یا ابن منصور لا تخف“ کی آواز سنی۔ اُس نے اپنے دور ملازمت میں بہت سے

افراد کی پشت پر کوڑے مارے ہوں گے مگر کسی ایک شخص کو بھی سزا دیتے وقت اس نے یہ صدائے غیبی نہیں سنی تھی۔ اس لئے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ آوازِ غیب حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایسے سنگین لمحات میں حضرت حلاجؒ کو صبر و استقامت کی تلقین کرنے والا، حق تعالیٰ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ بے شک! وہی ذات پاک تھی جس نے اس قدر نازک ساعتوں میں حسین بن منصورؒ کی یہاں تک دستگیری کی کہ وہ آخری لمحے تک اپنے پیروں پر کھڑے رہے۔ نہ شورِ فغاں بلند کیا اور نہ کسی سے رحم کی درخواست کی۔ جو کچھ کہا، اپنے اللہ سے کہا..... اور آخری سانس تک اسی کو پکارا۔

”احد..... احد.....“

اگر یہ کرامت نہیں تو اور کیا تھی؟ خلیفہ مقتدر با اللہ نے حضرت منصور حلاجؒ کے لئے ایک ہزار تازیانوں کی سزا اسی غرض سے منتخب کی تھی کہ اتنے کوڑوں کے درمیان ان کی موت واقع ہو جائے گی..... اور یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اگر ایک ہزار کوڑے کسی پہلوان کے بھی مار دیئے جاتے تو وہ جاں بحق ہو جاتا۔ اور بالفرض جان سے نہ گزرتا تو زمین پر پڑا ہوا سسک رہا ہوتا..... مگر تمام تاریخیں اسی صورت حال پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ آخری تازیانے تک نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے رہے بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے اللہ کو پکارتے رہے۔ ان کے ہوش و حواس کی درستگی کا تو یہ عالم تھا کہ چھ سو کوڑوں کی ضرب برداشت کرنے کے بعد بھی انہوں نے کو تو ال محمد بن عبد الصمد کو ایک انتہائی قیمتی نصیحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا کوئی ساحر اور زندیق ایسی اعلیٰ ظرفی، کشادہ دلی اور استقامت کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟ اہل نظر غور کریں۔

الغرض ایک ہزار تازیانوں کی سزا مکمل ہو چکی تو جلاد نے کو تو ال کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے حکم کا منتظر تھا۔

بیشتر مؤرخین کی روایات کے مطابق عباسی خلیفہ مقتدر با اللہ نے یہی تحریر کیا تھا کہ اگر حلاجؒ ایک ہزار کوڑوں کی سزا کے دوران مرجائیں تو اچھا ہے ورنہ ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ اس حکم نامے میں کسی شبہ کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ صاف تحریر تھا کہ اگر تازیانوں سے منصورؒ کا کام تمام نہ ہوا تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اصولی طور پر کو تو ال محمد بن عبد الصمد کو خلیفہ مقتدر با اللہ کے حکم کا تابع ہونا چاہئے تھا..... مگر اس نے نیا حکم جاری کر دیا۔

”حلاجؒ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔“

اب سوال یہ ہے کہ کیا کو تو ال محمد بن عبد الصمد اس بات کا مجاز تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے نیا حکم جاری کر سکے؟ بظاہر اس کا عہدہ و منصب اس لائق نہ تھا کہ وہ مقتدر با اللہ کے حکم سے کھلی ہوئی سرنابی کر سکے۔ پھر اس نے جلاد کو اشارہ کیوں کیا کہ حضرت منصور حلاجؒ کا ایک ہاتھ قطع کر دیا جائے۔ محمد بن عبد الصمد تو حکومت کا انتہائی کمزور آلہ تھا۔ وہ آخری وقت تک اس بات سے خائف تھا کہ کہیں حلاجؒ کے پرستار اپنے ممدوح کو اس سے چھین کر نہ لے جائیں۔ پھر اس نے اس قدر سنگ دلانہ حکم کیوں جاری کیا؟ جبکہ اسلامی شریعت میں انسانی اعضاء کا کاٹنا سختی کے ساتھ ممنوع ہے۔ ہم پہلے ہی

عرض کر چکے ہیں کہ اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمانِ مقدس موجود ہے کہ انسانی جسم تو کجا، یا گل کتے کے بھی اعضاء نہ کاٹو۔ پھر حضرت حسین بن منصورؒ کے حق میں یہ ستم کیوں روا رکھا گیا اور اس ظلم کا بانی کون تھا؟

کو تو اب محمد بن عبدالصمد کی بے اختیاری دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نئے حکم کا جاری کرنے والا، حامد بن عباس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ وزیر حامد بن عباس نے یہ سفاکانہ فرمان کیوں جاری کیا؟ ہماری نظر میں اس کا بس ایک ہی جواب ممکن ہے کہ حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا بدترین دشمن تھا۔ اس لئے وہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر اپنے قلب کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ ذاتی انا کی تسکین کے علاوہ اس واقعے میں ایک سیاسی مقصد بھی پوشیدہ تھا۔ حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ جیسی محبوب و مقبول شخصیت کو عبرت ناک سزا دے کر عوام کے دلوں پر حکومت کا رعب و جلال قائم کرنا چاہتا تھا۔

اب تیسرا سوال یہ ہے کہ اس وقت بعض علماء اور فقہاء بھی موجود تھے۔ ان بزرگ ہستیوں نے حامد بن عباس کو اس جارحانہ بلکہ وحشیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ اس کا سیدھا سا جواب تو وہی ہے کہ قاضی ابو عمر اور دوسرے علماء نے جبراً فتوے پر دستخط کئے تھے۔ اگر وہ حامد بن عباس سے اختلاف کر سکتے تو پھر منصورؒ کو کھینچ کر سر دار لایا ہی کیوں جاتا؟ وہ اس لمحے میں بھی خاموش تھے جب حضرت منصور حلاجؒ کی موت کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا..... اور اس وقت بھی ان کی زبانیں بند تھیں جب حضرت حسین بن منصورؒ کو قتل کرنے کا حکم جاری کیا جا رہا تھا۔

آخر انتہائی بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت منصور حلاجؒ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھانس یا کانٹا چبھ جانے پر بھی بہت سے لوگوں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے مگر اس مردِ خدا نے اپنے جسم کا ایک حصہ الگ ہو جانے پر اُف تک نہ کی بلکہ اسی وارفتگی کے ساتھ جو اہل عشق کا شیوہ ہے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

”میں اسی محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں جسے انقلابِ زمانہ کبھی نہ بگاڑ سکے گا۔ (یعنی گردشِ ماہ و سال کے سبب اس محبت میں نہ تبدیلی واقع ہوگی اور نہ کسی قسم کی کمزوری آئے گی بلکہ یہ محبت آج کی طرح ہمیشہ تازہ، شاداب اور پُر جوش رہے گی)

”ہجومِ بلا کے وقت نہ مجھے کوئی ضرر پہنچا اور نہ کوئی تکلیف محسوس ہوئی (اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ ہزار تازیانوں کی سزا اور پھر ہاتھ کاٹے جانے کے بعد بھی وہ مسکراتے رہے اور مخالفین کو دعاؤں سے نوازتے رہے)

”میرا کوئی عضو یا جوڑ نہیں کاٹا گیا جس میں تمہاری یاد شامل نہ ہو۔“ (چونکہ وہ حق تعالیٰ کی یاد میں غرق تھے، اس لئے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا)

پھر کچھ دیر بعد حضرت منصور حلاجؒ کا دوسرا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اگرچہ ان کے جسم پر مسلسل قیامت ٹوٹ رہی تھی مگر زبان پر اللہ کی کبریائی کا بیان جاری تھا۔ حضرت حسین بن منصورؒ نے آسمان کی طرف دیکھ

کر پُر شوق لہجے میں اپنے رب کو پکارا۔

”میرے معبود! میرے معبود! میں مرغوبات کے گھر میں عجائبات کو دیکھ رہا ہوں۔“

علماء کے نزدیک حضرت منصور حلاجؒ پر عالم مثال یا عالم آخرت ظاہر ہو گیا ہو گا اور آپؒ کھلی آنکھوں سے عجائبات دیکھ رہے ہوں گے..... یا پھر شوق وصال میں دنیا ہی کو ”مرغوبات“ کا گھر کہہ دیا ہو اور سامانِ قتل کو عجائبات سے تعبیر کیا ہو۔

پھر بڑی نیاز مندی کے ساتھ عرض کیا۔ ”میرے معبود! آپ تو اس شخص سے بھی دوستی کا سلوک کرتے ہیں جو آپ کو ایذا دیتا ہے..... پھر آپ اس شخص سے دوستی کا برتاؤ کیوں نہ کریں گے جسے آپ کے راستے میں ایذا پہنچائی جاتی ہے۔“

اللہ کو ایذا پہنچانے والے منکر، کافر اور مشرک ہیں..... مگر اللہ ان کے ساتھ بھی دوستی کا سلوک کرتا ہے یعنی انہیں رزق فراہم کرتا ہے، اولاد کی دولت سے مالا مال کرتا ہے اور دنیا میں ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرتا ہے۔ پھر جو اللہ کے راستے میں ستائے گئے ہیں، انہیں کس طرح فراموش کیا جاسکتا ہے۔

حضرت منصور حلاجؒ کے یہ الفاظ جو آخری لمحات میں آپؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے، تصوف کی دنیا میں عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد فارسی کے مشہور بزرگ شاعر شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے اسی مضمون کو اپنے شعر میں اس طرح ادا کیا۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بادشاہ نظر داری

(اپنے دوستوں کو کس طرح محروم رکھے گا، جبکہ تو دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آتا ہے)

یہ قول بھی حضرت منصور حلاجؒ کی وحدانیت پرستی پر کھلی دلیل ہے..... مگر علمائے بغداد کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ان کے دلائل کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے اور ان کے اقوال پر غور کرتے۔

جب قتل کے فتوے پر دستخط کئے جا رہے تھے تو حضرت منصور حلاجؒ نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنا عقیدہ بیان کیا تھا۔ بعض مؤرخین نے حضرت حسین بن منصورؒ کے اس بیان کو ان کے خوف پر محمول کیا ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے آپ کو ایک صحیح العقیدہ مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک انتہائی کمزور دلیل اور نہایت ضعیف دعویٰ ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ پر کوئی بھی الزام عائد کیا جاسکتا ہے مگر یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ وہ موت کے خوف سے اپنا بیان تبدیل کر رہے تھے۔ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ گزرے ہیں جن کے نزدیک موت ایک دلچسپ کھیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

حضرت منصور حلاجؒ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ کسی خوف کے زیر اثر، علماء کی جماعت کے سامنے اللہ کی وحدانیت، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور اصحابِ عشرہ مبشرہ کی فضیلت پر گواہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کی پوری زندگی بے باکی اور شجاعت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ سندھ کے مشہور بزرگ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے نام سے فارسی کی یہ غزل منسوب ہے جسے سن کر صوفی اور غیر صوفی سبھی جہ میں آ جاتے ہیں۔

نہ می دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقص
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یاری رقص
(میں نہیں جانتا کہ جب دیدار کا مرحلہ آتا ہے تو میں کیوں رقص کرنے لگتا ہوں) (بات کچھ بھی ہو) مگر
مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اپنے دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں)
اسی غزل کا مشہور شعر ہے جس سے عشق کی وارفتگی اور تسلیم و رضا کی انتہائی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔
تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی
من آں بسل کہ زیر خنجر خونخوار می رقص
(تو وہ قاتل ہے کہ دنیا کو تماشا دکھانے کے لئے میرا خون بہاتا ہے اور میں وہ بسل ہوں کہ خوں آشام
خنجر کے نیچے رقص کرتا ہوں)

ہمیں یقین ہے کہ جب حضرت لعل شہباز قلندرؒ نے یہ شعر کہا ہوگا تو حضرت منصور حلاجؒ کا واقعہ ان
کے پیش نظر ہوگا..... اور اگر بالفرض ایسا نہیں تھا، تب بھی حضرت حسین بن منصورؒ ہی اس شعر کی عملی تشریح
ہیں۔ صوفیاء کی کثیر جماعت میں حضرت حلاجؒ ہی واحد صوفی ہیں جنہیں اس قدر دردناک سزا دی گئی اور
زیر خنجر خونخوار انہوں نے جس طرح رقص کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔



پھر حضرت منصور حلاجؒ کے دونوں پاؤں بھی کاٹ دیئے گئے۔ اس وقت وہ سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔
اس ناقابل بیان اذیت کے تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد حضرت حسین بن منصورؒ نے حامد بن عباس،
کو تو ال محمد بن عبدالصمد اور دوسرے اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
”تم لوگوں نے میرے ظاہری ہاتھ تو کاٹ دیئے مگر میرے باطنی ہاتھ کون قطع کر سکتا ہے جنہوں نے
ہمت کا تاج عرش کے سر پر سے اتارا ہے۔“

پھر اپنے بریدہ پیروں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

”تم نے میرے ظاہری پاؤں قطع کر دیئے مگر ابھی میرے باطنی پاؤں باقی ہیں جن سے میں دونوں
عالم کا سفر کر سکتا ہوں۔“

ہم اس موقع پر فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کی ایک اور روایت پیش کرتے ہیں جس سے وزیر حامد
بن عباس کی سنگدلی اور سفاکی کا انتہائی خوفناک زاویہ منکشف ہوتا ہے۔ فرانسیسی عالم لکھتا ہے:

24 ذی الحجہ 309ھ کو ”باب خراسان“ میں پولیس چوکی کے سامنے دجلہ کے کنارے، لوگوں کی بہت
بڑی بھیڑ جمع تھی۔ حلاجؒ کو میدان میں لایا گیا۔ اس وقت ان کے سر پر افسر نما کلاہ (ٹوپی) موجود تھی۔
پہلے ان کے تازیانے مارے اور پھر پاؤں کاٹے گئے۔ ابھی وہ زندہ تھے کہ انہیں دار پر لٹکا دیا گیا۔ دوست
اور دشمن حلاجؒ کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ ان سے سوال کریں اسی اثناء میں شورش پسندوں نے چند
کانوں کو آگ لگا دی۔ خلیفہ مقتدر بالله کی طرف سے حلاجؒ کے سر کاٹنے کا حکم رات گئے تک نہ پہنچا تھا۔
ان لئے یہ کام دوسرے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔“

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ شدید تکلیف کے عالم میں رات بھر پھانسی پر لٹکے رہے۔

حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ پہلے حضرت حلاجؒ کے ایک ہزار تازیانے مارے گئے۔ پھر آپؒ کے دست و پا کاٹے گئے۔ آخر میں خلیفہ مقتدر باللہ کا حکم پہنچا کہ سر بھی قلم کر دیا جائے۔

قتل منصورؒ کے سلسلے میں عجیب متضاد روایتیں موجود ہیں۔ فرانسیسی دانشور کے علاوہ تمام مؤرخین نے 24 ذیقعدہ کو قتل کی تاریخ قرار دیا ہے۔ مگر لوئی ماسینیون 24 ذی الحجہ پر اصرار کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو یا پھر فرانسیسی مستشرق سے سہو ہو گیا ہو۔ بہر حال جہاں تک ہماری رسائی ممکن تھی ہم نے ایک ایک روایت کو جمع کر دیا ہے تاکہ اس ”شہید حق“ کی زندگی اور موت کا کوئی پہلو تاریکی میں نہ رہے۔

الغرض، شمشیر بدست جلا داد آگے بڑھا۔ اب حضرت منصورؒ کے رشتہ حیات کو منقطع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ جسمانی اعضاء الگ ہو جانے اور اس قدر خون بہہ جانے کے بعد بھی حضرت حسین بن منصورؒ پورے ہوش و حواس میں تھے۔ آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور کئی بار زبان مبارک سے یہ جملہ ادا کیا۔

”پانے والے کے لئے یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔“ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی، حضرت منصور حلاجؒ کی ولایت کا قائل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ حسین بن منصورؒ کے آخری لمحات کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔

فارس بغداد قتل منصورؒ کے وقت موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ قتل سے پہلے حلاجؒ کے ایک ایک عضو کو کاٹا گیا مگر ان کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہوا۔ ابوبکر عطوفی کا بیان ہے کہ میں حلاجؒ کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ ان کے کوڑے لگائے گئے۔ بعد میں دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے گئے مگر ان کی زبان سے کچھ بھی نہیں نکلا۔ (یعنی حلاجؒ نے اُف تک نہ کی)

خطیب بغدادی کے بقول عیسیٰ القصار کا بیان ہے کہ قتل سے ذرا دیر پہلے حلاجؒ کی زبان سے یہ کلمہ ادا ہوا تھا۔

”پانے والے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔“ روایت ہے کہ جب مشائخ بغداد تک یہ خبر پہنچی کہ حضرت منصور حلاجؒ نے مرنے سے پہلے اپنے اللہ کو اس طرح پکارا تھا تو ان سب پر رقت طاری ہو گئی۔ پھر تمام صوفیاء نے بالاتفاق حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تعریف کی۔ ”حسین نے سچ کہا۔“

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اللہ اس شخص پر کتنا قوی حال غالب تھا کہ ایک ہزار کوڑے کھائے، ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور اُف تک نہ کی۔ احد..... احد ہی کہتے رہے۔ اس حال کے سامنے ہزار کرامات بھی بے حقیقت ہیں.....“

اور آخری کلمہ جو زبان سے ادا ہوا، وہ تو سراسر توحید میں ڈوبا ہوا تھا۔ اعتبار خاتمے کا ہوتا ہے (یعنی ایک شخص کا انجام کس حالت پر ہوا) اگر بالفرض حلاج کی زبان سے کسی وقت کوئی ایسا کلمہ نکلا ہو جس کے سبب علماء کو تکفیر کی جرأت ہوئی ہو تو ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ابن منصور کی آخری حالت ان کے سچے موحد (خدا پرست) ہونے کو اچھی طرح ظاہر کر رہی ہے۔ لہذا ان عبارات میں تاویل ضروری ہے جن سے علماء کو شبہ ہوا ہے۔“



جلاد کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ حضرت منصور حلاج کی زبان مبارک پر وہی ایک کلمہ تھا۔ ”پانے والے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔“ پھر حضرت حسین بن منصور کا سر قلم کر دیا گیا۔ حامد بن عباس خوش تھا کہ اس نے کسی بڑی ہنگامہ آرائی کے بغیر حلاج سے نجات حاصل کر لی تھی..... مگر اس کا سکون بہت عارضی تھا جیسے ہی حضرت منصور کا سر خاک پر گرا، پورا مقتل شور ”انا الحق“ سے گونج اٹھا۔

حاضرین کو اپنی سماعت پر شک ہونے لگا مگر آواز اتنی واضح اور مسلسل تھی کہ کچھ دیر بعد ہی تمام شبہات دور ہو گئے۔ ”وہ انا الحق“ کی صدا تھی جو حضرت منصور حلاج کے لہو لہان جسم سے ابھر رہی تھی۔ ”یہ فتنہ مرنے کے بعد تو اور بھی شدید ہو گیا۔“ حامد بن عباس نے کو تو ال محمد بن عبد الصمد کو انتہائی غضب ناک لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کو تو ال محمد بن عباس پر بھی ہیبت طاری تھی۔ ”اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ محمد بن عبد الصمد نے گھبرا کر کہا۔ ”میں نے تو امیر المومنین اور آپ کے حکم پر عمل کر دیا۔“

”اس کے جسم کے مزید ٹکڑے کر دو تا کہ یہ شور ختم ہو جائے۔“ حامد بن عباس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اس نے بدحواسی کے عالم میں نیا حکم جاری کر دیا۔

کو تو ال محمد بن عبد الصمد نے جلاد کو اشارہ کیا۔ پھر حضرت حسین بن منصور کے جسم کے بہت سے ٹکڑے کر دیئے گئے مگر شور ختم نہ ہوا۔ مقتل میں موجود ہر شخص ”انا الحق“ کی آواز سن رہا تھا۔

یہاں تک کہ رات سر پر آ گئی۔ حامد بن عباس کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ مجمع منتشر ہو گیا مگر اس طرح کہ اکثر چہروں پر اُداسی تھی اور اکثر ذہن پریشان تھے۔ کچھ آنکھوں میں اطمینان اور بہت سی آنکھوں میں دے دے غصے کے سائے تھے۔

حامد بن عباس، کو تو ال محمد بن عبد الصمد اور تمام سپاہی ساری رات مقتل میں موجود رہے۔ حامد بن عباس بار بار کو تو ال سے پوچھتا تھا۔ ”اس شور کو کیسے بند کیا جائے؟ اگر یہ بات بغداد میں عام ہو گئی تو اس کے لاکھوں نئے معتقد پیدا ہو جائیں گے۔“

کو تو ال، حامد بن عباس کے سوال کا کیا جواب دیتا؟ وہ تو خود دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ آخر رات گئے تک حامد بن عباس اپنے حامیوں سے مشورے کرتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ حلاج کے ٹکڑے ٹکڑے جسم کو اسی طرح مقتل میں چھوڑ دیا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آواز خود بخود بند ہو جائے گی۔

آخر حامد بن عباس حضرت منصور حلاجؒ کا سر لے کر مقتل سے چلا گیا۔

دوسرے دن بغداد کے باشندوں نے دیکھا کہ حضرت حسین بن منصورؒ کا خون آلود سر بغداد کے پل پر آویزاں ہے۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ خوف زدہ بھی تھے اور دل گرفتہ بھی۔ حامد بن عباس کے نقارچی چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

”یہ ان لوگوں کی سزا ہے جو مذہب اور حکومت کے خلاف باغیانہ اقدام کرتے ہیں۔“
دوسری طرف حضرت منصور حلاجؒ کے بکھرے ہوئے اعضاء کا وہی حال تھا۔ جسم کے ایک ایک ٹکڑے سے صدائے ”انا الحق“ ابھر رہی تھی۔

حامد بن عباس ناقابل بیان وحشت میں مبتلا تھا۔ آخر اس نے مقتول کی نعرہ زنی سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک اور حکم جاری کیا۔

”حلاجؒ کے بریدہ جسم کو آگ لگا دی جائے۔“

حضرت حسین بن منصورؒ کے بدن کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر دفن بھی کیا جاسکتا تھا مگر ان کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا۔ پہلے ان کے اعضاء کاٹے گئے جو ایک غیر اسلامی فعل تھا۔ جو مذہب ایک پاگل کتے کو بھی ”مثلاً“ کرنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ ایک انسان کے ساتھ یہ وحشیانہ برتاؤ کس طرح گوارہ کرے گا؟

کچھ دیر کے لئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ شریعت کی نظر میں گناہ گار تھے اور ان کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ نتیجتاً انہیں ایک ہی وار میں قتل کر کے حامد بن عباس اور اس کے حامیوں کے بقول اس فتنے سے نجات حاصل کر لی جاتی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مفتیانِ وقت کی موجودگی میں ایک شخص کو ایسی دردناک سزائیں دی گئیں جن کے تصور سے بھی انسانی رو نگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
اب اس کے مُردہ جسم کو آگ میں جلانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ جیسے مرنے والا اپنی زندگی میں آگ کا

پجاری رہا ہو۔

فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کا کہا ہے کہ حلاجؒ کے جسم کو تیل سے بھلویا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ جب حلاجؒ کے جسم کو آگ لگائی گئی تو ایک شخص وہاں موجود تھا۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم کے ٹکڑے بھڑکتی ہوئی آگ پر پیچ و تاب کھاتے رہے یہاں تک کہ گوشت اور ہڈیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ حضرت خطیب بغدادی نے اس شخص کا نام ظاہر نہیں کیا۔ صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص کو تو ال محمد بن عبدالصمد تھا اور غالباً یہ اسی کا بیان ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خطیب بغدادی نے حضرت منصور حلاجؒ کو دی جانے والی تمام سزاؤں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے..... مگر شورِ انا الحق کے بارے میں کوئی روایت پیش نہیں کی۔ تذکرۃ الاولیاء اور

”تاریخ قزوینی“ میں یہ واقعہ اجمالی طور پر موجود ہے۔

فرانسیسی عالمِ لوئی ماسینیون کہتا ہے کہ حلاجؒ کی خاستر کو ایک مینار کی بلندی سے دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کا بیان ہے کہ جیسے ہی حضرت منصورؒ کی راکھ دریا میں ڈالی گئی، دجلہ کے پانی میں ایک تغیر رونما ہونے لگا۔ کچھ دیر پہلے یہی دریا سکون کی حالت میں بہہ رہا تھا۔ حلاجؒ کی راکھ پڑتے ہی موجیں سر اُبھارنے لگیں اور دریا کا پانی تیزی سے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ شدید طغیانی کے آثار پیدا ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دجلہ کا پانی کناروں سے باہر نکلنے لگا۔

حامد بن عباس اور دیگر اراکین سلطنت حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ بارش کے بغیر دریا میں سیلاب کہاں سے آگیا؟

طغیانی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بغداد کے غرق ہو جانے کے آثار پیدا ہو گئے اور لوگ خوف زدہ تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

”یہ قتل منصور کی پاداش ہے۔“

یہ ایک ہجوم میں سے ایک تیز آواز اُبھری۔

”ہاں! یہ میرے شیخ کے قتل کا بدلہ ہے جو قدرت تم سے لے رہی ہے۔ تم تھوڑی ہی دیر میں اپنی آنکھوں سے پورے بغداد کو غرق ہوتے ہوئے دیکھو گے۔“

حامد بن عباس یہ آواز سن کر چونک اٹھا۔ پھر اس نے کوتوال محمد بن عبدالصمد سے کہا۔

”تلاش کرو کہ یہ کون شخص ہے؟“

کوتوال نے پکار کر کہا۔

”جس نے بغداد کے غرق ہونے کی بات کہی ہے، وہ شخص سامنے آئے کیونکہ یہ مخلوق خدا کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔“

کوتوال کی پکار سن کر ایک شکستہ حال شخص آگے بڑھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ ”ہاں میں نے ہی یہ بات کہی ہے کہ دریائے دجلہ میں ایک خوفناک طوفان آئے گا اور پورا بغداد غرق ہو جائے گا۔“

”اے شخص! تو کون ہے؟“ حامد بن عباس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تو کس بنیاد پر بغداد کی تباہی کا دعویٰ کر رہا ہے؟“

”میں دعویٰ نہیں کر رہا ہوں، تم کھلی آنکھوں سے پانی کا یہ بیچ و تاب دیکھ رہے ہو۔“ اس شخص نے بے باکانہ انداز میں کہا۔ ”میں اپنے شیخ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔“

دریائے دجلہ کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر حامد بن عباس کا سارا غصہ اور طغیانی ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ اس شخص سے بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”کیا تیرے شیخ نے کہا تھا کہ اس کے قتل کے بعد دریا میں طغیانی آجائے گی؟“

”ہاں! میرے شیخ نے فرمایا تھا کہ ان کے جسم کو جلادیا جائے گا۔“ خادم نے روتے ہوئے کہا۔ ”پھر جب ان کی راکھ دریا میں ڈالی جائے گی تو دجلہ بے قابو ہو جائے گا۔“

اس میں حیل و حجت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ حامد بن عباس اپنی آنکھوں سے دریائے دجلہ کو بے قابو

ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”تیرے شیخ نے کچھ اور بھی کہا تھا؟“ حامد بن عباس بدحواس نظر آ رہا تھا۔

”ہاں! شیخ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جب سرکش موجیں کناروں سے نکل جائیں تو میرا خرقہ دریا کو دکھا دینا۔ دجلہ پر سکون ہو جائے گا۔“ خادم نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے وہ خرقہ؟“ حامد بن عباس نے گھبرا کر خادم سے پوچھا۔

”میرے پاس محفوظ ہے۔“ خادم نے جواب میں کہا۔

”تو خرقے کی حفاظت کر رہا ہے اور شہر بربادی کے قریب پہنچ چکا ہے۔“ حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے خدمت گار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اگر شیخ کی وصیت نہ ہوتی تو میں کبھی اس راز کو فاش نہ کرتا۔“ خادم نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔

”جب میرا مخدوم ہی نہ رہا تو پھر یہ شہر باقی رہے یا غرقاب ہو جائے۔“

”کیا باقی رہے گا اور کیا ختم ہو جائے گا؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔“ حامد بن عباس پر وحشت طاری تھی جس کے حکم سے حضرت منصور حلاجؒ کے اعضاء کاٹے گئے..... اور جو زندگی بھر ایک جانباز موحّد کو زندیق و ساحر سمجھتا رہا..... اور جس نے کو تو ال محمد بن عبدالصمد کو تنبیہ کی تھی کہ اگر حلاجؒ تجھے دریائے دجلہ میں سونا چاندی بہتا ہوا دکھا دے، تب بھی ہاتھ نہ روکنا اور کوڑوں کی سزا جاری رکھنا..... اب وہی شخص حضرت حسین بن منصورؒ کے خادم سے التجا کر رہا تھا۔

کچھ دیر کے لئے ہم نے تسلیم کر لیا کہ حضرت منصور حلاجؒ ایک شعبہ باز اور جادوگر تھے۔ پھر یہ کیسا عجیب انقلاب تھا کہ حامد بن عباس دریائے دجلہ میں اٹھنے والے طوفان کو روکنے کے لئے اسی جادوگر کا خرقہ طلب کر رہا تھا۔ بعض مؤرخین نے حامد بن عباس کی شان میں بہت قصیدے پڑھے ہیں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور ایک زندیق ساحر کی فتنہ انگیزیوں سے عالم اسلام کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ پھر حامد بن عباس ایک کافر اور جادوگر کی شعبہ بازیوں سے کیوں متاثر ہو گیا؟ اس نے اہل بغداد کو مخاطب کر کے یہ بات کیوں نہیں کہی کہ دریا میں اٹھنے والے طوفان کا تعلق اس شعبہ باز کی راکھ سے نہیں ہے..... اور اگر بالفرض خاکستر منصور ہی کے اثر سے دریائے دجلہ میں تلاطم برپا ہوا تھا تو حامد بن عباس نے بغداد کو غرق ہو جانے دیا ہوتا اور ایک جادوگر کے خرقے سے معاونت طلب نہ کی ہوتی۔ اہل ایمان مرجانا پسند کرتے ہیں مگر غیر اللہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حامد بن عباس اور اس کے ساتھیوں کو بھی اپنے عقائد کی اسی مضبوطی کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا۔ یہ تو اہل اللہ کی شان ہے۔ حامد بن عباس کو تو اپنی زندگی اور کرسی عزیز تھی۔ وہ زبان و بیان کی حد تک خدمت اسلام کا مدعی تھا۔ پھر جب بغداد کی غرقابی کا اندیشہ پیدا ہوا تو وہ اسی ”جادوگر“ کے لباس سے مدد حاصل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

آخر حامد بن عباس کے برق رفتار شہسوار حضرت منصور حلاجؒ کے خادم کو گھوڑے کی پشت پر سوار کر کے اسے اس کے مکان تک لے گئے۔ پھر خادم اپنے شیخ کا خرقہ لے کر دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی بیان کردہ روایت کے مطابق جیسے ہی خادم نے حضرت حسین بن

منصورؒ کا خرقہ دریا کے مقابل کیا، لہروں کا سارا بیچ و تاب ختم ہو گیا اور دجلہ پہلے کی طرح پرسکون نظر آنے لگا۔

تذکرۃ الاولیاء میں درج ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کی بکھری ہوئی راکھ سمٹ کر ساحل پر آگئی جسے لوگوں نے نکال کر دفن کر دیا۔



مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف ”سیرت منصور حلاجؒ“ میں ”تذکرۃ الاولیاء“ کی روایت کو قدرے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سولی دینے کے لئے باہر لایا گیا تو آپؒ نے اپنے ایک مرید کو طلب کر کے فرمایا۔

”جب میری راکھ دجلہ میں ڈالی جائے گی، اس وقت ایک سخت طوفان آئے گا جس سے بغداد کے غرق ہو جانے کا خطرہ ہوگا۔ اس وقت تم میرا خرقہ دریا میں ڈال دینا۔ دجلہ پرسکون ہو جائے گا۔“ چنانچہ جب سولی دے کر حضرت منصور حلاجؒ کے جسم کو جلایا گیا اور راکھ دریا میں ڈالی گئی، یکایک طوفان آگیا اور راکھ کے ہر ذرے سے ”انا الحق“ کا شور بلند ہوا۔ پانی اس قدر بڑھا کہ بغداد کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت مرید نے اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق حضرت حسین بن منصورؒ کا خرقہ دریا میں ڈال دیا۔ چند لمحوں میں دریا پرسکون ہو گیا اور شور انا الحق بھی بند ہو گیا۔



علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ نے اپنی کتاب ”آثار البلاد و اخبار العباد“ میں قدرے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے جو اس وقت بھی ڈھا کا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ آپ حضور اکرم ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ بن مالک کی اولاد ہیں۔ علامہ زکریا محمد بن قزوینیؒ فرماتے ہیں۔

”جب حضرت منصور حلاجؒ قتل کے لئے زنداں سے نکالے گئے تو آپؒ نے ایک دربان کو بلا کر فرمایا۔ ”جب مجھے جلایا جائے گا تو دجلہ کا پانی بڑھنے لگے گا۔ یہاں تک کہ بغداد غرقابی کے نزدیک پہنچ جائے گا۔ جب تم یہ حالت دیکھو تو میرے جلے ہوئے جسم کی تھوڑی سی راکھ پانی میں ڈال دینا، دجلہ پرسکون ہو جائے گا۔“

چنانچہ جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سولی دے دی گئی اور پھر ان کے جسم کو جلا دیا گیا تو اچانک دریائے دجلہ میں ہلچل پیدا ہوئی اور کسی موسمی تغیر کے بغیر پانی بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ بغداد کے غرق ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

چند اراکین سلطنت نے فوری طور پر عباسی خلیفہ تک یہ خبر پہنچائی جسے سن کر مقتدر بالله پریشان ہو گیا۔ اس نے خبر دینے والوں سے پوچھا۔ ”کیا حلاجؒ نے اس سلسلے میں کوئی بات کہی تھی؟“ خبر دینے والوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ خلیفہ مقتدر بالله نے کہا۔ ”ان لوگوں سے دریافت کرو جو

زنداں میں حلاج کی نگرانی پر مامور تھے۔“

پھر اس دربان کو عباسی خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو رات کے وقت پہرہ دیا کرتا تھا۔
”حلاج نے تجھ سے کچھ کہا تھا؟“ مقتدر باللہ، دریائے دجلہ میں بڑھتی ہوئی طغیانی کی خبر سن کر بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”ہاں امیر المومنین! حلاج نے زنداں سے رخصت ہوتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔“ قید خانے کے نگہبان نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

”جلدی کرو..... جلدی کرو.....!“ مقتدر باللہ بدحواس ہو گیا تھا۔ ”حلاج کے کہنے کے مطابق عمل کرو اور بغداد کو تباہی سے بچالو۔“

نتیجتاً حضرت حسین بن منصورؒ کی راکھ پانی میں ڈال دی گئی جس کے ہر حصے سے ”اللہ“ کا نقش دریا کی سطح پر ابھر آیا اور چند لمحوں میں دجلہ پر سکون ہو گیا۔

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ نے اس کے آگے کا حال تحریر نہیں کیا ہے۔ بظاہر ”آثار البلاد“ اور ”تذکرۃ الاولیاء“ کی روایات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے مگر یہ واقعہ کم و بیش ہر تاریخ میں موجود ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے جسم کو جلایا گیا تھا اور پھر ان کی راکھ دجلہ میں ڈال دی گئی تھی۔ اس کے بعد دریا کا پانی سیلاب کی کیفیت اختیار کر گیا تھا..... اور طغیانی کو حضرت منصور حلاجؒ کے مریدوں نے ان کی کرامت سے تعبیر کیا تھا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس واقعہ میں حضرت منصور حلاجؒ کی کرامت کے علاوہ ان کے صادق اور حق پرست ہونے کی دلیل بھی موجود ہے۔ معاذ اللہ! اگر وہ صاحب باطل (زندیق، کافر اور جادوگر) ہوتے تو اپنے دشمنوں کے حال پر رحم کیوں فرماتے؟ بلکہ خود ان کے غرق ہو جانے کی تمنا کرتے۔ اور اگر حضرت حلاجؒ کا بس چلتا تو اپنے تصرف روحانی کو کام میں لا کر اس سے بھی بڑی کوئی مصیبت اہل بغداد پر نازل کر دیتے..... مگر وہ عارف، صادق اور صاحب حق تھے۔ اس لئے دشمنوں کی دشمنی پر نظر نہیں کی..... بلکہ اپنی عارفانہ خیر خواہی اور ہمدردی کو کام میں لائے کیونکہ عارف اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے، بدخواہ ہرگز نہیں ہوتا۔“

آفات و مصائب پر مسکراتے ہوئے صبر کرنا اور ایذا پہنچانے والوں کے لئے دعائے خیر کرنا، دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اور یہی سرور کونین حضور اکرم ﷺ کی معروف ترین سنت ہے۔ حضرت منصور حلاجؒ سے لاکھ کوئی اختلاف کرے مگر زیر شمشیر ستم رقص کرنا اور اپنے دشمنوں کو دعاؤں سے سرفراز کرنا ان کی خاص عادت تھی..... اور یہ عادت اولیاء کے سوا کسی انسانی طبقے میں نہیں ملتی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مادہ پرست لوگوں نے بھی مقتل میں پہنچ کر بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا ہے مگر ان لوگوں نے اپنے دشمنوں کو دعائیں نہیں دیں۔ بس حضرت حسین بن منصورؒ کی استقامت اور مادہ پرستوں کی شجاعت میں یہی بنیادی فرق ہے۔



اب ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں حضرت منصور حلاجؒ کے اس نعرے پر بحث کریں گے جو خاص و عام میں مشہور ہے۔ یعنی نعرہ ”انا الحق“ (میں حق ہوں) عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ”انا الحق“ کہنے کی وجہ سے حضرت منصور حلاجؒ شرعی عدالت میں مجرم قرار پائے اور پھر انہیں بڑے سنگ دلانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ کی روایت ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ نے ”انا الحق“ کہنا شروع کیا تو لوگ ان سے بے اعتقاد ہو گئے اور ان کے بارے میں مخالفانہ گفتگو کرنے لگے۔ بعض دوستوں اور ساتھیوں نے سمجھایا۔ ”حسین! ”انا علی الحق“ کہو۔ جس کا مفہوم ہے کہ میں حق پر ہوں۔“

جواب میں حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”نہیں، میں انا الحق ہی کہوں گا۔“ اس کے بعد آپؒ نے یہ اشعار پڑھے۔

”میں عین محبوب ہوں..... اور محبوب میرا عین ہے۔“

”ہم دور و حیں ہیں جو ایک بدن میں حلول کئے ہوئے ہیں۔“ (ترجمہ)

علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ کے مطابق حضرت حسین بن منصورؒ کا یہ قول بھی مشہور ہے۔ آپؒ بڑے والہانہ انداز میں کہا کرتے تھے۔

”مجھے تجھ پر اور اپنے آپ پر بڑا تعجب ہے۔ تُو نے اپنے ساتھ مشغول کر کے مجھے اپنے آپ سے فنا کر دیا۔ پھر اپنے سے اتنا قریب کیا کہ مجھے گماں ہونے لگا کہ ”تُو“ میں ہے۔“

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے بقول یہ اشعار حضرت منصور حلاجؒ کے نہیں ہیں، وہ اپنے غلبہ شوق کی مثال دینے کے لئے کبھی کبھی مذکورہ اشعار پڑھ دیا کرتے تھے..... اور اگر بالفرض ان اشعار کا تعلق حضرت حسین بن منصورؒ سے ثابت ہو جائے، تب بھی یہ بات تسلیم شدہ نہیں کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو مخاطب کیا ہو۔ ان کی مراد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہو سکتی ہے اور شیخ بھی ان کا مطلوب و مقصود ہو سکتے ہیں۔

امام ابو نصر عبد اللہؒ ان اشعار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے خطاب ہے..... جب عشق مجازی میں انسان کا یہ حال ہوتا ہے تو عشق حقیقی میں اس پر کیا گزرتی ہوگی؟ حضرت منصور حلاجؒ نے ان اشعار کے ذریعے اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔“

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ ”اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت حلاجؒ نے حق تعالیٰ کو مخاطب کیا تھا، تب بھی ان کی مراد اتحاد یا حلول سے نہیں۔“ حضرت حسین بن منصورؒ علماء کی جماعت کے سامنے بارہا اپنا عقیدہ توحید ظاہر کر چکے تھے..... اور قتل کے وقت بھی انہوں نے اسی ذات واحد کو پکارا تھا۔

حضرت امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں حضرت منصور حلاجؒ کے کئی اقوال پیش کئے ہیں۔ ایک موقع

پر حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

”اور جو چیز اس کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی، وہ اس میں کس طرح حلول کر سکتی ہے؟ اتحاد تو ”حال اور محل“ میں ہوتا ہے حادث، قدیم کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔“

(انسان اور دیگر مخلوقات حادث کہلاتی ہیں اور اللہ کی ذات قدیم ہے)

”اور جس چیز کو اس نے نشوونما دیا، اس کی طرف کیوں کر پہنچ سکتی ہے؟“

”آنکھیں اسے اپنے اندر نہیں لے سکتیں اور گمان ان کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا۔“

”اس کا قرب یہ ہے کہ مکرم (معزز) بنادے اور دوری یہ ہے کہ ذلیل کر دے۔“

”وہ اول بھی ہے اور آخر بھی..... باطن بھی ہے اور ظاہر بھی..... قریب بھی ہے اور بعید بھی.....

اس کے مثل کوئی شے نہیں۔ وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔“

یہ ہیں وہ چند اقوال جنہیں پڑھ کر ایک عام مسلمان بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت منصور حلاجؒ کا

عقیدہ تو حید کیا تھا؟

علمائے تحقیق کے نزدیک حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت منصور حلاجؒ کا عقیدہ تو حید ایک ہی تھا۔ ہم

اپنے مضمون ”حضرت جنید بغدادیؒ“ میں اس واقعے کی تفصیلات پیش کر چکے ہیں کہ جب حضرت شیخؒ نے

عام مجلسوں میں ”توحید“ پر گفتگو کی تھی تو علمائے بغداد ان سے بھی ناراض ہو گئے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک

پہنچی کہ خلیفہ مقتدر باللہ نے تمام صوفیائے عراق کے ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ کے قتل کا بھی فرمان جاری

کر دیا تھا۔ آخر حضرت جنید بغدادیؒ کو قاضی القضاۃ کے سامنے اقرار کرنا پڑا تھا کہ صوفیاء کی جماعت سے

ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف ایک عالم اور فقیہ ہیں۔ اس واقعے کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ نے

عام لوگوں پر اپنی مجلسوں کے دروازے بند کر دیئے تھے۔

حضرت منصور حلاجؒ کی طرح تمام صوفیائے عراق پر کافرو زندقہ ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ان

بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ حضرت حسین بن منصورؒ کی طرح عقیدہ حلول کے

قائل ہیں۔ (حلول کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ انسان کی ذات میں سما جاتا ہے یا انسان اللہ کی ذات میں جذب

ہو جاتا ہے)

حضرت حسین بن منصورؒ کی طرح ان صوفیائے عراق کو بھی زنجیریں پہنا کر قتل میں لے جایا گیا تھا۔

آخر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کی ایک جرأت مند تقریر نے صوفیائے کرام کی جانیں بچائیں۔ خلیفہ معتقد

باللہ نے اپنا حکم واپس لیا اور اس جارحانہ اقدام پر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ سے معذرت کی۔

یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب موڑ ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ جس نے قتل کے فتوے پر اپنی مہر ثبت کی، وہ

خلیفہ معتقد باللہ کا بیٹا تھا۔

اور حضرت منصور حلاجؒ جنہیں انتہائی سفاکانہ انداز میں قتل کیا گیا، وہ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کے

شاگرد تھے۔



”تذکرۃ الاولیاء“ میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ کے پاس مسلسل خبریں پہنچنے لگیں کہ ابن منصورؒ ”انا الحق“ کہتا ہے تو مقتدر باللہ نے قتل کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد لوگوں نے منصورؒ کو سمجھایا۔ ”انا الحق نہیں، ہوا الحق کہو۔“

لوگوں کی نصیحت سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”ہاں! سب کچھ وہی ہے مگر تم لوگ کہتے ہو کہ وہ غائب ہے..... اور حسین کہتا ہے کہ میں غائب ہوں۔ بحر محیط بھی کہیں غائب یا گم ہوا کرتا ہے۔“

علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”وحدت الوجود کی اجمالی حقیقت یہ ہے کہ ممکنات کا وجود نظر سے غائب ہو جائے۔ اسے حقیقت نہیں کہتے کہ ممکنات کو خدا مان لیا جائے۔ حضرت منصور حلاجؒ کے نزدیک ”انا الحق“ کے معنی یہ ہیں کہ میں کچھ نہیں۔ یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ میں سب کچھ ہوں۔“

جب حضرت حسین بن منصورؒ کے ساتھی ان سے پوچھتے۔ ”شیخ! تم انا الحق کیوں کہتے ہو؟“

جواب میں حضرت منصور حلاجؒ فرماتے۔ ”میں انا الحق نہیں کہتا، کوئی اور کہتا ہے۔“

دوست حیران ہو کر کہتے۔ ”حسین! تمہاری یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔“

حضرت منصور حلاجؒ فرماتے۔ ”میرے سارے اختیارات سلب کئے جا چکے ہیں، میں مجبور محض

ہوں..... اور اس کے سوا کچھ نہیں۔“

”شیخ! آپ ہی اس مجبوری کی وضاحت کر سکتے ہیں۔“ دوست عرض کرتے۔

حضرت حسین بن منصورؒ فرماتے۔ ”انبیائے کرام علیہم السلام احوال و کیفیات پر غالب اور ان کے

مالک ہوتے ہیں، وہ احوال (کیفیات) کو پلٹ دیتے ہیں مگر احوال انہیں پلٹنے کی طاقت نہیں رکھتے۔“

حضرت منصور حلاجؒ کے اس قول مبارک کی تشریح یہ ہے کہ دنیا میں صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی

ذات پاک ایسی ہے جو انتہائی جذب کی حالت میں بھی پورے ہوش و حواس رکھتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے

لئے بھی بے خبر نہیں ہوتے۔ رسول اور نبی سے زیادہ قدرت حق کا مشاہدہ کون کر سکتا ہے۔ ایک رسول اور

نبی سے زیادہ کس انسان پر محبت کا غلبہ ہو سکتا ہے..... مگر چونکہ یہ برگزیدہ ہستیاں رشد و ہدایت کے

منصب عظیم پر فائز ہوتی ہیں، اس لئے ہمہ وقت ہوش میں رہتی ہیں۔ ان کا عہدہ منصبی اس بات کا متقاضی

ہوتا ہے کہ وہ جذبہ عشق سے سرشار ہونے کے باوجود مناظر قدرت حق میں گم نہیں ہوتے..... اور اگر

کبھی گم بھی ہوتے ہیں تو اس وقت ان کا تعلق مجلس اور مخلوق سے نہیں ہوتا۔ وہ عین خلوت کی کیفیت ہوتی

ہے اور خلوت میں حق کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس وہ اولیاء جو پوری طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہوتے

ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہوتی ہے یعنی وہ اپنے احوال پر غالب ہوتے ہیں..... مگر درجہ کمال تک

پہنچنے سے پہلے ان پر احوال و کیفیات ہی غالب رہتے ہیں۔ نتیجتاً حضرت منصور حلاجؒ نے اس بات کا

اقرار کرتے ہوئے فرمایا۔

”مجھ پر حال کی حکومت ہے اور ایک خاص کیفیت کا غلبہ ہے۔“



مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء، حضرت منصور حلاجؒ سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار آپؒ نے اپنے ایک خادم خاص کو حضرت حسین بن منصورؒ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔ ”شیخ! جو بات تم نے کہی ہے، اس سے توبہ کر لو۔ شاید تمہیں قید خانے سے رہائی مل جائے۔“ حضرت ابن عطاء کا پیغام سن کر حضرت منصور حلاجؒ نے ان کے خادم سے فرمایا۔ ”ابن عطاء کو میرا سلام کہنا..... اور اپنے شیخ سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نے یہ بات کہی ہے، اس سے کہو کہ وہ توبہ کر لے۔“

تذکرۃ الاولیاء میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کی روایت ہے کہ جب خادم نے حضرت منصور حلاجؒ کے الفاظ دہرائے تو حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ رو پڑے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”ہم تو خود حسین بن منصورؒ کے ادنیٰ غلام ہیں۔“

(یعنی ہماری کیا مجال کہ اس معاملے میں دخل دیں)

اب ہم حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ کی زندگی کا وہ تاریخ ساز واقعہ بیان کریں گے جس سے ایک طرف آپ کی بے مثال شجاعت و استقامت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف حضرت منصور حلاجؒ سے بے پناہ عقیدت کا۔

یہ حضرت منصور حلاجؒ کے قتل سے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ ابھی ان کے خلاف ”حلال الدم“ کا فتویٰ نہیں دیا گیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ایک روز حامد بن عباس نے حضرت حسین بن منصورؒ سے سوال کیا۔

”شہر بغداد میں بہت سے صوفی ہیں۔ کیا کوئی ایک شخص بھی تیرے عقیدے کی درنگی پر گواہی دے سکتا ہے؟“

حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

”بے شک! دارالخلافت میں بہت سے صوفی ہیں مگر یہاں صرف تین افراد مجھے پہچانتے ہیں۔ وہ میرے کلام پر شہادت دے سکتے ہیں۔ ایک شیخ ابو محمد جریریؒ دوسرے شیخ ابوبکر شبلیؒ اور تیسرے شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ۔“

جب حامد بن عباس ان تینوں بزرگوں کو طلب کرنے کے لئے اپنے خادم کو بھیجنے لگا تو حضرت حسین بن منصورؒ نے فرمایا۔

”شیخ ابو محمد جریریؒ اور شیخ ابوبکر شبلیؒ حقیقت کو چھپاتے ہیں..... اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ۔“

واضح رہے کہ حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کے خلیفہ اول تھے اور حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ شاگرد خاص۔ چونکہ حضرت منصور حلاجؒ بھی حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید یا شاگرد تھے، اس لئے ان

دونوں بزرگوں سے آپؐ کا رشتہ خاص تھا۔ اس کے باوجود حضرت منصور حلاجؒ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شیخ ابو محمد جریریؒ اور شیخ ابو بکر شبلیؒ ان کے معاملے میں گواہی دینے سے معذور ہوں گے۔

الغرض حامد بن عباس نے تینوں بزرگوں کو اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔ حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ اور حضرت شیخ ابو بکر شبلیؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کی موافقت سے انکار کر دیا۔

حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کو مخاطب کرتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ ”سن لیا تو نے؟ یہ دونوں بزرگ تیرے عقیدے سے انکار کرتے ہیں۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دونوں اخفائے راز کرتے ہیں۔ اس لئے میرے حال پر گواہی نہ دے سکیں گے۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔

حضرت شیخ ابو محمد جریریؒ اور حضرت شیخ ابو بکر شبلیؒ واپس چلے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کے رخصت ہو جانے کے بعد حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء تشریف لائے۔ حامد بن عباس نے ان سے پوچھا۔

”تم حلاجؒ کے عقیدے کی تصدیق کرتے ہو؟“

حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ نے فرمایا۔ ”یہ عقیدہ درست ہے۔ میں اس کا معتقد ہوں اور جس کا یہ اعتقاد نہ ہو، وہ بے اعتقاد ہے۔“

حامد بن عباس کو یقین نہیں تھا کہ حضرت ابن عطاءؒ اس قدر بے باکانہ انداز میں حضرت حسین بن منصورؒ کی حمایت کریں گے۔ ابھی وزیر مملکت حضرت ابن عطاءؒ کے جواب پر حیران ہو رہا تھا کہ حضرت شیخ نے حامد بن عباس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”میں وزیر سلطنت ہوں۔“ حامد بن عباس نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”صرف میری یہی ذمہ داری نہیں کہ میں امور مملکت کی نگرانی کرتا رہوں۔ عوام کے عقاید پر نظر رکھنا میرا اسلامی فریضہ ہے۔“

”تم جس کام کے لئے مقرر کئے گئے ہو، بس اسی کو انجام دیتے رہو۔“ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ نے کسی جھجک کے بغیر فرمایا۔

”آخر میں کس کام کے لئے مامور کیا گیا ہوں؟“ غالباً حامد بن عباس حضرت شیخ ابن عطاءؒ کا اشارہ سمجھ گیا تھا، اس لئے اس کے لہجے میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی۔

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ جس وزیر مملکت نے فقہان کرام اور مفتیان وقت کو جبری فتوے پر مجبور کر دیا تھا، حضرت شیخ ابن عطاءؒ جانتے تھے کہ وہی وزیر مقتدر باللہ کے دور حکومت میں کتنا طاقت ور اور کس قدر با اختیار تھا؟ حامد بن عباس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنا ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی شخص بیٹھے بیٹھے آفات و مصائب کو کھلی دعوت دیدے۔ حضرت شیخ ابن عطاءؒ اس راز سے واقف تھے۔ وقت کی مصلحت اور نزاکت کے پیش نظر حضرت شیخؒ کو خاموش رہنا چاہئے تھا..... مگر پھر سچ کون بولتا؟ کسی کو تو حرف حق زبان پر لانا تھا۔ اگر بالفرض حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ بھی سکوت اختیار کرتے تو پھر بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی؟ وقت کا غیر جانب دار مورخ تو صاف صاف لکھ دیتا کہ حامد بن عباس کے عہد اقتدار میں

بڑے بڑے زہاد، بڑے بڑے فقہاء اور بڑے بڑے باکردار انسان موجود تھے..... مگر کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو ظلم کے خلاف عملی احتجاج کر سکے یا کم سے کم ایک ظالم کو حقیقت کے آئینے میں اس کے مکروہ خدو خال ہی دکھا سکے۔ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ آخر ایسی قیامت خیز ساعتوں میں بارِ امانت کون اٹھاتا؟ زمانہ کتنا بھی خراب ہو مگر ہمیشہ سے حق تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ ”صنم خانہ عصر“ میں ایک نہ ایک اذان دینے والے کو باقی رکھتا ہے۔ انجام کار حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ تو اس جسم کے ساتھ آگے بڑھے اور پہاڑ سے بھی زیادہ گراں بوجھ اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھالیا۔

”تمہیں اس کے سوا کیا کام ہے کہ لوگوں کا مال غصب کرتے رہو۔“ حضرت شیخ ابن عطاءؒ اپنے انجام سے قطعاً بے پرواہ ہو گئے تھے۔ اس لئے آپؒ نے انتہائی پُر جلال لہجے میں حامد بن عباس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تمہارے عہد و منصب کا تقاضا اس کے سوا کیا ہے کہ تم بندگانِ خدا پر ظلم کرتے رہو اور ناحق ان کا خون بہاتے رہو۔“

جیسے ہی حضرت شیخ ابن عطاءؒ کی زبان مبارک سے یہ آتشیں الفاظ ادا ہوئے، حامد بن عباس کا پیرہن اقتدار جل اٹھا۔ حیرت و غضب کی شدت سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔

”تمہیں ان بزرگوں کے کلام سے کیا تعلق ہے؟ تم اسے کیا سمجھو گے؟“ حضرت شیخ ابن عطاءؒ نے وقت کی عدالت میں اپنا مکمل بیان قلم بند کرا دیا۔

حامد بن عباس نے اب تک کوئی ایسا گواہ نہیں دیکھا تھا جو ایک مظلوم کے حق میں شہادت دینے کے ساتھ ساتھ ظالم کے اعمال کا بھی محاسبہ کرتا ہے۔ آخر وزیر مملکت کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ حضرت شیخ ابن عطاءؒ کے آئینے میں اپنا کر یہہ النظر چہرہ دیکھتے ہی حامد بن عباس خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے با آواز بلند اپنے سپاہیوں سے کہا۔

”جس منہ سے اس نے یہ بات کہی ہے، اسی منہ پر گھونے مارو۔“

حامد بن عباس کے غلاموں نے حضرت شیخ ابن عطاءؒ کے جبرڑوں پر گھونے مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت شیخ ابن عطاءؒ نے حاکم حقیقی کے سامنے فریاد کی۔ ”اے اللہ! آپؐ نے اس شخص کو کس گناہ کی سزا میں مجھ پر مسلط فرمایا ہے کہ میں اس کے پاس چلا آیا۔“

یہ سن کر حامد بن عباس اور بھی غضب ناک ہو گیا۔ ”اس کے سر پر اتنے جوتے مارو کہ یہ اٹھا ہوا سر میرے سامنے جھک جائے۔“ وزیر مملکت نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

مورخ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاءؒ کے سر پر اتنی ضربیں لگائی گئیں کہ ان کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکھڑائے اور فرش پر گر پڑے۔

”اسے بھی حلاجؒ کی طرح حوالہ زنداں کر دو۔“ حامد بن عباس نے ایک اور بزرگ صوفی کو قید خانے میں ڈالنے کا حکم جاری کر دیا۔

بعض مصاحبوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”آپؐ ایسا نہ کریں۔ شیخ ابن عطاءؒ کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے۔

عام مسلمان ان کی اسیری کی خبر سن کر بگڑ جائیں گے۔“

رعایا کی برکشتگی کے خیال سے حامد بن عباس نے اپنا ارادہ بدل دیا..... اور حضرت شیخ ابن عطاء کو اس حالت میں گھر بھیج دیا گیا کہ ان کے دونوں نعتوں سے مسلسل خون جاری تھا۔

پھر جب حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کو گھر پہنچایا گیا تو آپؑ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں حاکم کون و مکاں کے دربار میں عرض کیا۔

”اے اللہ! اس وزیر کو قتل کر اور بری طرح قتل کر۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے۔“

طویل ایذا رسانی کے دوران حضرت شیخ ابن عطاء کے جسم مبارک سے بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ پھر یہ کہ بروقت علاج بھی نہ ہو سکا۔ نتیجتاً اس واقعے کے ایک ہفتے بعد حضرت شیخ ابن عطاء انتقال فرما گئے۔

جب قید خانے میں حضرت منصور حلاجؒ نے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کی وفات کی خبر سنی تو بے اختیار رونے لگے۔ ”ان معاملات میں اپنا ایک ہی گواہ اور ایک ہی رازدار تھا۔ سو وہ بھی چل بسا۔ اللہ شیخ کی مغفرت کرے۔“

جب سپاہیوں نے حامد بن عباس کے سامنے حضرت شیخ ابن عطاء کی بددعا کا واقعہ بیان کیا تو وہ زور سے ہنسا۔

”اس جادوگر کی شعبدہ بازیوں نے میرا کیا بگاڑ لیا؟“ حامد بن عباس کا اشارہ حضرت حسین بن منصورؒ کی طرف تھا۔ ”اگر ابن عطاء اتنا ہی بڑا ولی باکرامت تھا تو مجھ پر کوئی آفت کیوں نہیں لے آیا؟“

الغرض حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کے انتقال کے پندرہ دن بعد حضرت منصور حلاجؒ کو دار پر کھینچ دیا گیا۔

اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرت حسین بن منصورؒ کے عقائد پر حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیفؒ اور شیخ ابوالعباس ابن عطاء جیسے بزرگوں کی گواہی کافی ہے۔ یہ دونوں بزرگ شریعت اور طریقت میں ”امام وقت“ کا درجہ رکھتے تھے۔ اگر انہیں حضرت منصور حلاجؒ کے مسلک پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ ہرگز ایک بے عقیدہ شخص کی حمایت نہ کرتے..... اور جہاں تک حضرت شیخ ابن عطاء کا معاملہ ہے تو انہوں نے حضرت منصور حلاجؒ کی عقیدت میں جان تک گنوا دی۔ اگر حضرت شیخ کو گمان بھی ہوتا کہ حضرت شیخ بن منصورؒ خدائی کے دعویدار ہیں تو ان جیسا حق گو کسی طرح خاموش رہتا؟ حضرت شیخ ابن عطاء تو اس شان کے بزرگ تھے کہ وہ برسر عام کہہ دیتے۔

”حلاجؒ سے کوئی تعلق نہ رکھو کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔“

اس طویل بحث کا حاصل یہ ہے کہ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ درست تھے۔ جو لوگ حضرت منصور حلاجؒ کے جذب و مستی کو سمجھنے سے قاصر رہے، ان کے نزدیک حضرت منصورؒ مورد الزام تھے..... اور جو حضرات غلبہ عشق کے اثرات مابعد سے آشنا تھے، ان کی نظر میں حضرت حسین بن منصورؒ ”موحد“ بھی تھے اور عاشق جانناز بھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت منصور حلاجؒ سے کہا جاتا تھا کہ تم ”انا الحق“ کیوں کہتے ہو؟ تو آپؑ

بے اختیار فرماتے تھے۔

”میں ”انا الحق“ نہیں کہتا، کوئی اور کہتا ہے۔“

جب ایک موقع پر ”انا الحق“ کے سلسلے میں لوگوں نے شدید اعتراض کیا تو حضرت منصور حلاجؒ نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

”مجھے شرابِ محبت پلا کر کہتے ہیں کہ نغمہ سرانہ ہو۔“

”حالانکہ اگر ”سرات“ کے پہاڑوں کو یہی شراب پلا دی جاتی جو مجھے پلائی گئی ہے تو وہ بھی گانے لگتے۔“ (سرات ایک قصبے کا نام ہے)

”سیلیبی کی آرزو یہ ہے کہ میں اس کی محبت میں مرجاؤں۔“

”اور اس کی یہ آرزو تو ہمارے نزدیک ہر چیز سے زیادہ آسان ہے۔“

بعض علماء نے حضرت منصور حلاجؒ کے نعرہ ”انا الحق“ پر دلائل کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

”حسین بن منصورؒ کا مشہور قول ہے کہ جو چیز اسی کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی وہ اس میں کیوں کر حلول کر سکتی ہے۔ حادث، قدیم کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔ (انسان حادث ہے اور اللہ کی ذات قدیم) اس لئے جو لوگ حضرت منصور حلاجؒ پر ”حلول اور اتحاد“ کے عقیدے کا الزام عائد کرتے ہیں، ان کا خیال درست نہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اول و آخر اور باطن و ظاہر سمجھتا ہو، اگر اس کی زبان سے کسی وقت ”انا الحق“ نکل گیا ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔ لہذا اس کے اقوال کی تاویل ضروری ہے۔“

آگے چل کر مولانا ظفر عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں۔ ”اور ایک تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت ابن منصورؒ کی زبان کلام حق کی ترجمان تھی۔ ان کی زبان سے اسی طرح ”انا الحق“ نکلا تھا جیسے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ لینے کے لئے گئے تھے، اچانک ایک درخت سے آواز آئی۔ ”اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں۔“ (سورۃ القصص۔ آیت 30)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ فرماتے ہیں۔ ”یہ درخت نہیں بول رہا تھا بلکہ اللہ کلام کر رہا تھا۔ درخت تو اس کلام کا مظہر تھا۔ اسی طرح اگر اولیاء نے کسی وقت ”انا الحق“ کہہ دیا تو وہ خود نہیں کہہ رہے تھے۔ کہنے والا اللہ تھا۔ اولیاء تو اس کلام کے مظہر تھے۔“

اس سلسلے میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ ”ظاہر ہے کہ درخت نے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین نہیں کہا تھا بلکہ اس وقت وہ کلام الہی کا ترجمان تھا۔ اسی طرح ابن منصورؒ کے متعلق بھی خیال کیا جاسکتا ہے۔ غلبہ واردات و حالات میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عارف کی زبان سے اللہ تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں۔ اسے سالکین یا صاحب حال سمجھ سکتے ہیں۔ پس یہ بات تو مانی جاسکتی ہے کہ ابن منصورؒ کی زبان سے ”انا الحق“ نکلا ہو مگر یہ تسلیم شدہ نہیں کہ ابن منصورؒ نے خود ”انا الحق“ کہا تھا۔“

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کو نعرہ ”انا الحق“ کی وجہ سے قتل نہیں کیا

گیا۔ ان کے قتل کا جواز صرف وہی ایک واقعہ تھا جس میں حضرت حسین بن منصورؒ نے کہا تھا کہ اگر کوئی عاجز شخص حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے گھر کو پاک صاف کر کے اس کا طواف کرے۔ یہ عمل حج کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ واقعہ بھی متنازع ہے کیونکہ حضرت منصور حلاجؒ کے بقول انہوں نے ”حج کا مضمون“ حضرت امام حسن بصریؒ کی کتاب سے مستعار لیا تھا۔

صرف علامہ زکریا بن محمد قزوینی نے اپنی کتاب ”آثار البلاد“ میں ”انا الحق“ کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کے بقول ”انا الحق“ کہنے کی وجہ سے لوگوں میں حضرت منصور حلاجؒ کی مخالفت کا جوش پیدا ہوا مگر قتل کے لئے اس بات کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ حامد بن عباس اور اس کے ساتھی قتل کا جواز ڈھونڈنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بحث کے دوران قاضی ابو عمر کی زبان سے غصے میں ”یا حلال الدم“ (اے جس کا خون جائز ہے) نکل گیا اور پھر ان ہی دو لفظوں کو بنیاد بنا کر ایک بے گناہ کا خون بہا دیا گیا۔

بہ لوح تربت من یافتہ از غیب تحریرے
کہ اس مقتول راجز بے گناہی نیست تعمیرے
(میری قبر پر ترغیب سے یہ تحریر لکھی گئی کہ بے گناہ کے سوا اس مقتول کا کوئی جرم نہیں تھا)



اکثر مؤرخین کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کی مقبولیت عوام الناس کے عقائد میں خلل انداز ہو رہی تھی۔ اس لئے کسی مذہبی فتنے کے خوف سے حامد بن عباس نے حضرت حسین بن منصورؒ کو قتل کرادیا۔ ہمارے نزدیک یہ ایک گمراہ کن تجزیہ ہے۔ مؤرخین کے تبصروں کو پڑھ کر ایک عام مسلمان قاری یہی سوچتا ہے کہ حامد بن عباس ایک با کردار وزیر تھا اور اپنے سینے میں خدمت اسلام کا درد رکھتا تھا۔ اگرچہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم مختصراً پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ دربار خلافت کا ایک با اثر شخص حاجب ابن نصر قشوری حضرت منصور حلاجؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں شغب بھی حضرت منصور حلاجؒ کے حلقہ عقیدت میں شامل تھی..... اور اس عقیدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وزیر حامد بن عباس پریشان ہو گیا۔ سیاسی اعتبار سے حاجب ابن نصر قشوری اس کا قریب ترین حریف تھا۔ حامد بن عباس کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر خلیفہ مقتدر باللہ بھی حضرت حسین بن منصورؒ کے زیر اثر آ گیا تو ابن نصر قشوری دربار خلافت کا طاقت ور ترین مہرہ بن جائے گا..... اور وہی مہرہ بالآخر اسے شکست سے دوچار کر دے گا۔ نتیجتاً حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ کیونکہ ان ہی کی روحانی شخصیت کے سائے میں خاندان شاہی کے افراد جمع ہو رہے تھے۔ حامد بن عباس نے جس کو مذہبی فتنہ قرار دیا تھا، دراصل وہ ایک سیاسی فتنہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت حسین بن منصورؒ کی آڑ لے کر اسلام دشمنوں کی ایک مختصری جماعت مملکت میں ہنگامہ برپا کرنا چاہتی تھی۔ یہی لوگ حضرت منصورؒ کو خدا کہتے تھے اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے..... مگر اس سلسلے میں ہمیں حضرت حلاجؒ کا رویہ بھی دیکھنا چاہئے۔ بہت سے تاریخی

حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ ان گمراہ لوگوں سے سخت بیزار تھے۔ آپؒ نے کئی بار علماء کی مجلس میں کھلے الفاظ کے ساتھ فرمایا تھا۔

”میں صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، خدائے واحد کا پرستار ہوں۔ سرورِ کونین ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہوں اور اصحابِ عشرہ مبشرہ کی فضیلت کا قائل ہوں۔ جو لوگ مجھے خدا کہتے ہیں یا مجھ سے خلافِ شریعت امور منسوب کرتے ہیں، وہ جھوٹے ہیں اور ہڈیاں بکتے ہیں۔“

اس وضاحت کے بعد اصولی طور پر حضرت منصورؒ حلاجؒ کو تمام باتوں سے بری الذمہ قرار دینا چاہئے تھا مگر حامد بن عباس انہیں مجرم ثابت کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر حضرت حسین بن منصورؒ کو رہا کر دیا گیا تو ان کے حلقہٴ اثر میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا اور اسی مقبولیت کا سہارا لے کر حاجب ابن نصر قشوری اس کے اقتدار کی بساط الٹ دے گا۔ حامد بن عباس کی نظر میں حضرت منصورؒ حلاجؒ اس سیاسی فتنے کی بنیاد تھے۔ نتیجتاً اس نے سیاسی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے ”بنیاد“ پروار کیا اور بالآخر ایک دن بنیاد کو ڈھانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی اکثریت نے حضرت حسین بن منصورؒ کو کشتہٴ شریعت نہیں ”قتیل سیاست“ قرار دیا ہے۔

اب مستند تاریخی حوالوں کے ذریعے مختصراً حامد بن عباس کی شخصیت اور کردار کا جائزہ لیں گے۔ پھر قارئین کو خود پتہ چل جائے گا کہ حامد بن عباس کے سینے میں خدمتِ اسلام کا درد تھا یا اس کے دل میں خواہش نفسانی کا خنجر پیوست تھا جو اسے ہمہ وقت پریشان و مضطرب رکھتا تھا۔

علامہ سیوطی اپنی کتاب ”تاریخ الخلفاء“ میں فرماتے ہیں:

”300ھ میں مملکتِ اسلامیہ شدید انتشار کی لپیٹ میں آ گئی۔ بغداد میں چیزیں مہنگی ہو گئیں اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ حامد بن عباس نے دیہات پر تادان ڈال دیا تھا اور وہ عوام پر نئے نئے مظالم ڈھاتا تھا۔ نتیجتاً شہر میں لوٹ مار شروع ہو گئی۔ سیاسی حالات اس قدر بگڑ گئے کہ مجبور ہو کر فوج کو انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ عوام کے غیظ و غضب کا یہ حال تھا کہ انہوں نے فوج کو منتشر کر دیا اور مسلسل کئی دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ مشتعل لوگوں نے قید خانے جلاد دیئے اور زنداں کے دروازے کھول دیئے۔ کئی روز تک لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہا۔ وزیرِ حامد بن عباس پر پتھر برسائے گئے۔ غرض حکومتِ عباسیہ کی حالت بہت زیادہ دگرگوں ہو گئی۔ 309ھ میں حلاجؒ کو قاضی ابو عمر اور دیگر علماء کے اس فتوے کی وجہ سے قتل کیا گیا کہ وہ ”حلال الدم“ ہیں۔ منصورؒ کے احوال رفیعہ (بلند کرداری) کے سلسلے میں بہت سی روایتیں ہیں جنہیں بعض لوگوں نے مستقل تصانیف میں مدون کیا ہے۔“

علامہ سیوطیؒ کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حامد بن عباس اعمال کی کن پستیوں میں رینگ رہا تھا اور حضرت منصورؒ حلاجؒ کردار کی کن بلندیوں پر رواں دواں تھے۔

فرانسیسی عالمِ لوئی ماسینیون اپنی کتاب ”حسین بن منصور حلاجؒ“ میں تحریر کرتا ہے:

”منصور حلاجؒ کے تمام بد خواہوں اور دشمنوں کا سرغنہ خلیفہ مقتدر باللہ کا بوڑھا وزیرِ حامد بن عباس تھا۔ یہ آدمی مدت سے مستوفی مالیات (وزیر خزانہ) چلا آ رہا تھا۔ اس عہدے نے حامد بن عباس کو اس

قدر مغرور و مسرور کر دیا تھا کہ اگر در آمد سے ایک دینار بھی بیت المال (سرکاری خزانے) میں جاتا تو وہ یہی سمجھتا کہ گویا اپنی جیب سے دے رہا ہے۔ اس شخص نے بڑی چال بازی اور ریا کاری سے بہت سی دولت جمع کر لی تھی..... اس کی زندگی کا بیشتر حصہ عیش و عشرت میں گزرا تھا..... مگر ایسی عیش و عشرت کہ جس میں لطف و اخلاق کا گزرنہ تھا۔ (فرانسیسی عالم کہنا چاہتا ہے کہ حامد بن عباس ایک عیاش انسان تھا) حامد بن عباس بظاہر مسلمان تھا مگر اس کا ایمان پختہ نہ تھا۔ وہ ایک حریص اور کوتاہ نظر آدمی تھا اور بیکار سپاہی تھا۔ اسی فساد اخلاق کے باعث حامد بن عباس نے حضرت منصور حلاجؒ سے دشمنی رکھی۔ اسے حلاجؒ کا ہر کام برا نظر آتا تھا۔ اسے روحانیت منصورؒ اچھی نہ لگتی اور نہ اس کی پارسائی۔ وہ حلاجؒ کے اندازِ آخرت پر کان دھرتا اور نہ ان کی کرامات سے متاثر ہوتا۔ مختصر یہ کہ منصورؒ اس کی نظر میں ایک ایسا برا جادوگر تھا جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حامد بن عباس چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، دنیا کو حلاجؒ کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔“

فرانسیسی عالم آگے چل کر لکھتا ہے کہ دوسرا شخص شلمغانی تھا جو حامد بن عباس کو ابن منصورؒ کی مخالفت پر بھڑکاتا تھا۔ شلمغانی کو حامد بن عباس کے داماد نے یہ کہہ کر اپنے خسر سے ملایا تھا۔
”یہ شخص آپ کے کاموں میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوگا۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ابن منصورؒ کی دشمنی میں شلمغانی حد سے گزر گیا اور واقعتاً وہ حامد بن عباس کے بہت کام آیا۔ شلمغانی پست فطرت، ظالم اور شرابی انسان تھا۔ حامد بن عباس کے قتل کے تیرہ سال بعد شلمغانی بھی دردناک موت سے دوچار ہوا۔

فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون، قاضی ابو عمر کے بارے میں لکھتا ہے:

”وہ عیش پرست اور ہوشیار انسان تھا۔ 317ھ کے انقلاب میں قاضی ابو عمر کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی یعنی وہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے تک پہنچ گیا۔ قاضی ابو عمر ایک زمانہ ساز درباری اور ہوا کے رخ پر چلنے والا انسان تھا۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ہر سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ قاضی ابو عمر کی تلون مزاجی مشہور تھی۔ (یعنی وہ ایک بات پر قائم نہیں رہ سکتا تھا) اسے عطریات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ عجیب انداز سے اپنے حکم کے خلاف نیا حکم جاری کر دیا کرتا تھا۔ اسے اپنے غلط کام کو درست اور معقول ثابت کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ قاضی ابو عمر فقہ میں کمزور تھا اور دوسرے کاموں کے ذریعے اپنی اس کمزوری کو چھپاتا تھا۔“

لوئی ماسینیون خلیفہ مقتدر باللہ کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ وہ ست رائے اور تلون مزاج انسان تھا۔ جب اسے یہ بات یاد دلائی جاتی کہ خلیفہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، تو وہ آزرده خاطر ہو جاتا۔ اپنے پورے دورِ اقتدار میں مقتدر باللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ اسے میدانِ حشر میں اللہ کے حضور، اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے حلاجؒ سے منہ پھیر لیا تھا۔ مقتدر باللہ سونے کے ڈھیر پر فریفتہ تھا۔ اس نے ایک رشوت خور حبشی ”مفلح“ کو اپنے حرم کا خواجہ سرا اور نگہبان مقرر کیا تھا۔ (مفلح وہی شخص ہے جس نے حامد بن عباس کی مرضی کے مطابق حضرت منصور حلاجؒ کے قتل نامے پر

خلیفہ سے مہر تصدیق ثبت کرائی تھی) مقتدر باللہ کی ماں شغب بیٹی کی منت سماجت کرتی اور اسے قسم دیتی کہ وہ حلاجؒ کو آزار پہنچانے سے باز رہے..... لیکن اس نے ماں کی گریہ وزاری کو بھی جھٹلادیا تھا۔ یہ ہیں حضرت منصور حلاجؒ کے مخالفین اپنے کردار کے آئینے میں۔



خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ قتل کے بعد سر منصورؒ کو دو دن کے لئے بغداد کے پل پر آویزاں کر دیا گیا۔ پھر اسے خراسان لے جا کر گلی کوچوں میں پھرایا گیا اور حامد بن عباس کے حکم کے مطابق حکومت کے نقارچیوں نے جی بھر کے تشہیر کی۔ عام طور پر دنیا دار حکمران سلطنت کے باغیوں سے اس قسم کا برتاؤ روارکھتے ہیں ورنہ اسلام میں کافروں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ جائز نہیں۔ حامد بن عباس اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے، حضرت منصور حلاجؒ کو حکومت کا باغی قرار دے چکا تھا تا کہ دور دراز کے لوگوں پر اس کی ہیبت قائم ہو جائے۔

ہماری تحقیق کی حد تک، کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سر منصورؒ کی تشہیر کے بعد اسے کہاں دفن کیا گیا؟ البتہ فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون کہتا ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کی والدہ ”شغب“ نے حضرت منصور حلاجؒ کے سر مبارک کو ایک سال تک شاہی خزانے میں حفاظت سے رکھا۔ پھر دجلہ کے تعاون سے اپنے بھائی کے مقبرے کے نزدیک دفن کرا دیا۔ دجلہ ایک دلیر شخص تھا جس نے حضرت حسین بن منصورؒ کے سر کو اپنی نگرانی میں سپردِ خاک کیا۔

لوئی ماسینیون کی اس روایت سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مقتدر باللہ کی والدہ نے ایک سال تک سر منصور کی حفاظت کیوں کی؟ بس قیاس ہی کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کی ماں حامد بن عباس اور اس کی جماعت سے خائف تھی کہ کہیں یہ بے رحم لوگ سر منصورؒ کو بھی نذرِ آتش نہ کر دیں۔ خیال ہے کہ جب حامد بن عباس دنیا سے گزر گیا تو حضرت حلاجؒ کے سر کی تدفین عمل میں آئی ہوگی۔

خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ حضرت منصورؒ کے قتل کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حامد بن عباس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ کاٹے گئے، پھر دونوں پاؤں جسم سے جدا کر دیئے گئے۔ حامد بن عباس تکلیف کی شدت سے اس قدر چیخا کہ اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ بہت دیر تک زمین پر تڑپتا رہا اور لوگ عبرت کی آنکھ سے رقصِ بھل دیکھتے رہے۔ یہ خون رنگ تماشا بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر کسی شخص کو حامد بن عباس پر رحم آ گیا۔ وہ شمشیر بدست آگے بڑھا اور وزیر مملکت کو مخاطب کر کے کہا۔

”ہمارا جی تو یہی چاہتا ہے کہ تیرے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے اور تا دیر تجھ پر جاں کنی کی کیفیت طاری رہے مگر ہم لوگ مسلمان ہیں۔ اس لئے تیری مشکل آسان کئے دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے حامد بن عباس کا سر قلم کر دیا۔

پھر وزیر مملکت کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ بندگانِ خدا کے حقوق کا خون کر کے، عمر بھر جو دولت جمع کی گئی تھی، وہ خونخوار شعلوں کی زد میں تھی۔ ہر طرف موت کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور وہاں موجود تمام لوگ با آواز بلند کہہ رہے تھے۔

”حامد بن عباس کو حضرت شیخ ابن عطاء کی بددعا کھا گئی۔“

اس کے دردناک انجام میں دو عوامل نمایاں طور پر کار فرما تھے۔ ایک حضرت منصور حلاج کا قتل کہ حامد بن عباس نے اسی طرح ان کے دست و پا بھی قطع کئے تھے..... اور دوسرے حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کی بددعا کہ اے اللہ! اسے قتل کر اور اس طرح قتل کر کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں۔ قدرت کے اس محاسبے میں اہل نظر کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔



اور اب اس شخص کا انجام جو صاحب اقتدار تھا یعنی عباسی خلیفہ مقتدر باللہ۔ اگر وہ چاہتا تو حضرت حسین بن منصور کو معاف کر سکتا تھا یا کم سے کم ان کی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا..... اور اگر علماء کے فتوے کے مطابق یہ ممکن نہیں تھا تو پھر حامد بن عباس کو وحشت و درندگی کے مظاہرے سے باز رکھ سکتا تھا مگر مقتدر باللہ نے تو ماں کی التجاؤں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

آخر خونِ منصور رنگ لایا۔ 320ھ میں مونس نے موصل پر قبضہ کر لیا اور کچھ دن بعد ہی بغداد پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی فوجوں کو کوچ کا حکم دے دیا۔ جب مقتدر باللہ کو خبر ملی تو وہ اپنا لشکر لے کر آگے بڑھا..... اور پھر ”باب شامیہ“ پر فریقین میں خوریز تصادم ہوا۔ مقتدر باللہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو کر بغداد کی طرف پلٹا۔ راستے میں بربروں کے ایک فوجی دستے نے مقتدر باللہ کو گھیر لیا۔ معمولی سی مزاحمت کے بعد خلیفہ کے مختصر لشکر نے ہتھیار ڈال دیئے اور ایک بربری نے آگے بڑھ کر مقتدر باللہ کا سر قلم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے عباسی خلیفہ کے کپڑے اتار لئے اور اس کی برہنہ لاش وہیں چھوڑ دی۔ پھر سرکونیزے پر بلند کر کے مونس کے سامنے لے گئے۔

جب مقتدر باللہ کا کٹا ہوا سر گلی کوچوں سے گزرا اور اس کی داستانِ رسوائی گھر گھر پہنچی تو لوگوں کو حضرت منصور حلاج کے وہ الفاظ یاد آئے جو آپؑ نے قتل کے فتوے پر دستخط کرنے والے علماء سے کہے تھے۔

”میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو..... میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو.....“

علماء مجبور تھے۔ اس لئے ان کے انجام کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ پھر بھی عوام نے انہیں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے بھی اپنے دلوں میں اس کے لئے کوئی گنجائش محسوس نہیں کی..... مگر جو صاحبانِ اختیار تھے، ان کی بے اختیاری عبرت خیز تھی۔ قتلِ منصورؑ میں شریک ہونے والا کوئی ایک فرد بھی سلامتی کے ساتھ دنیا سے نہیں گیا۔

چلے تو منصور حلاجؑ بھی گئے کہ ایک دن سبھی کو جانا ہے..... مگر ان کے جانے کی ادا بڑی نرالی تھی۔ اس شان سے گئے کہ تاریخِ عشق کے سینے پر قدموں کے نشان چھوڑ گئے۔ کتنے زلزلوں نے زمین کو زیر و زبر کیا اور کتنے سیلابوں نے سنگی عمارتوں کے آثار تک دھو ڈالے مگر وہ کیسے عجیب نشانات ہیں کہ گیارہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی دھندلے نہیں ہوئے۔ ظاہر پرست مؤرخ کہتے ہیں کہ حسین بن منصورؑ کو ان کے ہم عصر صوفیاء نے رد کر دیا تھا، اس لئے وہ گمراہ تھے، شعبدہ باز، جادوگر اور زندیق تھے۔ مگر ان لوگوں کا حضرت شیخ ابوالعباس ابن عطاء کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت شیخ ابن عطاء، حضرت حسین بن

منصورؒ کے ہم عصر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے زمانے میں امام شریعت و طریقت بھی تھے..... اور برملا کہا کرتے تھے۔

”ہم تو منصورؒ کے ادنیٰ غلاموں میں سے ہیں۔“

ابن عطاءؒ سے بڑھ کر کس کی گواہی ہوگی کہ حضرت حلاجؒ کے عقائد پر شہادت دیتے دیتے خود بھی شہید ہو گئے۔

حضرت ابو عبد اللہ محمد بن خفیفؒ یکتائے روزگار صوفی اور شیخ المشائخ ہونے کے باوجود حضرت حسین بن منصورؒ کے نیاز مندوں میں شامل تھے۔ آپؒ اکثر قید خانے میں حاضر ہوتے اور حضرت منصورؒ حلاجؒ سے تصوف کے رموز و نکات پر گفتگو کرتے۔ خود بھی صاحب کرامت تھے اور حضرت ابن منصورؒ کی کرامات بھی برسرِ مجلس بیان کیا کرتے تھے۔ آپؒ کا مشہور قول ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ عالم ربانی تھے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ صوفیاء میں بھی ممتاز تھے اور علمائے ظاہر میں بھی آپؒ کا درجہ بہت بلند تھا۔ حضرت شیخ ابوالقاسمؒ کو ثقہ محدثین میں شمار کیا جاتا تھا۔ خطیب بغدادیؒ کے بقول ایک دن محمد بن حسین، حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ کی مجلس میں موجود تھے۔ حضرت منصور بن حلاجؒ کا ذکر آیا تو آپؒ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں نے روح کے بارے میں حضرت حلاجؒ کا قول نقل کیا تو ایک شخص برہم ہو گیا اور کہنے لگا۔

”اس کی مثال کیوں لاتے ہو؟ منصورؒ کو خدائے واحد سے کیا سروکار؟“

”پھر آپؒ نے کیا جواب دیا؟“ محمد بن حسین نے پوچھا۔

”میں نے صاف کہہ دیا کہ انبیائے کرام اور صدیقین کے بعد اگر کوئی موحد ہے تو وہ حلاجؒ ہی ہیں۔“

حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ کا انتقال 369 ھ میں ہوا۔ اگرچہ حضرت شیخؒ، ابن منصورؒ کی شہادت کے وقت کم عمر ہوں گے لیکن پھر بھی آپؒ کا زمانہ حضرت حلاجؒ کے زمانے سے بہت زیادہ قریب ہے۔



حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ”میں اور ابن منصورؒ دونوں ایک ہی ہیں۔ میرا بھی وہی حال ہے جو ان کا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ انہوں نے اپنا حال ظاہر کر دیا اور میں نے چھپائے رکھا۔“

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے ایک موقع پر فرمایا۔ ”لوگوں نے مجھے دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا مگر منصورؒ کو ان کی عقل نے ہلاک کر ڈالا۔“

بعض تاریخوں میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب حضرت حسین بن منصورؒ کو سرِ مقتل لے جایا گیا تو حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ بھی وہاں تشریف لے گئے اور حضرت منصورؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”کیا ہم نے تمہیں دنیا والوں سے روکا نہیں تھا؟“

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے علمائے تحقیق نے لکھا ہے کہ شبلیؒ نے ابن منصورؒ کو نصیحت کی تھی کہ وہ مغلوب الحال ہیں اور ایسے شخص کو مکمل طور پر خلوت میں رہنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جذب و مستی کی وجہ سے ان کی زبان لڑکھڑا جائے اور عوام معرفت کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر

رہیں۔ پھر بات بدل جائے اور لوگ نئے نئے مفہوم تراشنے لگیں۔
حضرت جنید بغدادیؒ نے بھی شروع میں حضرت ابن منصورؒ کو صبر اور خلوت کی تلقین کی تھی..... مگر دل کی خلش نے انہیں حجرے کے کسی گوشے میں چمن سے بیٹھنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ قتل سچ گیا اور صلیب ان کے خون سے رنگین ہو گئی۔



امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیریؒ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت منصور حلاجؒ کا عقیدہ اہلسنت کے حوالے کے مطابق تھا۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ، حضرت حسین بن منصورؒ کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔
سیدنا غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت ابن منصورؒ کو سالک طریقت مانتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی معذور بھی سمجھتے تھے۔ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

”حسین بن منصورؒ کو طریقت میں دشواری پیش آگئی تھی۔ ان کے زمانے میں کوئی ایسا نہ تھا کہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا اور سلامتی کے ساتھ اس دشواری سے نکال دیتا۔ میں اپنے اصحاب، مریدوں اور محبت کرنے والوں میں سے ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑنے والا ہوں جس کی سواری کو ٹھوکر لگ جائے۔“

حضرت غوث اعظمؒ کے قول مبارک کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ 297ھ میں انتقال فرما چکے تھے اور حضرت حسین بن منصورؒ 309ھ میں قتل کئے گئے۔ اگر حضرت جنید بغدادیؒ حیات ہوتے تو اپنے شاگرد کی دستگیری ضرور کرتے۔ اسی طرح حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکیؒ 296ھ میں اور حضرت شیخ ابوالحسن 295ھ میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے..... اور یہی وہ تینوں بزرگ تھے جن سے حضرت حسین بن منصورؒ نے رجوع کیا تھا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا خیال ہے کہ اگر یہ مشائخ زندہ ہوتے تو حضرت منصور حلاجؒ کو اس مشکل سے نکال سکتے تھے..... مگر میں عاجز و ناقص عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لوح محفوظ پر یہی لکھا جا چکا تھا کہ ابن منصورؒ کے دست و پا قطع کئے جائیں اور پھر انہیں نذر آتش کر کے ان کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ اور حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ صاحبان کشف تھے۔ ان تینوں مشائخ پر یہ راز فاش ہو چکا تھا کہ ابن منصورؒ کا یہی مقدر ہے۔ اس لئے تینوں بزرگوں نے خاموشی اختیار کی۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اس طرح حضرت حسین بن منصورؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

”وہ اللہ کے راستے میں اللہ کے قتل، میدان تحقیق کے شیر، بہادر، صف شکن، صدیق، بڑی موجیں مارنے والے دریا کے غریق، حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ان کے واقعات کی عجیب شان ہے جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بے انتہا سوز و اشتیاق رکھتے تھے اور شورش فراق کی شدت میں مست و بے قرار تھے۔ وہ عاشق صادق و پاکباز تھے۔ مشقت اور مجاہدے میں بڑے

درجے پر فائز تھے۔ وہ بلند ہمت، عالی منزلت اور شیریں بیان تھے۔ حقائق و اسرار و معانی میں بہت کامل تھے۔ باریک بین تھے اور فراست و دانائی میں بے نظیر تھے۔ اول سے آخر تک ان کے معاملات کی بنیاد بلا پر رہی۔“

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ بھی حضرت ابن منصورؒ کی ولایت و معرفت کے قائل تھے۔ علامہ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ اپنے وقت میں علوم ظاہری و باطنی کے مسلم امام تھے۔ علامہؒ نے حضرت منصور حلاجؒ کو اولیاء میں شمار کیا اور ان کے عارفانہ اقوال سے اپنی کتاب ”طبقات کبریٰ“ کو زینت دی۔ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے نزدیک حضرت حسین بن منصورؒ بڑے قوی حال اور عالی ہمت بزرگ تھے..... مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے۔ ”وہ بحمد اللہ مجھے دل سے عزیز ہیں مگر ان کا طریق مستقیم نہ تھا اور حال بھی مقرر نہ تھا۔ ایسے لوگوں کا کلام تقلید کے قابل نہیں ہوتا کہ وہ مغلوب الحال ہوتے ہیں۔“



حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ قتل کے بعد میں نے حضرت منصور حلاجؒ کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟“ حضرت ابن منصورؒ نے فرمایا۔ ”اللہ نے اپنی نوازش سے مجھے قصر صدق (سچائی کے محل) میں اتارا۔“ ان دونوں گروہوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا جو آپ کو اچھا اور برا کہتے تھے؟“ حضرت شبلیؒ نے دوسرا سوال کیا۔

”اللہ نے ان دونوں گروہوں پر اپنی رحمت نازل فرمائی۔“ حضرت منصور حلاجؒ نے فرمایا۔ ”ایک گروہ پر اس لئے رحمت نازل کی گئی کہ اس نے میرے حال سے واقف ہو کر مجھ پر مہربانیاں کیں..... اور دوسرے پر اس لئے کہ وہ مجھ سے واقف ہی نہیں تھا اور صرف اللہ کے واسطے مجھ سے دشمنی رکھتا تھا۔“ کسی دوسرے بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر نظروں کے سامنے ہے اور حضرت حسین بن منصورؒ ایک ہاتھ میں جام لئے کھڑے ہیں اور سر جسم سے غائب ہے۔ بزرگ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ سر قلم شدہ بندوں ہی کو جام عنایت فرماتا ہے۔“

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرز نمیرد

(اگر زمین سراسر ہوا بن جائے، تب بھی صاحب اقبال اور مقبول لوگوں کے چراغ کو بجھایا نہیں جا سکتا)



حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

400ھ (غزنی)

ولادت

465ھ (لاہور)

وفات

غزنی کے ایک علاقے ”ہجویر“ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا نام سید عثمان..... آپ کا سلسلہ نسب براہ راست حضرت امام حسینؑ سے ملتا ہے۔ علوم شریعت حاصل کرنے کے لئے طویل سیاحت کی اور اپنے وقت کے اکابر صوفیاء اور علماء سے اکتساب فیض کیا۔ پیر و مرشد کے حکم سے سلطان محمود غزنوی کے دور میں لاہور تشریف لائے۔ آپؒ نے تبلیغ اسلام کے لئے شدید اذیتیں برداشت کیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کا شمار ان صوفیائے عظام میں ہوتا ہے جن کا ہر عمل رسول اللہ ﷺ کے تابع تھا۔ لوگ فرط عقیدت سے آپؒ کو ”داتا گنج بخش“ کہہ کر پکارتے تھے..... مگر آپؒ اس لقب سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے تھے۔

”داتا تو ایک ہی ہے..... یعنی اللہ.....“

آپؒ نے تصوف کے موضوع پر بے مثال کتاب ”کشف المحجوب“ تحریر کی۔

بُت شکن سلطان محمود غزنوی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اس کے وارثوں میں اقتدار کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ 431ھ کا سال اہل غزنی کے لئے بڑا گراں ثابت ہوا تھا۔ سلطان مسعود غزنوی نے اپنے حقیقی بھائی امیر محمد کو اندھا کر کے زنداں کے حوالے کر دیا تھا۔ وقت نے کروٹ لی تو اسی نابینا امیر محمد کے وفادار سپاہیوں نے سلطان مسعود کو گرفتار کر کے قلعے میں بند کر دیا۔ پھر 433ھ میں سلطان مسعود کو قتل کر دیا گیا۔ عجیب نیرنگی زمانہ تھی۔ ایک بھائی قاتل تھا دوسرا مقتول۔ عظیم فاتح کی اولاد ایک دوسرے کی شرگ پر خنجر کھینچ رہی تھی۔ یہ جانگداز مناظر دیکھ کر غزنی کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ ابوالفضلؒ نے اپنے مرید خاص سے کہا۔

”سید! اب تم یہ علاقہ چھوڑ کر پنجاب کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں کے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“
 ”اور شیخ محترم! آپ؟“ مرید نے عرض کیا۔
 ”میرا کیا ہے؟ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا۔“ خواجہ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔ ”جتنی سانسیں لکھ دی گئی ہیں، وہ پوری کروں گا اور پھر تہہ خاک سو جاؤں گا۔“
 مرید کے لئے پیرومرشد کی جدائی سخت گراں تھی مگر حکم شیخ کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جواں سال درویش حضرت خواجہ ابوالفضلؒ کی دعاؤں کے سائے میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور ڈیڑھ ماہ کی طویل مسافت طے کر کے لاہور پہنچا۔

اگرچہ اس وقت لاہور اسلامی سلطنت کے زیر نگیں تھا لیکن غزنی کے انتشار اور مسلمانوں کی باہمی رنجشوں نے اہل ہند کے حوصلے بڑھادیئے تھے۔ دہلی اور دوسرے علاقوں کے ہندو راجہ متحد ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے سیاسی حکمت عملی کے طور پر ہانسی اور تھانیسیر کے مسلمانوں کو مسحور کر دیا تھا۔ محصورین نے اہل لاہور سے مدد مانگی مگر آپس کی نا اتفاقی کے سبب تھانیسیر اور ہانسی کے مسلمانوں کو فوجی کمک نہ پہنچ سکی۔ نتیجتاً ان دونوں تاریخی شہروں پر ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا اور مسمار شدہ بت خانے دوبارہ تعمیر کئے جانے لگے۔ پھر یہ ہندو راجہ دس ہزار کالشکر لے کر آگے بڑھے اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ مقامی مسلمانوں پر بڑا نازک وقت تھا۔ لاہور کے باشندے دن میں نہ کاروبار کر سکتے تھے اور نہ رات کو چھین کی نیند سو سکتے تھے۔ آخر

یہاں کے حاکم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے غزنی کی اطاعت قبول کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی۔ مگر اس سے پہلے کہ غزنی سے کوئی فوجی مدد آتی، دستِ قدرت نے کفار کی بچائی ہوئی بساط الٹ دی۔ اچانک ہندو راجاؤں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ اپنی اپنی فوج لے کر واپس چلے گئے۔ اس طرح لاہور اغیار کی پورشوں سے محفوظ رہا۔

غزنی سے آنے والے درویش نے اہل لاہور کی معاشرت کا جائزہ لیا۔ مرکز کی کمزوری نے مفتوحہ علاقوں کے مسلمانوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنی ذات میں گم تھا اور اسے تبلیغ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ رشد و ہدایت کا جو کام سلطان محمود غزنوی کے دور میں شروع ہوا تھا، اس پر جمود کی کیفیت طاری تھی۔

غزنی کے جواں سال درویش نے لاہور آتے ہی ایک نئی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ مقامی باشندوں نے خدا کا نیا گھر تعمیر ہوتے دیکھا تو ایک دن درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔

”یہاں پہلے ہی کئی مسجدیں موجود ہیں، پھر نئی عبادت گاہ کی کیا ضرورت ہے؟“
 ”ضرورت ہے۔“ درویش نے پر زور لہجے میں کہا۔ ”وہ امراء کی بنائی ہوئی مسجدیں ہیں اور اس مسجد کو اللہ کا ایک مزدور بندہ تعمیر کر رہا ہے۔“

مقامی باشندوں نے بڑی حیرت سے درویش کا جواب سنا مگر وہ اس بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے۔ نئی مسجد کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری رہا۔ خانہ خدا کی تعمیر میں جواں سال درویش کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ وہ خود بھی اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اور گارا اٹھایا کرتا تھا۔ لاہور کے امراء کو حیرت تھی کہ اب تک درویش نے مسجد کے سلسلے میں ان سے کسی قسم کے تعاون کی درخواست نہیں کی ہے۔ پھر یہ اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں؟ درویش ذاتی طور پر کوئی مالدار شخص ہے یا پھر کچھ خفیہ ہاتھ اس کی مدد کر رہے ہیں؟ الغرض لاہور کا ہر مسلمان باشندہ تعمیر مسجد اور نووارد درویش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور درویش اپنے کاموں میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے گرد و پیش کی خبر تک نہیں تھی۔

پھر جب مسجد کی تعمیر کا پون کام مکمل ہو گیا تو ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مغل شہزادہ دارا شکوہ اپنی مشہور تصنیف ”سفینۃ الاولیاء“ میں تحریر کرتا ہے کہ ایک دن لاہور کے کچھ علماء غزنی کے درویش کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ”تمہاری ساری محنت اکارت گئی۔“

درویش نے علمائے لاہور کی طرف حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ”ایک مزدور کی محنت کیسے رایگاں جاسکتی ہے جبکہ وہ خلوص نیت کے ساتھ خدا کے کاموں میں مصروف ہو۔“

”یہ سب کچھ تمہاری لاعلمی اور بے خبری کے سبب ہوا ہے۔“ علمائے لاہور نے جواب دیا۔ ”اگر تم مسجد کی تعمیر سے پہلے کسی ہوش مند انسان سے مشورہ کر لیتے تو خانہ خدا میں یہ نقص واقع نہ ہوتا۔“
 ”کیا نقص؟“ درویش کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ مسجد کے قبلے کا رخ صحیح نہیں ہے۔ اس کا جھکاؤ کسی قدر جنوبی سمت کی طرف ہے۔“ علمائے لاہور نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

غزنی کے درویش نے ایک نظر مسجد کی طرف دیکھا۔ پھر انتہائی پر یقین لہجے میں کہا۔
”میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ آپ حضرات کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس مسجد کا قبلہ بھی درست ہے اور میرے دل کا بھی۔“

علمائے لاہور کو جواں سال درویش کی یہ بے نیازی پسند نہیں آئی۔ ”عنقریب تمام لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کس کی بصارت میں خلل ہے۔“ یہ کہہ کر علماء کی جماعت واپس چلی گئی اور درویش پورے ذوق و شوق کے ساتھ خانہ خدا کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔

پھر جب مسجد مکمل ہو گئی تو غزنی کے درویش نے تمام علمائے لاہور کو خانہ خدا میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ علمائے لاہور پورے ذوق و شوق کے ساتھ تشریف لائے۔ ان کا خیال تھا کہ غزنی کے درویش کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اب اس نے اپنی کوتاہی کے ازالے کی کوئی تدبیر دریافت کرنے کے لئے انہیں بلایا ہو گا۔ اپنے ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں علمائے لاہور مسجد میں جمع ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خانہ خدا کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اور قبلے کا رخ وہی ہے جس پر انہیں اعتراض تھا۔ ظاہر پرست علماء اس صورت حال سے بہت خوش تھے کہ اب وہ غزنی کے درویش کی بھرپور گرفت کر سکیں گے اور مخلوق خدا کے سامنے علی الاعلان کہہ سکیں گے کہ فاضل اور تجربہ کار بزرگوں کو نظر انداز کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

غزنی کے درویش نے بڑے والہانہ انداز میں علمائے لاہور کا استقبال کیا۔ تھوڑی دیر بعد مؤذن نے پورے زور و شور کے ساتھ اذان کہی۔

علمائے لاہور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر اس اجتماع کا مقصد کیا ہے؟ ابھی سرگوشیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ غزنی کا درویش اگلی صف سے اٹھا اور امامت کے مصلے پر پہنچ کر حاضرین مجلس سے مخاطب ہوا۔ ”آئیے حضرات! نماز ادا کریں۔“

پھر نماز ادا کی گئی۔ عام لوگوں کو درویش کی امامت میں ایک خاص کیف حاصل ہوا۔ خود علمائے لاہور نے بھی محسوس کیا کہ یہ نماز کیفیت کے اعتبار سے دوسری نمازوں سے کچھ مختلف تھی۔

نماز ختم ہوئی تو درویش نے رقت آمیز لہجے میں دعا کی۔ ”اے خالق ارض و سما! اپنے عاجز بندوں کی اس حقیر سی خدمت کو قبول فرما۔“

دعا کے بعد غزنی کا درویش علمائے لاہور سے مخاطب ہوا۔ ”آپ حضرات کو اس مسجد کے قبلے کے رخ پر اعتراض تھا؟“

”وہ اعتراض تو اب بھی ہے۔“ لاہور کے ایک عالم نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”تم نے خانہ خدا کی تعمیر کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا، بزرگوں کی علمی حیثیت کو نظر انداز کیا اور اللہ کی زمین پر ایک ایسی مسجد کھڑی کر دی جس کا قبلہ درست نہیں ہے۔“

”میں نہیں جانتا کہ انا کیا ہے؟“ غزنی کے درویش نے اپنے روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ”میں کسی بزرگ کی علمی حیثیت پر معترض نہیں تھا۔ بس روز و شب اپنے کام میں مصروف رہا۔ جس کی عبادت کرتا

ہوں، اسی سے استعانت کی بھیک مانگتا رہا۔ اب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ حضرات کو اس لئے زحمت دی کہ اپنی آنکھوں سے قدرتِ خداوندی کا مظاہرہ دیکھ لیں۔“

یہ کہہ کر غزنی کے درویش نے مسجد کے میناروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب ملاحظہ کیجئے کہ قبلہ کس طرف ہے؟“

بات علمائے لاہور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر بھی ان حضرات نے اس طرف دیکھا، جدھر غزنی کے درویش نے اشارہ کیا تھا۔ چشم حیرت پر عجیب منظر نمودار ہوا۔ لاہور کے مذہبی دانشوروں نے کھلی آنکھوں سے قبلہ کا مشاہدہ۔

”اب بتائیے کہ اس مسجد کی تعمیر میں کیا نقص ہے؟“ غزنی کے درویش نے حیرت میں ڈوبے ہوئے علماء سے سوال کیا۔

”جب حقیقی قبلہ ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہے تو پھر شک کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟“ علمائے لاہور نے بیک زبان کہا۔ معترضین اپنے طرزِ عمل پر نادم تھے اور بار بار جواں سال درویش کے سامنے معذرت کا اظہار کر رہے تھے۔ بعض بزرگ درویش کے شکرگزار بھی نظر آ رہے تھے۔

”یہ آپ کا فیضِ روحانی ہے کہ ہم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر قبلہ مکرم کے دیدار سے شرف یاب ہوئے۔“

درویش نے شکایت کرنے کی بجائے عجز و انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا اور میرا فیض روحانی کیا؟ یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں کی شرم رکھ لیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور ہمارے دلوں کی تنگیوں کو دور فرمائے۔“

غزنی کے جس درویش سے یہ کرامت ظاہر ہوئی، وہ سید علی ہجویریؒ تھے جنہیں ”داتا گنج بخش“ کے لقب سے شہرتِ دوام حاصل ہے۔



حضرت سید علی ہجویریؒ 400 ھ یا 401 ھ میں غزنی کے ایک محلے ”ہجویر“ میں پیدا ہوئے۔ اکثر مقامات پر آپؒ کو ”جلابی“ بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؒ کے والد محترم سید عثمانؒ ”جلاب“ کے رہنے والے تھے اور مادرِ گرامی کا تعلق ”ہجویر“ سے تھا۔ بعض محققین کی نظر میں ”ہجویر“ اور ”جلاب“ غزنی کے دو مشہور محلے ہیں۔ آپؒ کی کنیت ابو الحسن تھی اور شجرۂ نسب براہِ راست حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ فقہی اعتبار سے امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے حصولِ علم کی خاطر بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں۔ کئی بار ہجرت کی۔ کبھی فرغانہ کو اپنا مسکن بنایا، کبھی خراسان جا پہنچے اور کبھی ماوراء النہر کی سکونت اختیار کی۔ جہاں بھی کسی فاضل کا پتہ ملا، اسی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس لئے کوئی نہیں جانتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کے اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟ پھر بھی مشہور ہے کہ مذہبی علوم میں آپؒ کے استاد حضرت شیخ ابو القاسم گرگائیؒ تھے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا معروف قول ہے..... ”فقر کے راستے میں مرشد کی رضا جوئی سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ پس فقیر کو چاہئے کہ ہر وقت مرشد کو اپنے پاس ہی سمجھے۔“
مرشد کے بارے میں شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا یہ قول بھی شہرت رکھتا ہے..... ”مرشد میں خواہشات نفسانی کے دریا کے پار اترنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہئے۔ اگر مرشد ماہر تیراک نہیں ہوا تو ایک دن خود بھی ڈوبے گا اور مرید کو بھی لے ڈوبے گا۔“

ایک بار حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے استاد گرامی حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ کے دیدار کو حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت شیخؒ طوس کی ایک مسجد میں تنہا بیٹھے تھے اور مسجد کے ستون سے باتیں کر رہے تھے۔
حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں۔ ”میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ حضرت شیخؒ کوئی واقعہ ستون سے بیان کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب استاد گرامی اپنی بات مکمل کر چکے تو میں آگے بڑھا۔ خدمت عالیہ میں سلام پیش کرنے کے بعد میں نے عرض کیا۔ ”شیخ محترم! آپ کس سے ہم کلام تھے؟ یہاں مسجد میں تو کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔“

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ نے جواب فرمایا۔ ”بیٹا! اس وقت اللہ نے مسجد کے ستون کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی میں اسی سوال کا جواب دے رہا تھا۔“
حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ استاد گرامی کا جواب سن کر مجھے اس ستون کا واقعہ یاد آ گیا جو سرور کونین ﷺ کے فراق میں رویا کرتا تھا۔

مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے رسالت مآب ﷺ کھجور کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر جب منبر تعمیر ہو گیا اور حضور اکرم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دیا تو کھجور کا وہ ستون رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز اتنی تیز تھی کہ تمام حاضرین مسجد نے سنی۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنا دست مبارک اس ستون پر رکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔



حضرت سید علی ہجویریؒ کی سیاحت محض حصول علم کے لئے تھی۔ آپؒ بزرگان دین کی صحبتوں سے فیض روحانی حاصل کرتے اور دنیا داروں کے اشتغال سے اس طرح نظر بچا کر گزر جاتے جیسے اللہ کی زمین پر ان چیزوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایک بار آپؒ نے خراسان میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو بیس سال سے یاد الہی میں کھڑا تھا۔ اس شخص کا معمول تھا کہ نماز کے لئے یا پھر فطری کاموں کی تکمیل کے لئے بیٹھتا تھا اور نہ باقی لمحات میں آنکھیں بند کئے کھڑا رہتا تھا۔ اس شخص کا نام ادیب کمندی تھا اور وہ خراسان کے ایک گاؤں کمندور میں رہتا تھا۔ ایک دن لوگوں نے ادیب کمندی سے پوچھا۔

”آخر تمہارے اس طرح کھڑے رہنے میں کیا راز ہے؟“

”کوئی راز نہیں ہے۔“ ادیب کمندی نے بے نیازانہ کہا۔ ”مجھے ابھی تک یہ درجہ حاصل نہیں ہوا ہے کہ

حق تعالیٰ کے مشاہدے میں بیٹھنے کی عزت حاصل کر سکوں۔“

ایک بار حضرت سید علی ہجویریؒ ماوراء النہر تشریف لے گئے۔ اس وقت آپؒ کے میزبان مشہور بزرگ

احمد حماد سرخسی تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت شیخ احمد حماد سے پوچھا۔ ”آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟“
 ”مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“ شیخ احمد حماد سرخسی نے فرمایا۔
 ”آخر آپ شادی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتے؟“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے دوسرا سوال کیا۔
 ”میں اکثر اپنے زمانے سے غائب رہتا ہوں۔“ شیخ احمد حماد نے فرمایا۔ ”جب غائب رہتا ہوں تو
 پھر دو جہانوں میں سے مجھے کچھ یاد نہیں رہتا..... اور جب حاضر ہوتا ہوں تو اپنے نفس کو اس قدر قابو میں
 رکھتا ہوں کہ مجھے ایک روٹی ہزار حوروں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس لئے میری نظر میں دل کے شغل سے
 بہتر کوئی شغل نہیں ہے۔“

یہی وہ مشاہدات تھے جن کے ذریعے حضرت سید علی ہجویریؒ کی روحانی تربیت ہوئی۔



علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ، حضرت ابوالفضل بن حسین خلیؒ کے دستِ حق
 پرست پر بیعت ہوئے اور حضرت ابوالفضلؒ کا روحانی سلسلہ مشہور بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ سے ملتا
 ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے پیر طریقت کے بارے میں فرماتے ہیں:

”ایک بار شیخ ”بیت الجن“ سے دمشق تشریف لے جا رہے تھے۔ میں بھی حضرت کے ہمراہ تھا۔ اتفاق
 سے رات کو تیز بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے پورا علاقہ کچھڑ سے بھر گیا تھا اور مسافروں کو چلنے میں بہت
 دشواری پیش آرہی تھی۔ چلتے چلتے اچانک میری نظر حضرت شیخؒ کے پائے مبارک پر پڑی اور میں حیران رہ
 گیا۔ حضرت شیخؒ کا پا جامہ اور جوتا مکمل طور پر کچھڑ سے محفوظ تھا۔

”شیخ محترم! یہ کیا ہے؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ اس واقعہ کی مجھ پر بہت ہیبت طاری تھی۔
 جواب میں پیر و مرشد نے فرمایا۔ ”سید! جب سے میں نے اپنی نفی کی اور توکل اختیار کیا، اسی دن سے
 اللہ نے میرے قدموں کو بھی ان آلائشوں سے پاک کر دیا ہے۔“

حضرت شیخ ابوالفضلؒ اپنے مریدوں کو کم گوئی اور کم خوابی کی بہت تاکید کیا کرتے تھے۔
 حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”کشف المحجوب“ میں ایک مقام پر اپنے پیر و مرشد
 کا یہ قول مبارک نقل کیا ہے۔ ”غلبے کے سوانہ سوؤ..... اور جب جاگو تو پھر سونے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ
 یہ مرید کے واسطے حرام ہے اور بیکاری کی نشانی ہے۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے پیر و مرشد کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ”میرے شیخؒ ریکی صوفیوں
 (دکانداروں) کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان سے بڑھ کر کوئی شخص ہیبت ناک
 (ہر جلال) نہیں دیکھا۔ ایک دن میں پیر و مرشد کے ہاتھ دھلا رہا تھا، دفعۃً مجھے یہ خیال گزرا کہ جب سارے
 کام تقدیر پر منحصر ہیں تو پھر ہم لوگ غلاموں کی طرح پیروں کی خدمت میں کیوں مصروف رہتے ہیں؟“

پیر و مرشد نے میری طرف دیکھا اور نہایت شیریں لہجے میں فرمایا۔ ”بیٹا! جو کچھ تمہارے دل میں ہے،
 مجھے سب معلوم ہے..... مگر ہر حکم کے لئے ایک سبب ہوا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تاج و
 تخت کسی کے سپرد کرے تو پہلے اس میں تاج و تخت کے سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہی

خدمت اس کی بزرگی کا سبب بن جاتی ہے۔“

حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے چھپن سال تک ایک ہی لباس زیب تن کیا۔ آپؒ کسی تکلف کے بغیر اپنے جاے میں پیوند لگایا کرتے تھے۔ پھر پیوندوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ اصلی کپڑے کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ یہ تھے وہ مرد کامل حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ جن کی آغوشِ محبت میں حضرت سید علی ہجویریؒ نے روحانی تربیت حاصل کی۔



حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنی تصنیف ”کشف الاسرار“ میں بہت سے عجائباتِ زمانہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

”غزنی میں ایک پیر مرد تھے۔ ان کا نام شیخ بزرگؒ تھا اور وہ اپنے کردار میں بھی حقیقتاً بزرگ ہی تھے۔ ایک دن شیخ بزرگؒ نے مجھ سے فرمایا۔ ”علی! کوئی ایسی کتاب لکھ کہ زمانے میں تیری یادگار رہ جائے۔“ اس وقت میری عمر صرف بارہ سال تھی۔ ایک بچے سے کسی یادگار تصنیف کا ذکر کرنا بڑا عجیب تھا۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔

”حضرت! میں ابھی اس قابل کہاں ہوں؟ نہ مجھے علم حاصل ہے اور نہ میں اپنی کم عمری کے سبب علم کے رموز کو سمجھ سکتا ہوں۔ پھر آپ کے حکم کی تعمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟“

شیخ بزرگؒ نے جواباً فرمایا۔ ”علی! کچھ بھی ہو، تجھے کتاب لکھنی ہی پڑے گی۔“

میں نے کچھ دن پہلے ہی ایک کتاب تحریر کی تھی۔ شیخ بزرگؒ کے اصرار پر وہی کتاب ان کی خدمت میں پیش کر دی۔

شیخ بزرگؒ کتاب کا مطالعہ کرتے رہے اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا کہ ایک بچے کی تحریر پڑھ کر ان کا کیا تاثر ہوگا؟ آخر کتاب ختم ہوئی اور شیخ بزرگؒ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”علی! تو دین کے معاملے میں بڑا بزرگ ہوگا۔“

شیخ کا ارشاد سن کر کچھ دیر تک تو مجھے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا کسی مجتہد کی طرح شیخؒ کے سامنے بیٹھا رہا۔

شیخؒ نے میری دلی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے۔ ”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“

پھر مجھے یقین آیا کہ شیخ بزرگؒ نے میری طفلانہ تحریر کو نظر انداز نہیں کیا ہے..... ”اگر شیخ کی دعائیں شامل حال رہیں۔“ میں نے عرض کیا۔

”تو ہماری دعاؤں میں شامل ہے۔“ شیخ بزرگؒ نے فرمایا۔ ”حق تعالیٰ نے چاہا تو سارا زمانہ ان دعاؤں کی تاثیر دیکھے گا۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ برصغیر پاک و ہند کے اتنے بڑے بزرگ ثابت ہوئے کہ ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود آپؒ کا فیض روحانی روزِ اوّل کی طرح جاری و ساری ہے۔

شیخ بزرگ نے جس کتاب کے تحریر کرنے پر اصرار کیا تھا، دراصل وہ ”کشف المحجوب“ تھی۔ شیخ بزرگ کی چشم معرفت پر یہ بات روشن تھی کہ یہی بارہ سالہ لڑکا جو ان ہو کر ایک ایسی کتاب تحریر کرے گا جسے تصوف کی دنیا میں شہرت دوام حاصل ہوگی۔



بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کے ماں باپ نے ان کی شادی نو عمری میں کر دی تھی۔ اگرچہ آپؒ ازدواجی زندگی کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن والدین کے حکم سے مجبور تھے۔ آخر کچھ دن بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ گیارہ سال تک آپؒ نے آزادانہ زندگی بسر کی اور اس طویل عرصے میں نہایت خوش و خرم رہے۔ والدین کو ایک بار پھر اولاد کی فکر لاحق ہو گئی۔ نتیجتاً حضرت سید علی ہجویریؒ کو دوبارہ رشتہ ازدواج سے منسلک کر دیا گیا۔ دوسری شادی کے بارے میں آپؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

”میں ایک سال تک اس آفت میں غرق رہا۔ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی اور رحمت سے مجھے خلاصی عطا کی۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سال بعد آپؒ کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کی کنیت ”ابوالحسن“ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن آپؒ کا بیٹا تھا اور پہلی بیوی کے بطن سے تھا۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق حسن کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ الغرض قدرت نے آپؒ کو اہل و عیال کی زنجیروں سے آزاد کر دیا اور آپؒ پرے انہماک کے ساتھ جستجوئے حق میں مشغول ہو گئے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ ابوالفضلؒ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپؒ ہمہ وقت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے۔ ایک دن حضرت شیخؒ نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”علی! اب تمہارے قلب میں اتنی استقامت پیدا ہو چکی ہے کہ اس خارزار ہستی سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ گے۔“

”یہ سب میرے اللہ کا کرم اور مرشد کی دعاؤں کا ثمر ہے۔“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کیا۔

”علی! اگر حق تعالیٰ نے تمہیں ثمر بار بنایا ہے تو پھر دوسروں کو بھی اس ثمر سے فائدہ پہنچاؤ۔“ حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔

”جو شیخ کا حکم ہو۔“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے سر تسلیم خم کر دیا۔

”تمہیں لاہور جانا ہوگا۔“ پیر و مرشد نے فرمایا۔ ”وہاں ایک مخلوق خدا تمہاری منتظر ہے۔ لوگ پیاس کی شدت سے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں مگر انہیں کوئی چشمہ معرفت نہیں ملتا۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ کو ایک لمحے کے لئے بھی پیر و مرشد کی جدائی گوارا نہیں تھی اور حکم شیخ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ منزل فراق قریب آگئی ہے۔ ”میں پیر و مرشد کے قدموں سے جدا ہو کر کہاں جاسکتا ہوں؟“

آپؐ نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

”علی! بظاہر یہ منزلِ فراق ہے مگر تم مجھ سے دور نہیں رہو گے۔“ حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے اپنے محبوب مرید کی دلی کیفیات کا اندازہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”مگر وہاں تو آپ کے مرید کامل حضرت شیخ حسین زنجائیؒ موجود ہیں اور وہ بحکم خدا قطب الاقطاب ہیں۔ ان کی موجودگی میں میری کیا ضرورت ہے؟“ حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے عذر پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”اور اگر میں لاہور چلا بھی جاؤں تو شیخ حسین زنجائیؒ کے ہوتے ہوئے میری ذات سے وہاں کے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”یہ حجت ہے یا انکار؟“ حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے دریافت کیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے پیرومرشد کے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا اور فوراً ہی عرض کرنے لگے۔ ”خادم کو مجالِ انکار کہاں؟ بس تصورِ فراق سے آزرده ہوں۔“

”اگر قریب رہو گے تو ساعتِ فراق نہیں آئے گی؟“ حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔ ”کیا میرے پیرومرشد مجھ سے جدا نہیں ہوئے؟ یہی نظامِ قدرت ہے۔“

”خادم تو بس حضوری چاہتا ہے۔“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے عرض کیا۔ ”یہی ایک آرزو ہے کہ خدمتِ شیخ میں زندگی گزار دوں۔“

”علی! اب یہی میری خدمت ہے کہ تم لاہور چلے جاؤ۔“ حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے فرمایا۔ ”یہ دُوری نہیں، حضوری ہے۔“

الغرض حضرت سید علی ہجویریؒ پیرومرشد کی دعاؤں کے سائے میں اس طرح رخصت ہوئے کہ آپؐ کی آنکھیں اشک باریں اور چہرہ مبارک پر رنج و الم کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔

تاریخ اور جغرافیہ پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ غزنی سے لاہور تک کا سفر کس قدر طویل اور کتنا دشوار گزار ہے؟ ملک الگ، زبان اور تہذیب و معاشرت جدا۔ ایسے سفر کی تیاریوں کے لئے جس قسم کے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر حضرت سید علی ہجویریؒ منزلِ عشق کے مسافر تھے۔ اس لئے کسی زادِ راہ کے بغیر ہی پیادہ پاروانہ ہو گئے۔

تقریباً دو ماہ بعد حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور پہنچے۔ یہ 431ھ کا زمانہ تھا۔ جب آپؐ لاہور تشریف لائے تو شام ہو چکی تھی۔ کسی سے جان پہچان نہیں تھی۔ اس لئے آپؐ نے شہر سے باہر ہی قیام کیا۔ پنجابی زبان کے ایک قدیم قلمی نسخے میں درج ہے کہ جہاں حضرت سید علی ہجویریؒ آکر ٹھہرے تھے اس جگہ ایک بلند ٹیلہ تھا اور اس پر ایک ”کریر“ کا درخت تھا۔ اس درخت کی لکڑی آج تک دربار میں موجود ہے۔

پھر جب صبح ہوئی تو حضرت سید علی ہجویریؒ شہر میں داخل ہوئے۔ اسی وقت سامنے سے ایک جنازہ آ رہا تھا۔ آپؐ نے شرکاء سے پوچھا۔ ”کس کی میت ہے؟“

لوگوں نے بتایا حضرت شیخ حسین زنجائیؒ کل رات انتقال فرما گئے۔

یہ جانگداز خبر سن کر چند لمحوں کے لئے حضرت سید علی ہجویریؒ دم بخود رہ گئے۔ پھر آپؐ کی آنکھیں

آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس اشک ریزی کے دو اسباب تھے۔ ایک یہ کہ آپؑ نے پیر و مرشد کے حکم کی مصلحت کو نہیں سمجھا اور سفر لاہور کے سلسلے میں عذر پیش کیا۔ دوسرے حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا دیدار آپؑ کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس لئے اپنی محرومی پر آبدیدہ ہو گئے۔

معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ، حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی تدفین میں شریک ہوئے۔ مقامی باشندوں نے بڑی حیرت سے اس اجنبی شخص کو دیکھا جو دفن کے بعد بھی بہت دیر تک قبر کے قریب اُداس بیٹھا رہا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ اکثر حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے اور رقت قلب کے ساتھ اپنے ”پیر بھائی“ کے لئے دعائے خیر فرماتے تھے، بہت دن بعد لاہور کے باشندوں پر یہ راز کھلا کہ جو روشنی زیر خاک روپوش ہو گئی ہے اور جو روشنی مزار کے باہر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ نظر آرہی ہے، دونوں ایک ہی آفتاب معرفت کا حصہ ہیں۔



حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپؑ 26 شعبان 347ھ کو ایران کے مشہور تاریخی شہر زنجان میں پیدا ہوئے۔ آپؑ کا شجرہ نسب براہ راست حضرت سیدنا امام حسینؑ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے والد ماجد کا نام سید علی محمود تھا۔ آپؑ کی تعلیم و تربیت زنجان ہی میں ایک امام مسجد کے زیر سایہ ہوئی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد آپؑ نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کے دل میں روحانیت کے باطنی اسرار جاننے کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر اسی جذبے سے سرشار ہو کر آپؑ مرشد کامل کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان دنوں حضرت شیخ ابوالفضلؒ کی روحانیت کا بہت جہ چا تھا۔ چنانچہ آپؑ اپنے والد محترم کے ساتھ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہی کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے۔

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے پیر و مرشد کی نگرانی میں سخت مجاہدے کئے۔ روایت ہے کہ حضرت شیخؒ کے حکم کے مطابق طویل عرصے تک ایک مکان میں گوشہ نشین رہے۔ اس دوران آپؑ نے نہایت قلیل غذا استعمال کی اور شب و روز کے بیشتر لمحات ذکر الہی میں گزار دیئے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ اسم اللہ کا بہت زیادہ ورد کیا کرتے تھے۔ جب آپؑ کی روحانی تربیت مکمل ہو گئی تو حضرت شیخ ابوالفضلؒ نے خرقہ خلافت عطا کرتے ہوئے فرمایا۔

”سید حسین! میں نے تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ اب دیار ہند تمہارا مسکن ہے۔ جاؤ اور بت پرستوں کو خدائے واحد کا پیغام سناؤ..... یقیناً اس راستے میں تمہیں بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ایسے جاں نسل لمحات میں تم اپنے اللہ ہی کو یاد کرنا اور اسی سے مدد مانگنا کہ وہی سارے عالم کا مشکل کشا ہے اور وہی دیکھ رہا ہے۔“

پیر و مرشد کا حکم پا کر حضرت سید حسینؒ اپنے شہر زنجان میں واپس آئے اور وہاں سے ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت میں آپؑ نے ہندوستان کی طرف اپنے تبلیغی سفر کا آغاز کیا۔ اس قافلے میں حضرت سید

حسین زنجانیؒ کے حقیقی بھائی حضرت سید یعقوب زنجانیؒ اور حضرت سید موسیٰ زنجانیؒ بھی شامل تھے۔ یہ 385ھ کا زمانہ تھا۔ آخر دو سال کے طویل سفر کے بعد حق پرستوں کا یہ قافلہ سبزوار، نیشاپور، ہرات، غزنی، جلال آباد اور پشاور ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔

لاہور میں آنے کے بعد حضرت شیخ حسین زنجانیؒ اور آپؒ کے ساتھیوں نے شہر کے جنوبی علاقے میں قیام کیا۔ یہ مقام آج کل ”شاہ عالمی“ کہلاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت سید یعقوب زنجانیؒ سے فرمایا کہ وہ تبلیغ کے لئے شہر کے جنوبی حصے کو مرکز بنالیں۔ دوسرے بھائی حضرت سید موسیٰ زنجانیؒ کو حکم دیا کہ وہ ”مستی دروازے“ کے آباد علاقے میں خیمہ زن ہو جائیں۔ آخر میں آپؒ نے اپنے لئے لاہور کے مشرقی علاقے میں آبادی سے دور ساحل دریا کی تنہائی کو پسند فرمایا۔ یہ علاقہ آپؒ کی ذات گرامی کی نسبت سے آج بھی ”چاہ میراں“ کہلاتا ہے۔ ”میراں“ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا لقب ہے۔

ان دنوں لاہور کے لوگوں کی اکثریت ہندو مذہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سورج دیوتا کے مندر میں اپنی مذہبی رسوم ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے کچھ عرصے تک ہندوؤں کی زبان سیکھی تاکہ مقامی لوگوں کو ان ہی کی زبان میں دین اسلام کا مفہوم سمجھایا جاسکے۔ پھر آپؒ نے تبلیغ کا آغاز اس طرح کیا کہ روزانہ شہر کے گلی کوچوں میں جاتے اور بت پرستوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کی تقریریں بہت پرجوش ہوتی تھیں۔ جب ہندو سرداروں کو خبر ملی کہ ایک مسلمان درویش ان کے ہم مذہبوں کو درغلارہا ہے اور بت پرستی کو باطل قرار دے رہا ہے تو انہوں نے محلے کے شریر لڑکوں کو سید حسین زنجانیؒ کے پیچھے لگا دیا۔ حضرت شیخؒ جدھر بھی جاتے، شریر ہندو لڑکے سائے کی طرح آپؒ کے تعاقب میں لگے رہتے۔ پھر جیسے ہی سید حسین زنجانیؒ بت پرستوں کو مخاطب کر کے اپنا وعظ شروع کرتے، وہ فتنہ پرداز لڑکے شور مچانے لگتے۔

”اپنے کان بند کر لو۔ اس مخبوط الحواس شخص کی کوئی بات نہ سناؤ نہ تم پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا۔“ لڑکوں کا شور و غوغا سن کر بت پرست منتشر ہو جاتے اور حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نہایت افسردہ لہجے میں فرماتے۔ ”لوگو! میری بات سنو۔ تم لوگ آگ کے اس گڑھے کی طرف بڑھ رہے ہو جو اپنی فطرت میں نہایت ہولناک ہے۔ یہ آگ کسی بت پرست کو نہیں چھوڑے گی۔ اس سے پہلے کہ تم اس کا ایندھن بن جاؤ، حق کی طرف لوٹ آؤ۔“

بت پرست استہزا کرتے ہوئے کہتے۔ ”ہم نے ساری زندگی اس آگ کی پوجا کی ہے۔ یہ اپنے پرستاروں کو کبھی نہیں جلاتی۔ یہی ہماری نجات دہندہ ہے۔“

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ آدم زادوں کی اس ضلالت و گمراہی پر مغموم ہو جاتے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگتے۔ ”بے شک! تُو ہی اپنی مخلوق کو ہدایت دینے والا ہے۔ تیری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنے جزو ناتواں بندے سید حسین کو استقامت دے کہ وہ تجھ ہی سے مدد کا طالب رہے۔“

معتبر روایت ہے کہ حضرت شیخ حسین زنجانیؒ نے تین سال تک مسلسل تبلیغ کی اور اس راستے میں

بے شمار اذیتیں برداشت کیں مگر ایک ہندو بھی حلقہ اسلام میں داخل نہ ہو سکا۔ آپؐ اپنی ناکامی پر بہت دل شکستہ تھے کہ ایک رات پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا، حضرت شیخ ابوالفضلؒ فرما رہے تھے۔

”حسین! ہم نے تمہارے صبر کو آزمایا۔ اب سوائے جمعہ کے اپنی قیام گاہ پر ہی رہا کرو۔“

پیر و مرشد کے حکم کے مطابق حضرت شیخ حسین زنجائیؒ نے تبلیغ کا طریق کار بدل ڈالا۔ اب آپؐ صرف جمعہ کے دن ہندو آبادی میں جاتے اور بت پرستوں کو خدائے وحدہ لا شریک کا پیغام سناتے۔ ایک دن آپؐ ہندو محلے میں تقریر کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور با آواز بلند کہنے لگا۔

”اگر تم سچے ہو تو میرے باپ کو ٹھیک کر دو۔ لاہور کے سارے وید اور حکیم اسے لا علاج قرار دے چکے ہیں۔“

حضرت شیخ حسین زنجائیؒ نے فرمایا۔ ”شفا تو وہی دیتا ہے جو اپنی ذات میں واحد ہے اور پرستش کے لائق ہے۔ پھر بھی تم تھوڑا سا پانی لاؤ۔ میں اپنے مالک سے التجا کروں گا کہ وہ تمہارے بیمار باپ کو شفا دے دے۔“

ہندو نو جوان پانی کا برتن لے آیا۔ حضرت شیخ حسین زنجائیؒ نے چند آیات الہی پڑھ کر پانی پر دم کر دیا۔ پھر ہندو نو جوان سے فرمایا۔ ”یہ پانی اپنے باپ کو پلا دو۔ طبیب حقیقی شفا بخشے گا۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ حسین زنجائیؒ اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ آئے۔

دوسرے دن وہی ہندو نو جوان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قدموں پر گر کر کہنے لگا۔ ”بے شک! آپ سچے سنت ہیں۔ میرا باپ جو کل تک اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا تھا، اب وہ پلنگ سے اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہونے لگا ہے۔ کچھ دن بعد آپ کے سلام کے لئے حاضر ہو گا۔“

اس واقعہ کے بعد بت پرستوں کے حلقے میں ایک شور مچ گیا، بہت سے بیمار ہندو آپؐ کی خانقاہ کے دروازے پر سر جھکائے ایستادہ نظر آنے لگے۔ حضرت شیخ حسین زنجائیؒ انہیں پانی دم کر کے دیتے اور پھر مریض چند ہی روز میں صحت یاب ہو جاتا۔ حضرت شیخؒ کی یہ کرامت دیکھ کر لاہور کے باشندے آپؐ کو ”سیجا“ کہہ کر پکارنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بت پرستوں کی صفیں ٹوٹنے لگیں اور کافرانہ عقائد کے مضبوط قلعوں میں گہرے شکاف پڑنے لگے۔ لوگ اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے قشقے کھرچنے لگے اور گلوں میں پڑے ہوئے زنا توڑ کر پھینکنے لگے۔

حضرت شیخ زنجائیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک ہندو کاشتکار رہتا تھا جو عرصہ دراز سے دے دے کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا تھا۔ جب اس نے حضرت شیخؒ کی شہرت سنی تو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ بہت بڑے وید ہیں اور ایسے بیماروں کا بھی علاج کر دیتے ہیں جن پر کوئی دوا اثر انداز نہیں ہوتی۔“

”تم نے غلط سنا ہے۔ میں کوئی طبیب نہیں ہوں۔“ حضرت شیخ حسین زنجائیؒ نے فرمایا۔

ہندو کسان حضرت شیخؒ کے انکار پر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے نہایت غمزہ لہجے میں کہا۔ ”لوگ تو یہی کہتے ہیں۔“

بوڑھے بت پرست کو اُداس اور دل گرفتہ دیکھ کر حضرت شیخ زنجائی نے فرمایا۔ ”تم شفا یاب ہو جاؤ گے مگر اس کے لئے تمہیں ایک سخت آزمائش سے گزرنا ہوگا۔“

”میں آپ کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔“ اپنی زندگی سے بیزار ہندو کاشتکار نے کہا۔
 ”تمہیں اپنے باپ دادا کا دھرم چھوڑ کر مذہب اسلام قبول کرنا ہوگا۔“ حضرت شیخ حسین زنجائی نے فرمایا۔ ”اس کے بعد تمہیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہوگی۔ بجز مرض الموت کے جو ہر جاندار کا مقدر ہے۔“
 بوڑھا ہندو کسان کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے دل ہی دل میں ایک منافقانہ فیصلہ کیا کہ وہ حضرت شیخ حسین زنجائی کے سامنے اسلام قبول کر لے گا مگر درپردہ اپنے آبائی مذہب پر عمل پیرا رہے گا۔ اس منافقانہ فیصلے کے بعد بت پرست کاشتکار نے بظاہر نہایت پرجوش لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتائیے کہ آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے؟“

حضرت شیخ حسین زنجائی نے اسے کلمہ شہادت کی تلقین فرمائی۔ ہندو کسان نے با آواز بلند اللہ اور اس کے آخری رسول ﷺ پر گواہی دی۔

حضرت شیخ زنجائی نے ایک مشرک کا اقرار سن کر تبسم فرمایا۔ ”اب تمہاری صحت تمہاری نیت پر منحصر ہے۔“

”شیخ! میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔“ نو مسلم کسان نے حیران ہو کر کہا۔

”مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے اقرار میں سچے ہو تو بیماریاں تم سے ہمیشہ دور رہیں گی۔ اور اگر اس ذات پاک کو دھوکا دے رہے ہو جس پر کائنات کے ایک ایک ذرے کا حال روشن ہے تو پھر یہ مرض شمشان بھومی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

حضرت شیخ حسین زنجائی کی زبان مبارک سے یہ انکشاف سن کر بوڑھے کسان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ”شیخ! میری نیت تو میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی۔ پھر یہ راز آپ پر کس طرح فاش ہو گیا؟“

”حق تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ جسے چاہتا ہے پوشیدہ رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے نقاب کر دیتا ہے۔“ حضرت شیخ حسین زنجائی نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی بوڑھا کسان اپنے منافقانہ فیصلے سے تائب ہوا اور اس نے کھلے دل سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ پھر جیسے ہی اس نے دوبارہ کلمہ شہادت پڑھا، برسوں پرانی دے کی تکلیف اس طرح ختم ہو گئی جیسے یہ مرض اسے لاحق ہی نہیں ہوا تھا۔

ایمان لانے کے بعد وہ بوڑھا کسان کئی سال تک زندہ رہا۔ اس دوران وہ اظہار عقیدت کے طور پر اپنے کھیتوں کا اناج اور سبزیاں حضرت شیخ حسین زنجائی کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا۔ اس کے تین جواں سال بیٹے تھے۔ بوڑھے کسان نے بارہا اپنے بیٹوں کو اسلام کی دعوت دی مگر وہ تینوں گمراہ نوجوان اپنے باپ کا مذاق اڑاتے رہے۔

پھر جب وہ بوڑھا کسان دنیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے تینوں بیٹوں کو وصیت کی۔

”میری بات غور سے سنو کہ تمہارے حق میں ایمان لانا ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو تو کم سے کم اتنا ضرور کرنا کہ حضرت شیخ کی خدمت میں اناج اور سبزیاں بھیجتے رہنا۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہاری زمین تمہارے اندازوں سے زیادہ فصل پیدا کرے گی اور تم خوشحال زندگی بسر کرتے رہو گے۔“

باپ کے مرتے ہی بیٹوں نے اس کی وصیت کو بھلا دیا۔ اگر کسی متعلقہ فرد نے کبھی اس کا ذکر بھی کیا تو وہ تینوں استہزا کرنے لگے۔ ”ہمارا باپ تو احمق تھا کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں اپنا دھرم بھی بچ گیا اور جب تک زندہ رہا اپنے مال و متاع کا نقصان بھی کرتا رہا۔ مگر ہم کسی کے فریب میں آنے والے نہیں۔“

روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اس سال فصل بہت شاندار ہوئی تھی۔ دیکھنے والوں نے کہا۔ ”یہ سب حضرت شیخ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

”یہ سب ہماری محنت کا صلہ ہے۔“ تینوں بھائیوں نے متکبرانہ لہجے میں جواب دیا۔

پھر جب وہ سوکراٹھے تو ایک ہی رات میں نقشہ بدل گیا تھا۔ کھیت ویران پڑے تھے اور تمام فصل سوکھ گئی تھی۔ اپنی بربادی کا ہولناک منظر دیکھ کر تینوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کہیں یہ ہمارے اس گناہ کی سزا تو نہیں کہ ہم نے باپ کی وصیت کو فراموش کر دیا۔“

اس خیال کے آتے ہی تینوں بھائیوں کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ جھکے ہوئے سروں کے ساتھ حضرت شیخ زنجائی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رو کر اپنا حال زار بیان کرنے لگے۔

”فقیر کو تمہارے مٹھی بھر اناج کی کوئی حاجت نہیں۔“ حضرت شیخ زنجائی نے فرمایا۔ ”میں تمہارے حق میں اس لئے دعا کروں گا کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔ جاؤ! اللہ ان ویران کھیتوں کو دوبارہ سرسبز و شاداب کر دے گا۔“

پھر جب وہ تینوں اپنے کھیتوں پر پہنچے تو ایک ناقابل یقین منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ فصل والہانہ انداز سے لہلہا رہی تھی اور زمین پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔

”ہمارے باپ نے صحیح سودا کیا تھا۔ ہمیں بھی خرید لیجئے کہ آپ سے بہتر کوئی خریدار نہیں۔“ حضرت شیخ حسین زنجائی کی بارگاہ میں تینوں بھائیوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح ہزاروں دیوتاؤں کی نفی کر کے خدائے واحد کی حقانیت پر گواہی دے رہے تھے۔

حضرت شیخ حسین زنجائی نے چوالیس سال تک اپنے لہو سے اس زمین کی آبیاری کی جسے بت پرستوں نے پتھر بنا دیا تھا۔ پھر جب یہ مٹی نم ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ تو حید کی نئی فصل بونے کے لئے تشریف لانے والے تھے۔ یہ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جس رات اللہ کا ایک ولی رخصت ہوا، اسی رات دوسرا ولی حدود لاہور میں داخل ہوا۔ ماضی میں بھی ہمیں ایک ایسی ہی عجیب مثال نظر آتی ہے کہ جس رات کے ابتدائی حصے میں حضرت امام ابو حنیفہؒ رخصت ہوئے، اسی رات کے آخری حصے میں حضرت امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔

حضرت شیخ حسین زنجائی کی تدفین کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نہایت خاموشی کے ساتھ مسجد کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ اس مسجد کی تعمیر کے وقت علمائے لاہور نے اعتراض کیا کہ قبلے کا جھکاؤ جنوب

کی سمت ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ نے علماء کے اعتراض کو بے نیازی کے ساتھ سنا اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ پھر خانہ خدا کی تعمیر کے بعد آپؒ نے علمائے لاہور کو جمع کیا اور اپنے روحانی تصرف کے ذریعے معترضین کو کھلی آنکھوں سے قبلے کا مشاہدہ کرا دیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس کرامت کا بہت غلغلہ ہوا اور عقیدت مندوں کا ہجوم آپؒ کے گرد سمٹ آیا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی، اسی کو اپنی تمام تبلیغی اور تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ خانہ خدا سے ملحق ایک مدرسہ تھا جہاں مسلمان طلباء آپؒ سے عربی سیکھتے تھے اور قرآن کریم کا درس لیا کرتے تھے۔ مدرسے کے برابر ایک حجرہ تھا جس میں آپؒ آرام فرمایا کرتے تھے۔ گردشِ ماہ و سال اور مقامی مسلمانوں کی بے پرواہی کے سبب یہ مسجد بے نشان ہو گئی مگر اس کے کچھ آثار آج بھی باقی ہیں۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کے درس دینے کا انداز بڑا دلنشین تھا۔ آپؒ اکابرین اسلام کی حیات مبارکہ کے حوالے سے ایسے واقعات بیان فرماتے کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی پگھل جاتا تھا اور گمراہوں کو نشانِ منزل صاف نظر آنے لگتا تھا۔ ایک بار آپؒ ایثار اور قربانی کے موضوع پر قریر فرما رہے تھے۔

”جب تک اپنی نفسانی خواہشوں کو اپنے بھائیوں کی فلاح کے لئے قربان نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک انسان پر پاکیزہ زندگی کے اسرار نہیں کھلتے اور کثافتیں اس کے وجود کو گھیرے رہتی ہیں۔“

یہ کہہ کر حضرت سید علی ہجویریؒ نے تین بزرگوں کا ایک واقعہ سنایا جسے سن کر آج بھی اہل ایمان کا لہو گرما جاتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا انتقال 686ھ میں ہوا۔ آپؒ کے متعلق حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ شیخ نوریؒ کے انتقال سے دنیا کا آدھا علم جاتا رہا۔

دوسرے بزرگ حضرت شیخ رقامؒ تھے جو صاحب علم بھی تھے اور صاحب تقویٰ بھی۔ تیسرے بزرگ حضرت ابو حمزہ بغدادیؒ تھے جنہیں بے خبر لوگوں کے ہاتھوں بڑی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔

خلیفہ وقت کا ایک غلام جس کا نام خلیل تھا، ان تینوں بزرگوں کے خلاف اپنے دل میں کدورت رکھتا تھا۔ اس نے ایک دن موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر المومنین سے کہا۔

”شیخ نوریؒ، شیخ رقامؒ اور شیخ ابو حمزہؒ کی وجہ سے لوگوں کا دین برباد ہو رہا ہے۔ یہ تینوں گمراہوں کے سردار ہیں۔ اگر ان تینوں کو قتل کر دیا جائے تو مذہب اسلام خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔“

خلیفہ وقت نے تحقیق کرائے بغیر ان تینوں کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ حضرت شیخ نوریؒ، حضرت رقامؒ اور حضرت ابو حمزہ بغدادیؒ کو گرفتار کر کے حاکم شہر کے سامنے لایا گیا۔

”تم لوگوں کے عقائد میں خلل ڈالتے ہو اور انہیں گمراہی کے راستے پر بلاتے ہو۔“ حاکم شہر نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”واللہ! ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔“ حضرت شیخ نوریؒ نے فرمایا۔

”تم موت کے خوف سے جھوٹ بول رہے ہو ورنہ سارا زمانہ تمہاری فتنہ انگیزیوں پر گواہ ہے۔“ حاکم

شہر نے تینوں بزرگوں کی کوئی دلیل قبول نہیں کی۔

”ہم سچ کی حقیقت کو پا چکے ہیں۔ اس لئے جھوٹ سے ہمیں کوئی نسبت نہیں۔“ حضرت ابو حمزہ بغدادی نے فرمایا۔

حاکم شہر نے اپنی سماعت کے دروازے بند کر لئے۔ یہاں تک کہ تینوں بزرگوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور جلاد نے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔

حاضرین کے دل رو رہے تھے مگر رعب اقتدار سے ان کی زبانیں خاموش تھیں۔

آخر جلاد تلوار لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر جیسے ہی وہ شیخ رقام کے قریب پہنچا، حضرت شیخ ابوالحسن نوری پوری شدت سے چیخ اٹھے۔ ”ادھر آؤ۔ پہلے میرا حق ہے۔“

حضرت شیخ نوری کی آواز میں ایسا جلال تھا کہ جلاد ٹھہر گیا۔

حاکم شہر بھی گھبرا گیا۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھا اور حضرت شیخ ابوالحسن نوری کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”کیوں شور مچاتے ہو؟ کیا تلوار میں ایسی لذت ہے کہ تم پہلے اپنی گردن اس کے نیچے رکھ دینا چاہتے ہو؟“

”ہاں!..... اس شمشیر خوں آشام میں ایسی ہی لذت ہے۔“ حضرت شیخ ابوالحسن نوری نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

”کیا موت کی دہشت نے تمہارے حواس تو نہیں چھین لئے ہیں؟“ حاکم شہر ایک صوفی کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

”میں پورے ہوش میں ہوں۔“ حضرت شیخ ابوالحسن نوری نے فرمایا۔ ”میرا مذہب ایسا ہے اور ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ چند سانس اپنے بھائیوں کی بہتری کے لئے صرف کر دوں۔ دوسری دنیا میں خدمت نہیں، قربت ہوتی ہے۔ ایثار کی لذت اسی دنیا میں ہے۔ پھر یہ لذت کسے نصیب ہوگی۔ اے میرے مہربان حاکم! مجھے اس لذت سے محروم نہ رکھ۔ بس یہی میری آخری خواہش ہے۔“

حاکم شہر نے حضرت شیخ نوری کی گفتگو سنی تو سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے جلاد کو اشارہ کیا کہ اپنی شمشیر نیام میں کر لے۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی کہ کچھ دیر کے لئے یہ ساعت گراں ٹل گئی تھی۔

”انہیں قید خانے میں ڈال دو۔“ یہ کہہ کر حاکم چلا گیا اور تینوں بزرگ حوالہ زنداں کر دیئے گئے۔

پھر حاکم شہر نے خلیفہ وقت کو طویل خط لکھا۔

”امیر المومنین! یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لوگوں کے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے؟ میری آنکھوں نے جو رنگ دیکھا ہے، وہ بہت عجیب ہے۔“

یہ تحریر کرنے کے بعد حاکم شہر نے حضرت شیخ ابوالحسن نوری کے ایثار کا واقعہ بھی تفصیل سے لکھ دیا۔

خلیفہ وقت نے حاکم شہر کا عریضہ پڑھا تو کچھ دیر کے لئے اس پر بھی سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ”کیا میری مملکت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں؟“ خلیفہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

پھر اس نے ایک برق رفتار قاصد کو یہ حکم دے کر روانہ کیا۔ ”تینوں کا قتل موقوف کر دو اور فوری طور پر

انہیں دربار میں بھیج دو۔“

حاکم شہر نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ، حضرت شیخ رقامؒ اور حضرت شیخ ابو حمزہؒ کو بغداد روانہ کر دیا۔

پھر یہ تینوں بزرگ اس شان بے نیازی کے ساتھ دربار خلافت میں داخل ہوئے کہ ان کے چہروں پر اطمینان و آسودگی کی گہری جھلک نمایاں تھی۔ خلیفہ وقت نے بہت غور سے ان صوفیوں کی طرف دیکھا جن کے لباسوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ کثرت ریاضت کے سبب جسم لاغر و نحیف تھے مگر پیشانیوں سے عجیب روشنی پھوٹ رہی تھی اور زرد چہروں سے عجیب شان کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کیا تم امیر المومنین سے کوئی حاجت رکھتے ہو؟“ خلیفہ وقت کی پر جلال آواز دربار میں گونجی۔
”یقیناً ہم ضرورت مند ہیں۔“ حضرت شیخ رقامؒ نے فرمایا۔ ”اور ایسی حاجت رکھتے ہیں جسے پورا کرنے پر امیر المومنین قادر ہیں۔“

حضرت شیخ رقامؒ کی بات سن کر خلیفہ وقت کے چہرے پر خوشی کا رنگ ابھر آیا۔ اُسے یقین تھا کہ حضرت رقامؒ اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے دربار خلافت سے رحم اور عافیت کا سوال کریں گے۔ ”تمہارے بقول اگر میں حاجت روایت پر قادر ہوا تو یقین رکھو کہ تم میرے دربار سے مایوس نہیں لوٹو گے۔“

”تو پھر اے امیر المومنین! اتنی مہربانی کریں کہ ہم درویشوں کو فراموش کر دیں اور دوبارہ دربار میں حاضر ہونے کی زحمت نہ دیں۔“ حضرت شیخ ابو حمزہ بغدادیؒ نے فرمایا۔

عجیب التجا تھی جسے سن کر خلیفہ وقت حیران رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ فاقہ کش لوگ دربار خلافت سے اس قسم کی درخواست کریں گے۔

ابھی خلیفہ وقت اسی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا۔ ”اے امیر المومنین! جس قدر جلد ہمیں فراموش کر دیں گے، اسی قدر آپ کا احسان زیادہ ہوگا۔“

خلیفہ وقت نے بہت کوشش کی کہ تینوں بزرگ کوئی عطیہ، کوئی نذر قبول کر لیں مگر درویشوں کو دربار خلافت کی حدود سے نکل جانے کی بہت جلدی تھی۔ مجبوراً خلیفہ نے انہیں نہایت عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔ پھر جب حضرت شیخ نوریؒ، حضرت شیخ رقامؒ اور حضرت شیخ ابو حمزہ بغدادیؒ دربار خلافت سے چلے گئے تو خلیفہ اپنے غلام خلیل پر برس پڑا۔

”بد نصیب! تو میرے ہاتھوں کو ان برگزیدہ لوگوں کے خون سے آلودہ کرنا چاہتا تھا۔“ یہ کہہ کر خلیفہ نے خلیل کو شہر بدر کر دیا۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”ایثار کی انتہا یہ ہے کہ ایک عابد و زاہد شخص سے ایک خطا سرزد ہو گئی۔ غیب سے آواز آئی کہ آج سے تیرا نام بد بختوں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہے۔“

اس عابد و زاہد شخص نے گریہ و زاری کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”اے میرے معبود! اگر تیری مشیت یہی ہے کہ میں دوزخ کا ایندھن بن جاؤں تو پھر تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ اپنے دوسرے بندوں کی جگہ

صرف مجھے جہنم میں ڈال دے تاکہ میرے انجام سے تیری مخلوق کو فائدہ پہنچے۔“
اس کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا کہ حضرت شیخ ابوالحسن نورانیؒ بھی ہمیشہ یہی دعا مانگا کرتے تھے۔

”بارالہما! ہر چیز خواہ وہ بری ہے یا بھلی، تیرے علم، تیری قدرت اور تیرے ارادے سے اس دنیا میں ہے۔ اگر تو ناچار دوزخ کو بھرنا ہی چاہتا ہے تو پھر اس کے سارے طبقوں کو مجھ سے بھر دے اور اپنے بندوں کو دوزخ کی آگ سے نجات دے دے۔“
حق تعالیٰ کا بھی یہی ارشاد ہے۔ ”تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے، یہاں تک کہ وہ چیز خرچ نہ کر دو جس کا تم محبت کرتے ہو۔“ (ترجمہ)

ایک اور موقع پر حضرت سید علی ہجویریؒ تقریر فرما رہے تھے۔ موضوع تھا ایثار۔
”ایک بار دس درویش سفر کر رہے تھے کہ گھنے جنگل میں پہنچ کر راستہ بھول گئے۔ جھلسا دینے والی دھوپ نے ان کے حلق خشک کر دیئے تھے اور پانی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ زادِ راہ کے طور پر ان درویشوں کے پاس جس قدر پانی موجود تھا، اس سے صرف ایک ہی آدمی کی پیاس بجھ سکتی تھی۔ آخر اس پانی کے استعمال کا وقت آیا تو تمام درویشوں نے ایک دوسرے کے لئے قربانی دی۔ یہاں تک کہ نو درویش مر گئے۔ پھر دسویں درویش نے وہ پانی پی لیا۔ کچھ دن بعد زندہ بچ جانے والے درویش نے ایک شخص سے یہ واقعہ بیان کیا۔

”اگر تم بھی وہ پانی نہ پیتے تو اچھا تھا۔“ اس شخص نے الم ناک ماجرا سن کر کہا۔
”اگر میں پانی نہ پیتا اور پیاسا مر جاتا تو خودکشی کے مجرم کی حیثیت سے آخرت میں میری گرفت ہوتی۔“ دسویں درویش نے جواب دیا۔

”پھر وہ نو درویش بھی خودکشی کے مرتکب ہوئے تھے۔ کیا بروز حشر ان سے باز پرس نہیں ہوگی؟“ اس شخص نے ایک عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

دسویں درویش نے جواب دیا۔ ”میرے تمام ساتھی شہید ہوئے ہیں۔“
”وہ کس طرح؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ان لوگوں نے ایک دوسرے کی جان بچانے کے لئے موت قبول کی تھی۔“ دسویں درویش نے کہا۔
”مگر جب میرے تمام ساتھی ایک دوسرے کی خاطر ایثار دیتے ہوئے انتقال کر گئے اور میں اکیلا رہ گیا تو شریعت نے مجھ پر واجب کیا کہ میں پانی پی لوں اور اپنے آپ کو دانستہ اور بغیر کسی بھلائی کے ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ اگر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح میں بھی پانی نہ پیتا تو میری موت بھی واضح ہو جاتی۔ چونکہ گیارہواں آدمی موجود نہیں تھا، جس کے لئے میں ایثار کرتا۔ نتیجتاً میری موت حرام ہو جاتی۔“

غزوہٴ اُحد کے حوالے سے بھی ایک ایسا ہی واقعہ مشہور ہے کہ ایک مسلم خاتون زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی۔ اتفاق سے وہاں سات مسلمان زخمی سپاہی میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ خاتون نے ایک سپاہی کو پانی پلانا چاہا تو اس نے اپنے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ الغرض

ایک دوسرے کے لئے ایثار کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ساتوں سپاہی شدید عالم تشنگی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کے اسی جذبہ ایثار کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ ”اور اپنی جانوں کا ایثار کرتے ہیں، اگرچہ انہیں ٹھگی ہو۔“ (ترجمہ)

یہ اثر انگیز تقریریں سن کر حضرت سید علی ہجویریؒ کے حلقہ عقیدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہزاروں انسان اپنی اپنی ضرورتیں لے کر آستانہ عالیہ پر حاضر ہوتے۔ آپؒ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے اور کارساز عالم اپنے بندوں کی مشکل کشائی فرما دیتا۔ کبھی کبھی خاص احباب جمع ہوتے تو آپؒ نہایت درو انگیز لہجے میں شکایت کرتے۔

”لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر وقت ناپائیدار دنیا کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی اولاد کی درخواست کرتا ہے، کوئی مال و زر کی اور کوئی عزت و جاہ کی۔ اگرچہ یہ ساری چیزیں فانی ہیں لیکن بنی نوع آدم نے انہیں مقصد حیات بنالیا ہے اور اس عہد کو فراموش کر دیا ہے جو ان کی روحوں نے روز الست میں اپنے رب سے کیا تھا۔ کبھی کوئی مجھ سے یہ نہیں کہتا کہ میں اس کی سلامتی ایمان کے لئے دعا کروں..... اور کبھی کوئی اپنا دامن اس لئے نہیں پھیلاتا کہ میں اس میں علم و حکمت کے سکے ڈال دوں۔ سب اس شے کے طلب گار ہیں جو اپنی فطرت میں بے وفا ہے اور اہل دل کے لئے سخت ضرر رساں ہے۔“

یہی وہ احساسات تھے جن کے سبب حضرت سید علی ہجویریؒ آزرده رہا کرتے تھے۔ آپؒ کے مدرسے میں طالب علموں کا ہجوم تھا مگر یہاں بھی وہی بے خبری کا فرما تھی۔ کوئی طالب علم بھی اس لئے تعلیم حاصل نہیں کر رہا تھا کہ وہ جہالت خانہ ہند میں اسلامی علم کی شمع روشن کرے گایابت پرستوں کی صفوں میں کار تبلیغ جاری رکھتے ہوئے راستے کی سختیاں برداشت کرے گا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے دین مصطفیٰ ﷺ کی خدمت کے لئے دو بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ایک یہ کہ اپنی تہذیب، ثقافت، وطن، حلقہ احباب اور ہر وہ چیز جو آپؒ کو محبوب تھی، اس سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ اور ایک ایسی زمین پر ہمیشہ کے لئے آباد ہو گئے تھے جہاں کا ذرہ ذرہ بے خبر اور بے گانہ تھا۔ دوسرے یہ کہ آپؒ نے لذت و نشاط کی زنجیر کو ترک کر کے مخلوق خدا کی خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ واضح رہے کہ جب سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے۔ اس وقت آپؒ کی عمر مبارک صرف اکیس سال تھی۔ اس زمانہ شباب میں خواہش نفس سے منہ موڑ لینا بذاتِ خود اتنی بڑی کرامت ہے کہ اسے بطور مثال ساری دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ دوسری قوموں میں ایسے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے تجرد کی زندگی بسر کی مگر وہ لوگ انسانی ہجوم میں نہیں ٹھہرے۔ تاریک غاروں، ویران جنگلوں اور سنان دریاؤں کے کنارے پڑے رہے اور ایک دن خاموشی سے کسی گوشہ گمنامی میں مر گئے۔ یہ ایک مکمل راہبانہ زندگی تھی جس نے ان کی ذات کو تو فائدہ پہنچایا مگر وہ لوگ مخلوق خدا کے کسی کام نہ آ سکے۔ اس کے برعکس حضرت سید علی ہجویریؒ ترک لذات کر کے مخلوق خدا کی ہجوم میں آئے اور اللہ کے بندوں سے اتنا پیار کیا کہ اپنی لذت کی بھی نفی کر دی۔ بقول اقبال

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

در اصل یہی اسلام اور رہبانیت کا فرق ہے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے مسجد اور مدرسے کی تعمیر میں جس قدر تکلیفیں برداشت کی تھیں، اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ کسی تاریخی حوالے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے خانہ خدا کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور یا دوسرے شہروں کے صاحبانِ ثروت سے مالی تعاون کی درخواست کی ہو یا آپؒ نے ذاتی خرچ سے مسجد تعمیر کرائی یا پھر آپؒ کو دستِ غیب حاصل تھا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، اس مردِ خدا کی قلندری میں کسے کلام ہو سکتا ہے جس نے تنہا ایک عبادت گاہ تعمیر کرائی اور پھر اس عمارت کے ستون کھڑے کئے ہوں جس کے ذرے ذرے سے علم کی روشنی پھوٹی تھی۔ پھر جب خانقاہ و مدرسہ تیار ہو گیا تو اس کی صدائے پر جلال گونجی۔

”لوگو! آؤ بھلائی کی طرف۔ مسافرو! آؤ روشنی کی طرف۔“

عقیدت مند ہوں یا معترضین، سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنے کسی شاگرد سے علم کی قیمت وصول نہیں کی۔ اگر طلب کرتے تو آپؒ کا یہ عمل بھی جائز ہوتا کیونکہ حضرت سید علی ہجویریؒ کا کوئی ذریعہٴ معاش نہیں تھا۔ مگر آپؒ تو قناعت اور توکل کے راستے کے مسافر تھے۔ اہل دنیا کے سامنے دستِ طلب کیا دراز کرتے..... اور اگر کوئی دیتا تو کیا دیتا کہ وہ جو چیز حاصل کر رہا تھا، اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔ علم و عمل کے بادشاہ کو دینے کے لئے اہل لاہور کے پاس کیا تھا۔ وہ تو خود ضرورت مند اور سوالی تھے۔

کچھ دنوں تک اہل طلب نے بڑے جوش اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اپنے شاگردوں سے کچھ مطمئن تھے۔ مگر ایک دن آپؒ پر ایک عجیب راز فاش ہوا۔ طالب علم بڑے ذوق و شوق سے اپنے اسباق یاد کر رہے تھے۔ بحث و مباحثہ بھی زور و شور پر تھا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو محسوس ہوا کہ شاگردوں کے دماغ روشن تھے مگر ان کے دل اور روہیں خالی تھیں۔ یہ بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ کسان نے جس زمین میں اپنا بیج بویا تھا، وہ زرخیز نہیں تھی۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے محسوس کیا کہ ان کے شاگردوں کے دماغ میں بوئے حکومت موجود ہے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر آپؒ نے کئی بار اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے میرے مرید! یہ دنیا ایک کشتی کے مانند ہے اور پانی پر تیر رہی ہے۔ پس ٹو غوطہ خور بن نہ کہ غرق آب ہو۔ کسی کا دل تجھ سے رنجیدہ نہ ہو۔ وہ بادشاہ جو ظلم کی بنیاد اُکھاڑنے اور رعایا کو فائدہ پہنچانے والا ہو، اس کی تعریف کر۔ مگر یاد رکھ کہ بادشاہ کی ستائش اس لئے نہ ہو کہ اس میں خود تیری غرض موجود ہو۔ اس نکتے کو فراموش نہ کر کہ طمع میں ہمیشہ خواری ہے۔ مرشد کو اپنا قبلہ سمجھ..... اور دل و جان سے اس کی خدمت کر کہ اسی میں تیری فلاح ہے۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ نے کئی بار واضح الفاظ میں اپنے شاگردوں کو تنبیہ کی مگر ان کے دلوں سے دنیا

کی بے جا طلب کم نہ ہو سکی۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے شاگردوں کا اندازِ فکر یہ تھا کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچ کر عوام الناس پر حکومت کریں گے۔ یہ سوچ روحانیت کے یکسر خلاف تھی۔ آخر سید علی ہجویریؒ کی تمام جان سوزیاں اور کاوشیں رائیگاں گئیں۔ لاہور کی تاریخ میں وہ دن بہت تاریک تھا جب حضرت سید علی ہجویریؒ نے مایوس ہو کر اپنی درس گاہ بند کر دی۔

”تمہاری یہ حرص و طمع تمہیں جس دروازے پر چاہے لے جائے، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے نہایت افسردہ لہجے میں اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اب میں تم سے کیا شکایت کروں کہ تم نے میرے خلوص کے بدلے میں مجھے کیا دیا؟ جو کچھ کہوں گا اپنے مالک سے کہوں گا کہ وہی تقدیروں کا بدلہ والا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے؟ مگر تم یہاں سے چلے جاؤ کہ اب میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔“

ایک عام آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ ادا کرتے وقت حضرت سید علی ہجویریؒ کس قدر رنجیدہ خاطر ہوں گے..... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک شاگرد نے بھی اپنے استاد گرامی کے اذیت و کرب کو محسوس نہیں کیا۔ دکان بند ہوئی تو دنیا داروں کی طرح اٹھ کر چلے گئے۔ تاریخ تصوف کے اوراق میں ایسے بے شمار واقعات محفوظ ہیں کہ جب کوئی مرید اپنے پیر و مرشد سے بچھڑتا تھا تو صدمہ فراق سے بے حال ہو جاتا تھا۔ خود حضرت سید علی ہجویریؒ جب اپنے شیخ حضرت ابوالفضل ختلیؒ سے رخصت ہوئے تھے تو شدتِ غم سے نڈھال تھے..... مگر جب حضرت علی ہجویریؒ کے شاگرد اپنے استاد کی درس گاہ سے اٹھے تو کسی کے چہرے پر عکسِ ملال تک نہیں تھا۔

پھر وہ دروازہ بند ہو گیا جس میں حکمت و عرفان کی مشعلیں جلتی تھیں اور جہاں سے سیاہ بخت لوگ روشنی لے کر اپنی روحوں کے تاریک مکانوں کو سجاتے تھے۔

جو لوگ قوموں کے عروج و زوال پر گہری نظر رکھتے ہیں، ان کے خیال میں یہ تاریخ لاہور کا سب سے بڑا المیہ تھا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے دل شکستہ ہو کر اپنی درس گاہ بند کر دی اور مقامی طالب علموں کو احساس تک نہیں ہوا کہ وہ کس عظیم نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

مدرسہ بند کرنے کے حوالے سے ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت سید علی ہجویریؒ درس دے رہے تھے۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے دو شاگردوں کا دھیان کسی اور طرف تھا اور کبھی کبھی وہ دونوں آپس میں گفتگو بھی کر لیتے تھے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے شاگردوں کا یہ عمل سخت ناگوار گزرا۔ آپؒ نے درس روک دیا اور نہایت پر جلال لہجے میں ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تو یہاں موجود ہوں۔ پھر تم کہاں بھٹک رہے ہو؟“

جیسے ہی شاگردوں کی نظریں استاد گرامی کے چہرہ مبارک پر پڑیں، دونوں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں اس وقت حضرت سید علی ہجویریؒ حالتِ جلال میں تھے اور ایک مردِ جلال کے جلال کو کوئی دنیا دار برداشت نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً وہ دونوں شوخ و شریر شاگرد حضرت شیخؒ کے جلال کی نذر ہو گئے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کو اپنے شاگردوں کی موت کا بڑا قلق تھا۔ آپؒ زندگی بھر اس واقعے کو فراموش نہ کر

مکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی الم ناک حادثے کے رونا ہونے کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ نے تمام طالب علموں کے لئے اپنی درس گاہ کے دروازے بند کر دیئے تھے اور علم کے طلب گاروں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

”اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ تم اس قابل نہیں کہ اس امانت کا بوجھ برداشت کر سکو۔“

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو شاگردوں کے نذر جلال ہونے کا واقعہ کوئی تاریخی حثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک ایسی روایت ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔ اس کے برعکس اس روایت پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ نے اپنے شاگردوں میں دنیا طلبی کا شدید جذبہ دیکھ کر مدرسہ بند کر دیا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کے زیر اثر حضرت سید علی ہجویریؒ نے اس کارِ عظیم کو ترک کر دیا جس کی خاطر آپؒ نے از دواجی زندگی سے گریز کیا اور شوقِ تبلیغ میں اپنا وطن تک چھوڑ دیا۔ اگرچہ ان تمام واقعات پر ماہ و سال کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور صدیوں کا کشفِ غبار چھایا ہوا ہے لیکن پھر بھی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت سید علی ہجویریؒ کو شدید اذیتیں پہنچائی تھیں جن سے دل برداشتہ ہو کر آپؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

درس گاہ کے دروازے بند ہو چکے تھے لیکن کار تبلیغ ختم نہیں ہوا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ عام لوگوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے اور اپنے پُر اثر وعظ سے گم کردہ راہ انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے۔ پھر جذبہ عقیدت اس قدر بڑھا کہ لوگ آپؒ کو ”گنج بخش“ کہہ کر پکارنے لگے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد مشہور بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور تشریف لائے اور حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار مبارک کے قریب چلہ کش ہوئے اور پھر دہلی جانے سے پہلے آپؒ نے یہ شعر پڑھا جو شہرت و دوام حاصل کر چکا ہے۔

مکج بخش هر دو عالم، مظهر نور خدا
ناقصاں را عید کامل کاطلاں را رہنما

”دونوں جہاں کے خزانے دینے والا، نور خداوندی کا مظہر،

ناقص لوگوں کے لئے مرشد کامل اور کاملوں کے لئے رہنما“ (ترجمہ)

اکثر تذکرہ نگاروں نے اس شعر کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کیا ہے مگر "معین بخش" کا لفظ حضرت سید علی ہجویری کی زندگی میں ہی شہرت پا چکا تھا۔ آپؒ نے اپنی تصنیف "کشف الاسرار" میں ایک مقام پر فرمایا۔

”اے علی! تجھے خلقت ”گنج بخش“ کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا اپنے دل میں خیال تک نہ لا..... ورنہ یہ محض دعویٰ اور غرور ہو گا۔ گنج بخش یعنی خزانے بخشنے پر قادر تو صرف اسی کی ایک ذات ہے جو بلا شک و شبہ مالک الملک ہے۔ اس کے ساتھ شرک نہ کر بیٹھنا ورنہ زندگی برباد ہو جائے گی۔ لا ریب! وہی اکیلا خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ کی اس تحریر سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپؒ اپنی زندگی ہی میں

”گنج بخش“ کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جوش عقیدت میں یہ شعر پڑھا تو ”گنج بخش“ کا لفظ زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ اس روایت میں ایک کمی یہ ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نہایت خاموشی سے چلہ کشی اختیار کی تھی۔ پھر اگر آپؒ نے اپنی زبان مبارک سے یہ لفظ ادا فرمایا تو وہاں کتنے لوگ موجود تھے؟ کس نے سنا اور کس نے اس روایت کو دوسروں تک منتقل کیا؟ تاریخ اس سلسلے میں خاموش ہے۔ کچھ مؤرخین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ مذکورہ شعر کا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی قسم کے کئی اشعار حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے منسوب کئے جا چکے ہیں مگر بعد میں آنے والے محققین نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ کسی اور معین الدین کے اشعار ہیں جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے صدیوں بعد پیدا ہوا تھا۔

اس بحث سے قطع نظر، عام عقیدت مند حضرت سید علی ہجویریؒ کو ”گنج بخش“ کہہ کر پکارتے تھے مگر آپؒ ہمیشہ سخت لہجے میں تنبیہ فرماتے تھے کہ ”گنج بخش“ صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔“

دوسرا لفظ ”داتا“ ہے جو اس طرح حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی کا حصہ بن گیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت آپؒ کے حقیقی نام سے نا آشنا ہے۔ یہ لفظ ہندی ہے اور اس کا مطلب ہے ”دینے والا“ بعض اوقات ہندو لوگ ”داتا“ کو بھگوان (خدا) کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مگر براہ راست خدا کے معنی میں۔

اگر آپؒ ”گنج بخش“ اور ”داتا“ کے مفہوم پر غور کریں تو دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کی روحانی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ”داتا“ کا لفظ سب سے پہلے کس نے استعمال کیا؟ یہ امر تو طے شدہ ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت سید علی ہجویریؒ کی زندگی میں یہ لفظ استعمال کرتا تو آپؒ سختی کے ساتھ اس کا منہ بند کر دیتے۔ اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ آپؒ کے وصال کے بعد عقیدت مندوں نے حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی کے ساتھ یہ لفظ وابستہ کر دیا..... اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد علی بن عثمان کو بھول گئی اور انہیں صرف ”داتا“ یاد رہ گیا جو ہندی زبان سے اخذ کیا گیا ہے اور جس سے ہندو انداز فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تھے، اس وقت پورے ہندوستان پر بت پرستوں کا غلبہ تھا اور عام آدمی ایک معمولی زمیندار کو بھی ”ان داتا“ کہتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ چونکہ حضرت سید علی ہجویریؒ کی ذات گرامی سے فیض و برکات کا دریا جاری تھا، اس لئے نو مسلم عقیدت مندوں نے آپؒ کو ”داتا“ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا ہو۔ بہر کیف، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اب آپؒ پاک و ہند کے لوگوں میں داتا گنج بخشؒ کے نام سے شہرت عام رکھتے ہیں۔



مدرسہ بند کرنے کے بعد ایک طویل عرصے تک حضرت سید علی ہجویریؒ پر ایک اضطرابی کیفیت طاری رہی۔ جب یہ بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو آپؒ شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

اس عظیم المرتبت بزرگ کے بارے میں تمام تاریخیں خاموش ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی قبر کا نشان تک نہیں ملتا۔ حضرت داتا صاحب اپنی تصنیف ”کشف الاسرار“ میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

”جب میں آخری وقت میں حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر آپؒ نے فرمایا۔ ”میری جان! میرے لئے خاتمہ بالخیر کی دعا کر۔“

پھر حضرت داتا صاحبؒ نے دیکھا کہ حضرت شیخ بہت آہستہ لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ حضرت داتا صاحبؒ نے کان لگا کر سنا۔ حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کر رہے تھے۔ ”الہی! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔“

حضرت داتا صاحبؒ نے عرض کیا۔ ”شیخ! میرے لئے بھی تو کچھ دعا کیجئے۔“

حضرت شیخ حسام الدین لاہوریؒ نے فرمایا۔ ”اے علی ہجویریؒ! اپنی ذات سے کسی کو رنجیدہ نہ کر۔ آخر دم تک اس بات کی کوشش کرتے رہنا کہ ہر کوئی تجھ سے خوش رہے۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں پر احسان کر۔ مگر اس کے باوجود کسی کو اپنا دوست نہ سمجھ اور اپنے علم کو برباد نہ کر! مال اور اولاد کو فتنہ (آزمائش) سمجھ جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر ہے۔“ ”اموال اور اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔“ میری طرف دیکھ کہ میں نزع کے عالم سے گزر رہا ہوں۔ کوئی بیٹا اور کوئی رشتہ دار اس وقت میری مدد نہیں کر سکتا۔ جو کچھ میں نے کیا ہے وہی میرے سامنے ہے اور وہی میرے آگے آئے گا۔“



بہت سے لوگ حضرت داتا صاحبؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے خواہش مند رہتے تھے مگر آپؒ یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کرتے تھے۔

”تم جس راستے پر چلنا چاہتے ہو، وہ بہت دشوار گزار ہے۔ اگر تم چند قدم چل کر لڑکھرائی گئے تو خود بھی ناکام و نامراد رہو گے اور مجھے بھی شرمندگی میں مبتلا کرو گے۔ بس! حسن نیت کے ساتھ فرائض ادا کرتے رہو۔ یہی تمہاری ولایت ہے۔“

اگر کوئی شخص زیادہ اصرار کرتا تو حضرت داتا صاحبؒ اسے پہلے یہ واقعہ سناتے۔

”ایک بار میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ ایک روحانی راز تھا جو کسی طرح مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تھا۔ اس کے انکشاف کے لئے میں نے بڑی ریاضت کی۔ مگر وہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اس سے پہلے بس ایک بار میں اس قسم کی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا اور میں نے حضرت شیخ ابویزیۃؒ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی تھی اور بحکم خدا میرا وہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو میں حضرت شیخ ابویزیۃؒ کے مزار مبارک پر چلہ کشی پر گیا۔ تین مہینے تک ایک سوالی کی طرح حضرت شیخؒ کے آستانے پر چل رہا۔ اس دوران روزانہ تین مرتبہ غسل اور تیس بار وضو کرتا..... مگر میری مشکل روز اول کی طرح بد قرار تھی۔ نہ کوئی خواب، نہ کوئی اشارہ..... بس محرومی ہی محرومی تھی۔ آخر میں نے مایوس ہو کر خراسان جانے کے لئے بڑھت سفر باندھا۔ سنت کے طور پر ایک موٹے کپڑے کی گدڑی میرے بدن پر تھی اور اہل ظاہر

کے اسباب میں سے صرف ایک عصا اور لوٹا میرے پاس تھا۔ شہر کش“ کے نواح میں ایک گاؤں تھا، جہاں میں نے قیام کیا۔ اتفاق سے یہاں ایک خانقاہ میں صوفیوں کا ایک گروہ مقیم تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے مجھے دیکھتے ہی با آواز بلند کہا۔

”یہ شخص ہم میں سے نہیں ہے۔“

واقعی میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ وہ رسم پرست لوگ تھے۔ ان کے جسم اچھی پوشاکوں سے آراستہ تھے اور میرے بدن پر ایک معمولی کپڑے کی گدڑی تھی اور اسی گدڑی کے سبب ان لوگوں نے مجھے نظر حقارت سے دیکھا تھا۔ آخر شب ب سری کے لئے ان صوفیوں نے مجھے نیچے منزل پر جگہ دی اور خود بالائی منزل پر چلے گئے۔ پھر رات کے کھانے کا وقت آیا تو ان لوگوں نے مجھے ایک سوکھی روٹی دی جو بہت دن تک پڑے رہنے کے باعث سبز رنگ کی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے مالک کا شکر ادا کرتے ہوئے وہی بد مزہ اور مڑی ہوئی روٹی کھالی..... مگر وہ صوفی خود ایسی لذیذ غذائیں کھا رہے تھے کہ جن کی خوشبو نیچے منزل تک آرہی تھی۔

طعام کے بعد ان صوفیوں نے خربوزے کھانے شروع کر دیئے اور چھلکے میری طرف پھینکتے جاتے تھے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”اے مولائے کریم! اگر ان لوگوں کا ظاہری حلیہ وہ نہ ہوتا جو تیرے دوستوں کا ہوتا ہے تو میں کسی بھی صورت میں ان کی یہ زیادتی برداشت نہ کرتا۔“

الغرض یہ ظاہر پرست صوفی مجھے طرح طرح سے طنز و ملامت کا ہدف بنا رہے تھے مگر انبیائے پاک علیہم السلام اور اولیائے کرام کی ایک بہت بڑی سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے میرے دل کو ناقابل بیان مسرت ہو رہی تھی..... اور لمحہ بہ لمحہ مجھ پر عجیب و غریب اسرار ظاہر ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ میری مشکل جو حضرت شیخ ابویزیدؒ کے مزار مبارک پر چلے کش ہونے کے باوجود حل نہیں ہو سکی تھی، خود بخود آسان ہو گئی..... اور مجھ پر یہ راز فاش ہو گیا کہ ہمارے بزرگ کس طریقے سے جاہلوں کی محبت سے مستفیض ہوتے تھے اور طنز و ملامت کو برداشت کرنے سے کس طرح روحانی درجات میں اضافہ ہوتا تھا۔

اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سنانے کے بعد حضرت دانا صاحبؒ اس شخص سے پوچھتے جو مرید ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔

”کیا تم سلوک کے راستے میں یہ سنگِ ملامت برداشت کر سکو گے اور سر سے پاؤں تک زخمی ہونے کے باوجود حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاؤ گے؟“

اگر وہ شخص کہتا کہ طنز و ملامت کے سارے تیر برداشت کرے گا تو حضرت سید علی ہجویریؒ اسے اپنے حلقہٴ ارادت میں شامل فرما لیتے..... اور اس کے چہرے سے ذہنی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تو یہ کہہ کر رخصت کر دیتے۔ ”فرض و سنت پر سختی کے ساتھ کار بند رہو۔ جہاں تک ممکن ہو سکے لوگوں کی دل آزاری سے بچو اور مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنا شعار بناؤ۔ بس یہی تمہارے لئے راہِ نجات ہے۔“



حضرت داتا گنج بخشؒ سماع کے قائل تھے مگر اپنے مریدوں کو اس قسم کی مجلسوں سے دور رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ آپؒ کے پیرومرشد حضرت فتح ابوالفضلؒ کا مشہور قول ہے۔

”سماع ان لوگوں کا توشہ ہے جو ابھی درمیانی منزل میں ہوں مگر جو منزل رسیدہ ہوں ان کو سماع کی ضرورت نہیں۔“

والی کابل و غزنی کی طرف سے رائے راجو کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ شخص سفلی عملیات میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے پنجاب کے لوگ اسے راجو جوگی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دن حضرت سید علی ہجویریؒ اپنی درس گاہ کے دروازے پر تشریف فرما تھے کہ ایک ہندو عورت سر پر دودھ کا مٹکا اٹھائے ہوئے سامنے سے گزری۔ آپؒ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا۔

”خاتون! اگر تم یہ دودھ ہمارے ہاتھ فروخت کر دو گی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہاری گائیں بہت سارا دودھ دیں گی اور ان کی صحت پر بھی خراب اثر نہیں پڑے گا۔“

”بابا! ہم یہ دودھ رائے راجو کو دینے پر مجبور ہیں۔“ ہندو عورت نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم لوگ رائے راجو کو دودھ نہ دیں تو ہمارے جانوروں کے تھنوں سے دودھ کی بجائے خون نکلنے لگتا ہے۔“

”انشاء اللہ! اب ایسا نہیں ہوگا۔“ حضرت سید علی ہجویریؒ نے فرمایا۔ ”تم تجربہ کر کے دیکھ لو۔“

ہندو عورت حضرت داتا صاحبؒ کی روحانی شخصیت سے کچھ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے دودھ کا مٹکا آپؒ کے حوالے کر دیا۔ آپؒ نے دودھ کی قیمت ادا کی۔ پھر تھوڑا سا دودھ پیا اور باقی دریا میں ڈال دیا۔ عورت نے شام کے وقت اپنے جانوروں کو دودھ پاتا تو حیرت انگیز طور پر گھر کے سارے برتن بھر گئے اور گایوں کے تھنوں میں دودھ پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر آنا فانا قرب و جوار کے دیہاتوں میں پھیل گئی۔ غریب لوگ دور دراز کے علاقوں سے دودھ لے کر حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپؒ تھوڑا سا دودھ پی لیتے اور باقی دریا میں پھینکوا دیتے۔ پھر جب وہ دیہاتی دوبارہ اپنے جانوروں کو دوتے تو ایسا لگتا کہ بھینسوں اور گایوں کے تھنوں سے دودھ کا آبشار اُبل رہا ہے۔ نتیجتاً لاہور کے تمام گوالوں نے رائے راجو کو دودھ دینا بند کر دیا۔

آخر پنجاب کا حاکم حضرت سید علی ہجویریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہنے لگا۔ ”تم نے میرا دودھ تو بند کر دیا اب کوئی اور کمال دکھاؤ۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”میں کوئی جادوگر نہیں ہوں کہ تمہیں شعبدے لھاؤں۔“

”پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟“ رائے راجو نے برہم ہو کر پوچھا۔

”میں تو اتنا حقیر و عاجز ہوں کہ اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو بھی جنبش نہیں دے سکتا۔“ حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا۔ ”یہ سب اسی کے حکم سے ہو رہا ہے جو مالک الملک ہے، پرستش کے لائق ہے اور اپنی ت میں واحد ہے۔ ہاں! اگر تمہیں اپنے ساحرانہ کمالات پر ناز ہے تو شوق سے دکھاؤ۔“

رائے راجو بڑا شعبدہ باز تھا مگر جب اس نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا

چاہا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم پتھر کا ہو گیا ہے اور وہ اپنی تمام ساحرانہ صلاحیتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ آخر رابے راجو نے عاجز آ کر حضرت سید علی ہجویریؒ کے سامنے زمین پر سر رکھ دیا۔ پھر اہل لاہور نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پنجاب کا حاکم اپنے باپ دادا کے عقائد سے تائب ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہونے والا یہ پہلا شخص تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی ذاتِ گرامی سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا مگر سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپؒ نے تصوف کو شریعت اور سنت کا پابند کیا، پتھر دلوں میں ایسی صلاحیت پیدا کی کہ وہ شبنم کی لطافت اور پھولوں کی خوشبو کو محسوس کر سکیں..... اور بنجر زمین کو وہ نم بخشا جس کے اثر سے دیارِ ہند میں ایمان کی فصل سرسبز و شاداب ہوئی۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے سفر تبلیغ کا آغاز کیا تو پہلے حضرت سید علی ہجویریؒ کے دربارِ معرفت میں حاضر ہوئے اور چلہ کشی کے بعد اپنے پیش رو کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔
”ناقصاں را پیر کامل کا ملاں رار ہنما۔“

حضرت سید علی ہجویریؒ کے بارے میں دنیا پرستوں کی مرتب کردہ تاریخ کیا کہتی ہے، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے پیش نظر صرف سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا قول مبارک ہے جو حضرت داتا گنج بخشؒ کی روحانی عظمتوں پر سب سے بڑی گواہی ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی معتبر تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کا خلیفہ اکبر کون تھا؟ پھر یہ سلسلہ کس طرح جاری ہوا اور موجودہ زمانے میں روحانیت کے اس عظیم خانوادے میں حضرت داتا گنج بخشؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ”کشف المحجوب“ ہی آپؒ کی خلیفہ اکبر ہے اور قیامت تک اسی کتاب کے ذریعے ”سلسلہ ہجویریہ“ جاری رہے گا۔ بڑے بڑے مشائخ اور اولیائے کرام کا قول مبارک ہے کہ:

”اگر کسی شخص کو مرشدِ کامل کی تلاش ہو اور کوتاہی قسمت سے کوئی روحانی رہنما نہ ملتا ہو تو اسے لازم ہے کہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ ”کشف المحجوب“ کا مطالعہ کرے۔ انشاء اللہ ہدایت پا جائے گا۔“

میں ذاتی طور پر گواہ ہوں کہ 1971ء میں ”کشف المحجوب“ کے مطالعے سے میرے ایک صحابی دوست کے نظریات یکسر تبدیل ہو گئے۔ میرا وہ دوست اس وقت جرمنی میں مقیم ہے اور اپنے آپ کو حضرت داتا گنج بخشؒ کا ادنیٰ ترین غلام کہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ۔

”خاک پنجاب از دم او زندہ گشت“

(پنجاب کی زمین اُس کے دم سے زندہ ہو گئی)



حضرت سید معین الدین چشتی رحمہ اللہ علیہ

ولادت

536ھ (سیستان)

وفات

633ھ (اجمیر شریف)

اسم گرامی سید معین الدین حسن..... والد محترم کا نام غیاث الدین حسن..... علم کی تلاش میں طویل سفر کئے۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے دست مبارک پر بیعت کی..... برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کے بانی..... ”سلطان الہند“ اور ”غریب نواز“ القاب۔

اہل حق کی روایتوں کے امیں
کوچہ وہم میں یقین ہی یقین
ظلمت شب میں ایک شمع حرم
دشت وحشت میں اک مسافر دیں
آٹھ صدیوں سے ہند کے سلطان
خواجہ خواجگاں معین الدین
(خان آصف)

سلطان محمود غزنوی سومنات کی جنگ ہار جاتا مگر عین لڑائی کے دوران اسے مشہور بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا بخشا ہوا خرقہ یاد آیا اور پھر سلطان نے اسی خرقے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دعا کی۔ دشمنوں کی بساط الٹ گئی اور سلطان محمود غزنوی فاتح قرار پایا، پھر تاریخ نے اس کے نام کو ”بت شکن“ کی حیثیت سے محفوظ کر لیا..... مگر سلطان کی اولاد اس ورثے کی حفاظت نہ کر سکی اور ایک بزرگ کی دعاؤں سے حاصل کی ہوئی عظیم الشان سلطنت کو گنوا دیا۔

یہی حال شہاب الدین غوری کا تھا۔ اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں کے طفیل پر تھوی راج چوہان پر غلبہ حاصل ہوا مگر غوری کے وارث بھی ان دعاؤں کی تاثیرات کو برقرار نہ رکھ سکے۔ شہاب الدین غوری سے لے کر سلطان ابراہیم لودھی تک، مسلمان برصغیر کی قسمت کے مالک رہے..... مگر سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین محمود کے سوا کوئی تیسرا فرمانروا ایسا نہیں تھا جس نے نظام اسلام کی آبیاری کے لئے اپنا خون صرف کیا ہو۔ ویسے سب مسلمان تھے مگر ان کی توجہات کا مرکز صرف ان کی اپنی ذات تھی۔ سلطان سکندر لودھی ایک پارسا شخص تھا مگر اس کا بیٹا ابراہیم لودھی ہزاروں برائیوں اور خرابیوں کا مجموعہ۔ اس کے غرور و تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے خونی رشتے داروں کو بھی غلام سمجھتا تھا۔

قدرت نے ابراہیم لودھی کو اس کے اعمال کی سزا دینے کے لئے ایک چھوٹی سی ریاست فرغانہ کے حکمران ظہیر الدین بابر کو دہلی اور آگرہ پر بطور عذاب نازل کیا۔ یہ مغل زادہ برسوں اپنے اس شعر پر عمل کرتا رہا اور خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔

نو روز و نو بہار و مئے دلربا خوشی است

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مگر جب وہ پانی پت کے میدان میں رانا سانگا کے دولاکھ راجپوتوں کے مقابل آیا تو اپنا سارافلسفہ کیف و نشاط بھول گیا۔ بابر کو احساس ہوا کہ معرکہ صیاح میں علم نجوم، ساغر و صراحی اور چنگ و رباب اس کے کسی کام نہیں آسکتے۔ مجبوراً اس نے خالق کائنات کے سامنے فرشِ خاک پر سر رکھ دیا اور گریہ و زاری کرنے لگا۔

”اے خدا! مجھے لشکر کفار پر غلبہ عطا فرما! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اس حرام شے کو منہ نہیں لگاؤں گا۔“

یہ دعا مانگ کر ظہیر الدین بابر نے علم نجوم کی کتابوں کو آگ لگا دی اور شراب کے برتن توڑ ڈالے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک طرف راجپوتوں کا خون بہتا رہا اور دوسری طرف نادر و نایاب شرابوں کے ذخیرے۔ عادل سے مانگی گئی تھی اس لئے عالم اسباب میں اثر پذیر ہوئی۔ اور پھر مغل زادے کو وہ فتح حاصل ہوئی جسے پوری دنیا کی عسکری تاریخ میں ایک کارنامے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

شہنشاہ ظہیر الدین بابر 49 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ محض ایک سیاسی طالع آزما تھا۔ اس لئے مغل سلطنت کی بنیادیں تو مضبوط کر گیا مگر اس کی فتوحات سے اسلامی نظام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مغل شہنشاہ خود تو شراب و شباب سے تائب ہو گیا تھا مگر اس کا وارث نصیر الدین ہمایوں عیش و عشرت میں مبتلا رہتا تھا۔ نتیجتاً ایک اور طالع آزمائشیر شاہ سوری بساط سیاست پر ابھرا اور اس نے ہمایوں سے پنجہ آزمائی کی۔ مغل شہنشاہ کے کمزور بازو و تلوار کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ انجام کار اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر ایران میں پناہ گزینی کی زندگی گزارنی پڑی۔

شیر شاہ بڑا جفاکش اور عادل حکمران تھا مگر کاتب تقدیر نے اس کی عمر اور اقتدار کے خانے میں بہت کم مدت تحریر کی تھی۔ پھر بھی شیر شاہ سوری نے پانچ سال کے مختصر ترین دور حکومت میں بڑے حیران کن تعمیری کارنامے انجام دیئے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو سلطان شمس الدین اتمش کے عہد رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی..... مگر..... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

شیر شاہ کا جانشین سلیم شاہ کچھ زیادہ اہل ثابت نہیں ہوا، آخر آپس کی رنجشوں نے سوری خاندان کا خاتمہ کر دیا اور یہ جنگجو قبیلہ اقتدار کی دنیا میں ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ قرار پایا۔

بساط سیاست کو غبار آلود پا کر مفروز شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں نے اپنے حریفوں کی کمزور بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور اپنی فردوس گم شدہ کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہمایوں اپنے کردار اور عقائد کے اعتبار سے ایک بہتر انسان تھا..... مگر کارزار ہستی میں وہ بہتر حکمران ثابت نہیں ہوا۔ کثرتِ افیون نوشی نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ آخر ایک دن وہ مرگ ناگہانی سے دوچار ہوا اور بلند زینے کی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا۔

ہمایوں کا بیٹا جلال الدین اکبر باپ کی موت کے وقت بہت کم سن تھا۔ اس لئے مذہبی اور دنیاوی تعلیم سے محروم رہا۔ نتیجتاً فتنہ پردازوں کو اسلام کے خلاف زہر افشانی کا موقع مل گیا۔ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کے دل و دماغ میں اپنی بد عقیدگی کا زہر اتارنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے برہمن بھی اس کے گرد سمٹ آئے۔ سیاست کی آڑ میں عجیب عجیب چالیں چلی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کم عقل حکمران نے اپنا مذہب ”دین الہی“ ایجاد کر لیا۔

اکبر کے اس نئے مذہب پر ہندو دھرم کا زیادہ غلبہ تھا۔ بادشاہ کے سامنے آگ روشن کی جاتی تھی اور ایک خوش گلو درباری دلکش آواز میں حمد کے اشعار گاتا تھا۔ اس طرح ”آتش پرستی“ کا جواز پیدا

کیا گیا۔

”دو آشیانہ منزل“ میں بادشاہ سورج کے سامنے سر جھکا کر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ آفتاب پرستی کی ابتداء تھی۔

بادشاہ سفر اور قیام دونوں میں گنگا کا پانی استعمال کرتا تھا۔ معتد ملازموں کی ایک جماعت دریا کے کنارے مامور رہتی تھی جہاں سے سر بہ مہر کوزوں میں پانی بھر کر لایا جاتا تھا۔ قیام الہور کے دوران بادشاہ ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہر دوار کا پانی پیتا تھا۔ اسی طرح تمام کھانے گنگا جل میں پکائے جاتے تھے۔

آگ، سورج کے آگے سر جھکانے اور گنگا جل پینے کے بعد اکبر نے تمام ہندوؤں کو خدائے واحد کا پرستار قرار دے دیا۔ ”یہ راز ہم پر روشن ہو گیا ہے کہ ہندو کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہراتے۔ اگرچہ ان کی کچھ باتیں قابل اعتراض ہیں لیکن ہمیں ان کی خدا پرستی کا پورا یقین ہے۔“

ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اکبر نے گائے کا ذبیحہ حرام قرار دے دیا۔ وہ ہر قسم کے گوشت پر پابندی لگانا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر باز رہا کہ اس طرح بہت سے کام ناتمام رہ جائیں گے۔ پھر بھی مغل شہنشاہ نے قصابوں اور ماہی گیروں کے لئے نیا فرمان جاری کر دیا کہ ان کے گھروں کو عام آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے..... اور جو لوگ اس برادری سے رسم و راہ رکھیں، ان سے تاوان وصول کیا جائے۔ قرآن نے سور اور اس کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔ اس حکم پر اکبر نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر سور کو اس کی بے غیرتی کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے تو شیر یا اس طرح کے دوسرے جانوروں کو حلال ہونا چاہئے۔“

پھر اکبر کی گستاخیاں اس حد تک بڑھیں کہ وہ علی الاعلان مذہب اسلام کا مذاق اڑانے لگا۔ ایک دن اس نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ملت اسلامی کا سارا سرمایہ بد عقلی کا مجموعہ ہے۔“ (معاذ اللہ)

دراصل شیخ مبارک، ابوالفضل فیضی اور عیار برہمنوں نے اکبر کے منہ میں اپنی زبانیں رکھ دی تھیں اور وہ ان ہی ناپاک زبانوں سے مذہب اسلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ دیوان خانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اعلانیہ نماز ادا کر سکے۔

اسی طرح اکبر نے صاحب نصاب لوگوں پر زکوٰۃ بھی معاف کر دی تھی۔ بظاہر وہ اپنی تقریروں میں کہا کرتا تھا کہ زکوٰۃ ختم کرنے سے اس کا مقصد معاشی حالات کو بہتر بنانا ہے..... مگر دراصل وہ اسلام کے اس دوسرے بڑے رکن کو ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اکبر نے ”دین الہی“ کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے سجدہ تعظیسی کا اجراء کیا۔ بادشاہ کا دیدار کرنے والے کسی جھبک کے بغیر اکبر کو سجدہ ادا کرتے تھے اور یہ جواز پیش کرتے تھے کہ زمانہ قدیم میں بھی شاہان وقت کے لئے سجدہ تعظیسی جائز تھا۔ (دین اسلام کے خلاف یہ کھلی بغاوت اور سرکشی تھی۔ اسلام نے ایسے تمام سجدوں اور تعظیسی آداب کو قیامت تک کے لئے حرام قرار دے دیا)

تھا) اکبر کے مشیروں نے ماضی کی ایک رسم سے فائدہ اٹھایا اور جابل بادشاہ کو یقین دلادیا کہ سجدہ تعظیسی دراصل خدا ہی کو سجدہ کرنا ہے۔

پھر سجدہ تعظیسی کی رسم نے یہاں تک فروغ پایا کہ سجدہ کرنے والا دستار کو ہاتھ میں لے لیتا اور اپنا برہنہ سر بادشاہ کے پائے اقدس پر رکھ دیتا۔ پھر زبان حال سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتا۔
”میں اپنے دل کی توجہ بادشاہ کی اطاعت کی طرف مبذول کرتا ہوں۔“

ملاقات کے وقت ”السلام علیکم“ کی معروف رسم ختم ہو چکی تھی اور ان کی جگہ ایسے کلمات ادا کئے جاتے تھے جن کے ظاہری معانی بڑے دلکش اور خوش کن تھے مگر باطنی طور پر وہ کسی اور کی خدائی کا اعلان کرتے تھے۔ جب کوئی شخص کسی سے ملتا تو با آواز بلند کہتا۔ ”اللہ اکبر۔“

جواب دینے والا بڑی عقیدت سے جواب دیتا۔ ”جل جلالہ.....“

آج بھی عام عوام پر مسلمان اپنے خدا کی کبریائی بیان کرنے کے لئے یہی الفاظ ادا کرتے ہیں۔ مگر مغل شہنشاہ کے دور اقتدار میں ان کلمات کا مفہوم کچھ اور تھا۔ مغل شہنشاہ کا خاندانی نام جلال الدین تھا اور لقب ”اکبر“۔ جب پکارنے والا ”اللہ اکبر“ کہتا تو اس کے ذہن میں یہی خیال ہو گا کہ وہ خالق کائنات کو پکار رہا ہے..... مگر دین الہی کی بنیاد رکھنے والے یہ کلمہ سن کر مطمئن ہو جاتے کہ وہ اکبر کی خدائی کے لئے راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ اسی طرح ”جل جلالہ“ بظاہر اللہ کی شان کبریائی کا اظہار ہوتا تھا مگر سلطنت مغلیہ کے فتنہ گر یہی سمجھتے تھے کہ یہ جلال الدین بادشاہ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ الغرض بڑے فریب کارانہ انداز میں اللہ کے سادہ دل بندوں کو گمراہ کیا جا رہا تھا۔

اکبری دور کے ایک مشہور شاعر ملا شیری نے اپنے شعر میں اسی سنگین حقیقت کی طرف کھلا اشارہ کیا ہے۔

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است

گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

(بادشاہ نے اس سال نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو وہ اگلے سال خدا ہو جائے گا) مختصر یہ کہ دربار اکبر کے فتنہ گر شیخ مبارک، ابوالفضل فیضی اور دوسرے عیار برہمن مغل شہنشاہ کو خدا بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے..... اور وہ کم عقل حکمران خود بھی اپنی اس حیثیت سے مطمئن ہو چکا تھا کہ ایک واقعے نے اس کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے۔

اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے اور ہندو اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مشہور راجپوت سردار راجہ مان سنگھ کی بہن رانی جو دھابائی سے شادی کی تھی۔ ملکہ ہند کی پوجا پاٹ کے لئے قصر شاہی میں ایک چھوٹا سا مندر تعمیر کیا گیا تھا جس کے اندر ہندوؤں کے تمام قابل ذکر دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں۔ قلعے میں مؤذن کی صدا بلند ہونے کی بجائے صبح و شام ”کیرتن“ اور ”بھجن“ کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں..... اور گمراہ مصاحب اسے یقین دلاتے رہتے تھے۔

”آپ ہی ”آن داتا“ ہیں اور آپ ہی لوگوں کے ”مشکل کشا“۔ دنیا کے سارے کام آپ ہی کے

حکم سے انجام پاتے ہیں اور آپ کے سوا کسی طاقت کا وجود نہیں۔“

دین الہی کا موجد جھرو کے میں بیٹھ کر رعایا کو درشن دے رہا تھا اور بزعم خود اپنی روحانی طاقت سے لوگوں کے مسائل حل کر رہا تھا..... مگر ایک دن جب اکبر کی نظر اپنے ذاتی مسئلے پر گئی تو وہ لرز اٹھا۔

مغل شہنشاہ کے کئی بیٹے ہوئے مگر چند روز یا چند ماہ زندہ رہ کر مر گئے۔ رانی جو دھابائی نے اپنے دیوتاؤں کے سامنے بڑی گریہ و زاری کی، بڑی منتیں مانیں، بڑی نذریں پیش کیں مگر ملکہ عالیہ تخت ہندوستان کا وارث پیدا کرنے سے قاصر تھی۔

اکبر بھی تنہائی میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کیسا مشکل کشا ہے کہ خود اپنی مشکل دور نہیں کر سکتا۔ پھر بے اولاد ہونے کی یہ خلش اس قدر بڑھی کہ اکبر کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

آخر ایک دن کسی درباری نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا۔ ”آپ کا مسیحا یہیں فتح پور سیکری میں موجود ہے۔ اس سے رجوع کریں۔ سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔“

”کون؟“ مغل شہنشاہ نے حیران ہو کر اپنے درباری کی طرف دیکھا۔

”حضرت شیخ سلیم الدین چشتی۔“ درباری نے مسیحا کی نشاندہی کی۔

”کیا شیخ ہمیں تخت ہندوستان کا وارث دے سکتے ہیں؟“ مغل شہنشاہ کی حیرت برقرار تھی۔ اس کی

پراگندہ عقل یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ دعاؤں سے انسانی تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔

”آپ وہاں حاضر ہو کر تو دیکھیں۔“ درباری نے عرض کیا۔ ”میری آنکھیں تو بارہا ایسے مناظر دیکھ

چکی ہیں کہ مفلس و بد حال انسان اس آستانے پر حاضر ہوئے اور اپنے دامن بھر کر چلے گئے۔“

”ہمیں ایک فقیر کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟“ مغل شہنشاہ تذبذب کا شکار

تھا۔ ”ہم تو خود ضرورت مندوں کی جھولیاں بھرتے ہیں، اگر ہمارا دامن کسی کے آگے پھیلا تو پھر ہماری

روحانی عظمتوں کی بلند ترین عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔“

”طل الہی بہتر سمجھتے ہیں۔“ درباری خاموش ہو گیا مگر اس کی گفتگو نے اکبر کی آرزوؤں کے خرمن

میں ایک دکھتا ہوا انگارہ رکھ دیا تھا۔

مغل شہنشاہ کئی دن تک شدید ذہنی کشمکش کا شکار رہا۔ آخر ایک روز اولاد کی سلگتی ہوئی خواہش اسے

ایک بوریا نشین درویش کے دروازے تک لے گئی۔

حضرت شیخ سلیم الدین سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے خاندان

سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ادائے بے نیازی کے ساتھ فرمانروائے ہند کی طرف دیکھا۔ ”لوگوں کا

ان داتا اور مشکل کشا ایک فقیر کے دروازے پر؟“

”شیخ! تمام حکیم و طبیب عاجز آ گئے اور ساری تدبیریں رائیگاں گئیں۔“ مغل شہنشاہ نے حضرت شیخ

سلیم چشتی کے سامنے اپنی ناطقتی اور بے سروسامانی کا اعتراف کر لیا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ حضرت شیخ نے فرمایا۔

”مجھے تخت ہندوستان کا وارث چاہئے۔“ مغل شہنشاہ گریہ و زاری کرنے لگا۔

”واللہ خیر الوارثین (اللہ بہتر وارث دینے والا ہے)“ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے آیت مقدسہ کی تلاوت فرمائی۔ ”مگر تُو نے تو اللہ کو فراموش کر دیا ہے۔ پھر تجھے تیرا وارث کون دے گا؟“

”شیخ! میں آپ کی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔“ مغل شہنشاہ بہت دیر تک فریاد کرتا رہا۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ استغراق کے عالم میں بیٹھے رہے۔ پھر آنکھیں کھول کر مغل شہنشاہ سے فرمایا۔

”تُو بظاہر ہندوستان کا حکمران ہے مگر حقیقتاً سلطان الہند کوئی اور ہے۔“

اکبر نے شدید حیرت کے عالم میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی طرف دیکھا۔

”دراصل اقلیم ہند پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حکومت ہے۔“ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے فرمایا۔ ”اور میں بھی اسی آستانے کا غلام ہوں۔ اب تُو اس فقیر کے دروازے تک آ گیا ہے تو میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تجھے بھی سلطان الہند کے حوالے کر دوں۔“

”کچھ بھی کیجئے شیخ!“ مغل شہنشاہ نے حضرت سلیم چشتیؒ کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

”حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار اقدس پر حاضری دے اور فقیروں کی طرح اپنا دامن پھیلا دے۔ پھر دیکھ کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تجھے نامراد نہیں لوٹائے گا۔“

مغل شہنشاہ، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر واپس چلا گیا۔

پھر دیکھنے والوں نے عجیب منظر دیکھا۔ مغل شہنشاہ اجمیر شریف کی طرف جا رہا تھا جہاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آرام فرما ہیں۔

فتنہ گروں کی جماعت میں ہلچل مچ گئی۔ مفسدوں کے اس گروہ نے مغل شہنشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اگر آپ اجمیر تشریف لے گئے تو رعایا کے ذہن منتشر ہو جائیں گے۔ لوگ تو آپ سے مرادیں مانگتے ہیں۔ پھر آپ کس کے دروازے پر ہاتھ پھیلانے جا رہے ہیں؟“

”جب ہم اپنے آپ کو کچھ نہیں دے سکتے تو پھر دوسروں کو کیا دیں گے؟“ مغل شہنشاہ نے فتنہ گروں کی بات کو جھٹلا دیا۔ ”یہ سب فریب ہے، جب ہمارے تخت کا وارث اس دنیا میں نہیں آ سکتا تو پھر ہم کیسے مشکل کشا ہیں؟“

فتنہ گروں نے مغل شہنشاہ کو باز رکھنے کے لئے آخری دلیل پیش کی۔ ”جہاں ظل الہی تشریف لے جا رہے ہیں وہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر ہے..... ایک بے جان قبر کسی زندہ انسان کو کیا دے سکتی ہے؟“

دربار اکبری کے فتنہ گر پوری طاقت سے منطق کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے مگر مغل شہنشاہ ان کی دلیل سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ فتح پور سیکری سے اجمیر شریف تک پیدل سفر کرے گا۔

فتنہ گر، بادشاہ کا منہ دیکھتے رہ گئے اور ”دین الہی“ کا موجد، رعایا کا اُن داتا، مخلوق کا مشکل کشا اور دنگیر اپنی درخواست لے کر اجمیر شریف روانہ ہو گیا۔

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا یہ سفر کوئی افسانہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے۔ اور کسی نے نہیں، خود اکبر کے بیٹے شہنشاہ جہانگیر نے اس تاریخی واقعے پر گواہی دی ہے۔
جہانگیر نے اپنی ٹوک (خودنوشت) میں خود واضح طور پر تحریر کیا ہے۔
”میرے والد بزرگوار نے میری ولادت کے لئے فتح پور سے اجمیر تک پیدل سفر کیا تھا۔ یہ فاصلہ ایک سو بیس کوس ہے۔“

جب مغل شہنشاہ اجمیر شریف پہنچا تو اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ سفر کے آغاز میں خدمت گاروں نے اکبر کو سمجھایا تھا کہ یہ انتہائی دشوار گزار راستہ ہے۔ اگر ظل الہی سواری استعمال فرمائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”ہم سلطان الہند کے دربار میں حاضر ہو رہے ہیں۔ نیاز مندی کے اظہار کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ پیادہ سفر اختیار کیا جائے۔“ اکبر نے واضح جواب دے کر اپنے خدمت گاروں کی زبانیں بند کر دی تھیں۔

پھر جب مغل شہنشاہ یہ طویل سفر طے کر کے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار مبارک پر حاضر ہوا تو اس کے پاؤں زخمی تھے اور راستے کے گرد و غبار سے سرخ و سفید چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔
پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جلال الدین اکبر، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے قدموں میں دست بستہ کھڑا ہے۔ اس نے کسی گداگر کی مانند اپنا دامن مراد پھیلا دیا اور دعا مانگنے لگا۔
”بے شک آپ سلطان الہند ہیں اور میں آپ کی عظیم الشان سلطنت کا ایک ادنیٰ کوچہ گرد۔ میری حالت زار پر توجہ فرمائیے۔“

جلال الدین اکبر بہت دیر تک زار و قطار روتا رہا۔ پھر اس نے جوش اضطراب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار مبارک کی چادر اپنے سر پر ڈال لی۔ مغل شہنشاہ کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل مضطرب کو قرار آ گیا ہو۔

پھر فرمانروائے ہند نے اجمیر شریف کے باشندوں میں زرق و برق تقسیم کیا اور واپس لوٹ گیا۔
فتنہ گر مصاحب آپس میں باتیں کرتے اور در پردہ اکبر کا مذاق اڑاتے۔

”ایک قبر سے ہندوستان کا وارث کیا مانگئے گیا تھا؟ پتھروں کے ڈھیر نے کیا دیا اسے؟“ فتنہ گر سرگوشیاں کرتے اور خاموشی سے شہنشاہ کی ناکامی و نامرادی کا تماشا دیکھتے۔

آخر ایک دن قصر شاہی خوشی کے شادیانوں اور نقاروں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ خواصوں نے مغل شہنشاہ کو ولی عہد سلطنت کی پیدائش کی خبر سنائی۔ دار الحکومت آگرہ کے در و بام چراغوں اور قندیلوں سے جگمگا اٹھے۔

اکبر نو مولود فرزند کو لے کر حضرت سلیم چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”صاحب اقتدار ہو گا اور رہتی دنیا تک اس کے نام کی گونج سنائی دے گی۔“ حضرت شیخ نے فرمایا۔

جلال الدین اکبر نے حضرت شیخ سلیم چشتی سے اظہار عقیدت کے لئے اپنے بیٹے کا نام بھی سلیم رکھ

ویا۔ پھر یہی سلیم نور الدین جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔
حضرت شیخ سلیم الدین چشتیؒ سے جہانگیر کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار مقرب درباری نے
حضرت شیخ کی شان میں نازیبا کلمات ادا کر دیئے تھے۔ وہ شخص ملکہ نور جہاں کا بہت منہ چڑھا تھا۔
جب جہانگیر کے مخبروں نے اسے یہ خبر دی تو وہ شدت غضب سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور پھر اس
نے فرمان جاری کر دیا۔

”اس بے ادب کی زبان گدی سے کھینچ کر نکالو اور میرے سامنے پیش کرو۔“
حکم شاہی کے مطابق اس شخص کی گردن میں سوراخ کر کے زبان نکالی گئی۔ ہزاروں افراد نے یہ
مرزہ خیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب اس بے ادب انسان کی زبان جہانگیر کے سامنے لائی گئی تو
جہانگیر سر دربار چیخ اٹھا۔

”ہر وہ زبان جو میرے شیخ کی جناب میں گستاخی کی مرتکب ہوگی، اس کا یہی حشر ہوا گا۔“
سزا سے پہلے ملکہ نور جہاں نے اس شخص کی پر زور سفارش کی تھی۔ جہانگیر کے حضور عشوہ طرازیوں
بھی کی تھیں اور اپنے غمزہ وادا سے بھی کام لیا تھا مگر مغل شہنشاہ نے حسن کی سحر کاریوں سے متاثر ہوا اور نہ
ملکہ ہند کی التجاؤں سے۔ اس نے نور جہاں سے صاف صاف کہہ دیا۔
”اگر میرے شیخ کے سلسلے میں تم بھی مجرم قرار پاتیں تو تمہارا حشر بھی اس شخص سے زیادہ مختلف نہ
ہوتا۔“

جہانگیر کی اسی عقیدت نے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد کو بڑے فتنوں سے محفوظ رکھا۔ اگر اسے
شیخ سلیم چشتیؒ سے اس قدر والہانہ محبت نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ مذہب کے نام پر ہندوستان میں کیا
کیا گل کھلائے جاتے۔ دوسرا ”دین الہی“ تو ایجاد نہ ہوتا مگر مذہب کے سلسلے میں بڑی ہنگامہ آرائیاں
ہوتیں۔ وہ لڑکا جو ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوا اور جس نے اپنے عہد طفولیت میں اپنی ماں کو
جوؤں کے آگے سر جھکاتے دیکھا ہو، اس سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ
کی محبت میں نور جہاں جیسی کافر ادا عورت کی سفارشات کو بھی جھٹلا دے گا۔ نفسیات کے عام اصولوں
کے مطابق تو جہانگیر پر ہندو دھرم کی گہری چھاپ ہونی چاہئے تھی کہ اس نے ایک ہندو عورت کی آغوش
میں تربیت پائی تھی..... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر اپنی پوری زندگی میں ہندو مذہب کی طرف کبھی مائل
نہیں ہوا۔ یقیناً یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت سلیم چشتیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا فیضان
نظر تھا کہ عیش و عشرت اور کیف و مستی کے ہجوم میں بھی اس نے عدل و انصاف سے کام لیا اور مذہبی
معاملات میں ہندوستانی مسلمانوں کو بہت بڑی آزمائش سے بچالیا۔ یہ جہانگیر کا ایک عظیم الشان کارنامہ
ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین شاہ جہاں تخت نشین ہوا۔ شاہ جہاں ایک بلند حوصلہ اور نیک
سیرت حکمران تھا مگر اس کے دل و دماغ پر محبت کا غلبہ تھا۔ اپنی ملکہ ممتاز محل سے اس کی محبت پوری دنیا
کی تاریخ میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی محبت نے تان نال تعمیر کرایا۔ بے شک! وہ اس زمین پر

اپنی محبت کی خوب صورت ترین یادگار چھوڑ گیا مگر سیاسی اعتبار سے وہ مسلمانان ہند کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔ مغل سلطنت شدید انتشار کا شکار تھی۔ شاہ جہاں کی غلط حکمت عملی نے بابر کے عظیم ورثے کو وقت کی نیلام گاہ میں اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ بیک وقت کئی افراد مسلمانوں کے مستقبل کی بولیاں لگا رہے تھے۔ ان خریداروں میں دارا شکوہ سب سے نمایاں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ باپ کا منظور نظر تھا۔ شجاع اور مراد بھی حکومت کے دعوے دار تھے۔ ان دونوں بیٹوں کو کسی نہ کسی عنوان سے باپ کی حمایت حاصل تھی۔ بس ایک اور نگزیب تھا، ماں باپ اور بھائیوں کی محبت سے محروم۔ یہ وقت کی چال تھی کہ جو شخص سب سے زیادہ جرأت مند، انتظامی امور میں سب سے زیادہ سخت اور حکومت کے لئے سب سے زیادہ بہتر امیدوار تھا، اسی کو سب سے زیادہ نا اہل ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بظاہر اور نگزیب تنہا تھا مگر آسمانوں پر اسے مستقبل کا حکمراں لکھا جا چکا تھا اور جب آسمانوں کا فیصلہ زمین پر نازل ہوا تو اہل دنیا کی تدبیریں الٹ گئیں۔ دارا، شجاع اور مراد اپنے انجام کو پہنچے اور شاہ جہاں کو عزت و احترام کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔

جب اور نگزیب تخت نشین ہوا تو اس پر بے شمار الزامات تھے۔ غیروں سے تو شکوہ کیا، اسے اپنوں نے بھی معاف نہیں کیا۔ مگر وہ مردِ قلندر ان تمام اعتراضات سے بے نیاز مسلمانوں کو گمراہی کے تاریک غاروں سے نکالنے کے لئے دنیا کی ہر بلا سے الجھا، ہر طوفان سے نبرد آزما ہوا۔ ضرورت پڑی تو آتشِ نمرود میں بھی کودا۔ ملتِ اسلامیہ کی بھلائی کے لئے دریائے نیل سے بھی گزرا۔ عیش پرستوں نے خلفائے راشدین کے طرزِ زندگی کو ماضی کے افسانوں سے تعبیر کیا تو خود اس نے ٹوپیاں سی کر اور قرآنِ کریم کی کتابت کر کے روزی حاصل کی۔ اور اعتراض کرنے والوں کو بتا دیا کہ ہر دور میں اسلامی اصولوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے سکون کے لئے اپنی نیندیں حرام کر لیں مگر ہوس کے غلاموں کی زبان درازیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

کچھ مسلمان مجذوبوں اور ملنگ قسم کے درویشوں نے جب اسلام میں ہندو جوگیوں اور سادھوؤں کے نظریات شامل کرنا چاہے تو اس کی شمشیر ایک بار پھر بے نیام ہو گئی۔ جس نے شریعت محمد ﷺ میں دخل اندازی کی، اس کی گردن شانوں سے جدا کر دی گئی۔ سرمد اپنے تمام تر روحانی کمالات لے کر برہنہ ہوا تو اور نگزیب نے اتمامِ حجت کے لئے اس سے کہا وہ لباس پہن لے اور اسلام کو بدنام کرنے کی کوششوں سے باز آ جائے۔ جب سرمد نہیں مانا تو اسے بھی خون میں نہلا دیا گیا۔ پھر جس نے بھی شراب عشق پی کر عریانی کی حالت میں ولایت کا دعویٰ کیا، وہ قہرِ عالمگیری سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب اسے صوفیوں اور درویشوں کا دشمن قرار دیا جانے لگا۔

آج اس قسم کی بے شمار روایات مشہور ہیں کہ اور نگزیب نے بزرگانِ دین کے مزارات تک کو منہدم کر دیا۔ یہ بڑی خوفناک تہمت تھی۔ وہ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے خواجہ معصومؒ کا مرید تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ اور نگزیب قبر پرستی کو گناہِ عظیم سمجھتا تھا اور عوام کی اکثریت نے اولیائے کرام کے مزارات کو عبادت گاہوں کا درجہ دے دیا تھا۔ بے شمار انسان اپنی عجیب عجیب مرادیں اور خواہشات لے

کر مزارات پر جاتے تھے۔ قبروں کو بو سے دیتے تھے اور بے دریغ سجدے کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دین کی آرام گاہوں پر بھکاریوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لاتعداد فقیر، اولیائے کرام کے مزارات مقدسہ پر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں چند بھکاری حقیقتاً معذور ہوتے تھے ورنہ سارے کے سارے صحت مند اور توانا نظر آتے تھے۔ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان حکمران جو شدید محنت کے بعد روزی حاصل کرتا وہ کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی قوم کے افراد اپنے دست و پا توڑ کر ذلت کی زندگی بسر کریں۔ یہ گداگر بھیک مانگنے کے ساتھ منشیات کے استعمال کی لعنت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تمام جس، انیون اور بھنگ پینے والوں کا اجتماع ان ہی مقامات مقدسہ پر ہوتا تھا۔ اور نگزیب سے پہلے کسی حکمران نے مسلمانوں کے اس نازک مسئلے پر غور نہیں کیا تھا مگر جب اسے اقتدار حاصل ہوا تو وہ معاشرے کی ہر بیماری کو دور کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اور نگزیب نے تمام بزرگانِ دین کے مزارات کو ایسے افراد کی موجودگی سے پاک کیا اور خاص و عام کو اپنے مذہبی پیشواؤں کا احترام کرنا سکھایا۔ یہی وہ معاشرتی اصلاحات تھیں جنہیں غیر مسلم تاریخ نویسوں اور تنگ نظر مسلمانوں نے غلط رنگ میں پیش کیا یہاں تک کہ آج بھی جاہلوں کی ایک بڑی جماعت اور نگزیب کو صوفیوں کا دشمن سمجھتی ہے۔

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب اور نگزیب اسلامی معاشرے کو مسلمان نما سادھوؤں اور جوگیوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور نگزیب نے تمام بزرگانِ دین کے مزارات مقدسہ پر جا کر ان فضول رسموں کا جائزہ لیا تھا جن سے گمراہی پھیل رہی تھی اور پھر ایسے احکام جاری کر دیئے تھے جو بدعت کے اس سیلاب کو روکنے میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ آخر میں وہ ایک ایسے مزار پر حاضر ہونے والا تھا جہاں ہر وقت بندگانِ خدا کا ہجوم رہتا تھا۔ شہنشاہ کے استقبال کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ مزار سے میلوں دور تک سپاہی موجود تھے۔ اور نگزیب کی سواری شہر کے نواح میں داخل ہوئی۔ اس نے کوچوان کو حکم دیا، تیز رفتار گھوڑوں کی لگا میں کھینچی گئیں اور پھر وہ رک گئے۔ اور نگزیب نیچے اتر آیا۔ وزیر سلطنت کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔ مگر وہ حیران تھے کہ آخر بادشاہ کو کیا ہو گیا ہے؟ اور نگزیب پیدل چلنے لگا۔ شاہراہ کے دونوں جانب کھڑے ہوئے سپاہی بھی اپنے فرمانروا کے اس طرزِ عمل پر حیرت زدہ تھے۔ وزیر سلطنت اور دوسرے امیر بھی خاموشی سے شہنشاہ کے پیچھے چلتے رہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اور نگزیب سے پیدل چلنے کا سبب پوچھ سکے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ جس بزرگ کے مزار پر اور نگزیب کو حاضری دینا ہے وہ یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ پھر یہ طویل سفر کس طرح تمام ہو گا؟ تمام امیر و وزیر حیران و پریشان تھے۔ قدم قدم پر آرام دہ شاہی سواریاں استعمال کرنے والوں کو اپنی زندگی عذاب معلوم ہو رہی تھی مگر اور نگزیب کا یہ حال تھا کہ وہ ایک جفاکش سپاہی کی طرح تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ آخر سفر تمام ہوا۔ مزارِ اقدس کا گنبد نظر آنے لگا۔ زائرین کا ہجوم تھا مگر آج بادشاہ کی آمد کے باعث منتظمین نے لوگوں کو مختلف قطاروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر طرف مکمل نظم و ضبط کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ اور نگزیب کے جاہ و جلال نے لوگوں کو ساکت کر دیا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے اس

مقام مقدس پر کسی بازار کی طرح شور برپا ہوتا تھا۔ اور نگزیب چلتے چلتے اچانک کچھ شکستہ حال لوگوں کے پاس ٹھہر گیا۔ یہ ان انسانوں کی قطار تھی جو ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے محروم ہو چکے تھے۔ اور نگزیب نے ان بد نصیب آدم زادوں کو غور سے دیکھا۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر ہاتھ بھیک کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سکوت بھی اس لئے تھا کہ تمام اندھوں کو پہلے ہی شہنشاہ کی آمد سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی انہیں خاموش رہنے کی تنبیہ بھی کی گئی تھی ورنہ یہ نابینا افراد چیخ چیخ کر آسمان سر پہ ٹھالیتے تھے۔

ایک اور نگزیب ایک اندھے سے مخاطب ہوا۔ ”تو یہاں کس لئے آیا ہے؟“

”اپنی آنکھوں کی روشنی مانگنے کے لئے۔“ اندھے نے لرزتے ہوئے کہا۔

”تو کب سے بینائی کے حصول کے لئے دعا مانگ رہا ہے؟“ اور نگزیب نے دوسرا سوال کیا۔

”پانچ سال سے۔“ اندھے کی آواز بدستور کانپ رہی تھی۔

”پھر تجھے اب تک روشنی کیوں نہیں ملی؟“ اور نگزیب کا لہجہ تند و تیز تھا۔

”اللہ کی مرضی۔“ اندھا خوف و دہشت سے سہا ہوا تھا اور اس کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اور نگزیب اندھے کا جواب سن کر آگے بڑھ گیا۔ پھر مغل شہنشاہ نے اسی طرح کے کئی اندھوں سے

سوالات کئے۔ سب کے مسائل یکساں تھے اور تمام اندھے روشنی کی دعا مانگنے کے لئے بزرگ کے مزار

پر جمع ہوئے تھے۔ کوئی یہاں پانچ سال سے مقیم تھا اور کوئی دس سال سے مگر کسی کی بھی بینائی واپس نہیں

آئی تھی۔ اور نگزیب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سارے اندھوں کو مخاطب کرتے ہوئے غضب

ناک لہجے میں کہا۔

”میں بزرگ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی دعا مانگو۔ اگر میری واپسی تک تمہاری آنکھوں

کی روشنی بحال نہیں ہوئی تو تم سب کو قتل کرادوں گا۔“

عجیب آمرانہ حکم تھا۔ اندھے فریاد کرنے لگے مگر اور نگزیب پر ان کی گریہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

وہ ادب و احترام کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

جن لوگوں نے آج سے پہلے اور نگزیب کو نہیں دیکھا تھا، وہ ہندوستان کے اس باجروت شہنشاہ کو

دیکھنے کے لئے مزار مبارک کے قریب سمٹ آئے لیکن اور نگزیب کو اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔ وہ

ایک غلام کی طرح سر جھکائے صاحب مزار کے قدموں میں کھڑا تھا۔ کچھ سرکاری ملازمین کا بیان ہے کہ

اور نگزیب کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں، جلال معرفت سے چہرے کا

رنگ زرد تھا اور ہونٹوں کو آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی۔ مغل شہنشاہ بہت دیر تک آیات قرآنی کی تلاوت

کرتا رہا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے بلند ہوئے۔ بزرگ کی روح کو اس طرح ایصالِ ثواب کیا

کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ شہنشاہ کو روتا دیکھ کر امراء سلطنت پر رقت طاری ہو گئی۔ عجیب روح

پرور سماں تھا۔ حاضرین چند لمحوں کے لئے دنیا کی تمام ہنگامہ آرائیوں کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت

گزارنے کے بعد اور نگزیب اُلٹے پاؤں چلتا ہوا مزار مقدس سے باہر آیا۔ اچانک مغل شہنشاہ کی نظر ایک

دوسری قبر پر پڑی۔ یہ قبر بزرگ کے مزار سے چھ گز کے فاصلے پر تعمیر کی گئی تھی۔ اور نگزیب قبر کی زینت و آرائش دیکھ کر چونک پڑا۔ قبر کا طرز تعمیر بھی دلکش تھا اور اس کے ساتھ ہی نہایت ہی قیمتی پتھر بھی استعمال کئے گئے تھے۔ اور نگزیب قبر کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا پھر وزیر سلطنت سے مخاطب ہوا۔

”یہ کس کی قبر ہے؟“ اور نگزیب کے لہجے سے حیرت و استعجاب کی جھلک نمایاں تھی۔

”یہ نظام سقہ کی قبر ہے جس نے حضور کے دادا شہنشاہ ہمایوں کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔“ وزیر سلطنت نے ادب سے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

”شمع پیش آفتاب پر تو نہ دارد۔“ (سورج کے سامنے شمع کی کوئی حیثیت نہیں) اور نگزیب نے سخت الفاظ میں کہا۔ ”یہ کیسی بے ادبی ہے کہ میرے بزرگوں کو اس کا خیال تک نہ آیا۔“ اور نگزیب کا لہجہ مزید نت ہو گیا تھا۔ ”اس قبر کا نشان مٹا دو اور نظام سقہ کی لاش کو یہاں سے دور لے جا کر دفن کر دو۔“ وزیر سلطنت کو یہ حکم دینے کے بعد اور نگزیب مزار کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

تمام امیر و وزیر لرزاں تھے اور سپاہی اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ اب شہنشاہ بے گناہ اندھوں کو قتل کرادے گا۔ وہ اور نگزیب کی ضدی طبیعت سے واقف تھے کہ ایک بار حکم دینے کے بعد وہ اپنے الفاظ واپس نہیں لیتا تھا۔ مگر جب مغل حکمران فاتحہ خوانی کے بعد واپس ہوا تو باہر کی فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ تمام اندھے دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ انہیں آنکھوں کی گم شدہ روشنی مل چکی تھی اور وہ اور نگزیب کی بلند اقبالی کو دعائیں دے رہے تھے۔ سپاہیوں نے اس انتشار پر قابو پانے کے لئے طاقت کا استعمال کرنا چاہا لیکن اور نگزیب نے انہیں روک دیا۔ اندھے شور مچا کر کچھ دیر تک اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے کہ حضور کی آمد ہمارے لئے مبارک ثابت ہوئی ہے اور ہمیں کھوئی ہوئی آنکھیں مل گئیں ورنہ ہم تو برسوں سے تاریک راہوں میں بھٹک رہے تھے۔

”یہ سوال نہیں کہ کسی انسان کی آمد مبارک ہے یا نامبارک۔“ اور نگزیب کی آواز گونجی اور ایک بار پھر ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔ ”سوال یہ ہے کہ تم کئی سال سے اس مرد بزرگ کے کوچے میں پڑے ہوئے تھے مگر تمہاری حالت یہ تھی کہ تم نے گداگری کو پیشہ بنالیا تھا اور اپنی حالت پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ تم نے ایک بار بھی اپنے خدا کے حضور لرز کر دعائیں نہیں کیں۔ مگر آج جب تمہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی تو تم خوف و دہشت سے رو پڑے۔ پھر تم نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی۔ یہاں تک کہ بہتے ہوئے آنسو تمہاری زندگی سنوار گئے۔“ یہ کہہ کر اور نگزیب واپس چلا گیا۔

در اصل واقعہ یہ تھا کہ سخت مذہبی انسان ہونے کے باوجود اور نگزیب اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی بزرگان دین سے کوئی کرامت سرزد ہو سکتی ہے اور اپنے اس خیال کو آزمانے کے لئے آج وہ ہندوستان کے سب سے بڑے بزرگ کے مزار پر حاضر ہوا اور اپنی آنکھوں سے جب اور نگزیب نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ لیا تو اس کے ذہن میں پرورش پانے والے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس واقعے کے بعد اور نگزیب کئی بار مزار اقدس پر حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کے

لئے دعائیں مانگیں۔ بے شمار ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ایک مرتبہ مغل شہنشاہ آگرہ سے پیدل چل کر یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک روایت یوں بھی ہے کہ اپنی زندگی کی خوفناک ترین جنگ لڑنے سے پہلے اورنگزیب ننگے پاؤں بزرگ کے مزار پر حاضر ہوا تھا یہاں تک کہ اس کے پیروں کے چھالے پھوٹ گئے تھے اور ان سے پانی بہہ رہا تھا۔ پھر اس نے بزرگ کا واسطہ دے کر اپنے خدا سے عافیت طلب کی تھی۔ اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اورنگزیب کے دشمن ذلت و رسوائی کے ساتھ میدان میں سے فرار ہو رہے تھے اور قدرت کا نادیدہ ہاتھ اس کے کشادہ سینے پر فتح کا ایک اور تمغہ سجا رہا تھا۔

جن کے مزار اقدس پر محی الدین اورنگزیب عالمگیر جیسا با شرع انسان پا برہنہ حاضر ہوتا تھا، وہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نسلی اعتبار سے صحیح النسب سید تھے۔ آپؒ کا شجرہ عالیہ بارہ واسطوں سے امیر المومنین حضرت علیؑ تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت خواجہؒ 14 رجب 536ھ کو جنوبی ایران کے علاقے سیستان میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد گرامی خواجہ غیاث الدین حسنؒ بہت دولت مند تاجر اور با اثر شخص تھے۔ کثرت مال کو قرآن حکیم میں سب سے بڑا فتنہ قرار دیا گیا ہے مگر خواجہ غیاثؒ، صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عابد و زاہد انسان بھی تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک دولت مند گھرانے میں بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ عیش و عشرت کی فراوانی کے باوجود حضرت خواجہؒ میں بچپن ہی سے ایک عجیب انداز کی قناعت تھی۔

جس زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ولادت ہوئی وہ بڑا پر آشوب دور تھا۔ سیستان اور خراسان لوٹ مار کی زد میں تھے اور ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ سیاسی انتشار نے انتہائی سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ سرسبز و شاداب علاقوں میں آگ بھڑک رہی تھی اور خوبصورت شہر کھنڈروں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ملت اسلامیہ میں کئی فرقے پیدا ہو چکے تھے جو بڑی سفاکی اور بے رحمی سے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ ”ملاحدہ“ اور ”باطنیوں“ کی جماعت نے پورے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

سلجوقی خاندان کی یادگار سلطان سنجر اس علاقے کا حکمران تھا۔ اس کی شوکت و سطوت کی داستانیں دور دراز کے علاقوں تک مشہور تھیں کہ اچانک گردشِ ایام نے نئی کروٹ لی۔ تاتاریوں کا ایک وحشی گروہ جسے ”غز“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، پوری طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس گروہ کے جبر و تشدد کو روکنے کے لئے سلطان سنجر اپنی فوجیں لے کر آگے بڑھا مگر اسے تاتاریوں کے مقابل شکست ہوئی۔ سیستان کا حاکم بڑی شجاعت سے لڑا مگر تاتاریوں کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہو گیا۔ خود سلطان سنجر کو بڑی بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہونا پڑا۔

یہی وہ خون رنگ اور زہر آلود فضا تھی جس نے خواجہ غیاث الدین حسنؒ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ آپؒ اپنے بیوی اور بچے کو لے کر خراسان چلے آئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عمر مبارک ایک سال کے قریب تھی۔ خواجہ غیاثؒ کا خیال تھا کہ انہیں ارضِ خراسان میں کوئی نہ کوئی گوشہ عافیت

ضرور مل جائے گا..... مگر گردشِ ماہ و سال کے وہی تہور تھے اور جاں گدازِ فتنے یہاں بھی سر اٹھا رہے تھے۔ خواجہ غیاثؒ نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ اس وقت کے بہترین استاد مقرر کئے گئے..... مگر خراسان کی صورتِ حال روز بروز بگڑتی چلی گئی۔

549ھ میں خونی سیلاب انسانی سروں سے گزر گیا۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عمر شریف تیرہ سال تھی۔

مولانا عبدالحلیم شرر ملت اسلامیہ کے انتشار کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

”549ھ میں سلطان سنجر کو ”ترکانِ غز“ کے مقابلے میں دوبارہ شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اب ملک کا کوئی حامی و نگران نہیں رہا اور بے گناہ لوگوں کی قسمت یک بیک وحشی درندوں اور بے رحم لٹیروں کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ وہ درشت مزاج اور وحشی فطرت لوگ خراسان کے علاقے میں گھس آئے۔ ”طوس“ اور ”نیشاپور“ کو بڑی بے رحمی سے لوٹا۔ خواتین کو جہاں پایا، بے عزت کیا۔ ان کی عصمتیں خراب کیں اور انہیں بے حرمت و بے آبرو کیا۔ عورتوں اور لڑکوں کو پکڑ کر لونڈی غلام بنایا۔ تمام مسجدیں برباد کر دیں، مکانات منہدم کر دیئے گئے، نیشاپور میں ظالموں نے ایسا ظلم کیا اور اس قدر خون بہایا کہ اپنے خیال میں انہوں نے ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا خوش قسمت تھا جو کہیں چھپ چھپا کر بچ گیا ہو۔ ہر طرف لاشوں کے انبار اور تودے لگے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ”جامع مسجدنجی“ میں پناہ لی اور اندر سے دروازے بند کر لئے مگر یہ وحشی جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے، انہوں نے مسجد کے دروازے کلباڑیوں سے چیر ڈالے اور خاص مقام میں جو خداوند ذوالجلال کا دامنِ عافیت اور دین داروں کے نزدیک دارالامان تھا، گھس کر سب کو شہید کر ڈالا۔ یہی حالت وہاں کے عالیشان ”بیمارستان“ (دارالشفاء) کی ہوئی جس کی عمارت ایک قلعے جیسی تھی، بہت سے لوگوں نے اس میں پناہ لی مگر وہ وحشی وہاں بھی داخل ہو گئے اور جو بھی ملا، خواہ وہ طبیب تھا یا مریض، زخمی تھا یا جراح، بلا امتیاز سب کو جامِ فنا پلا دیا۔“

ایک اور مقام پر مولانا عبدالحلیم شرر ان وحشیوں کی فتنہ انگیزی کے بارے میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

”نیشاپور کے مظلوموں اور جامِ شہادت پینے والوں میں سپاہی اور عوام نہ تھے بلکہ بڑے بڑے علماء، فضلاء، اولیاء، ابرار، اتقیاء اور احرار بھی تھے۔ تمام علماء اور شیوخ شہید ہوئے۔ کل صالحین اور متصوفین فنا کر دیئے گئے۔ نیشاپور اس زمانے میں علم و فضل کا مخزن تھا۔ لہذا مدت ہائے دراز کے ذوقِ علم نے کچھ سرمایہ علمی وہاں فراہم کیا تھا، وہ سب بھی خاک میں ملا دیا گیا اور کل کتب خانوں میں آگ لگا دی گئی۔“

الغرض مصیبتوں اور آفتوں کے اسی الم ناک ماحول میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پرورش پائی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کے خون کے دریا بہتے دیکھے۔ کبھی کبھی آپؒ نہایت رقت آمیز لہجے میں اپنے والد گرامی سے سوال کرتے۔

”بابائے محترم! خونِ مسلم کی یہ ارزانی کب تک رہے گی؟“

نوعمر فرزند کا یہ سوال سن کر حضرت خواجہ غیاث الدینؒ رونے لگتے۔ ”بیٹے! یہ شرر بار موسم اور یہ خونی ہوائیں اہل ایمان کے لئے آزمائش ہیں۔ تمہیں صبر کرنا ہی پڑے گا۔“

پھر ایک دن صبر کی تلقین کرنے والا بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ خواجہ غیاث الدینؒ حسنؒ نے 551ھ میں وفات پائی۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ کی عمر پندرہ سال تھی۔

آپؒ نے آنکھیں کھولتے ہی ہر طرف قیامت صغریٰ کے مناظر دیکھے تھے۔ یہ ایک اور قیامت تھی جو پوری شدت کے ساتھ آپؒ کے قلب حساس پر نازل ہوئی۔ سارا مال و اسباب پہلے ہی برباد ہو چکا تھا۔ اب متاع عزیز بھی چھن گئی اور خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ ایک شفیق و مہربان باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔

غیاث الدینؒ حسنؒ کی موت نے حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپؒ ہر وقت اداس اور مغموم رہنے لگے۔ ایسے نازک لمحات میں آپؒ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی نورؒ نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا اور بڑے حوصلے کے ساتھ بیٹے کو سمجھایا۔

”فرزند! زندگی کے سفر میں ہر مسافر کو تنہائی کی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر تم ابھی سے اپنی تکلیفوں کا ماتم کرنے بیٹھ گئے تو یہ دشوار گزار راستہ کیسے طے کرو گے؟ اٹھو! اور پوری توانائی کے ساتھ اپنا سفر شروع کرو۔ ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے۔ یہ والد محترم کی محبت کا ثبوت نہیں کہ تم دن رات ان کی یاد میں آنسو بہاتے رہو۔ اولاد کی محبت یہ ہے کہ وہ بزرگوں کے خواب کی تعبیر پیش کرے اور تمہارے باپ کا ایک ہی خواب تھا کہ ان کا بیٹا علم و فضل میں کمال حاصل کرے۔“

مادر گرامی کی تسلیوں سے حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ کی طبیعت سنبھل گئی اور آپؒ ذوق و شوق کے ساتھ علم حاصل کرنے لگے۔ مگر سکون و فراغت کی یہ مہلت بھی زیادہ طویل نہیں تھی۔ مشکل سے ایک سال گزرا ہو گا کہ حضرت بی بی نورؒ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ تنہائی کی داستان مکمل ہو گئی۔ اب حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ اس دنیا میں اکیلے تھے۔

والد گرامی کی وفات کے بعد ایک باغ اور ایک چکی آپؒ کو ورثے میں ملی تھی۔ والدہ محترمہ کی زندگی میں آپؒ حصول رزق کی کشمکش سے آزاد تھے مگر جب مادر مہربان بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں تو معیشت کا سارا بوجھ آپؒ کے کندھوں پر آ پڑا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ نے باغبانی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ سارے کام آپؒ خود ہی انجام دیتے، درختوں کو پانی دیتے، زمین کو ہموار کرتے، پودوں کی کاٹ چھانٹ عمل میں لاتے، کھاد وغیرہ کا بندوبست کرتے اور منڈیوں میں جا کر خود ہی پھلوں کو فروخت کرتے۔ اس کارباری کشمکش میں آپؒ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتیؒ کو اس کا بڑا قلق تھا لیکن یہ ایک ایسی فطری مجبوری تھی کہ جس کا بظاہر کوئی علاج بھی ممکن نہیں تھا۔ آپؒ اکثر اوقات اپنی اس محرومی پر غور کرتے اور جب کوئی حل نظر نہ آتا تو شدید مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھتے اور رونے لگتے۔ یہ خدا کے حضور بندے کی ایک خاموش دعا تھی۔



ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم قدوزیؒ کا گزر ہوا۔ حضرت خواجہؒ نے بزرگ کو دیکھا، دوڑتے ہوئے گئے اور حضرت ابراہیم قدوزیؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے۔

بزرگ ایک لڑکے کے اس جوش عقیدت سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے حضرت خواجہؒ کے سر پر ہاتھ رکھا، دعائیں دیں اور آگے جانے لگے لیکن آپؒ نے حضرت ابراہیم قدوزیؒ کا دامن تھام لیا۔ بزرگ نے پلٹ کر پوچھا۔ ”اب کیا چاہتا ہے؟“

حضرت خواجہؒ نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ ”یہ ایک التجا ہے کہ آپ چند لمحوں کے لئے میرے باغ میں قیام فرمائیں۔ کون جانے پھر یہ نیک ساعت لوٹ کر آتی بھی ہے یا نہیں؟“

حضرت خواجہؒ کا لہجہ اس قدر عقیدت مندانہ تھا کہ حضرت ابراہیم قدوزیؒ انکار نہ کر سکے اور باغ کے اندر چلے گئے۔ حضرت خواجہؒ نے بزرگ کو نہایت احترام سے بٹھایا اور پھر اجازت لے کر باغ کے ایک گوشے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو آپؒ کے ہاتھوں میں انگوروں سے بھرے ہوئے دو طباق تھے۔ حضرت خواجہؒ نے عاجزی کے ساتھ انگور کے وہ تازہ خوشے حضرت ابراہیم قدوزیؒ کے سامنے رکھ دیئے اور خود دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

”خادم کے پاس آپ کی تواضع کے لئے بس یہی کچھ تھا۔ اگر اسے قبول فرمائیں گے تو میں اپنی خوش قسمتی پر فخر کروں گا۔“ حضرت خواجہؒ نے اس نوعمری میں سعادت مندی کا وہ مظاہرہ کیا تھا کہ حضرت ابراہیم قدوزیؒ بھی حیران تھے۔

بزرگ نے ایک بار پھر حضرت خواجہؒ کو محبت آمیز نظر سے دیکھا اور آپؒ کی دلجوئی کے لئے چند انگور اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔ حضرت ابراہیم قدوزیؒ کے اس عمل سے حضرت خواجہؒ کے چہرے پر خوشی کا وہ رنگ ابھر آیا جو کسی نعمت عظیم کے حاصل ہونے پر نمایاں ہوتا ہے۔ بزرگ نے آپؒ کی اس کیفیت کا بھی جائزہ لیا، پھر فرمایا۔ ”معین الدین! بیٹھ جاؤ۔“

حضرت خواجہؒ دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت ابراہیم قدوزیؒ نے بڑے والہانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”فرزند! تم نے ایک فقیر کی خوب مہمان نوازی کی۔“ بزرگ کے الفاظ سن کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ادب سے سر جھکا لیا۔

”یہ سرسبز و شاداب درخت، یہ لذیذ پھل، یہ ملکیت، یہ جائیداد، سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے۔“ حضرت ابراہیم قدوزیؒ باغ کی طرف اشارہ کر کے انتہائی جذب کے عالم میں بول رہے تھے۔ ”آج یہاں بہاروں کا دور دورہ ہے، کل اسی مقام پر خزاں کی حکومت ہوگی۔ یہی گردشِ روز و شب ہے اور یہی نظامِ قدرت ہے۔ تیرا یہ باغ بھی وقت کی تیز آندھیوں میں اجڑ جائے گا۔ پھر خدا تجھے ایک باغ اور عطا کرے گا۔ ایسا باغ جس کے درخت قیامت تک گرم ہواؤں سے محفوظ رہیں گے۔ ان درختوں کے پھلوں کا ذائقہ ایک بار جو بھی چکھ لے گا، پھر وہ دنیا کی کسی نعمت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“ اتنا کہنے کے بعد حضرت ابراہیم قدوزیؒ نے اپنے پیرہن کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

حضرت خواجہ بزرگ کے اس عمل کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب حضرت ابراہیم قندوزیؒ کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو انگلیوں میں دبا ہوا سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا صاف نظر آ رہا تھا۔
 ”وہ تیری مہمان نوازی تھی، یہ فقیر کی دعوت ہے۔“ اتنا کہہ کر حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے روٹی کا ٹکڑا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے منہ میں ڈال دیا اور پھر تیزی کے ساتھ باغ سے نکل کر کسی طرف چلے گئے۔

روٹی اس قدر خشک تھی کہ اس کا چبانا دشوار تھا۔ مگر حضرت خواجہؒ نے اسے ایک بزرگ کا تحفہ عظیم سمجھ کر کھالیا۔ اس ٹکڑے کا حلق سے اترنا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ آپؒ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کائنات کی ہر شے فضول ہے۔

دوسرے دن حضرت خواجہؒ نے اپنا باغ اور چکی فروخت کر دی۔ آپؒ کے اس فیصلے پر تمام متعلقین حیران تھے۔ ان لوگوں نے حضرت خواجہؒ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر آپؒ پر اثر نہیں ہوا۔ جائیداد کی فروخت کے بعد جس قدر رقم حاصل ہوئی اسے آپؒ نے کھڑے کھڑے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت خواجہؒ کا یہ عمل عزیز واقارب کے لئے اور بھی حیران کن تھا۔ بیشتر افراد کے نزدیک آپؒ کسی خلل دماغی کا شکار ہو گئے تھے۔ مگر کون جانتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کے دل پر کیا گزری ہے اور ذہن کے کس گوشے سے روشنی کی وہ لکیر پھوٹ رہی ہے جس نے دنیا کے تمام اُجالوں کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔



حضرت ابراہیم قندوزیؒ سے ملاقات اور پھر اپنا سارا مال و متاع اللہ کی راہ میں لٹانے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؒ نے خراسان سے نکل کر سب سے پہلے مشرق کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں سمرقند و بخارا اسلامی علوم و فنون کے اہم مراکز سمجھے جاتے تھے۔ یہاں حضرت خواجہؒ نے سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر تفسیر، فقہ، حدیث اور دوسرے علوم ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ آپؒ کے اساتذہ میں کون کون بزرگ شامل تھے، اس کا صحیح علم تو کسی کو نہیں مگر بعض روایتوں سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ آپؒ کے استادوں میں مولانا حسام بخاریؒ بھی تھے اور انہی بزرگ نے حضرت خواجہؒ کو قرآن کریم حفظ کرایا تھا۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ”مرشد کامل“ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب آپؒ کا رخ عراق کی طرف تھا۔ راستے میں نیشاپور میں حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ سکونت پذیر تھے۔ بیشتر کتابوں میں خواجہ عثمانؒ کو ”ہارونی“ لکھا گیا ہے جو تحقیقی اعتبار سے غلط ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدم بے اختیاری کے عالم میں خانقاہ چشتیہ کی طرف کھینچے چلے گئے۔ چشتی کا لفظ سب سے پہلے حضرت خواجہ اسحق شامیؒ کے نام کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اگرچہ خواجہ اسحقؒ کا وطن شام تھا مگر آپؒ نے تبلیغ و ہدایت کے لئے موضع چشت کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔ چشت خراسان کے اطراف میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر اللہ نے اپنے صالحین بندوں کے طفیل اس غیر معروف مقام کو شہرت و دوام بخشی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دن تک ایک عام طالب علم کی حیثیت سے حضرت عثمان ہروئیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے مگر حضرت شیخؒ نے آپؒ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ حضرت خواجہؒ پر مدید مایوسی کا غلبہ ہوا۔ کئی بار عقل نے فریب دیا کہ یہاں تیرے مقدر کا کچھ نہیں ہے۔ کسی دوسرے آستانے پر جا کر قسمت آزمائی کر۔ خیالات کی یہ سرکشی بڑی خوفناک تھی لیکن آپؒ نے بڑی ہمت سے اس پر قابو پایا اور مسلسل حضرت خواجہ عثمان ہروئیؒ کی بارگاہ میں حاضری دیتے رہے۔ پھر ایک دن آپؒ نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”میری دلی تمنا ہے کہ حضور مجھے مستقل غلامی کا شرف بخش دیں۔“ حضرت خواجہؒ کا اشارہ مریدی کی طرف تھا۔

حضرت عثمان ہروئیؒ نے آپؒ کی اس خواہش کے جواب میں فرمایا۔ ”فرزند! مجھ سے اپنا ہی بوجھ نہیں اٹھتا پھر تمہارا بارِ گراں کیسے اٹھاؤں گا؟“

حضرت عثمان ہروئیؒ آپؒ کو ٹالنا چاہتے تھے مگر حضرت خواجہؒ اصرار کرتے رہے۔ ”جہاں آپ کے سینکڑوں خادم ہیں، وہاں ایک غلام کے اضافے سے کیا فرق پڑے گا؟“

”یہ سب کے سب خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔“ حضرت عثمان ہروئیؒ نے پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔ ”یہ لوگ مجھے مرشد کامل سمجھتے ہیں مگر ان نادانوں کو کیا خبر کہ ان کا پیر خود منزل کی تلاش میں ہے۔“

”ان لوگوں کی طرح میں بھی آپ سے خُسن ظن رکھتا ہوں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس طرح اظہار عقیدت کیا کہ حضرت عثمان ہروئیؒ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پھر شیخؒ نے آپؒ کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں تقریباً ڈھائی سال تک حاضر رہے۔ شیخؒ جہاں بھی جاتے، آپؒ غلاموں کی طرح ساتھ رہتے۔ ساری ساری رات محض اس خیال سے جاگتے

کہ کہیں پیر و مرشد کو کسی چیز کی ضرورت نہ پیش آجائے۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، آپؒ کے جذبہ خدمت گزاری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت عثمان ہروئیؒ نے انسانی ہجوم سے بچنے کے لئے قصد اپنے ظاہری کمالات پر پردہ ڈال دیا تھا۔ لوگ آپؒ کا نام سن کر دور دراز مقامات سے چلے آتے تھے مگر جب شیخؒ سے کسی کشف و کرامت کا اظہار نہ ہوتا تو مایوس ہو کر لوٹ جاتے۔ پھر یہ

تھے عام ہو گئے کہ حضرت شیخ عثمان ہروئیؒ ایک دنیا دار شیخ ہیں۔ ان کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی اپنے پیر و مرشد کے شب و روز کا بغور مشاہدہ کرتے رہتے تھے اور

عجب اتفاق تھا کہ آپؒ نے اس طویل عرصے میں شیخؒ کی کوئی کرامت اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت عثمان ہروئیؒ کے بہت سے مرید اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ انہیں

بھی تک دست غیب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان مریدوں کے خیال میں شیخؒ ظاہری علم رکھتے تھے اور انہیں ظنی علم سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ کہنے والے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

سے بھی کہا کرتے تھے کہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟ یہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی اور دروازہ دیکھو۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بدگمانوں کے اس گروہ کو سخت ترین جواب دیتے اور اسی ذوق و شوق سے خدمت شیخؒ میں مصروف رہتے۔

ایک بار حضرت عثمان ہروئیؒ نیشاپور سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا معمول تھا کہ آپؒ ہمہ وقت پیرومرشد کے ساتھ رہتے۔ اس مرتبہ بھی سفر کے دوران آپؒ اس طرح شیخؒ کے پیچھے چل رہے تھے کہ جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے ہمراہ ہو۔ حضرت عثمان ہروئیؒ کا تمام سامان خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سر پر تھا اور آپؒ اس سعادت پر اس قدر نازاں تھے کہ جیسے دولت کو نین ہاتھ آگئی ہو۔ شیخؒ نے ایک غیر آباد علاقے میں قیام کیا۔ پھر بڑے عجیب سے لہجے میں حضرت خواجہؒ سے فرمایا۔

”معین الدین! ساری دنیا چلی گئی۔ اب تم بھی چلے جاؤ۔ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو لوگ اس طرح خالی ہاتھ کیوں لوٹ جاتے؟“ حضرت عثمان ہروئیؒ کا اندازِ کلام ہی کچھ اور تھا۔ ”تم کئی سال سے ناکام و نامراد بھٹک رہے ہو، آخر تم نے کیا پایا؟“

”شیخ! اب میں کہاں جاؤں گا؟ آپ کے سوا میرا کون ہے؟“ یہ کہتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتیؒ رو پڑے۔ ”میں تو ایک کا ہو چکا۔ اب مجھے دوسرے کے در پر صدا دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ حضرت خواجہؒ کا یہ جواب سن کر حضرت عثمان ہروئیؒ بے قرار ہو گئے اور آپؒ کو سینے سے لگا کر انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا فرمائی۔

”اے خدائے ذوالجلال! معین الدین کو قبول فرمالے۔ اس نے میری بے سرو سامانی کے باوجود مجھے نہیں چھوڑا۔ تو بھی اسے زمین پر تنہا نہ چھوڑ۔“

ابھی دعا کے الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ بارشِ نور میں نہا گئے۔ ایک تیز شعاعِ دل و دماغ کو روشن کرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آپؒ کی آنکھوں کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ گئے۔

”معین الدین! اب کیا نظر آتا ہے؟“ حضرت عثمان ہروئیؒ نے آپؒ کو علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”شیخ کے صدقے میں عرش سے تحتِ اثریٰ تک دیکھ رہا ہوں۔“ حضرت خواجہؒ نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ تم سیراب ہو گئے ورنہ عشق کے صحرا میں لوگ ایک بوند کو بھی ترس جاتے ہیں۔“ شیخؒ نے فرمایا اور سفر کا ارادہ ترک کر کے واپس نیشاپور لوٹ آئے۔

درحقیقت یہ حضرت خواجہؒ کی طویل آزمائش تھی جو کم و بیش ڈھائی سال جاری رہی۔ اس کے بعد حضرت عثمان ہروئیؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ ظاہر پرستوں کا ہجوم دوبارہ لوٹ آیا۔ بہت سے انسانوں نے شیخؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ہزاروں افراد نے ایک نگاہِ کرم کی بھیک مانگی مگر حضرت عثمان ہروئیؒ یہی فرماتے رہے۔

”جو کچھ میرے ہاتھ میں تھا، میں نے معین الدینؒ کے حوالے کر دیا۔“

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان ہروئیؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو لے

کر مکہ معظمہ حاضر ہوئے تھے اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد شیخؒ نے بلند آواز میں فرمایا تھا۔ ”الہی! معین الدین حاضر ہے۔ اپنے اس عاجز بندے کو شرف قبولیت عطا فرما۔“

جواب میں ندائے غیبی سنائی دی۔ ”ہم نے اسے قبول کیا۔ بہ شک! یہ معین الدین ہے۔“
مکہ معظمہ کے قیام کے بعد شیخؒ دربار رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ پھر جیسے ہی سرور کونین ﷺ کی قربت حاصل ہوئی عثمان ہروئیؒ نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو حکم دیا۔ ”معین الدین! آقائے کائنات کے حضور سلام پیش کرو۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے گداز قلب کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”السلام علیکم یا سید المرسلین ﷺ“

وہاں موجود تمام لوگوں نے سنا۔ روضہ رسول ﷺ سے جواب آیا۔ ”علیکم السلام یا سلطان الہند۔“
اس کے بعد شیخؒ نے حضرت خواجہؒ کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا۔ ”معین الدین! تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں دونوں مقامات پر قبولیت کی سند عطا ہوئی۔ آئندہ بت خانہ ہند تمہاری سرگرمیوں کا مرکز ہوگا۔ اگرچہ وہاں کفر کی گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے لیکن بالآخر تم وہاں اسلام کی شمع روشن کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اس طویل و عریض ملک میں تم ہی سلطان کہلاؤ گے جسے دربار رسول ﷺ سے تاج سلطانی بخشا گیا ہو وہ ہند کے تمام بادشاہوں پر غالب آکر رہے گا۔“

فرمودہ شیخ سن کر حضرت خواجہؒ نے خاکِ مدینہ کو بوسہ دیا اور روضہ رسول ﷺ کی جالیاں پکڑ کر رونے لگے۔ جوشِ گریہ اس حد تک بڑھا کہ آپؐ کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اسی آہ و زاری کے درمیان حضرت خواجہؒ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”غلام تو ام زیں سبب تاجدارم۔“ (تیرا غلام ہوں اسی لئے شہنشاہ کہلاتا ہوں)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سوانح لکھنے والے تمام تذکرہ نگاروں نے ان دونوں روایتوں کو پورے اعتماد کے ساتھ قلمبند کیا ہے جس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ یہ دونوں روایات مستند ہیں مگر تصوف کو ایون سمجھنے والے مسلمانوں کے نزدیک ایسے سارے واقعات انتہائی نامعتبر قرار پاتے ہیں۔ یہاں اس طویل بحث میں الجھنے کی گنجائش نہیں پھر بھی اس قدر وضاحت ضروری ہے کہ روحانیت انسان کا ذاتی تجربہ ہے۔ شدید ریاضت کے بعد جب اس پر کائنات کے کچھ اسرار منکشف ہوتے ہیں اور پھر وہ عام لوگوں کے سامنے اپنے مشاہدات بیان کرتا ہے تو سطحی ذہن اور علم رکھنے والے انسان اس مردِ خدا رسیدہ کو ”ہونقوں“ کی طرح دیکھنے لگتے ہیں اور اپنی ناتجربہ کاری کی بنیاد پر چیخنے لگتے ہیں کہ وہ شخص فریبِ نظر کا شکار ہے اور اس کا مشاہدہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ آرٹ کا کوئی پروفیسر محض اپنی بے خبری کے سبب جدید ترین سائنسی ایجادات کو جھٹلا دے اور جب کھلی آنکھ سے ان ایجادات کا مشاہدہ کرے تو حیران رہ جائے۔ اولیاء کی کرامات پر بھی یہی مثال صادق آتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ واقعات کا معاملہ انتہائی نازک اور حساس ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی مسلمان سرور کونین ﷺ کے حوالے سے کوئی غلط بات منسوب کرے اور پھر

حضرت عثمان ہرونیؓ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو بہت باخبر اور ذمہ دار مسلمان تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض جھوٹے اور پیشہ ور صوفی اپنی ناتواں اور کھوکھلی ذات کو با اثر بنانے کے لئے گستاخی اور بے ادبی کی اس منزل تک بھی پہنچ گئے ہوں۔ مگر حضرت خواجہ عثمان ہرونیؓ اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کو اللہ نے سب کچھ عطا کر دیا تھا۔ پھر وہ اپنے آقا کی ذات پاک سے ایسی بات کیوں منسوب کرتے کہ جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو بڑا سنگین جرم ہوتا کہ وہ ذاتی مفاد کے لئے رسالت مآب ﷺ کا نام لے کر اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ جھوٹ تو آخر جھوٹ ہی ہوتا ہے، خواہ مذاق کے طور پر ہی کیوں نہ بولا جائے اور ایک جھوٹا شخص سب کچھ ہو سکتا ہے، اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا۔

البتہ ان روایات کا ایک پہلو بہت زیادہ غور طلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ اور روضہ اطہر سے بلند آواز میں جواب آنا اور سینکڑوں انسانوں کا اس آواز کو سننا قدرت خداوندی کے خلاف تو نہیں مگر اس سے شریعت خداوندی میں خلل پڑتا ہے اور رسالت کا احترام بھی متاثر ہوتا ہے۔ دراصل روضہ اطہر سے سلام کا جواب آنا، انسانی محسوسات کا ایک خاص عمل ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی تائید غیبی کے باعث احساس کے اسی عمل سے گزر رہے تھے۔ پھر جب آپؒ نے کسی موقع پر اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہوگا تو مریدین نے خوش عقیدگی کے سبب روایتوں میں اتنا اضافہ کر دیا ہوگا کہ روضہ اقدس سے آنے والا جواب حاضرین نے بھی سنا۔ اس کے بعد صدیوں کے سفر میں یہ روایت اتنی معتبر ٹھہری کہ اہل نظر حضرات نے تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس سلسلے میں مجھ بے علم اور ناچیز انسان نے بعد انکسار اپنی رائے پیش کر دی ہے ورنہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا؟



حضرت خواجہ عثمان ہرونیؓ کے دست حق پرست پر بیعت ہونے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے طویل عرصے تک شدید ریاضتیں کیں۔ ان ریاضتوں کے بارے میں حضرت خواجہؒ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں۔

”میرے پیر و مرشد نے اپنی ریاضتوں کے ابتدائی ایام میں ایسے طریقے سے جہاد نفس کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ آپؒ نے ریاضت کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، عارفان حقیقت کے گروہ میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ مسلسل سات سات دن تک روزہ رکھتے اور پانچ مثقال کی ٹکیہ سے افطار فرماتے۔ صرف ایک چادر اوڑھا کرتے۔ اگر وہ پھٹ جاتی تو اسے اپنے ہاتھوں سے سی لیتے۔“

ریاضتوں اور مجاہدوں کی منزل سے گزرنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیر و مرشد کی اجازت سے دوبارہ سفر شروع کیا۔ آپؒ سب سے پہلے دمشق کے راستے سے ہوتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے۔ حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد روضہ رسول ﷺ پر حاضری دینے کے لئے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ پھر اہل اللہ کی زیارت کے لئے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا۔

سفر بغداد کے دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ملاقات حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ سے ہوئی۔ اولیائے کرام کی جماعت میں حضرت شیخؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ اس وقت حضرت نجم الدین

کبریٰ ”سنجار“ میں قیام فرماتے۔ سنجار، موصل کے قریب ایک پہاڑی مقام ہے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ وہی مشہور بزرگ ہیں جو بیک وقت گوشہ نشین صوفی بھی تھے اور مومن جانباز بھی۔ جب محمد خوارزم تاتاریوں کے حملے کی تاب نہ لا کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا تو ہلاکو خان اپنے لشکر جرار کے ساتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھا۔ تاتاری حکمران کو اس کے جاسوسوں نے بتایا کہ سلطان ”خوارزم“ کے علاقے میں موجود ہے۔ ہلاکو خان نے شدید قہر و غضب کے عالم میں حکم دیا کہ شہر خوارزم کا وجود تک مٹا دیا جائے۔

اتفاق سے اس وقت حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ بھی خوارزم میں سکونت پذیر تھے۔ ہلاکو خان کا امیر لشکر برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔ خوارزم کے باشندے گریہ و زاری کرتے ہوئے حضرت نجم الدین کبریٰ کی خانقاہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت حضرت شیخ اپنے مریدوں اور دوسرے طالب علموں کو درس دے رہے تھے۔

”حضرت! وقت دعا ہے۔ تاتاری درندے شہر کے گرد و نواح میں پہنچ چکے ہیں۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہونے والا ہے۔“

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے خوارزم کے باشندوں کی فریاد سنی۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر اپنے قریب رکھے ہوئے مٹی کے پیالے کو چٹائی پر اوندھا کر دیا۔ یہ وہ پیالہ تھا جس میں حضرت شیخ پانی پیا کرتے تھے۔

”اب تم لوگ جاؤ۔ خدا نے چاہا تو تاتاریوں کے شر سے محفوظ رہو گے۔“ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے فرمایا۔

خوارزم کے باشندوں کا ہجوم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گیا اور ہلاکو خان کا امیر لشکر ناکامی کی حالت میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ پھر جب وہ اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو اس کے چہرے سے شگستگی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

”خوارزم کے باشندے تہ تیغ کر دیئے گئے اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی؟“ ہلاکو خان نے انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنے امیر لشکر سے پوچھا۔

”نہیں شہنشاہ! آپ کا یہ غلام کچھ بھی نہ کر سکا۔“ امیر لشکر ہلاکو خان کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

”اس کی وجہ؟“ ہلاکو خان کی قہر آلود آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔

”شہنشاہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے مگر میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔“ امیر لشکر نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب تاتاری لشکر خوارزم کے قریب پہنچا تو چند لمحوں کے لئے ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ پھر جب یہ تاریکی دور ہوئی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تاحد نظر ایک لٹق و دق صحرا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم بہت دیر تک اپنے ہدف کی تلاش میں بھٹکتے رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے خوارزم کی پوری آبادی کو زمین نکل گئی ہو۔“

ہلاکو خان نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے امیر لشکر کی گفتگو سنی اور نیا فرمان جاری کرتے ہوئے کہا۔
”کل صبح پھر حملہ کرو۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ خوارزم شہر صحرا میں تبدیل ہو جائے۔“

دوسرے دن نماز فجر کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے اسی مٹی کے پیالے سے پانی پیا اور اسے دوبارہ چار پانی پر الٹ دیا۔

تاتاری لشکر ایک بار پھر جوش و خروش کے ساتھ خوارزم کی طرف بڑھا مگر جب شہری حدود میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ وہی واقعہ پیش آیا۔ دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تاتاری لشکر ناکام و نامراد واپس لوٹ گیا۔

ہلاکو خان نے دوبارہ یہ ماجرا سنا تو اپنے امیر لشکر پر برہم ہو گیا۔ ”تو جھوٹا ہے یا پھر تیری آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔“

”شہنشاہ! میں جھوٹ بھی نہیں بولتا اور میری بینائی بھی برقرار ہے۔“ تاتاری امیر لشکر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا مگر خوف و دہشت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ہلاکو خان کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب ہزاروں سپاہیوں نے اپنی مذہبی رسم کے مطابق قسمیں کھا کر اس واقعے پر گواہی دی۔ پھر اس نے اپنے سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تجھے ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر تو پھر بھی ناکام رہا تو میں خود لشکر تاتاری کی قیادت کروں گا۔“

تیسرے دن بھی وہی صورت حال پیش آئی۔ تاتاریوں کی آنکھوں کے سامنے ایک طویل و عریض صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔

تیسرے دن ہلاکو خان بہ نفس نفیس ایک لشکر جرار لے کر خوارزم کی طرف بڑھا۔
حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نماز فجر کے بعد اپنا عمل دہرانا چاہتے تھے کہ یکایک خانقاہ کے ایک گوشے سے مردِ غیب کی آواز سنائی دی۔ ”بس شیخ! بہت ہو چکا۔ اللہ نے تین دن تو تمہاری لاج رکھ لی۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟“

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ”آخر مشیت الہی کیا ہے؟“
”مشیت الہی یہ ہے کہ فتنہ تاتاری تمہاری دعاؤں سے نہیں ٹلے گا۔“ مردِ غیب نے کہا۔ ”اور تمہیں یہ بھی خبر ہونی چاہئے کہ تم اسی فتنے کے دوران جامِ شہادت نوش کرو گے۔“

”سبحان اللہ!..... سبحان اللہ!“ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کے ہونٹوں کا تبسم گہرا ہو گیا۔ پھر آپ نے اس مٹی کے پیالے سے پانی پیا اور اسے چٹائی پر سیدھا رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے اپنے مریدوں کو طلب کر کے فرمایا۔

”یہ فتنہ تاتاری بہت خوفناک اور جان لیوا ہے۔ اس لئے تم سب لوگ اپنے اپنے علاقوں کو واپس لوٹ جاؤ۔ خدا تمہیں انسان نما درندوں کی خوراک بننے سے محفوظ رکھے۔“

بعض مریدوں نے عرض کیا۔ ”ابھی تک آپ کی دعاؤں کے طفیل یہ شہر فتنہ گروں کی یورش سے محفوظ

ہے۔ میں یقین ہے کہ آپ کی حرید دعاؤں سے یہ ہنگامہ دور و گیر مستقل طور پر ختم ہو جائے گا۔“
”ہرگز نہیں!“ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے نہ جلال لہجے میں فرمایا۔ ”اس مہلت کو قیمت جانو
لہ خیر راستوں کے ذریعے اس شہر سے نکل جاؤ۔“

حضرت شیخ کا جواب سن کر مریدوں نے اپنی اپنی سواریاں تیار کیں اور پھر جرد و مرشد سے درخواست
کی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔
”بہتر یہی ہے کہ تم لوگ میری بات مان لو اور عافیت کے سائبان کی طرف چلے جاؤ۔ میرا خیال
چھوڑ دو کہ تمہارے شیخ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

آخر آپ کے تمام مرید خانقاہ سے رخصت ہو گئے۔ بس چند جاں نثار خدام رہ گئے تھے جو اپنے شیخ
کو تنہا چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں تھے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ نے اپنے ان خدمت گاروں کو مخاطب
کرتے ہوئے فرمایا۔

”کل تک ہمارے لئے گوشہ نشینی جائز تھی مگر آج حرام ہے۔ اللہ کا نام لے کر اٹھو اور کافروں سے
جہاد کرو۔ بہت سماع سن چکے، اب شمشیروں کی جھنکار سنو۔ بہت ورد کر چکے، اب سب سے بڑا اور
آخری وظیفہ پڑھو۔“

یہ کہہ کر حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ نے اپنا خرقہ پہنا، کمر باندھی اور کھوار لے کر خانقاہ سے باہر نکل
آئے۔ پھر اتنی بہادری سے لڑے کہ کئی تاناریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خانقاہ کے ایک گوشے میں
بیٹھ کر ضرب لا الہ سے نفس کے بتوں کو قتل کرنے والا صوفی جب میدان کارزار میں اترتا تو ایک پُر عزم
مجاہد بن گیا اور اس نے کئی کافروں کے سر قلم کر دیئے۔ یہ خونی معرکہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ابھی
حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کے بازوؤں کی توانائی باقی تھی کہ ناگہاں ایک تاناری کا زہر آلود تیر آپ
کے سینہ مبارک میں پھوست ہو گیا۔ حضرت شیخ نے اپنے ہاتھ سے اس تیر کو کھینچ کر نکال دیا مگر وہ خون
بہہ جانے کے باعث جانبر نہ ہو سکے اور سرخ کفن پہن کر خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ سماع سے بہت رغبت رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی
ڈھائی ماہ تک حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر رہے اور ایک عظیم جانباز صوفی کی صحبتوں سے فیض
یاب ہوئے۔



اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی بغداد تشریف لے گئے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی
کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اندازاً 553ھ میں حصول علم کے لئے
طویل سفر اختیار کیا تھا۔ اس وقت حضرت خواجہ کی عمر مبارک 17 سال تھی۔ غوث اعظم حضرت شیخ
عبدالقادر جیلانی نے 561ھ میں وفات پائی۔ اگر ماہ و سال اور اعداد و شمار کے آئینے میں واقعات کا
جائزہ لیا جائے تو حضرت غوث اعظم کے وصال کے وقت خواجہ معین الدین چشتی اپنی عمر کے پچیسویں

سال سے گزر رہے تھے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت خواجہؒ نے صرف سات سال کے مختصر عرصے میں تمام مذہبی اور دینی علوم میں مہارت حاصل کی۔ یہ قدرتِ خداوندی کا ایک کرشمہ بھی ہے اور اس مردِ مومن کی تربیت کا اہتمام بھی جسے مستقبل قریب میں مملکت ہند کی سلطانی کے عہدے پر فائز کیا جانے والا تھا۔

غوثِ اعظمؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے اور بڑی محبت سے اپنا مہمان بنایا۔ اسی زمانے میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اُداس بیٹھے تھے۔ غوثِ اعظمؒ کے مریدوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور تمام صورتِ حال اپنے مرشد کے گوش گزار کر دی۔

جواب میں غوثِ اعظمؒ نے فرمایا۔ ”مجھے خواجہ چشتیؒ کی اُداسی کا سبب معلوم ہے۔ بے شک! تم لوگ ان کے جسم کی تواضع کر رہے ہو مگر خواجہؒ کی روح بھوکی ہے۔ جب تک انہیں روحانی غذا نہیں ملے گی اس وقت تک وہ اسی طرح مغموم رہیں گے۔“

غوثِ اعظمؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اشارہ محفلِ سماع کی طرف تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے بیشتر بزرگ نہایت ذوق و شوق سے سماع سنتے تھے۔ اس کے برعکس غوثِ اعظمؒ کے قادر یہ سلسلے میں مکمل گریز کیا جاتا تھا۔ بڑی عجیب صورتِ حال تھی لیکن حضرت غوثِ اعظمؒ نے صرف حضرت خواجہؒ کی خاطر محفلِ سماع آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ بغداد کے انتہائی متقی اور پرہیزگار لوگوں میں سے ایسے افراد کا انتخاب کیا گیا جو نہایت خوش گلو تھے۔ پھر ایک علیحدہ مکان کا انتظام کیا گیا جس میں یہ محفلِ سماع منعقد ہونے والی تھی۔ اس کے بعد حضرت غوثِ اعظمؒ نے حاضرین سے فرمایا۔

”اگر کوئی اور شخص بھی سماع کی خواہش رکھتا ہو تو اسے بھی اطلاع کر دو۔“ یہ کہہ کر آپؒ اپنے مریدوں کے ساتھ خانقاہ میں تشریف لے گئے۔

ایک طرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ درس دے رہے تھے اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی محفلِ سماع جاری تھی۔ وعظ کہتے کہتے اچانک حضرت غوثِ اعظمؒ خاموش ہو گئے۔ مریدوں نے حیرت سے اپنے پیرو مرشد کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے قریب رکھا ہوا اپنا عصا اٹھایا اور اس طرح زمین پر ٹیک دیا جیسے آپؒ کسی چیز کو دبا رہے ہوں۔ مجلس وعظ پر گہرا سکوت طاری تھا۔ حاضرین نے اپنی زندگی میں پہلی بار حضرت غوثِ اعظمؒ کو اس حالت میں دیکھا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چہرہ مبارک کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت غوثِ اعظمؒ اپنے عصا پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ہر ذہن پریشان تھا اور ہر آنکھ حیران تھی۔ یہاں تک کہ حضرت غوثِ اعظمؒ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ عقیدت مند لرز اٹھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر بہت دیر یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ آپؒ معمول پر آ گئے۔ حضرت غوثِ اعظمؒ نے اپنا عصا ایک طرف رکھ دیا اور اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

”خواجہ معین الدین چشتی حلب وجد میں تھے۔ اس عاشق جانباز کو روکنا بہت مشکل تھا۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا اور ان کے جذب کی یہی کیفیت برقرار رہتی تو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں زمین بغداد ہی نہ الٹ جائے۔“

اکثر تذکرہ نگاروں نے غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے اس واقعے کو بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ شاید اس طرح وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی روحانی عظمتوں کا اظہار کرنا چاہتے تھے مگر جوش عقیدت میں ان لوگوں نے موقع اور محل کی نزاکتوں کو فراموش کر دیا۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کس مرد بزرگ کے مہمان تھے اور جس سرزمین پر یہ محفل سماع منعقد ہوئی تھی، اس کی روحانی حیثیت کیا تھی؟

حضرت خواجہ کے وجد و حال کے اثر سے سرزمین بغداد کا الٹ جانا، جذب و مستی کا تاثر تو ہو سکتا ہے مگر ہوش کی دنیا میں اس واقعے کی کوئی حیثیت نہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی جس متبرک خطے میں قیام فرماتے تھے، وہاں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی جیسے عظیم بزرگ نہ صرف موجود تھے بلکہ حضرت خواجہ کے میزبان بھی تھے۔ اس صورت حال میں یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی بے حال ہو جاتے اور سرزمین بغداد ڈمگمانے لگتی۔

دوسرے یہ کہ بغداد میں بڑے بڑے آئمہ اور مجتہد آسودہ خاک ہیں۔ ان ہی عظیم الشان ہستیوں میں امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی ”فقہ حنفی“ پر عمل کرتے تھے۔ اب صورت حال کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ حضرت خواجہ ظاہری طور پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مہمان تھے اور روحانی طور پر اپنے امام حضرت ابوحنیفہؒ کے۔ یہ تو عین مقام ہوش تھا مگر افسوس! خوش عقیدہ حضرات نے سرزمین بغداد کے احترام کو ملحوظ نہیں رکھا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ذات سے جذب و مستی کا ایک ایسا واقعہ منسوب کر دیا جس کی یہاں کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بغداد سے رخصت ہوتے وقت غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو کو اپنا خرقہ بھی مرحمت فرمایا تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی اپنی کتاب ”لطائف اشرفی“ میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے مگر بعض مورخین نے اس واقعے کی صحت سے انکار کیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ محض جوش عقیدت ہے ورنہ تاریخ کے آئینے میں یہ دونوں روایتیں بہت کمزور مجہول نظر آتی ہیں۔ جب یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت غوث اعظم سماع سے کوئی شغف نہیں رکھتے تھے تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے مہمان کے لئے ایک ناپسندیدہ شے کا اہتمام کرتے اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی جیسے مرد کامل سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی ایک ایسی خواہش کی تکمیل کے لئے جس کا کوئی یقینی شرعی جواز موجود نہیں، حضرت غوث الاعظم جیسے قطب الاقطاب کو اپنی روش تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتے۔ واضح رہے کہ ایک دوسرے کا

احترام کرنا بھی تصوف کی اعلیٰ ترین روایت ہے۔ بالفرض اگر حضرت غوث اعظمؒ رسم میزبانی کی خاطر اور اپنی عادت کے خلاف مجلس سماع کے انعقاد کا حکم بھی جاری کر دیتے تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا فوری ردِ عمل یہ ہوتا کہ آپ اس طرح اپنی ”روحانی غذا“ حاصل کرنے سے انکار کر دیتے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت امام ابوحنیفہؒ سفر میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ اتفاق سے آپؒ جس مسجد میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگ حضرت امام مالکؒ کے فقہ کے زیر اثر تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کسی پس و پیش کے بغیر مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو گئے اور پیش امام کی اتباع میں حضرت امام مالکؒ کے طریقے سے نماز ادا کی۔

نماز کے بعد جب حاضرین مسجد نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا کہ اپنا علیحدہ مسلک رکھتے ہوئے آپؒ نے فقہ مالکیؒ کے مطابق نماز ادا کیوں کی، تو جواب میں امام اعظمؒ نے فرمایا۔
”مجھ پر مالک بن انسؒ کا اتنا احترام تو واجب ہے کہ میں ان کی مملکت میں انہی کے قوانین پر عمل کروں۔“

اس واقعے کی روشنی میں ہمیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بھی اسی حسنِ عمل کی توقع رکھنی چاہئے تھی۔

بغداد کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ”تبریز“ تشریف لے گئے۔ ان دنوں وہاں مشہور بزرگ حضرت خواجہ ابوسعید تبریزیؒ قیام فرماتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حضرت شیخ ابوسعید تبریزیؒ بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ ان کے فیوض و برکات کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں مرید تھے مگر ستر مرید ایسے تھے کہ جن میں سے ہر ایک کو ولایت کا درجہ حاصل تھا۔ ان ہی مریدوں میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی شامل تھے جنہیں تصوف کی دنیا میں ہمہ گیر شہرت حاصل ہے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے حضرت شیخ ابوسعید تبریزیؒ کی خدمت میں بہت کم وقت گزارا مگر چند دنوں کی یہ صحبت بھی اپنی تاثیر میں اکسیر کا درجہ رکھتی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تبریز سے اصفہان تشریف لائے۔ وہاں اس وقت مشہور بزرگ حضرت شیخ محمود اصفہانیؒ موجود تھے۔ حضرت خواجہؒ کچھ دنوں تک حضرت شیخ محمودؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ ان ہی دنوں آپؒ نے ایک نو عمر لڑکے کو دیکھا جو درویشوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے وہ لڑکا حضرت شیخ محمود اصفہانیؒ کی ذات سے بہت متاثر تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ حضرت شیخؒ کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہو جائے۔ مگر جب اس نے حضرت خواجہؒ کو دیکھا تو ارادہ بدل لیا۔ یہاں تک کہ جب آپؒ اصفہان سے رخصت ہوئے تو وہ لڑکا بھی ساتھ ساتھ ہولیا۔

”صاحبزادے! آخر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“ ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس

لڑکے سے پوچھا۔

”آپ کی قربت کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“ لڑکے نے عرض کیا۔

”میں تو خود درویشوں کا خدمت گزار ہوں۔ تمہیں کیا دے سکتا ہوں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے لڑکے کو ٹالنے کے لئے فرمایا۔

”کچھ بھی سہی، مگر مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجئے۔“ لڑکے کا لہجہ عقیدت سے سرشار تھا۔ ”کون کیا ہے؟ یہ اللہ جانے۔ مگر میرے مخدوم تو آپ ہیں۔“

لڑکے کی وارفتگی کا یہ عالم دیکھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انکار نہ کر سکے اور اسے اپنے دامنِ محبت میں چھپالیا۔

بعد میں یہی لڑکا اولیائے ہند کا تاجدار بنا اور آج ساری دنیا اسے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام سے جانتی ہے۔



اصفہان کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ خرقان تشریف لے گئے۔ یہاں دو سال تک آپؒ نے وعظ فرمایا اور ہزاروں انسانوں کو راہِ راست پر گامزن کیا۔ پھر آپؒ یہاں سے ایران کے شہر استر آباد چلے گئے۔ ان دنوں استر آباد میں ایک مرد کامل حضرت شیخ ناصر الدینؒ قیام فرماتے تھے جن کا سلسلہ دو واسطوں سے مشہور صوفی حضرت یازید بسطامیؒ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شیخ ناصر الدینؒ کی عمر 122 سال تھی۔ حضرت خواجہ چشتیؒ نے ان بزرگ کے بڑے کمالات دیکھے۔ ان ہی کمالات سے متاثر ہو کر آپؒ کئی ماہ تک استر آباد میں قیام پذیر رہے اور حضرت شیخ ناصر الدینؒ سے فیض روحانی حاصل کرتے رہے۔

استر آباد کے بعد ہرات تشریف لائے۔ ہرات افغانستان کا ایک شہر ہے جو ایران کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دن بھر شہر میں گھومتے اور رات ہوتے ہی مشہور بزرگ حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہو جاتے۔ یہاں ساری رات ذکر و عبادت میں مشغول رہتے اور عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے۔

کچھ دن بعد آپؒ کے ذوقِ ریاضت کے چرچے پورے شہر میں سنائی دینے لگے۔ نتیجتاً مقامی باشندوں کا ایک ہجوم حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے گرد سمٹ آیا۔ ہزاروں ضرورت مند انسان اپنی عجیب عجیب درخواستیں لے کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ مخلوقِ خدا کی کثرت سے حضرت خواجہؒ کی عبادت میں خلل پڑنے لگا۔ مجبوراً آپؒ ہرات سے سبزوآر تشریف لے گئے۔



ابھی سبزوآر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیام کو چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مقامی باشندوں کی ایک جماعت بطورِ خاص آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ پھر ان ستم رسیدہ لوگوں نے بڑے دردناک لہجے میں اپنے حالات بیان کئے۔

”شیخ! ہم اہل شہر کی جانب سے آپ کے حضور ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ یہاں کا گورنر یادگار محمد ایک ظالم حکمران ہے۔ اس کے جابرانہ رویے سے مخلوق خدا تنگ ہے۔ لوگ رحم کی بھیک مانگتے مانگتے قبروں میں سو گئے مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اب تو ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کے ظلم و تشدد کی لے تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ آپ اس کے حق میں دعائے خیر فرمائیں کہ وہ ہدایت پا جائے۔ یا پھر بددعا کر دیں کہ اس کی ہلاکت سے اہل شہر کو نجات مل جائے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سبزوار کے باشندوں کی فریاد سنی اور انہیں یقین دلایا کہ خداوند ذوالجلال بہت جلد اس شہر کے رہنے والوں پر اپنے کرم کی بارش کرے گا۔

دوسرے دن حضرت خواجہ گورنر یادگار محمد کے دربار میں تشریف لے گئے۔ محل کے دروازے پر پہنچ کر آپؒ نے دربان سے کہا۔

”اپنے حاکم کو خبر کرو کہ اس سے درویش معین الدین ملنا چاہتا ہے۔“

دربان نے حاکم سبزوار کو اطلاع دی لیکن یادگار محمد کا غرور انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں دربان کو جواب دیا۔

”میرے پاس کسی بھوکے ننگے فقیر سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔“

دربان واپس آیا اور جیسے ہی اس نے یادگار محمد کے الفاظ دہرانے کی کوشش کی، اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ دربان نے گھبرا کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا، اس کی روح کانپنے لگی، ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کسی اجازت کے بغیر محل کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ دوسرے دربان کی نظر پڑی تو وہ آپؒ کو روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے دربان کا ہوا تھا۔ پھر محل میں ایک شور سا برپا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ یادگار محمد صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس کے کمرے میں داخل ہو گئے جہاں بیٹھ کر وہ سنگ دل حاکم انسانی تقدیروں کے فیصلے کرتا تھا۔ دربار میں ہلچل سی مچ گئی۔ حضرت خواجہؒ کے جلال معرفت کا یہ عالم تھا کہ جس پر نظر پڑتی، اپنے ہوش و ہوا اس کھو بیٹھتا۔ یادگار محمد نے آپؒ کو دیکھا تو خوف و دہشت سے کانپنے لگا۔

”میں وہی بھوکا ننگا فقیر ہوں جس سے تُو نے ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔“ گورنر کے دربار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارعب آواز گونجی۔ ”میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ تُو مجھے بندگانِ خدا کی خون میں ڈوبی ہوئی چند روٹیوں کی بھیک دے دے یا مخلوقِ خدا کے جسموں کو برہنہ کر کے چند گزر ریشمی کپڑا میرے حوالے کر دے۔ میں تو اس لئے آیا ہوں کہ حجت تمام ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ تیرے جسم اور تیرے اقتدار کو زمین نکل لے، حق کی نافرمانیوں سے باز آ جا۔ تُو جن پر ستم ڈھا رہا ہے، انہیں ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا۔ بساطِ ہستی پر تیری حیثیت ہی کیا ہے؟ تجھ سے پہلے بڑے بڑے ستم گر یہاں اپنی طاقت آزما چکے ہیں، انہیں تلاش کر کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے؟“

گورنر سبزوار کے دربار پر کسی قبرستان کا سا گمان ہو رہا تھا۔ حاضرینِ مردوں کی طرح ساکت تھے

اور یادگار محمد اپنی زرنگار کرسی سے اتر کر نیچے آنا چاہتا تھا مگر اس کا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جابر حاکم کے سامنے کلمات حق ادا کر کے واپس جا چکے تھے لیکن آپؒ کے الفاظ کی گونج ابھی تک باقی تھی۔

دوسرے دن سبزوار کے باشندوں نے اپنی آنکھوں سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا۔ یادگار محمد بارِ ندامت سے سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ آپؒ نے اس کے حق میں دعائے خیر کی اور اللہ کی زمین پر عدل و انصاف قائم کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی گورنر سبزوار بہت سے تحائف لے کر آیا تھا مگر آپؒ نے کوئی نذر قبول نہیں کی۔ تمام قیمتی سامان اور زر نقد ان محتاجوں میں تقسیم کر دیا جو یادگار محمد کے ظلم و تشدد کا شکار رہ چکے تھے۔

حامد بن فضل اللہ جمالی سولہویں صدی عیسوی میں ایک نامور سیاح، ادیب، شاعر اور صوفی گزرے ہیں۔ جمالی نے اپنی مشہور کتاب ”سیر العارفين“ میں مذکورہ بالا واقعے کو مختصر انداز سے بیان کیا ہے، جو بہر حال زیادہ معتبر ہے۔ جمالی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیام سبزوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں کا حاکم یادگار محمد ایک فاسق و فاجر انسان تھا۔ اس کی درشت مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ معمولی معمولی باتوں پر غضب ناک ہو کر بے گناہ انسانوں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ دل و دماغ پر گمراہی اور نفاق کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ روح اس قدر کثیف اور غلیظ تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض و عداوت رکھتا تھا اور ان مقدس ہستیوں کی شان میں توہین آمیز الفاظ استعمال کر کے سر محل قہقہے لگاتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ جن لوگوں کے نام صحابہ کرام کے ناموں پر رکھے گئے تھے، انہیں مستقل اذیتیں پہنچاتا رہتا تھا۔ قلب کی یہ سیاہی یادگار محمد کو اس مقام تک کھینچ لائی تھی جہاں پہنچ کر انسانی جسم میں شیطان حلول کر جاتا ہے۔

اس نے شہر کے باہر ایک باغ لگایا جسے وہ جنت کہہ کر پکارتا تھا۔ یہاں اکثر رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں۔ خوبصورت کنیریں اسے شراب پلاتیں اور ساری رات ہنگامہ ناؤ نوش برپا رہتا۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پہلے دن شہر سبزوار میں داخل ہوئے تو آپؒ نے اسی باغ کا رخ کیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بھی دربان موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہؒ باغ میں تشریف لے گئے اور یادگار محمد کی بھائی ہوئی حوض میں غسل فرمایا۔ حوض کا پانی خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔ غسل کے بعد آپؒ نے دو رکعت نماز ادا کی اور تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو گئے۔

ناگہاں ایک نیک دل شخص کی نظر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر پڑی۔ وہ تیزی سے آپؒ کے قریب آیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ”یہ ایک جابر و سفاک انسان کی تفریح گاہ ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اگر وہ ادھر آ گیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔“ دراصل اجنبی شخص حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقام سے ناواقف تھا۔ اس لئے ازراہ ہمدردی آگاہ کرنے چلا آیا تھا تا کہ آپ یادگار محمد

کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔

حضرت خواجہؒ نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ فرمایا۔

”تم بھی اس درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ جاؤ جو حوض کے نزدیک ہے۔“

اجنبی شخص آپؐ کی بات سن کر گھبرا گیا۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اتنے میں یادگار محمد کے کچھ ملازم نظر آئے۔ اجنبی شخص کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ حضرت خواجہ چشتیؒ نے اسے تسلی دی اور اپنے قریب بٹھالیا۔ خادموں نے حضرت خواجہؒ کو دیکھا اور پوچھنا چاہا کہ وہ بغیر اجازت باغ میں کیسے داخل ہو گئے؟ مگر آپؐ کے جلال کا یہ عالم تھا کہ ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ چپ چاپ حوض کے کنارے قالین بچھائے اور ان پر شراب کی صراحیاں رکھنے لگے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ کچھ دیر بعد یادگار محمد اپنی محفل نشاط آراستہ کرنے کے لئے باغ میں آنے والا ہے۔ اور پھر وہ بدکردار حاکم اپنے مصاحبوں کے ہمراہ باغ میں آ پہنچا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھتے ہی ملازمین پر برس پڑا۔

”یہ کون ہے اور ہمارے عشرت کدے میں کس کی اجازت سے داخل ہوا ہے؟“

ملازمین بدستور خاموش رہے مگر خوف و دہشت سے ان کے جسم لرز رہے تھے اور انہیں اپنا بھیانک

انجام بہت قریب نظر آ رہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ملازمین کی بے چارگی دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور یادگار محمد کے قریب پہنچ کر فرمانے لگے۔ ”فقیر اپنی مرضی سے یہاں آیا ہے، اسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔“

یادگار محمد نے ایک عارف کا کلام سنا مگر جیسے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے نظریں چار ہوئیں، اپنی قوت گویائی کھو بیٹھا۔ اس کے مصاحب بھی پتھروں کی طرح ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔

”یہ مجبور انسان بے قصور ہیں۔ یہ تیرے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔“ اتنا کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یادگار محمد کو نگاہ کرم سے دیکھا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور فرش پر اس طرح گر پڑا جیسے کوئی بت ضرب لا الہی سے زمین بوس ہو جائے۔ یادگار محمد کے بے ہوش ہوتے ہی اس کے تمام مصاحبوں اور خادموں نے بھی زمین پر اپنے سر رکھ دیئے۔

حضرت خواجہؒ نے اجنبی شخص سے فرمایا۔ ”حوض کا پانی لے کر اس کے منہ پر چھڑکو۔“ آپؐ کا اشارہ

یادگار محمد کی طرف تھا۔

اجنبی نے آپؐ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ چہرے پر پانی کی چھینٹیں پڑتے ہی یادگار محمد کو ہوش آ گیا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بالآخر مجبور ہو کر حضرت خواجہؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”کیا تُو اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔

”واللہ! میں اپنی تمام سیاہ کاریوں سے تائب ہو گیا۔“ یادگار محمد لی آواز لرز رہی تھی۔

”اب تیرے عقائد کا کیا حال ہے؟“ حضرت خواجہؒ نے دوبارہ فرمایا۔

”آپ کے طفیل میرا سینہ روشن ہو گیا۔“ اب یادگار محمد بچکیوں سے رونے لگا۔ ”خدا کی قسم! تمام اصحاب رسول ﷺ بزرگ و محترم ہیں۔ ان کے قدموں سے لپٹی ہوئی خاک بھی میرے لئے اکیر سے بڑھ کر ہے۔“ یادگار محمد بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں صحابہ کرام کی عظمت کا اعتراف کر رہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آگے بڑھے اور اپنا دست مبارک اس کی پشت پر رکھ دیا۔ سبزوار کا جاہر و سفاک شخص کسی ضعیف و ناتواں انسان کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں فرطِ عداوت سے جھکی ہوئی تھیں۔ حضرت خواجہؒ نے اسے وضو کرنے کا حکم دیا اور پھر دو رکعت نماز ادا کرنے کی ہدایت کی۔ اب وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

جب باغ سے رخصت ہونے لگے تو یادگار محمد نے آپؐ کا دامن تھام لیا اور درخواست کی کہ اسے ہمیشہ کے لئے شرفِ غلامی بخشا جائے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے بیعت سے سرفراز فرمایا۔ جیسے ہی آپؐ نے یادگار محمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ یہاں تک کہ جس قدر دولت تھی، پیر و مرشد کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ حضرت خواجہؒ نے جواباً فرمایا۔ ”سیم و زر کے اس انبار کو ان لوگوں میں تقسیم کر دو جو اب تک تیرے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔“

یادگار محمد نے ایسا ہی کیا۔ کھڑے کھڑے سب کچھ لٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام کینروں اور غلاموں کو بھی آزاد کر دیا اور دنیا سے اس قدر بیزار ہو گیا کہ اپنی دونوں بیویوں کو بھی طلاق دے دی۔

کچھ دن بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سبزوار سے ”حصار شادماں“ تشریف لائے تو یادگار محمد بھی آپؐ کے ہمراہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ پوری زندگی پیر و مرشد کی خدمت میں بسر کرے مگر حضرت خواجہؒ نے یادگار محمد کو اسی مقام پر لوگوں کی رشد و ہدایت کے لئے مقرر کیا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو کل تک خود گمراہ تھا، آج وہی شخص بندگانِ خدا کو آوازیں دے کر بلارہا تھا۔

”حی علی الفلاح (آؤ بھلائی کی طرف)“

اور لوگ اس کی صدا سن کر دوڑے چلے آ رہے تھے۔

یادگار محمد کا مزار آج بھی حصار شادماں میں موجود ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



حصار شادماں سے رخصت ہو کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بلخ تشریف لائے اور حضرت شیخ احمد محمندیؒ کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ اس تاریخی شہر کے نواح میں مولانا حکیم ضیاء الدین بلخی ایک عالم و فاضل شخص تھے۔ اسی مقام پر ان کا مدرسہ تھا اور یہیں وہ اپنے سینکڑوں شاگردوں کو درس دیتے تھے۔ حکیم ضیاء الدین ظاہری علوم میں درجہ کمال رکھتے تھے مگر انہیں تصوف پر اعتقاد نہیں تھا۔ اکثر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔

”تصوف ایک ہڈیاں ہے جو تیز بخار میں مبتلا لوگ بکا کرتے ہیں۔ یہ دیوانوں کی باتیں ہیں جن کا

کوئی مفہوم نہیں۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہمیشہ سفر میں تیرکمان ساتھ رکھتے تھے۔ ساتھ میں ایک خادم ہوتا تھا۔ آپ جب بھی آبادی سے جنگل کی طرف جاتے، شکار کرتے اور اسی گوشت سے روزہ افطار فرماتے۔ ایک دن بلخ میں بھی حضرت خواجہ نے ایک کلنگ کا شکار کیا اور اپنے خادم کو کباب بنانے کا حکم دے کر خود نماز میں مشغول ہو گئے۔ جب تک آپ نماز سے فارغ ہوئے، خادم کھانا تیار کر چکا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت حکیم ضیاء الدین ادھر سے سلام کرتے ہوئے گزرے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے انہیں بھی کھانے کی دعوت دی۔ حکیم صاحب بہت بھوکے تھے اس لئے انکار نہ کر سکے اور ایک فقیر کے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔

حضرت خواجہ نے بڑی محبت سے کلنگ کی ایک ران حکیم ضیاء الدین کے سامنے رکھی اور دوسری خود کھانے لگے۔ جیسے ہی حکیم ضیاء الدین نے بسم اللہ کہہ کر اس پرندے کا گوشت منہ میں رکھا ان کی حالت غیر ہو گئی۔ دل و دماغ کے سارے اندھیرے دور ہو گئے اور جب روح کی گہرائیوں میں تیز روشنی اُتری تو حکیم ضیاء الدین اسے برداشت نہ کر سکے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے آگے سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر حکیم صاحب کے منہ میں ڈال دیا۔ چند لمحوں میں ان کی حالت سنبھل گئی اور پھر بہت دیر تک حضرت خواجہ کے چہرہ مبارک کو دیکھتے رہ گئے۔ محویت کا یہ عالم تھا کہ ایک ساعت کے لئے بھی ان کی نظریں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے رُخ روشن سے نہیں ہٹتی تھیں۔

حضرت خواجہ نے تبسم فرماتے ہوئے پوچھا۔ ”مولانا! کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم نے میرے علم کا سارا سرمایہ لوٹ لیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔“ حکیم ضیاء الدین بلخی نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا اور پھر نہایت عقیدت سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بھی جواباً شدید محبت کا اظہار کیا اور حکیم صاحب کی درخواست قبول کر لی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی بیعت سے مشرف ہونے کے بعد حکیم ضیاء الدین نے اپنا سارا کتب خانہ دریا میں ڈال دیا اور ان کی یہ حالت ہو گئی۔

نمی دامنم کہ آخر چوں دم دیداری رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیش یاری رقصم

(میں اس راز کو نہیں جانتا کہ آخر دیدار کے وقت کیوں رقص کرنے لگتا ہوں مگر پھر بھی مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اپنے دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں)



بلخ کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے غزنی میں کچھ عرصے تک قیام فرمایا۔ یہاں پہنچ کر آپ ہدایت غیبی کے منتظر تھے۔ بالآخر آپ کی زندگی کی مبارک ترین ساعت آئی۔ جب ایک رات آپ نے سرور کائنات حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ رسول کرم ﷺ نے حضرت خواجہ معین

الدین چشتیؒ کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا اور ہندوستان جانے کی ہدایت فرمائی۔ آپؒ کو دربار رسالت ﷺ سے سلطان الہند کا خطاب پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا لیکن اذن سفر اب ملا تھا۔ آقا ﷺ کی اجازت پاتے ہی 586ھ میں لاہور تشریف لائے۔

برصغیر کے اس تاریخی شہر میں پہنچتے ہی سب سے پہلے مشہور بزرگ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ یہاں آپؒ نے چلہ کشی کی۔ (یہ چلہ گاہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک کے نزدیک آج بھی موجود ہے۔ اس متبرک مقام کو ایک بند کمرے کی صورت میں محفوظ کر دیا گیا ہے) حضرت سید علی ہجویریؒ سے فیض روحانی حاصل کر کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ملتان تشریف لے گئے۔

ملتان اس زمانے میں مشرقی علوم و فنون کا مرکز تھا۔ یہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پانچ سال تک قیام فرمایا اور سنسکرت زبان سیکھی۔ آپؒ کے لئے اس زبان کی تعلیم نہایت ضروری تھی۔ حضرت خواجہ عنقریب ہندو قوم کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرنے والے تھے۔ اس لئے مقامی زبان سے آگاہ ہونا ناگزیر تھا۔ ملتان سے آپؒ دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں مختصر قیام کے بعد حضرت خواجہ اجمیر شریف روانہ ہو گئے اور اسی خطہ زمین کو آپؒ نے اپنی تبلیغ کا مستقل مرکز بنایا۔



اجمیر کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ یہ شہر آگرہ کے مغرب میں تارہ گر کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا بنایا ہوا قلعہ ہے جس کے گرد فصیل موجود ہے۔ اجمیر ہندوستان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد دوسری صدی عیسوی میں راجہ ارجے پال نے رکھی تھی۔ آج جہاں یہ شہر آباد ہے، ماضی بعید میں اس مقام پر نہ تھا بلکہ جنوب میں پہاڑوں کے اندر بسایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آثار قدیمہ کے شائقین جب بھی اس تاریخی بستی کو دیکھنے جاتے ہیں تو انہیں قدیم اجمیر کے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں کچھ لوگوں نے یہاں کھدائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں بعض نادر و نایاب اشیاء دستیاب ہوئی تھیں۔ انجام کار یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ فی الواقع اس جگہ کوئی شہر آباد تھا۔ پھر ماہرین نے اسی شہر کو اجمیر کہہ کر پکارا تھا۔ محکمہ آثار قدیمہ کے مطابق انسانی آبادی بتدریج اپنی اصلی جگہ سے ہٹتے ہٹتے بہت دور چلی گئی۔ چنانچہ اجمیر سے نو دس میل کے فاصلے پر مغرب اور شمال میں ”اجیر آباد“ نام کی ایک بستی آج بھی موجود ہے۔ یہی بستی زمانہ قدیم میں ایک بڑے شہر کا درجہ رکھتی تھی۔ بعض تاریخی کتابوں میں اجمیر کو دیگر ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً جاتگیر، جیراگ، جیمیر، آدمیر اور جلو پور وغیرہ۔

راجہ ارجے پال نے کوہ اراولی کے دامن میں اجمیر کی بستی بسائی تھی اور اسے اپنا پایہ تخت قرار دے کر ایک مستقل سلطنت قائم کی تھی۔ جب سن قوم نے وسط ایشیا سے حملہ کر کے سرزمین ہند کو پامال کرنا شروع کیا اور پھر وہ لوگ تمام پنجاب اور راجپوتانہ پر چھا گئے تو اجمیر کے راجہ نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی وقت گزرتا رہا۔ آخر ساتویں صدی عیسوی میں اجمیر پر چوہان راجپوتوں کا قبضہ ہو

گیا۔ اگرچہ راجپوت حکمران گوجروں کے زیر اثر تھے لیکن پھر بھی اجمیر ایک آزاد ریاست تھی۔

دسویں صدی عیسوی میں تاریخ ہندوستان نے نیا رخ بدلا اور سلطان سبکتگین بت پرستوں کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ بظاہر مسلمانوں کی یلغار اتنی شدید نہیں تھی مگر درپردہ ایک خوفناک طوفان پرورش پا رہا تھا۔ آخر سلطان محمود غزنوی مشرکین پر قہر بن کر نازل ہوا۔ اس نے پتھر کے پجاریوں کو ایک لمحے کے لئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ جب بھی بے شمار دیوتاؤں کے ماننے والے اپنی زندگی کے لئے سکون کی چند سانسیں فراہم کرتے تھے، محمود غزنوی کسی برقی سوزاں کی طرح لپکتا تھا اور ان کے آسائش کدوں کو جلا کر خاک کر دیتا تھا۔ 1001ء میں سلطان نے اجمیر کو ذلت آمیز شکست دی۔ ہندو راجہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اجمیر پال کی زندگی کا یہ تلخ ترین تجربہ تھا۔ پھر اسے بیڑیاں پہنا کر سلطان محمود غزنوی کے سامنے لایا گیا تو وہ ندامت کے لہجے میں نہایا ہوا تھا اور کسی مجرم کی طرح اس کی گردن خم تھی، اجمیر پال زیادہ دن تک طوقِ رسوائی کا بار نہ اٹھا سکا۔ آخر ایک روز اس نے غلامانہ زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اجمیر پال کے بعد اس کا بیٹا آند پال تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے اجمیر، گوالیار، کاننجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے منتشر حکمرانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے مسلمانوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

گیارہویں صدی میں پسل دیو اجمیر کا راجہ تھا۔ (اسی راجہ کے نام پر آج بھی اجمیر میں تالاب بسلا موجود ہے) پسل دیو کے عہد حکومت میں اجمیر ایک طاقت ور ریاست بن کر ابھری تھی۔ 1024ء میں سلطان محمود غزنوی نے سومات پر حملہ کیا۔ فیصلہ کن جنگ سے پہلے اجمیر کے مقام پر راجہ پسل دیو سے بھی سلطان کی فوجوں کا مقابلہ ہوا تھا۔ محمود غزنوی جو پورے ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا تھا، ایک معمولی راجہ اس کے حملے کی تاب کس طرح لاسکتا تھا؟ آخر ایک عام سی خون ریزی کے بعد پسل دیو کو شکست ہوئی۔ پھر جب یہ ہندو حکمران اسیری کی حالت میں محمود غزنوی کے سامنے لایا گیا تو اس کی ذہنی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ پسل دیو کو یقین ہو چلا تھا کہ اب سلطان کی سیلابی قوت کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے وہ اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو کر حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ محمود غزنوی نے پسل دیو کو مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا۔ اگرچہ کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ مل چکی تھی لیکن پسل دیو زندگی کے ہنگاموں سے اتنا بیزار ہو گیا تھا کہ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مجبوراً محمود غزنوی نے سالار ساہو کو اجمیر کا حاکم بنا دیا۔ اس واقعے کے بیس سال بعد راجپوتوں نے دوبارہ قوت پکڑ لی جس کے نتیجے میں مسلمان حاکم کو قتل کر دیا گیا۔ آزادی کی فضاطی تو پسل دیو کے چھوٹے بھائی انا دیو کو اجمیر کا حکمران بنا دیا گیا۔ (آج بھی اجمیر میں تالاب انا ساگر اسی راجہ کے نام سے موسوم ہے)

انا دیو کے بعد پرتھوی راج چوہان تخت نشین ہوا۔ اسی راجہ کے عہد میں اجمیر نے غیر معمولی ترقی کی۔ پرتھوی راج ہی نے قلعہ تارہ گڑھ کی ناتمام عمارت کو مکمل کیا۔ اس قلعے کی بنیاد راجہ اجمیر پال نے رکھی تھی اور بالآخر پرتھوی راج نے اسے سنگ سرخ سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ قلعہ اپنی مضبوطی کے اعتبار سے پورے ہندوستان میں منفرد تھا۔ جنگی نقطہ نظر سے بھی یہ قلعہ دیارِ ہند میں مضبوط ترین سمجھا

جاتا تھا اور پورے علاقے میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں تھی۔ آج بھی قلعے کے باقی ماندہ کھنڈرات اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اجمیر اس زمانے میں برصغیر کے سب سے طاقت ور ہندو حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ اس علاقے میں ہندوستان کی سب سے زیادہ بہادر، جنگجو اور غیرت مند قوم راجپوت آباد تھی۔ راجپوتوں کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اس قوم کے افراد مر جانا پسند کرتے تھے لیکن انہیں کسی کے آگے سر جھکانا گوارا نہیں تھا۔ وقت پڑنے پر راجپوتوں کی عورتیں خود کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیا کرتی تھیں تاکہ ان کے شوہر پیچھے مڑ کر اپنے گھروں کی طرف نہ دیکھیں اور دشمن سے جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہو جائیں۔ یہ تھا اس بت پرست قوم کا مزاج جسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عنقریب خدا کی وحدانیت کا پیغام سنانے والے تھے۔



اس وقت دہلی اور اجمیر پر پرتھوی راجہ چوہان کی حکومت تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر کے نواح میں اپنی خانقاہ تعمیر کی۔ یہ خانقاہ تعمیر کی، گھاس پھوس کی ایک مختصر سی جھونپڑی تھی جس میں حضرت سلطان الہند قیام فرما تھے۔ نماز کا مصلیٰ، پانی کا برتن اور ایک جوڑا لباس۔ یہ تھا شہنشاہ معرفت کا کل سامان۔

کچھ دن تک مقامی راجپوتوں نے آپؐ کے قیام کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ شروع میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو بھی ایک ایسا جوگی اور سادھو سمجھا گیا جو مکتی (نجات) حاصل کرنے کے لئے دنیا کے ہنگاموں سے دور جنگل میں آ پڑا تھا۔ مگر جب کچھ لوگوں نے حضرت خواجہؒ کی جھونپڑی میں آ کر آپؐ کو قریب سے دیکھا تو یہ راز فاش ہوا کہ اس شخص کی وضع قطع ہندو سنیا سیوں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر چہ میگوئیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ راجپوت، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھنے کے لئے آتے اور دیکھتے ہی رہ جاتے۔ آپؐ کے نورانی چہرے میں ایک ایسی کشش تھی کہ جسے مقامی ہندو کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے لیکن ان کے دل خود بخود اس بزرگ ہستی کی طرف کھینچے چلے جا رہے تھے۔ راجپوتوں کو یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ حضرت خواجہؒ ہندو مذہب کی مختلف شاخوں میں سے کسی پر عمل کرنے والے نہیں تھے مگر چونکہ انہوں نے آج تک راجستھان کے علاقے میں کسی مسلمان کو عبادت کرتے نہیں دیکھا اس لئے حضرت خواجہؒ کے مذہب کی حقیقت جاننے سے قاصر تھے۔

پھر ایک دن کچھ راجپوت آپؐ کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ذکر الہی میں مشغول تھے۔ راجپوت خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہؒ اپنے اوراد و وظائف سے محروم ہو گئے۔

”تم لوگ یہاں کیسے آئے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوتوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی۔ راجپوت ایک غیر مقامی شخص کے لب و لہجے پر حیرت زدہ رہ گئے۔

”ہم کچھ دنوں سے یہاں جنگل میں تمہیں تنہا دیکھ رہے ہیں۔“ ایک راجپوت نے تیز لہجے میں کہا۔

اس کی آواز میں فطری سختی تھی۔ ”آج سوچا کہ تمہاری آمد کا سبب دریافت کریں۔ آخر تم کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟“

”کیا میری وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے؟“ حضرت خواجہؒ کی آواز نرم و شیریں تھی۔
 ”نہیں..... تم ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتے ہو؟“ دوسرے راجپوت نے کہا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے قومی غرور و اقتدار کی جھلک نمایاں تھی۔ ”پھر بھی ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارا کس قوم سے تعلق ہے اور تم اجمیر کیوں آئے ہو؟“

”میں مسلمان ہوں اور تمہیں اپنے اللہ کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔“ اب کی بار حضرت خواجہؒ کے لہجے سے جلالِ روحانی ظاہر ہو رہا تھا۔

مسلمان کا نام سن کر راجپوت چونک پڑے۔ ان کے ذہنوں میں بے شمار پرچھائیاں لرزنے لگیں۔
 ”کیا تم شہاب الدین غوری کی قوم سے تعلق رکھتے ہو؟“ ایک راجپوت نے نہایت تند و تیز لہجے میں پوچھا۔ اس کے الفاظ میں ساری دنیا کی حقارتیں اور نفرتیں سمٹ آئی تھیں۔

”ہاں! وہ بھی میرا دینی بھائی ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ راجپوتوں کے اس طرزِ گفتگو سے سمجھ چکے تھے کہ آئندہ چند لمحوں میں کیا پیش آنے والا ہے۔ اسی لئے آپ نے بھی اپنی آواز کو بلند رکھا۔

”وہ بھی تمہارے اللہ کا پیغام لے کر یہاں آیا تھا۔“ دوسرے راجپوت نے جواباً کہا۔ ”اس کا اندازِ گفتگو تحقیر آمیز تھا۔“ ہم نے غوری کو ذلت آمیز شکست دے کر وہ پیغام بھی غیر راجپوتوں کی زمین میں دفن کر دیا۔“

”اللہ کا پیغام کبھی دفن نہیں ہوتا۔“ حضرت خواجہؒ کے جلال میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ”تم سے پہلے یہاں کتنی قومیں آباد تھیں۔ آج تم ان کے نشان بھی تلاش نہیں کر سکتے۔ اگر ساری دنیا بھی ہلاک ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ غوری تو اپنے ہمراہ ایک لشکرِ جرار لے کر آیا تھا مگر میں تمہارے درمیان تنہا ہوں پھر بھی خدا کا پیغام سناؤں گا اور تمہیں وہ پیغام سننا ہوگا۔ اگر تم اپنے کان بند کر لو گے تو تمہاری سماعتوں میں شگاف پڑ جائیں گے۔ چاہے اس کشمکش میں پواہندوستان زیر و زبر ہو جائے لیکن وہ پیغام تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر کر رہے گا۔ جاؤ اپنے دروازے بند کر لو۔ دل و دماغ پر پھرے بٹھا لو مگر وہ روشنی کی لکیر آہنی دروازوں سے گزر کر بھی تم تک پہنچ جائے گی۔“

یہ ایک بڑا دعویٰ تھا اور ایک ایسے انسان کی طرف سے کیا گیا تھا جو ایک سرکش قوم کے حلقے میں تنہا تھا۔ راجپوتوں کو حضرت خواجہؒ کی یہ بے باکی ناگوار گزری تھی۔ ”ہم اپنی زمین پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے۔“ ایک راجپوت نے اپنے روایتی غرور کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

”یہ زمین اللہ کی ہے۔ اگر کسی انسان کی ملکیت ہوتی تو تمہارے باپ دادا موت کا ذائقہ نہ چکھتے اور اس زمین کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لہجہ پُر جلال تھا مگر گفتگو منطقی تھی۔ ”ہم سب اس زمین پر اللہ کے کرایہ دار ہیں اور عنقریب ایک ایک کر کے اس کی بارگاہ

میں حاضر ہونے والے ہیں۔“

”ہم کسی اللہ کو نہیں جانتے۔“ دوسرے راجپوت نے بگڑ کر کہا۔ ”زمین و آسمان پر ہمارے دیوتاؤں کی حکومت ہے۔ اگر تم یہاں مزید رہنا چاہتے ہو تو تمہارے قیام کی ایک ہی صورت ہوگی کہ تم آئندہ اپنی زبان پر اللہ کا نام نہیں لاؤ گے۔“ حق کے اظہار پر یہ پہلی پابندی لگائی گئی تھی۔

”میرے لئے تو اللہ ہی سب کچھ ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرہ مبارک پر ایک عجیب رنگ ابھر آیا اور دل اپنے خالق کی بارگاہ میں جھک گیا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جسے راجپوتوں کے سیاہ قلب محسوس نہیں کر سکتے تھے اور اندھی آنکھیں معرفت کے اس رنگ کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ”میں اسی کے نام سے زندہ ہوں اور تمہیں بھی اسی کے نام کی برکت سے زندہ کرنے آیا ہوں۔“

حضرت خواجہؒ کے اس جواب پر راجپوت خفا ہونے کی بجائے ہنس پڑے۔ ”تمہیں اپنی زندگی کے لئے نہ اچھی غذا میسر ہے، نہ لباس، نہ مکان۔ پہلے خود کو تو زندہ کر لو۔“ ایک راجپوت نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے تمسخر کرتے ہوئے کہا۔

”میری زندگی کے لئے ایک جوڑا لباس، چار گز زمین اور جنگلی پھل کافی ہیں۔ تم اپنی فکر کرو۔ اس شان و شوکت کے باوجود آنے والا وقت تمہاری سانسیں غصب کر لے گا۔ پھر تم اس دنیا میں داخل ہو جاؤ گے جہاں آگ کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔“ حضرت خواجہؒ نے درپردہ اپنے خدا کے پیغام کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کر دی تھی مگر ابھی یہ پیغام مبہم تھا۔

”آخر تم کس اللہ کی بات کرتے ہو؟“ ایک راجپوت نے کہا جو حضرت خواجہؒ کی مستقل بے باکی دیکھ کر جھنجھلا گیا تھا۔ ”تمہارے اللہ کا وہ کون سا پیغام ہے جو تم ہمیں سنانا چاہتے ہو؟“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہونٹوں پر ایک دلنواز تبسم ابھر آیا تھا۔ ”اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ہر شے سے بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کا کوئی باپ ہے۔“ حضرت خواجہؒ نے سنسکرت زبان میں سورہ اخلاص کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”اللہ کو سب سے زیادہ یہ بات ناپسند ہے کہ انسان اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی پوجا کرے۔ جن بتوں کو تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو، وہ کس طرح عبادت کے لائق ہو سکتے ہیں؟ یہ پتھر کی مورتیاں جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتیں۔ تم کس امید پر ان کے آگے اپنا دامن مراد پھیلاتے ہو۔ یہ تو خود تمہاری محتاج ہیں کہ تم انہیں ایک مقام سے اٹھا کر دوسرے مقام پر رکھتے ہو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بت خانہ اجمیر میں پہلی اذان دی تھی۔

راجپوت کی سماعتیں اس آواز سے نا آشنا تھیں۔ ایک درویش بے مایہ نے ان کے آباؤ اجداد کی رسموں کو پامال کر ڈالا تھا۔ راجپوت جوش غضب میں کھڑے ہو گئے اور ان کی تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ وہ اس مسلمان فقیر کو تہ تیغ کر دینا چاہتے تھے جو ان کے روبرو ان کے دیوتاؤں کی نفی کر رہا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پہلی بار بت پرستوں کو نگاہ کرم سے دیکھا۔ ایک برق سی لہرائی۔ دیوتاؤں کی طرح راجپوتوں کی شجاعت کے افسانے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ان کے جسموں پر لرزہ

طاری ہو گیا۔ شمشیریں ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور پھر وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے جنہوں نے آج تک میدان جنگ میں بھی کسی کو اپنی پشت نہیں دکھائی تھی۔

عجیب منظر تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے راجستھان کے صحراؤں میں، پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں، ہند کے قدیم بت خانوں میں اور گمراہ فرما رواؤں کے شاہی ایوانوں میں ایک ہی پیغام گونج رہا ہے۔

”حق آیا، باطل فرار ہو گیا اور باطل تو فرار ہونے ہی کے لئے ہے۔“

وہ راجپوت جو کچھ دیر پہلے تک اپنی روایتی غیرت و شجاعت کے افسانے بیان کر رہے تھے، حضرت خواجہ کی ایک نگاہ کرم کی بھی تاب نہ لا سکے اور اس طرح فرار ہو گئے جیسے کوئی طاقتور دشمن ان کے تعاقب میں ہو۔ راجپوت سپاہیوں میں کچھ دیر تک اس واقعے کا ذکر سرگوشیوں میں ہوتا رہا۔ پھر راجپوتوں کی وہی جماعت جو ایک بار پہلے بھی حضرت خواجہ کے جلالِ روحانی کی جھلک دیکھ چکی تھی، دوبارہ اس مردِ درویش کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوئی۔ کچھ ساتھیوں نے انہیں مسلمان درویش کی طرف جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہتے ہوئے اپنے گھر سے نکلے تھے کہ اس فقیر نے ہمارے دیوتاؤں کی توہین کی ہے، ہمارے آباؤ اجداد کی رسموں کو برا کہا ہے، ہم اس سے اس ذلت کا انتقام لیں گے۔

راجپوت اپنے جسموں پر تلواریں سجائے اور دلوں میں نفرت و حسد کا غبار لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ نمازِ ظہر ادا کر رہے تھے اور سجدے کی حالت میں تھے۔ راجپوت سرگوشیاں کرنے لگے کہ اسی بے خبری کے عالم میں حضرت خواجہ کا کام تمام کر دیا جائے۔ بت پرستوں نے اپنی شمشیروں کے قبضے پر ہاتھ رکھ دیئے مگر اس سے پہلے کہ وہ تلواروں کو بے نیام کرتے، حضرت خواجہ نے سجدے سے سر اٹھایا اور حالتِ قیام میں چلے گئے۔ راجپوت ایک مسلمان کے طرزِ عبادت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ کیسی پرستش تھی کہ پوجا کرنے والے کے سامنے نہ کوئی بت تھا اور نہ کسی طرف سے گھنٹیوں کی پر شور آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ تو اپنے دونوں ہاتھ باندھے اس طرح کھڑا تھا جیسے اس کا جسم ساکت ہو گیا ہو۔ بس ہونٹوں کو ہلکی ہلکی جنبش ہو رہی تھی جیسے وہ زیر لب کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قیام سے رکوع میں چلے گئے۔ راجپوت اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے تھے۔ پھر جیسے ہی حضرت خواجہ نے سجدہ ادا کرنے کے لئے زمین پر سر رکھا، تمام صنم پرستوں نے تلواریں کھینچنا چاہیں مگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ جسم کی پوری طاقت استعمال کرنے کے بعد بھی شمشیریں بے نیام نہ ہو سکیں۔ بے چارگی کا عجیب عالم تھا۔ ایک بار پھر نامعلوم سی خوف و دہشت راجپوتوں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جمانے لگی۔ کچھ دیر بعد حضرت خواجہ نے سلام پھیرا، دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھائے اور رسمِ بندگی سے فراغت پا کر راجپوتوں کی طرف دیکھا۔

”تمہاری مہمان نوازی کے لئے فقیر کے پاس جنگلی پھلوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اسی تبسمِ دلنواز کے ساتھ فرمایا جو آپ کی عادتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ راجپوت کسی پتھر

کے مجتہد کی مانند خاموش کھڑے تھے۔ ”بیٹھ جاؤ! اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو اطمینان سے جمع کر لو۔ پھر جس ارادے سے آئے ہو اس پر عمل کرو۔ فقیر تو خدا کی راہ میں سربکف گھر سے نکلا ہے۔ جہاں چاہو خنجر آزمائی کر دیکھو۔ درویشوں کے قتل کے لئے کسی بھی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کشف نے راجپوتوں کے سفاک جذبوں کا راز اس طرح فاش کر دیا تھا کہ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار ہوتے وقت تمام بت پرست چیخ رہے تھے۔

”یہ جادوگر ہے..... بڑا جادوگر۔“ راجپوتوں کے خیال میں ایک جادوگر ہی ان کے دل کا حال جان سکتا تھا۔

اس کے بعد راجپوتوں کی وہی جماعت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خدمت میں تیسری بار حاضر ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بت پرستوں کے پیروں میں ایک زنجیر ہے اور وہ دور تک بھاگنے کے باوجود ایک فقیر کے پاس واپس آنے کے لئے مجبور ہیں۔ دراصل حضرت خواجہؒ کے اخلاقِ عالیہ کی زنجیر تھی جس نے انتہائی سرکش قوم کو اپنے حلقوں میں جکڑ رکھا تھا۔ آخر سفیر اسلام کے پیغام کو چند نافرمانوں نے سنا اور پھر اپنی آبائی رسموں کو چھوڑ کر ایک ایسے مذہب میں داخل ہو گئے جہاں دنیا کی طرح نہ کوئی بندہ تھا اور نہ کوئی بندہ نواز، جس کی نگاہ میں اچھوت، کھتری، شودر، راجپوت اور برہمن سب برابر تھے۔

کفر کے قلعے میں پہلا شگاف پڑ گیا، مذہبی اجارہ داروں کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئیں۔ نجومیوں اور کاہنوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں کی گردش میں ایک عجیب سا انتشار برپا تھا۔ پراسرار علوم کے جاننے والے حیرت زدہ تھے اور آسمان کے بروج میں کسی خوفناک انقلاب کی تصویر صاف نمایاں تھی۔



حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قیامِ اجیر کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب آپؒ اس تاریخی مقام پر تشریف لائے تو شہر سے باہر ایک طویل و عریض میدان میں درخت کے نیچے قیام کیا۔ حضرت خواجہؒ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ یہ راجہ پر تھوی راج چوہان کے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ آپؒ کچھ دیر آرام فرماتے رہے۔ اچانک ساربانوں کی نظر ایک ایسے درویش پر پڑی جو اپنے ظاہری حلیے کے اعتبار سے تمام جوگیوں اور سادھوؤں سے مختلف تھا۔ ساربان تیزی سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قریب آئے اور انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگے۔

”اے شخص! تو کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ساربانوں کی تلخ کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں اللہ کا ایک بندہ ہوں اور اس پیڑ کے سائے میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔“

”یہ راجہ کے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہاں کوئی دوسرا قیام نہیں کر سکتا۔“ ساربانوں کے دلوں

پر آپ کی شیریں کلامی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

”یہ تو بہت بڑا میدان ہے۔ راجہ کے اونٹ بھی بیٹھ جائیں گے اور میں بھی ایک گوشے میں سما جاؤں گا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں اسلام کی وہی روایتی مٹھاس تھی مگر ساربان نہیں مانے۔ ان کی غیر مہذبانہ گفتگو اب گستاخی اور بے ادبی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حضرت خواجہؒ نے اپنا مختصر ترین سامان اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

”خیر! یہ درویش تو یہاں سے اٹھ جاتا ہے مگر اس کے بعد جو بھی یہاں آ کر بیٹھے گا، پھر اسے کوئی نہیں اٹھا سکے گا۔“

ساربانوں نے خوب تمسخر کیا، قہقہے لگائے مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان تمام باتوں سے بے نیاز ”انا ساگر“ کی طرف چلے گئے۔ (یہ اجمیر کے نواح میں ایک قدیم تالاب تھا جس میں اعلیٰ ذات کے ہندو غسل کیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی تحریک کی کامیابی کے بعد یہ تالاب مسلمانوں کے استعمال میں آنے لگا۔ انا ساگر حضرت خواجہؒ کے مزار مبارک سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ عرس مبارک کے دنوں میں اس پختہ تالاب کے کنارے کنارے ہزاروں مسلمان وضو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماضی کے حکمرانوں نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ ان کی جاگیر اتنی آسانی سے مسلمانوں کے قبضے میں چلی جائے گی)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تشریف لے جانے کے بعد شام کے قریب پر تھوی راج چوہان کے اونٹ گھاس چرتے ہوئے میدان میں داخل ہوئے اور رات گزارنے کے لئے زمین پر بیٹھ گئے۔ صبح ہوئی تو حسب معمول ساربان آئے اور جب انہوں نے اونٹوں کو اٹھایا تو وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکے۔ ساربانوں نے دوبارہ کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر تو بے گناہ جانوروں پر کوڑے برسنے لگے یہاں تک کہ بعض اونٹ لہو لہان ہو گئے لیکن زمین سے نہ اٹھ سکے۔ معصوم اور بے زبان حیوانوں پر تشدد کے سارے حربے آزمانے کے بعد ساربانوں کو مسلمان درویش کے الفاظ یاد آئے۔ اب انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ اسی فقیر کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی ساربانوں کے ہوش اُڑ گئے۔ پھر ان لوگوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سمرات پر تھوی راج چوہان کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔

جب ساربانوں نے دہلی اور اجمیر کے حاکم کو یہ واقعہ سنایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے اپنے خدمت گاروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”یقیناً تم لوگوں نے کوئی زیادتی کی ہوگی ورنہ یہ سادھو سنت تو بہت رحم دل ہوتے ہیں۔ اب یہ اونٹ اسی کی دعا سے اٹھیں گے، جس کی بددعا سے زمین نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ جاؤ! اس سادھو سے معافی مانگو۔“

پر تھوی راج چوہان کا حکم سنتے ہی ساربان، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تلاش میں نکلے۔ کچھ دیر بعد ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ”انا ساگر“ کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ ساربانوں

نے قریب جا کر دست بستہ معافی مانگی۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔
 ”اچھا جاؤ! زمین تمہارے اونٹوں کو چھوڑ دے گی۔“

ساربان اپنی مذہبی رسم کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاؤں چھو کر واپس آئے تو ان کے اونٹ میدان میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

یہ سرزمین اجمیر پر حضرت خواجہؒ کی دوسری کرامت تھی۔ جب ساربانوں نے اپنے ہم مذہبوں کے سامنے اس واقعے کو دہرایا تو مقامی باشندوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اس وقت سارا ہندوستان تو ہم پرستی اور جادوگری کے دام میں اسیر تھا۔ بیشتر لوگوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس کرامت کا ذکر سن کر کہا۔

”وہ بڑا ساحر ہے۔ آؤ چل کر اس کے ساحرانہ کمالات دیکھیں۔“

اجمیر کے باشندے قطار در قطار حضرت خواجہؒ کو دیکھنے کے لئے آنے لگے مگر وہاں نہ کوئی جادوگری تھی، نہ شعبدہ بازی۔ بس ایک شگفتہ مسکراہٹ تھی جس نے آگ میں پھول کھلا دیئے تھے۔ ایک خُسنِ اخلاق تھا جسے دیکھ کر پتھروں کے دل پانی ہوئے جاتے تھے۔ اس ہجوم میں وہ راجپوت بھی شامل تھے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قتل کی منصوبہ سازی کرتے کرتے فرار ہو گئے تھے مگر اب ان کے لئے تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ مجبوراً انہوں نے حضرت خواجہؒ کے قدموں پر اپنے سر رکھ دیئے اور ایک فقیر بے سرو ساماں کا چہرہ دیکھ کر باپ دادا کے عقائد کی جمع کردہ تمام دولت لٹا دی۔ اجمیر کے ہزاروں باشندوں نے اپنی آنکھوں سے یہ عجیب منظر دیکھا کہ صدیوں کے بت پرست چند لمحوں میں ایک نادیدہ ہستی کی وحدانیت پر ایمان لے آئے تھے۔ اگرچہ اس وقت ایمان لانے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کفر کی سنگی دیواریں چٹخنے لگی تھیں اور ان میں ایک ہلکا سا شگاف نظر آنے لگا تھا۔

پتھر کے پجاریوں کے لئے یہ بڑی لرزہ خیز خبر تھی۔ ہندوؤں کے لاکھوں معبود مل کر بھی ایک اُن دیکھے خدا کے پرستار کو نہ روک سکے۔ پروہتوں کے چہروں پر نفرتوں کی سرخی ابھر آئی۔ برہمن غضب ناک ہو گئے اور دیوتاؤں کے نام لیوا پیچ و تاب کھانے لگے۔ ہر طرف ایک حشر برپا تھا۔ ہندو دھرم کے رکھوالے مندروں میں جمع ہوئے، نیا مذہب قبول کرنے والوں کو طلب کیا گیا۔

”آخر تمہیں اس اجنبی کے پیغام میں کیا کشش محسوس ہوئی؟“..... یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف اشارہ تھا..... ”تم نے اس کے خدا کو دیکھا ہے؟..... یہ برہما، یہ وشنو، یہ شکر، تمہیں کوئی بھی نہ روک سکا۔ کیا تمہارے آباؤ اجداد دیوانے تھے؟“

”ہم کچھ نہیں جانتے۔“ مسلمان ہونے والے راجپوتوں نے بیک زبان کہا۔ ”ہمارے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ بولتا ہے، بس ہم اپنے دل سے مجبور ہو گئے۔“ یہ ایک مختصر سا جواب تھا، مگر برہمنوں کی منطقوں کے دفتروں پر بھاری تھا۔

پجاریوں نے ان سے مزید بحث نہیں کی۔ دنیا کے ہر جابرانہ نظام کی طرح نو مسلم راجپوتوں کو بھی

پیشکش کی گئی کہ اگر وہ اپنے گمراہ کن اور باغیانہ خیالات سے باز آ جائیں تو ان پر سیم وزر کی بارش کی جا سکتی ہے، مگر وہ مکمل باغی تھے، اس لئے برہمنوں کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنے مذہب میں دوبارہ داخل نہیں ہوئے تو زندگی کی ساری رعایتیں چھین لی جائیں گی اور ان پر راجستھان کی زمین تنگ کر دی جائے گی..... مگر باغی راجپوت ان دھمکیوں سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔ بالآخر انہیں برادری سے خارج کر دیا گیا۔

کچھ عاقبت نااندیشوں نے راجہ پرتھوی راج چوہان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ باغیوں کی اس مختصر تعداد کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے اسلام کے خارے سے نجات حاصل کر لی جائے۔ پرتھوی راج فطری طور پر ایک ذہین اور مدبر حکمران تھا۔ اس نے مشیروں کی یہ تجویز قبول نہیں کی۔ اس علاقے میں تمام راجپوت کسی نہ کسی عنوان سے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ اگر باغی راجپوتوں کو قبول اسلام کے جرم پر تہ تیغ کر دیا جاتا تو یہ ایک انتہائی سزا ہوتی جس کے نتیجے میں قتل ہونے والوں کے رشتہ داروں پر برے اثرات مرتب ہوتے اور پھر اس طرح متحد راجپوتوں کی صف میں شگاف پڑ سکتا تھا۔ اس مصلحت کے پیش نظر پرتھوی راج نے باغیوں کے قتل سے گریز کیا اور ان پر معاشی پابندیاں عائد کر دیں۔

اب خدائے واحد کے نام لیوا اپنے معاشرے کے لئے اجنبی ہو کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے قدموں میں آ پڑے تھے۔ جب کبھی انہیں اپنے گھروں کے آزاد ماحول کی یاد آتی تو وہ اداس ہو جاتے۔ حضرت خواجہ اپنے ہم مذہبوں کی یہ حالت دیکھ کر فرماتے۔

”تم لوگوں کا یہ اضطراب محض عارضی ہے۔ جو اللہ کی راہ میں گھر سے بے گھر ہوئے یا ستائے گئے، وہ عنقریب عظیم الشان فتح سے ہم کنار ہوں گے ذلت آمیز شکست تمہارے دشمنوں کا مقدر بن چکی ہے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے، آسمان کا فیصلہ زمین پر نازل ہونے ہی والا ہے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی یہ اثر انگیز تقریر سن کر راجپوتوں کے بے قرار دل ٹھہر جاتے اور وہ خدائے لاشریک کا نام لے کر ایک ایسی لذت کا احساس کرنے لگتے جس سے وہ کل تک آشنا نہیں تھے۔ پرتھوی راج چوہان اور دیگر امراء سلطنت کے سخت احکام کی بنیاد پر مسلمان ہو جانے والے راجپوتوں کے لئے معاشی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا گیا تھا۔ حکومت اور برسر اقتدار طبقے کا خیال تھا کہ باغی راجپوتوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرنے کے بعد وہ ان لوگوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو حضرت خواجہ کی کرامت سے بہت زیادہ متاثر نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جسموں پر پابندیاں لگیں تو دل پہلے سے زیادہ آزاد ہو گئے۔ زبانوں پر مہریں لگائی گئیں تو ذہن کچھ اور زیادہ سرکش ہو گئے۔

جاسوسوں نے پرتھوی راج کو خبر دی کہ معتب راجپوت نیا مذہب قبول کرنے کے بعد بہت زیادہ خوش نظر آتے ہیں۔

”پابندیاں مزید سخت کر دی جائیں۔“ پرتھوی راج چوہان نے دوسرا حکم جاری کیا۔

اس دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چند خادم ملتان اور لاہور چھوڑ کر اجمیر چلے آئے تھے۔ نتیجتاً خدا پرستوں کی تبلیغ نے نیارنگ اختیار کر لیا تھا۔ پرتھوی راج کی طرف سے اجازت پاتے ہی وزیر مملکت نے نئی منصوبہ سازی کی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ایک خادم اپنے پیر و مرشد کے وضو کے لئے انا ساگر سے پانی لینے گیا تو وہاں خلاف معمول راجپوت سپاہیوں کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ حضرت خواجہؒ کے خدمت گار نے ان لوگوں کو یکسر نظر انداز کر کے تالاب سے پانی بھرنا چاہا، لیکن پرتھوی راج کے سپاہیوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا۔

”اب تم اچھوت لوگ اس تالاب کو اپنے گندے ہاتھوں سے ناپاک نہیں کر سکتے۔ اگر پانی چاہتے ہو تو کوئی اور جگہ تلاش کرو۔“

”پانی تو جانوروں پر بھی بند نہیں کیا جاتا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔

”ہاں..... ہم لوگ جانوروں پر پانی بند نہیں کرتے۔ مگر تم حیوانوں سے بھی بدتر ہو۔“ پرتھوی راج چوہان کے سپاہیوں نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں حضرت خواجہؒ کے خدمت گار کو جواب دیا۔

اتمام حجت کے طور پر آپؒ کے خادم نے راجپوت سپاہیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ طاقت اور اکثریت کے نشے سے سرشار تھے اس لئے انسانیت اور تہذیب کی زبان سے نکلنے والا کوئی لفظ بھی ان کے دماغوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ خادم مجبوراً واپس چلا گیا اور اپنے پیر و مرشد سے تمام واقعہ بیان کیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے خادم کی گفتگو غور سے سنی اور کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ مسلمانوں کی یہ مختصر سی جماعت اپنے شیخ کی خاموشی پر دم بخود تھی، انہیں بھی اس بات سے شدید اذیت پہنچی تھی کہ پرتھوی راج پست حرکتوں پر اتر آیا تھا اور جس کے نتیجے میں ان کے پیر و مرشد وضو کے پانی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ راجپوت مسلمان اپنی ناطاقتی اور بے سرو سامانی پر چیخ و تاب کھا کر رہ گئے۔ حضرت خواجہؒ نے اپنے عقیدت مندوں کو صبر کی تلقین فرمائی، پھر اسی خادم کو جو کچھ دیر پہلے پانی لینے جا چکا تھا، اپنے استعمال کا برتن دیتے ہوئے کہا۔

”راجہ کے سپاہیوں سے کہنا کہ آج اس مختصر سے برتن میں پانی بھر لینے دیں، اس کے بعد ہم کوئی دوسرا انتظام کر لیں گے۔“

خادم حکم پاتے ہی دوبارہ ”انا ساگر“ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب راجپوت سپاہیوں نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو وحشیوں کی مانند قہقہے لگانے لگے۔ خادم نے قریب پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ دہرا دیئے۔ خادم کا لہجہ ایک درخواست گزار کا لہجہ تھا اس لئے راجپوت کچھ دیر تک مسلمانوں کی بے چارگی اور اپنی برتری کے احساس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر ایک سپاہی نے بڑی حقارت سے کہا۔

”جا..... آج تو تجھے ہم نے پانی کے چند قطرے بخش دیئے، مگر کل ادھر کا رخ نہ کرنا۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا خادم بڑے سکون سے تالاب کے کنارے پہنچا اور اس نے اپنے پیرومرشد کے استعمال کا برتن پانی سے بھر لیا۔ چند لمحوں کی بات تھی۔ راجپوت سپاہیوں کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے خادم پر بھی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ”انا ساگر“ کا پانی ایک چھوٹے سے برتن میں سمٹ آیا تھا۔ کچھ دیر پہلے جس پانی پر طاقت کے ذریعے پابندیاں لگائی جا رہی تھیں، اس کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی۔ راجپوت سپاہی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس تالاب کو دیکھ رہے تھے جس سے کل تک پورا علاقہ سیراب ہو رہا تھا اور اب اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں تھا۔ راجپوتوں کے بقول یہ جادوگری کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ اگرچہ راجستھان کی پوری سرزمین ساحروں سے بھری ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہندو ساحروں کے بقول مسلمان فقیر کا جادو ان سب پر حاوی تھا۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر پرتھوی راج کے سپاہیوں پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا خادم بھی لرزتے قدموں سے واپس آیا اور کانپتے لہجے میں تمام واقعہ سنانے لگا۔ آج اسے پہلی بار اپنے پیرومرشد کی روحانی طاقت کا اندازہ ہوا تھا۔

”وہ کیسی ناپائیدار چیز پر جھگڑا کر رہے تھے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے انتہائی پُر جلال لہجے میں خدا پرستوں کی اس مختصر سی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جس تالاب کا پانی قدرت خداوندی سے اس فقیر کے کوزے میں سمٹ آیا ہے، وہ خشک بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس کائنات کا خالق سمندر کو بھی سوکھ جانے کا حکم دے تو اسے اس کے ارادے سے کون باز رکھ سکتا ہے؟“

حضرت خواجہ کی ایمان افروز گفتگوں کر مسلمان راجپوتوں کے افسردہ چہرے شاداب ہو گئے تھے، ہونٹوں کی گم شدہ مسکراہٹ لوٹ آئی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے پرتھوی راج چوہان کی طاقت و رفوجوں سے اپنی شکست کا انتقام لیا ہو۔

پورے اجمیر میں ہنگامہ برپا تھا۔ جس نے بھی ”انا ساگر“ کے خشک ہونے کی خبر سنی، حیران رہ گیا۔ کوئی بھی اس محیر العقول واقعہ پر یقین کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا لیکن جب شہر کے باشندے تالاب کے کنارے جمع ہوئے تو انہیں اس خبر پر اعتبار کرنا پڑا کہ صدیوں پرانا ذخیرہ آب ختم ہو چکا ہے۔ جن سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے ”انا ساگر“ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے کوزے میں سمٹتے دیکھا تھا، وہ وحشت زدہ سے پرتھوی راج کے سامنے کھڑے تھے اور گریہ و زاری کے انداز میں اپنے حکمران سے کہہ رہے تھے۔

”سمراٹ! ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکے۔ لیکن اس کوتاہی میں ہمارے ارادوں کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ سادھو اتنا بڑا جادوگر ہے کہ ہماری شمشیریں تک بے نیام نہ ہو سکیں، ہمارے ہوش و حواس، دست و بازو، جوش و خروش، عزم و شجاعت سب اس کے طلسم کے زیر اثر تھے۔ ہم اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکے۔ اے راجپوتوں کے عظیم سردار! ہمیں معاف کر دیجئے کہ ہم بے تصور ہیں۔“

راجپوتوں کی آواز خوف و دہشت سے لرز رہی تھی۔

خود پر تھوی راج بھی یہ اطلاع پا کر سر اسیمہ ہو گیا تھا، مگر وہ ان سپاہیوں کی موجودگی میں اپنی فکر و پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر انا ساگر پر متعین فوجیوں کو سخت ست کہہ کر دربار سے رخصت کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اپنے چند رازدار مشیروں کو لے کر خلوت میں چلا گیا۔ پر تھوی راج ایک مسلمان فقیر کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف تھا۔ اس نے فوری طور پر اس مشکل کا حل تلاش کرنا تھا، لیکن مشیروں نے اسے صبر و ضبط کی تلقین کی۔ اُن کے خیال میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مقابلہ صرف ہندوستان کے بڑے جادوگر ہی کر سکتے تھے اور اس واقعہ سے چشم پوشی کرنی چاہئے تھی تاکہ مسلمان فقیر اپنی روحانی طاقت کے سلسلے میں حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو جائے اور پھر عالم بے خبری میں ساحروں کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ پر تھوی راج کو اپنے مشیروں کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے فوری طور پر حضرت خواجہؒ کی خدمت میں معززین شہر کا ایک وفد روانہ کر دیا۔

اجمیر کے چند سربراہ آوردہ افراد نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے سپاہیوں کے گستاخانہ رویے پر معافی مانگی اور اس کے ساتھ درخواست کی کہ انا ساگر کی سابقہ حالت بحال کر دی جائے ورنہ بہت سے انسان پیا سے مر جائیں گے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کافروں کی اس شرارت سے باخبر تھے، مگر آپؒ نے اسلام کی رواداری اور صلہ رحمی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ تو حق کے نافرمانوں کے لئے ایک ہلکی سی تنبیہ تھی ورنہ ہمارا مذہب تو کسی کتے کو بھی پیاس سے تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ یہ کہہ کر آپؒ نے خادم کو حکم دیا۔ ”برتن کا پانی تالاب میں واپس ڈال دیا جائے۔“

خادم اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل کے لئے انا ساگر کی طرف روانہ ہوا اور آپؒ نے راجپوت قوم کے نمائندوں سے دوبارہ فرمایا۔ ”قدرت بار بار سرکشوں کو مہلت نہیں دیتی، اس سے پہلے کہ تمہارے آباؤ اجداد کی زمین تم پر تنگ ہو جائے، بت پرستی کو چھوڑ کر خدائے واحد پر ایمان لے آؤ ورنہ آگ دوزخ کی بھڑکتی ہے سزا کے واسطے۔“

راجپوتوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی احساسِ ندامت نہیں تھا، دراصل وہ حضرت خواجہ چشتیؒ سے نظر ملاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ بھی اپنے دوسرے ہم مذہبوں کی طرح مسلمان فقیر کے جادو کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت خواجہؒ اپنا فرض پورا کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر فساد برپا کرنے والوں نے محبت کا یہ پیغام سنا، مگر ان کی نفرتیں کچھ اور شدید ہو گئیں۔ پھر وہ اپنے سینوں میں سازش و انتقام کی آگ روشن کئے ہوئے چلے گئے۔



پھر جب وہ لوگ واپسی میں انا ساگر کے قریب سے گزرے تو پہلے کی طرح پورا تالاب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بت پرستوں کے ذہن جلنے لگے اور وہ اسی حالت میں پر تھوی راج کے سامنے حاضر ہوئے اور

اپنے حکمران کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ دوبارہ تنہائی میں مشورے ہونے لگے۔ پھر بہت غور و فکر کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے مقابلے کے لئے شادی دیو کا انتخاب کیا گیا۔ شادی نام کا ایک دراز قامت اور تنومند جادوگر اجمیر کے سب سے بڑے مندر کا پجاری تھا۔ اپنے طاقتور جسم اور ساحرانہ کمالات کے باعث ایک دیو کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آس پاس کے علاقوں میں شادی دیو کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پرتھوی راج نے اس نازک مرحلے پر شادی دیو کو طلب کر کے ہندو مذہب کو درپیش خطرات کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس سے درخواست کی کہ اپنے جادو کی بے پناہ طاقت کے سہارے دیوتاؤں کی بستی کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کر دے۔

شادی دیو نے اپنے سفلی علوم کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا روحانی مقام جاننے کی کوشش کی۔ کئی دن کی محنت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان فقیر کو آسانی سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ شادی دیو نے اپنے تابع شیاطین کو مخاطب کیا۔ ایک شیطان نے اس سے سرگوشی کی۔ شادی دیو کے چہرے پر مسرت و شادمانی کے گہرے سائے رقص کرنے لگے۔ اس نے پرتھوی راج کو خوشخبری سنائی کہ بالآخر وہ مسلمان درویش پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پرتھوی راج نے چین کی سانس لی اور شادی دیو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

شادی دیو نے مختصر سے عرصے میں اپنے چیلوں کو نئے منتر سکھائے اور پھر ساحروں کی فوج لے کر اس طرف بڑھا جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ قیام فرماتے تھے۔ جیسے ہی جادوگروں کی یہ جماعت حق پرستوں کے قریب پہنچی تو وہ راجپوت جوئے نئے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، کچھ گھبرا سے گئے۔ ان لوگوں نے ڈرتے ڈرتے حضرت خواجہؒ سے کہا۔ ”وہ آرہے ہی۔ انہیں روکیے۔“

”وہ پہلے بھی آئے تھے اور ناکام ہو کر چلے گئے تھے..... اب ان کی دوبارہ آمد سے ہمارے کاموں میں کیا خلل پڑے گا؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اطمینان سے فرمایا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

شادی دیو نے اپنا جنگی منصوبہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی بہت دور سے طلسم پڑھتے ہوئے حضرت خواجہؒ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک خاص فاصلے پر تمام جادوگر ٹھہر گئے۔ شادی دیو نے ان سے آگے بڑھنے کے لئے کہا مگر اس کے چیلے یہ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے آگے جانے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ شادی دیو مسلمانوں پر حملہ آور ہو اور وہ اس کی مدد کے لئے پچھلی صف میں رہ کر اپنے جادو کا استعمال کرتے رہیں۔ شادی دیو اپنی ساحرانہ قوت کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے وہ بے اختیار آگے بڑھا اور ساتھ ہی اپنے پیروکاروں کو ہدایت بھی کرتا گیا کہ وہ مسلسل منٹروں کا ورد کرتے رہیں۔ اس طرح جو مسلمان اس کے حمسے سے فرار ہو کر اس طرف آئے گا، جل کر راکھ ہو جائے گا۔ عجیب منصوبے تھے اور عجیب خوش فہمیاں تھیں۔

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال
(میں کس خیال میں الجھا ہوا ہوں اور آسمان کیا سوچ رہا ہے)

شادی دیو حلتِ قہر میں اپنے ساحرانہ کمالات کا مظاہرہ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں اور منہ سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ ایک پُر ہول منظر تھا اور اس کی ہولناکی میں شادی دیو کی گرج دار آواز نے مزید اضافہ کر دیا تھا۔

”مسلمان سن لیں کہ ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ جب تک میں خاموش رہا، تم عافیت میں رہے..... مگر آج میں نیند سے جاگ گیا ہوں اور میری یہ بیداری دیوتاؤں کے دشمنوں کو ہلاک کر ڈالے گی۔“

شادی دیو اس قسم کی لاف زنی کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا لیکن ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ اچانک رک گیا۔ اس کے منہ اور آنکھوں سے نکلنے والے شعلے یکایک بجھ گئے۔ شادی دیو چند لمحوں تک حیرت زدہ کھڑا رہا۔ پھر اس نے چیختے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اپنے جسم کو جنبش تک نہ دے سکا۔ دوسری بار چیخنا چاہا تو زبان بھی ساکن ہو گئی۔ شادی دیو کے معاون جادوگر اپنے گرو کی اس خاموشی کو کسی نئی حکمت عملی سے تعبیر کر رہے تھے اور خود زور زور سے ان منستروں کو پڑھ رہے تھے جن کی انہیں ایک طویل عرصے تک مشق کرائی گئی تھی۔

اس دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ جب مریدوں نے شادی دیو اور اس کے ساتھیوں کے حملے کی اطلاع دی تو آپؒ اپنی خانقاہ سے باہر تشریف لائے۔ کچھ فاصلے پر شادی دیو ساکت و جامد کھڑا تھا۔ حضرت خواجہؒ نے اسے ایک نگاہِ جلال سے دیکھا۔

شادی دیو کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بلند آواز میں ”رحیم، رحیم“ پکارنے لگا۔ صدیوں سے ”رام رام“ کرنے والی بت پرست جماعت کا ایک باکمال فرد اپنی آبائی زبان بھول گیا تھا اور ایک ایسے کلمے کو بار بار دہرا رہا تھا جس سے کچھ دیر پہلے تک اس کے ہونٹ نا آشنا تھے۔

جب شادی دیو کے شاگردوں نے اپنے استاد کا یہ حال دیکھا تو غصے سے بے قابو ہو گئے اور شدید وحشت کے عالم میں ہڈیاں بکنے لگے۔ پھر انہیں جس قدر نازیبا الفاظ یاد تھے وہ سب کے سب شادی دیو کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیئے۔ شادی دیو بہر حال اپنی قوم کا معزز ترین فرد تھا۔ اس لئے دشنام لمرازی برداشت نہ کر سکا۔ آگے بڑھنے کی بجائے وہ پیچھے کی طرف پلٹا اور جو لکڑی اور پتھر اس کے سامنے آیا وہ اپنے شاگرد جادوگروں پر برسانے لگا۔ یہ بڑی خوف ناک تبدیلی تھی۔ اہل باطل کی ساری تدبیریں خود انہی پر الٹ دی گئی تھیں۔ شادی دیو نے اپنے کئی ساتھیوں کو ہلاک کر ڈالا اور جو باقی بچے تھے وہ فرار ہو گئے۔

شادی دیو کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کی بگڑتی ہوئی کیفیت دیکھی تو اپنے ایک خادم کے ہاتھ پانی کا ایک پیالہ بھر کر بھیجا۔ جیسے ہی شادی دیو نے وہ پانی پیا، کفر کی تاریکیاں دل و دماغ سے مٹ گئیں اور وہ بڑے عقیدت مندانہ انداز میں حضرت خواجہؒ کی قدم پائی سے سرفراز ہوا۔ خدا پرستوں کی صف میں ایک اور کلمہ گو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف کفر کے شعلے میں ایک اور گہرا اشکاف پڑ گیا تھا۔



جب پرتھوی راج چوہان نے ہندو دھرم کے رکھوالوں کی تازہ شکست کا احوال سنا تو اس کے ماتھے پر بے شمار شکنیں ابھر آئیں اور وہ قہر آلود لہجے میں اپنے مشیروں سے کہنے لگا۔

”میں آخر کب تک اس آفتِ ناگہانی کو برداشت کرتا رہوں گا۔ اگر پہلے ہی میری تجویز پر عمل کر لیا گیا ہوتا تو آج ذلت و رسوائی کے یہ مناظر سامنے نہ آتے۔ بس اب میرے صبر و ضبط کی انتہا ہو چکی ہے۔ اسی وقت فوج کو حکم دو کہ ان مٹھی بھر بھکاریوں کا نام و نشان مٹا کر راجپوتوں کی دھرتی کو پاک کر دے۔“ پرتھوی راج اس طرح بول رہا تھا جیسے میدانِ جنگ میں اعلیٰ نسل گھوڑا زخمی ہو کر بے لگام ہو جائے۔

مشیروں نے بڑے تدبیر سے پہلے اپنے حکمران کا غصہ ٹھنڈا کیا اور پھر مسلمانوں سے نجات پانے کے لئے نئی تجویز پیش کی۔

”شادی دیو کے ذریعے ہم نے ایک جنگ کا آغاز کیا تھا۔ ابھی یہ معرکہ اپنے انجام کو نہیں پہنچا ہے۔ ابھی ہمارے ترکش میں کئی زہریلے تیر باقی ہیں۔ جب تک جوگی بے پال زندہ ہے، ہمیں اپنی فتح سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔“

جوگی بے پال کا نام سنتے ہی پرتھوی راج کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جوشِ غضب میں اس عظیم جادوگر کو بھول گیا جس سے خود اسے بھی بڑی عقیدت تھی۔ پرتھوی راج نے فوری طور پر بے پال سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور کچھ دیر بعد ہی چند تیز رفتار سپاہی اپنی امید کے آخری مرکز کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جوگی بے پال، اجمیر کے مضافاتی علاقے میں رہتا تھا۔ اسے سحر و طلسم میں وہ مہارت حاصل تھی کہ پورے ہندوستان میں بے پال کا کوئی دوسرا حریف موجود نہیں تھا۔ ہزاروں جادوگر اس کے شاگرد تھے۔

جوگی بے پال جیسے ہی پرتھوی راج کے کمرے میں داخل ہوا، اجمیر کا حکمران اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قدم چومنے کے لئے آگے بڑھا۔ بے پال نے جواب میں پرتھوی راج کو صحت و زندگی اور مسرت و کامرانی کا آئینہ دکھایا۔ پھر اس نے بے وقت طلبی کا سبب پوچھا۔ پرتھوی راج نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے شادی دیو کی شکست تک کے واقعات تفصیل سے سنا دیئے۔ جوگی بے پال کو حضرت خواجہؒ کی روحانی عظمت کا اندازہ نہیں تھا اس لئے نہایت کبر و غرور کے انداز میں کہنے لگا۔

”پورے ہندوستان میں میرے علم کی حکومت ہے۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے جسے چاہوں اسے عہدے سے معزول کر دوں اور جسے چاہوں اقتدار سونپ دوں۔ مجھے خود اپنی غفلت پر افسوس ہے کہ میں گرد و پیش سے بے خبر رہا اور ایک مسلمان فقیر نے میری مملکت میں اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔“ یہ کہتے کہتے جوگی بے پال جوشِ غضب سے کانپنے لگا۔ ”آج مسلمانوں کا اس زمین پر آخری دن ہے۔ میں انہیں ایسا سبق دوں گا کہ پھر کبھی کوئی اچھوت اس پوتر استھان (مقدس مقام) کا رخ نہیں کرے گا۔“

جوگی جے پال کا کبیر اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ وہ پرتھوی راج کے خلوت کدے سے اس طرح اٹھا جیسے

مفتا پورا ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو اور وہ ایک مافران غلام کو سخت ترین سزا دینے جا رہا ہو۔

جوگی جے پال نے پہلے اپنے شاگردان خاص کو حکم دیا کہ وہ مسلمان فقیر اور اس کے خدمت گاروں کا کام تمام کر ڈالیں۔ اس ہدایت کے ملتے ہی تقریباً پانچ سو جادوگروں نے بیک وقت اپنے ساحرانہ کمالات کا آغاز کیا۔ ناگہاں باشندگان اجمیر نے دیکھا کہ پہاڑیوں سے آگ کے شعلے بلند ہوئے اور یہ شعلے تیزی سے اس طرف سفر کرنے لگے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قیام فرما تھے۔ پرتھوی راج اور اس کے درباری، جادوگروں کی اس شعبہ بازی سے مطمئن نظر آ رہے تھے مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ آگ حضرت خواجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی بجھ جاتی تھی۔ اپنے اس حربے کی ناکامی کے بعد جوگی جے پال کے چیلوں نے لاکھوں سانپ پیدا کر دیئے جو پھن اٹھائے ہوئے اس طرح بڑھے جیسے مسلمانوں کے جسموں میں اپنا زہر داخل کر کے انہیں ہلاک کر ڈالیں گے، لیکن جادو کے ذریعے پیدا ہونے والے ان سانپوں کا بھی وہی حشر ہوا جو کچھ دیر پہلے بھڑکتی ہوئی آگ کا ہو چکا تھا۔ تمام سانپ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے قریب پہنچ کر سر پکٹتے تھے اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو جاتے تھے۔ جادو کے دونوں خوفناک ترین مظاہروں کی ناکامی کے بعد شاگردوں نے استاد کے سامنے اعتراف شکست کر لیا۔

جوگی جے پال کو آج تک نامرادی اور بے چارگی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے شدید حالت غضب میں اپنے چیلوں کو برا بھلا کہتا ہوا حضرت خواجہ کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ جب مسلمان راجپوتوں نے جے پال کو آتے ہوئے دیکھا تو پیر و مرشد سے عرض کرنے لگے۔

”یہ تمام ساحروں کا گرو اور پرتھوی راج کی امیدوں کا آخری سہارا ہے۔“

جواب میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا۔ ”جس خدا نے دوسرے جادوگروں کو تحقیر آمیز شکست دی ہے وہی جے پال کو بھی ذلیل و رسوا کرے گا۔“ ابھی آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات کی گونج باقی تھی کہ جے پال نزدیک آ گیا۔

”میں جوگی جے پال ہوں۔“ اس نے آتے ہی اپنا تعارف کرایا اور بلند بانگ دعوے شروع کر دیئے۔ ”ہندوستان کے تمام دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور شہروں پر میری حکومت ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تم بے یار و مددگار لوگوں پر آسمانی قہر کی طرح نازل ہو جاؤں، بہتر ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں فرار کے لئے راستہ دے دوں گا اور اب تک تم اس زمین پر جس قدر ہنگامے برپا کر چکے ہو، ان کا حساب طلب نہیں کروں گا۔“

”ہم یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آسمانی قہر کس پر نازل ہو گا؟ بس ایک اسی کا دعویٰ سچا ہے، باقی تمام وہم و گمان ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

جوگی جے پال ایک خدا پرست کی بے نیازی پر بھڑک اٹھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کو فضا میں جنبش

دی۔ یکا یک لوگوں نے دیکھا کہ ایک رتی برآمد ہوئی جس کا ایک سراز من پر تھا اور دوسرا تاحد نظر آسمان کی وسعتوں میں گم تھا۔ بے پال نے اس اتنی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہندوستان کا سب سے بڑا جادوگر حضرت خواجہ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”میں آسمان کی طرف جا رہا ہوں، وہاں سے برق کی شکل میں میرا عذاب نازل ہوگا۔“ یہ کہہ کر بے پال اوپر چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ فلک نیلگوں نے اسے نگل لیا۔ رتی بدستور موجود تھی مگر بے پال غائب تھا۔

جوگی کے روپوش ہوتے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے جوتوں کو حکم دیا کہ اس ساحر اعظم کو تلاش کر کے زمین پر لاؤ جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے آسمان پر گیا ہے۔ وہ بڑا عجیب منظر تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اجیر کے رہنے والوں نے دیکھا کہ جوگی بے پال چنٹا ہوا زمین کی طرف آ رہا ہے اور حضرت خواجہ کے نعلین اس کے سر پر کسی آہنی گرز کی طرح برس رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بے پال اپنے ساحرانہ کمالات کے باوجود بڑی ذلت و رسوائی کے ساتھ واپس آیا اور کھلے الفاظ میں اپنی شکست تسلیم کرنے لگا۔ پھر اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پائے مبارک پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس شخص کو سارے ہندوستان کے جادوگر تلاش نہیں کر سکتے اسے ایک مسلمان کے جوتوں نے زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا۔ میری ساری عمر کی یہ ریاضت تھی جو چند لمحوں میں برباد ہو گئی۔“ اتنا کہہ کر بے پال رونے لگا۔ فرط اندامت سے اس کا سر نہیں اٹھتا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے تسلی دینے کے لئے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”جس علم کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس کی بربادی پر انسان کو غمزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا میں صرف خدا پرستوں کی بات حق ہے اور بالآخر حق کو ساری کائنات پر غلبہ حاصل ہو کر رہے گا۔“ آپ کے ان فرمودات کے بعد بے پال کے دل و دماغ کی تاریکی دور ہو گئی اور اس نے با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی رسم کو پامال کر ڈالا۔

قبول اسلام کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جوگی بے پال کا نام عبداللہ صحرائی تجویز کیا۔ آج بھی پاک و ہند کے بے شمار خوش عقیدہ لوگ اس روایت پر اعتبار کرتے ہیں کہ بے پال نے حضرت خواجہ کی خصوصی دعا کے طفیل حیات دوام حاصل کی تھی وہ اس وقت بھی زندہ ہے لیکن کسی کو ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس مبارک میں ہر سال لاکھوں انسان شریک ہوتے ہیں اور جب ان میں سے کوئی شخص تارا گڑھ کی پہاڑیوں کے پُر پیچ راستوں میں بھٹک جاتا ہے تو بے پال (عبداللہ صحرائی) اس گم کردہ راہ زائر کی رہنمائی کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک متنازع مسئلہ ہے۔ ہم بھی اس پر کوئی بحث نہیں کرتے کہ بے پال مر گیا یا زندہ جاوید ہے؟ خدا علیم و خبیر ہے، وہی اپنے رازوں کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کی جو طاغوتی قوتیں بظاہر ناقابل شکست نظر آتی تھیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک جنبش چشم نے انہیں مسخر کر لیا تھا اور پھر وہ مغلوب ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ بڑے سے بڑا تنگ نظر اور متعصب ہندو تاریخ دان بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت خواجہ

معین الدین چشتیؒ کے سامنے جوگی بے پال کی تمام ساحرانہ صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ خدائے واحد کی قدرتِ لازوال پر ایمان لے آیا تھا۔ بس یہی نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ایک سرِ حق پرست نے بت خانہ ہند میں اذان دی تھی تو سارے قوی الجبہ اصنام منہ کے بل گر کے ”حو اللہ احد“ کہتے تھے۔



پہلے شادی دیو اور پھر جوگی بے پال کی شکستِ فاش نے پرتھوی راج کے ایوانِ حکومت پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ تمام مشیرانِ سیاست اس خوفناک انقلاب کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں مذہبی تبدیلی کا اگر یہی عمل جاری رہتا تو پھر وہ دن زیادہ دور نہیں تھا جب کسی جنگ کے بغیر اجمیر کے تمام باشندے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جاتے اور راجپوت محافظوں کی بے نیام شمشیریں پرتھوی راج کی گردن کی طرف لپکنے لگتیں۔ انہی مستقل دوسووں اور اندیشوں نے پرتھوی راج کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ بالآخر اس نے حضرت خواجہؒ اور مسلمانوں کی مختصر جماعت پر عام فوجی یلغار کا فیصلہ کر لیا۔ اس مخصوص نشست میں اجمیر کے تمام مدبر اور دانشور موجود تھے۔ ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی پرتھوی راج کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ جادوگروں کے عبرت ناک انجام کے بعد بڑے سے بڑا جنگجو دہشت زدہ رہنے لگا تھا۔ اسی مجلس میں گفتگو کے دوران ایک بوڑھے مذہبی پیشوا نے پرتھوی راج کو اس کی ماں کی نصیحت یاد دلائی جو اپنے وقت کی بڑی ماہر نجوم تھی۔ بعض تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک کاہنہ تھی۔ پرتھوی راج کی ماں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا جس کے ذریعے اسے ایک مرد بزرگ کے بارے میں خبر دی گئی تھی۔ پھر جب وہ بوڑھی عورت خواب سے بیدار ہوئی تھی تو اس نے پرتھوی راج کو قریب بلا کر بڑی محبت سے کہا تھا۔

”اے میرے شجاع بیٹے! تجھ سے دنیا میں راجپوتوں کی آن قائم ہے مگر عنقریب اس علاقے میں ایک بزرگ ہستی داخل ہوگی جس کی ریاضت سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ اپنے باپ دادا کے دھرم کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کر لیں گے۔ تو بھی اس سادھو سنت کی باتوں کو غور سے سننا۔ اگر تیرے دل و دماغ آمادہ ہو جائیں تو نئے پیغام کو قبول کر لینا اور ایسا نہ ہو تو کم سے کم خاموش رہنا اور کسی عنوان بھی آنے والے کی مخالفت نہ کرنا۔ اگر اقتدار کے نشے میں تجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگئی تو پھر اس غلطی کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔“

پرتھوی راج نے اس وقت اپنی ماں کے اس خواب کو محض ایک واہمہ سمجھ کر کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ بیٹے کی اس بے رغبتی کو دیکھ کر بوڑھی ماں آزرده ہوگئی تھی اور اس نے شدید کرب ناک لہجے میں پرتھوی راج سے کہا تھا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تیرا جوشِ جوانی تجھے ایک ضعیف عورت کی نصیحت سننے سے روک رہا ہے۔ مگر یہ انداز بے نیازی بڑا خوفناک ہے۔ اگر تیرے نزدیک میرا خواب کوئی خیال پریشان ہے تو پھر نجوم کی آواز

کو غور سے سن۔ ستارے بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ آنے والا آ کر رہے گا۔“
پرتھوی راج نے ماں کی خاطر اس پیش گوئی کو بظاہر تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے کسی ایسی بزرگ ہستی کی آمد کا قائل نہیں تھا جو تنہا مضبوط ترین راجپوت حکومت کی بساط الٹ دے۔

پرتھوی راج کی ماں بیٹے کے جبری اقرار سے خوش نہیں ہوئی بلکہ مزید وحشت و اضطراب میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے راجپوت حکمران کے سرکش ذہن کو اچھی طرح پڑھ لیا تھا لیکن وہاں نافرمانی اور بے خبری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بوڑھی کاہنہ مجبوراً خاموش ہو گئی اور تقدیر کی کرشمہ سازیوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے کئی بار نجوم کے ذریعے بزرگ کی آمد کا وقت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بارہ بروج میں سات ستاروں کی گردش بوڑھی کاہنہ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ (اس وقت ماہرین فلکیات نے سات ستارے ہی دریافت کئے تھے۔ اب ان کی تعداد دس ہے) جب ستاروں کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہ ہو سکا تو پرتھوی راج کی ماں نے رازداری کے ساتھ کچھ پنڈتوں سے بھی رجوع کیا مگر ان کا علم بھی اس وقت خاص کی نشاندہی کرنے سے عاجز رہا۔

بوڑھی کاہنہ اپنی اس بے چارگی پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ پرتھوی راج کی ماں کا خیال تھا کہ اگر وہ سادھو سنت اس کی موجودگی میں تشریف لے آئے تو وہ اپنے بیٹے کو ان کی مخالفت کرنے سے باز رکھے گی اور اس طرح راج گھرانے کے سر سے یہ خطرہ ٹل جائے گا۔ یہ شخص ایک انسانی خواہش تھی جس کی تکمیل بہر حال نہ ہو سکی اور پرتھوی راج کی ماں مختصر سی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے حکومت کے چند وفادار مشیروں سے کہا تھا۔

”اگر میرے بعد وہ بزرگ آجائیں تو ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنا۔“

آج راجستھان کی قدیم تاریخ اسی نازک ترین مسئلے سے دوچار تھی۔ آنے والا آچکا تھا اور اسے جھٹلانے والے مسلسل جھٹلا رہے تھے۔ جب شادی دیو اور جوگی جے پال بھی شکست کھا کر حضرت خواجہ چشتیؒ کے سامنے خم ہو گئے تو پرتھوی راج نے گنتی کے چند مسلمانوں کے خلاف بھرپور فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا لیکن اسی وقت ایک مشیر نے اجمیر کے حکمران کو اس کی آنجھانی ماں کے گم گشتہ الفاظ یاد دلانے۔

کچھ دیر کے لئے ماں کی پیش گوئی کا ذکر سن کر پرتھوی راج سناٹے میں آ گیا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر مذہبی عقائد، خاندانی عظمت اور اقتدار کا نشہ مسلط ہو گیا۔ وہ حالات کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں سے نکلنے والے تمام راستے ذلت اور تباہی کی طرف جاتے تھے۔ اگر وہ ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مسلمان درویش کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کر لیتا تو چند برسوں میں اجمیر کی پوری آبادی حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتی اور پھر اس کی حکومت کا کوئی وجود باقی نہ رہتا۔ اگر خود کلمہ پڑھ لیتا تو بندہ و آقا کا فرق مٹ جاتا کیونکہ معین الدین چشتیؒ کا خدا محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں شامل دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح پرتھوی راج چوہان کے نسلی غرور اور جاہ و جلال کو کہاں پناہ ملتی؟ وہ قدیم طبقاتی کشمکش کا شکار اور اندھی روایات کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ اس لئے نفسیاتی خواہشوں کے اشاروں پر رقص

کرتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پھرے بٹھا دیئے اور ماں کی پیش گوئی کی طرف سے کان بند کر لئے۔ پھر بھی مشیروں کی بات کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ پرتھوی راج نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف طاقت کے استعمال کا ارادہ ملتوی کر دیا..... مگر جہاں تک بغض و نفاق کا تعلق تھا، وہ پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا تھا۔

اب تمام بت پرست ایک نئے انداز سے سوچ رہے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے براہ راست تصادم پورے علاقے کی ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ اس لئے طے کیا گیا کہ امام کو چھوڑ کر مقتدیوں پر مشق ستم کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ منصوبہ بھی تیار کر لیا گیا کہ ہندو مذہب کے روحانی پیشوا عام انسانوں کو دیوتاؤں کے عذاب سے ڈرائیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیں کہ آئندہ جو شخص مسلمانوں سے تعلق رکھے گا اس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ پرتھوی راج اور اس کے مشیروں کو اس حکمت عملی کے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع تھی۔ ان کے خیالوں میں یہ سختیاں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دیں گی اور کمزور اعصاب کے ہندو دہشت زدہ ہو کر اپنے مذہبی حصار سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس منصوبہ سازی کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ مسلمان اشیائے خورد و نوش لینے کے لئے بستی یا شہر کی طرف آئے تو مقامی باشندوں نے نہایت سنگ دلی سے آنکھیں پھیر لیں۔

ایک خدا کے نام لیوا ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہو گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو راجپوتوں کی اس نئی روش سے آگاہ کیا گیا تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے روبرو انتہائی خوش الحانی سے یہ آیت مقدسہ تلاوت فرمائی۔

”تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک خدا کی راہ میں اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ شے قربان نہ کر دو۔“ (ترجمہ)

کلامِ الہی سنتے ہی مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے دل ٹھہر گئے۔ لذیذ غذاؤں کی بجائے اُلی ہوئی سبزیوں سے شکم کی آگ بجھائی جانے لگی۔ مگر قافلہ ایمان کی سبک رفتاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مسلمانوں کے اس مجاہدانہ طرزِ عمل سے کافروں پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ انہیں یقین تھا کہ زندگی کی راہیں مسدود ہو جانے کے بعد یہ مفلوک الحال مسافر اپنے میر کارواں سے بچھڑ جائیں گے لیکن جب مسلمانوں کے پایہ استقامت میں ہلکی سی بھی لرزش پیدا نہ ہوئی تو پتھر کے پجاری عالم وحشت میں اپنا گریبان چاک کرنے لگے۔ اتفاق سے اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا۔ حضرت خواجہؒ کے ایک خادم سید روشن علیؒ تھے۔ ایک دن وہ صبح کے وقت بستی کے قریب ٹھہل رہے تھے کہ انہیں ایک گوالن سر پر دودھ رکھے نظر آئی۔ وہ بہت تیزی سے شہر کی طرف جا رہی تھی۔ سید روشن علیؒ نے اسے آواز دی۔ گوالن ٹھہر گئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ دودھ لے کر کہاں جا رہی ہے؟ گوالن نے جواباً کہا کہ وہ روزانہ مہاراجہ کے لئے دودھ فراہم کرتی ہے۔ سید روشن علیؒ نے دودھ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تا کہ اگر چیز خالص ہو تو وہ آئندہ اسی گوالن سے خرید سکیں۔ دودھ فروخت کرنے والی عورت نے سید روشن علیؒ کے سامنے برتن

رکھ دیا۔ حضرت خواجہؒ کے خادم نے بے ارادہ دودھ کو انگلی پر لے کر دیکھا۔ وہ نہایت عمدہ تھا۔ اس لئے سید روشن علیؒ نے چاہا کہ گوالن تھوڑا سا دودھ انہیں بھی دے دے۔ ابھی وہ اپنی بات مکمل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ دودھ فروش عورت چیخنے لگی۔

”تم نے مہاراجہ کے استعمال میں آنے والے دودھ کو ناپاک کر دیا۔ میں ابھی جا کر تمہاری شکایت کرتی ہوں۔“ گوالن اس طرح چیخ رہی تھی کہ جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ سید روشن علیؒ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ایک مسلمان کے چھو لینے سے کوئی شے ناپاک نہیں ہوتی مگر گوالن نے ان کی ایک نہ سنی اور وہ مسلسل شور مچاتی ہوئی شہر کی طرف چلی گئی۔

جب وہ دودھ فروش عورت قدرے تاخیر سے پہنچی تو پرتھوی راج کے ملازموں نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ گوالن نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے محل کے خادموں کو تمام واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ دودھ مہاراج کے قابل نہیں رہا۔ ملازمین نے فوری طور پر اجمیر کے حکمران کو خبر دی۔ پرتھوی راج کے دل میں پہلے ہی مسلمانوں کی طرف سے غبار موجود تھا۔ اس واقعے نے کدورت میں مزید اضافہ کر دیا۔

”اب ان کی شرارتیں یہاں تک پہنچ گئی ہیں؟“ شدت غضب سے پرتھوی راج کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”اس گستاخ اور بے ادب بھکاری کو ہمارے حضور پیش کرو۔“

یہ حکم پاتے ہی چند مسلح سپاہی گوالن کے بتائے ہوئے راستے کی جانب دوڑ پڑے۔ سید روشن علیؒ نے اس واقعے کی سنگینی کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا تھا اور وہ گوالن کے جانے کے بعد نہایت اطمینان و سکون سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اچانک انہیں کچھ فاصلے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر فضا میں دھول اڑنے لگی۔ جب گرد و غبار صاف ہوا تو پرتھوی راج کے سپاہی سید روشن علیؒ کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تیزی کے ساتھ گھوڑوں سے اترے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم سے گوالن کے بارے میں پوچھنے لگے۔ سید روشن علیؒ نے انتہائی جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کر لی کہ انہوں نے دودھ کو انگلی پر لے کر دیکھا تھا۔ جواباً پرتھوی راج کے سپاہیوں نے اس عمل کو سنگین جرم قرار دیا اور سید روشن علیؒ کو گرفتار کر کے اپنے حکمران کے سامنے پیش کر دیا۔

پورے دربار پر سکوت مرگ طاری تھا۔ آج پہلی مرتبہ مغرور راجپوت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ایک خادم کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ پرتھوی راج نے بڑے تلخ اور غضب ناک لہجے میں سید روشن علیؒ سے مسلسل سوالات کئے مگر وہ ایک فرماں روا کے جاہ و جلال سے متاثر ہوئے بغیر جواب دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مردِ مومن نے بھرے دربار میں ہندو فلسفے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور ”پاکی و ناپاکی“ کے موضوع پر اس طرح بولے کہ راجپوتوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون جمنے لگا۔

آخر پرتھوی راج سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ایک ظالمانہ حکم جاری کر دیا۔ ”جس انگلی نے

ہمارے دودھ کو ناپاک کیا ہے، اسے کاٹ دو۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے اور یہی انصاف۔“

سید روشن علیؒ کی انگلی کاٹ دی گئی۔ خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ اس سے راجپوتوں نے نیک شگون لیا۔ ان کی زمین پر دشمن کا لہو بہہ رہا تھا اور یہ ایک اچھی علامت تھی۔ کچھ دیر بعد سید روشن علیؒ نے اپنی کٹی ہوئی انگلی اٹھائی اور شہر اجمیر سے نکل کر جنگل کی طرف چلے گئے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے دوسرے ساتھی سکوت پذیر تھے۔ جب سید روشن علیؒ بارگاہِ شیخ میں حاضر ہوئے تو آپؒ بظاہر پرسکون تھے لیکن خون بہہ جانے کی وجہ سے چہرے پر نقاہت نمایاں ہونے لگی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ان کا زرد چہرہ دیکھ کر فرمایا۔ ”روشن علیؒ! تم کچھ بیمار نظر آ رہے ہو؟“

”نہیں پیر و مرشد! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ سید روشن علیؒ نے ادب سے عرض کیا۔ ”بس آج ایک عجیب سا واقعہ رونما ہو گیا۔“ یہ کہہ کر سید روشن علیؒ نے اپنی ٹی ہوئی انگلی شیخؒ کے سامنے رکھ دی۔ سید روشن علیؒ کے دوسرے ساتھی یہ منظر دیکھ کر جذباتی ہو گئے مگر حضرت خواجہؒ نے انہیں پرسکون رکھنے کے لئے قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ جن کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

”عنقریب ہم تمہیں جان و مال اور اولاد کے خسارے سے آزمائیں گے اور پھر جو اس راستے میں ثابت قدم رہے گا وہی اپنے رب کا پسندیدہ بندہ قرار پائے گا۔“

کلامِ الہی سن کر بھڑکتے ہوئے جذبات اعتدال پر آگئے مگر چہرے گہری اداسیوں کے غماز تھے۔ ظلم کے خلاف ایک خاموش احتجاج، ایک بے زبان شکایت، ایک بے آواز خواہش انتقام۔

”ہر چیز اپنے خدا کی طرف لوٹ کر جانے والی ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایسے لہجے میں فرمایا جو معرفت کے جلال سے لبریز تھا۔ ”روشن علیؒ! تم اپنی انگلی زیر زمین دفن کرو اور اس کے ساتھ ہی پرتھوی راج کی حکومت پر بھی خاک ڈال دو۔“

اجمیر کے حکمران نے ایک مسلمان درویش کو قصدِ اہیت ناک سزا دی تھی۔ دراصل وہ سید روشن علیؒ کی انگلی کاٹنے کے بعد حضرت خواجہؒ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اگر حضرت خواجہؒ نے کسی روحانی طاقت کا مظاہرہ کیا تو وہ کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑا لے گا اور مسلمانوں کی صف میں خاموشی رہی تو آئندہ بھی اسی قسم کی سزائیں جاری رکھے گا۔ پرتھوی راج اپنی اس سنگدلانہ حرکت کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا لیکن جب حضرت خواجہؒ نے مکمل سکوت اختیار کیا تو حاکم اجمیر کے حوصلے بڑھ گئے۔ مسلمانوں کی اس خاموشی کو پست ہمتی سے تعبیر کیا گیا۔



اسی دوران ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ پرتھوی راج کا ایک معزز درباری حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اسے حضرت خواجہؒ سے نادیدہ عقیدت تھی۔ کٹر ہندو ہوتے ہوئے بھی وہ حضرت خواجہؒ کے متعلق راج دربار میں ہونے والی گفتگو کو بہت غور سے سنتا تھا۔ اگرچہ تمام درباری حضرت خواجہؒ کی شان میں بے دریغ نازیبا کلمات ادا کرتے تھے لیکن اس راجپوت عہدیدار نے آج تک اپنی

زبان کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک نامعلوم کشش کے زیر اثر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حلقہ ارادت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اتفاق سے اس دن بھی پرتھوی راج کے دربار میں مسلمان درویش کو دشنام طرازی کا ہدف بنایا جا رہا تھا۔ راجپوت سردار کچھ دیر تک تو اپنے اوپر جبر کر کے یہ غلیظ و کثیف گفتگو سنتا رہا مگر پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ حضرت خواجہؒ کی تعریف کرنے لگا۔ ابھی راجپوت سردار کے الفاظ کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پرتھوی راج کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی آستین میں بھی کچھ سانپوں کی پرورش کر رہا ہوں۔“ پرتھوی راج اس طرح بول رہا تھا جیسے نفرت و قہر کا دہانہ کھل گیا ہو۔ پھر اس نے عالم طیش میں راجپوت سردار کو معزول کرتے ہوئے نیا حکم جاری کیا۔ ”زندگی کی ساری آسائشیں چھین کر اسے بھی بد بخت فاقہ کشوں کی قطار میں شامل کر دو۔“ پرتھوی راج اس سردار کو بھی قتل کر سکتا تھا لیکن راجپوتوں کی صفوں میں انتشار پھیل جانے کے خوف سے صرف معزولی پر اکتفا کیا گیا۔

دوسرے ہی دن راجپوت سردار کو تمام سرکاری اعزازات سے محروم کر کے اس طرح نکالا جا رہا تھا جیسے وہ بھی کوئی اچھوت ہو۔ راجپوت سردار نے ایک نظر اپنی چھن جانے والی کرسی کی طرف دیکھا اور پھر گردن اٹھائے ہوئے دربار سے نکل کر چلا گیا۔ پرتھوی راج کا خیال تھا کہ اتنے بڑے عہدے سے معزول ہو جانے کا تصور اس کو بدحواس کر دے گا اور وہ معافی مانگ کر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرے گا مگر وہاں تو سارا نقشہ ہی الٹ گیا تھا۔ عہدے کی بھیک مانگنا تو کجا، راجپوت سردار نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ حکومت کے ایک معزز فرد کا اس بے نیازی کے ساتھ چلے جانا بظاہر پرتھوی راج کی شکست پر منہج ہوتا تھا لیکن اسے یہ طمانیت حاصل تھی کہ اس نے ایک پوشیدہ دشمن کو وقت سے بہت پہلے ہلاک کر ڈالا تھا۔

یہ معزز راجپوت دربار سے نکل کر اسی طرف روانہ ہو گیا جہاں چند فاقہ کش درویش قیام پذیر تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سردار کا والہانہ استقبال کیا اور جب اس نے مکمل روداد سنائی چاہی تو آپؒ نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ ”خدا کے حکم سے فقیر کو سب کچھ معلوم ہے۔ تم راجہ کے دربار میں دوبارہ جاؤ گے مگر نئے انداز سے۔“

پھر راجپوت سردار نے کلمہ توحید پڑھا اور اپنے ماضی سے تمام رشتے توڑ لئے۔ وقت کی گردش تیز ہو گئی تھی اور زمین کی طنائیں کھینچی جانے والی تھیں۔ دوسرے دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار سے فرمایا۔

”اب وہ ساعت آگئی ہے کہ باطل پرستوں کی ساری غلط فہمیاں دور کر دی جائیں۔ تم ان سے جا کر کہو کہ وہ گمراہی کے تاریک غار سے نکل آئیں۔ آسمانوں پر فیصلے ہو چکے اور پتھر کے پجاریوں کو جتنی چھوٹ ملنی تھی مل چکی۔ اللہ کا ہمیشہ سے یہ مزاج رہا ہے کہ وہ کسی فرد یا قوم کو بے خبری کے عالم میں نہیں پکڑتا۔ اجمیر کے حکمران اور تمام باشندوں کو آخری بارتنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری

سے باز آ جائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو اپنی گردنوں سے دیوتاؤں کی غلامی کا طوق اتار پھینکیں۔ فرشتہ اجل ان کے سروں پر کھڑا ہے۔ چند لمحوں کی مہلت کے سوالوح محفوظ پر اور کچھ تحریر نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کر لیں گے تو انہیں دنیا و آخرت دونوں کی نعمتوں سے نوازا جائے گا ورنہ ایک عبرت ناک انجام، ایک لرزہ خیز موت بہت دیر سے ان کی منتظر ہے۔“

راجپوت سردار نے اپنے امام کے فرمودات کو حرف بہ حرف ذہن نشین کیا اور اس دربار کی طرف جانے لگا جہاں سے ایک دن پہلے اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ نکال دیا گیا تھا۔ چلتے چلتے راجپوت سردار کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آخری نصیحت فرمائی۔

”اب تم اسلام کے سفیر ہو۔ تمہاری گزشتہ پہچان مٹ چکی۔ اب صرف اللہ اور رسول ﷺ تمہارا حوالہ ہیں۔ بے شک! یہ حوالہ بت پرستوں کی تمام شناختوں پر بھاری رہے گا۔ جاؤ! اور اپنے ایمان کی اس طرح گواہی دو کہ پرتھوی راج کے ایوان اقتدار میں زلزلہ آجائے۔“

راجپوت سردار نے ایسا ہی کیا۔ ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔“
اجمیر کے ایوان سلطنت میں بہت دیر تک یہ آشنا آواز گونجتی رہی۔ پرتھوی راج چوہان اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں پر سکتہ طاری تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہیں پیغام حق اتنے قریب سے سنایا جائے گا۔ راجپوت سردار نے اسلام کی سفارت کا حق ادا کر دیا۔ کچھ دیر بعد حکمران طبقہ حیرت و استعجاب کے حصار سے باہر نکلا اور آداب سفارت پامال کر دیئے گئے۔ پرتھوی راج کے خیال میں اس وقت بھر پور طاقت کا مظاہرہ ضروری تھا۔ پہلے راجپوت سردار کو نقش ترین الفاظ سے نوازا گیا، پھر اسے بری طرح زد و کوب کیا گیا اور دربار سے نکال دیا گیا۔ جب وہ اپنے لباس پر زخموں کے تمغات سجائے رخصت ہو رہا تھا تو پرتھوی راج کی قہر آلود آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اجمیر کا حکمران کہہ رہا تھا۔
”اس سے پہلے کہ ان پر میرا غضب نازل ہو، تمام مسلمان اجمیر کی حدود سے نکل جائیں۔ بس یہ آخری مہلت ہے۔ اس کے بعد انہیں کوئی رعایت نہیں دوں گا۔“

راجپوت سردار نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور پہنچ کر پرتھوی راج کے الفاظ دہرا دیئے۔ باقی جو حالات پیش آئے تھے، ان کی شہادت مسلمان راجپوت کے پیرہن سے مل گئی تھی۔
”بے شک! تو جسے گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا۔ پھر آپؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ آج تک کسی مرید یا خادم نے آپؒ کو اس قدر حالت غیظ میں نہیں دیکھا تھا۔ ایک آتشیں جلال تھی جو باطل کے تمام خس و خاشاک کو پھونک دینا چاہتی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ الہامی انداز میں فرما رہے تھے۔

”من ثرا زندہ بدست لشکر اسلام بیروم۔“ (میں نے تجھے زندہ حالت میں لشکر اسلام کے حوالے کیا) پھر یہ خیر اڑتے اڑتے اجمیر کے حکمران تک پہنچ گئی۔ خوشامدی درباریوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مذاق اڑاتے ہوئے پرتھوی راج سے کہا۔

”جس فقیر کو ایک وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ چوہان سراٹ کو زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے

حوالے کرنا چاہتا ہے؟“

کہنے والے نے ابھی اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ دربار میں بے ہنگم قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ وہی استہزائیہ قہقہے تھے جو ہر دور میں اہل ایمان کا مقدر بنتے رہے ہیں۔ آج وہی رسم اجمیر کی سنگلاخ زمین پر دہرائی جا رہی تھی۔ زمین کی طرح پتھر کے پجاریوں کے دل بھی سخت ہو گئے تھے۔ ہدایت کا آبتار ان کے سینوں پر گر رہا تھا مگر سنگ و آہن کے بنے ہوئے قلب کوئی تاثر قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی تھیں مگر وہ نوشتہ یوار پڑھنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔

”مجھے گرفتار کرنے کے لئے لشکر اسلام کہاں سے آئے گا؟“ پرتھوی راج کی ہنسی بھی اپنے درباریوں کے قہقہوں میں شامل ہو گئی تھی۔ ”غوری گزشتہ سال راجپوتوں کی شجاعت کو آزما چکا ہے۔ کیا وہ اس قدر جلد اپنی شکست کو فراموش کر کے دوبارہ ادھر کا رخ کرے گا؟ کیا ساری دنیا نے میدان جنگ سے اس کے ذلت آمیز فرار کا منظر نہیں دیکھا تھا؟“ دربار میں بہت سی تائیدی آوازوں کا شور بلند ہوا۔ ”اب کیا راجپوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی فوج آسمان سے اترے گی؟“ پرتھوی راج چوہان نے غرور و تکبر کی ایک خاص ادا کے ساتھ اہل دربار کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے فرمانروا کی ہم نوائی میں مصاحبوں نے بھی شہاب الدین غوری کی شکست خوردہ شخصیت کا دشنام طرازی کا ہدف بنانا شروع کر دیا اور پھر طنز و اعتراض کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔

پرتھوی راج سید روشن علیؒ کی انگلی کاٹ کر اور اسلام کا پیغام لانے والے قاصد کو اپنے دربار سے نکال کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا مگر جب مسلمان درویش کی جانب سے کسی روحانی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوا تو چوہان سمرات مطمئن ہو گیا۔ اس کے خیال میں حضرت خواجہ بھرف ہندو جادوگروں کی ساحرانہ کرشمہ سازیوں کو زائل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور انہیں یہ کمال حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی روحانیت کے ذریعے راجہ کے لشکروں پر حملہ آور ہو سکیں۔ اگرچہ وہ اپنے کانوں سے اونٹوں کے جسموں کے مفلوج ہونے اور انا ساگر کے ایک کوزے میں سمٹنے کی خبریں سن چکا تھا۔ اس کی عبرت کے لئے یہ مناظر کافی تھے لیکن حکومت کا گہرا نشہ پرتھوی راج کو ہوش میں آنے ہی نہیں دیتا تھا۔ ماں کی پیش گوئی اور نصیحت بھی بے اثر ہو چکی تھی۔ دراصل پرتھوی راج چوہان بھی دوسرے سرکشوں اور نافرمانوں کی طرح یہ سوچتا تھا کہ اگر مسلمانوں کا خدا موجود ہے تو زلزلہ کیوں نہیں آ جاتا۔ آسمان سروں پر ٹوٹ کر اہل اجمیر کو تباہ کیوں نہیں کر دیتا۔ یہ وہی مطالبات تھے جو ہر دور کے بت پرست، مردانِ حق سے کرتے رہتے تھے۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں بھی بعض اوقات کفار ان قریش ایسے ہی عذاب کے منتظر رہتے تھے۔ آج صدیوں بعد سرورِ کونین ﷺ کا ایک خادم اپنے آقا ﷺ کا پیغام لے کر اجمیر کی حدود میں داخل ہوا تو منکرینِ حق اس سے بھی وہی مطالبات کر رہے تھے۔ جہل اور کفر کی تاریکیوں کے باعث وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ لوح محفوظ میں سب کچھ موجود ہے..... اور وقت معلوم سے پہلے کوئی فیصلہ زمین پر نازل نہیں ہوتا۔



قدرت کی طرف سے دی جانے والی اس مہلت نے پرتھوی راج کو اور سرکش بنا دیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خاموشی اسے مزید کج روی پر اُکسار ہی تھی اور اجمیر کا حکمران مسلمان درویش اور اس کے چند ساتھیوں کی شہر بدری کا حکم جاری کر رہا تھا۔ عجیب صورت تھی۔ ایک طرف باطل کا قص جاری تھا اور دوسری طرف شہاب الدین غوری اپنے خون آلود پیرہن کو دیکھ رہا تھا۔

587ھ میں شہاب الدین غوری نے ایک خوفناک مقابلے کے بعد پرتھوی راج سے شکست کھائی تھی اور افغانوں کی مختصری فوج راجپوتوں کی یلغار کو نہ روک سکی تھی۔ یہاں تک کہ مسلمان سپہ سالار شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شہاب الدین غوری گھوڑے کی پشت سے علیحدہ ہو کر زمین پر گر جاتا اور راجپوت سپاہیوں کے تیز رفتار گھوڑے اس کے جسم کو روند ڈالتے، وفادار غلام قطب الدین ایبک اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور شہاب الدین غوری کو میدان جنگ سے نکال کر محفوظ مقام تک لے گیا۔ ایک خادم نے آقا کی نمک خواری کا حق ادا کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تاریخ کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔

شہاب الدین غوری اپنے لہو میں نہایا ہوا غزنی پہنچا۔ طبیعوں کی بہترین دواؤں اور خدمت گاروں کی سخت تیمارداری نے غوری کے جسم کے زخم تو بھر دئے تھے لیکن اس کے دل و دماغ اور روح سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ وہ اکثر گوشہ تنہائی میں پڑا رہتا اور کبھی کبھی اپنی شکست کے مناظر کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتا۔ تمام اراکین سلطنت نے عجیب عجیب انداز سے اسے تسلیاں دیں مگر وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے لذیت ناک واقعہ کو فراموش نہ کر سکا۔ خوشی کے کئی موسم آئے اور گزر گئے مگر شہاب الدین غوری نے کسی پُرسرت تقریب میں شرکت نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے وہ جنگی لباس بھی تبدیل نہیں کیا جو شکست کے وقت جسم پر آراستہ تھا۔ دوسرے اراکین سلطنت کی تو حیثیت ہی کیا، خود اس کے بڑے بھائی غیاث الدین غوری نے کئی بار سمجھایا مگر وہ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا۔

”میں اس خون رنگ قبا کو اس وقت تک اپنے جسم سے الگ نہیں کر سکتا جب تک پرتھوی راج چوہان آہنی بیڑیوں میں جکڑا ہوا میرے سامنے حاضر نہیں ہو جاتا۔ اگر گردش تقدیر کے باعث ایسا نہ ہو سکا تو پھر یہی لباس میرا کفن بن جائے گا۔“

کچھ لوگوں نے اس واقعے کو شہاب الدین غوری کی جذباتیت سے تعبیر کیا ہے لیکن غیور انسانوں کے جینے کی ادا ایسی ہی انوکھی ہوتی ہے کہ عام لوگوں کو ان روایتوں پر یقین نہیں آتا۔ اس سلسلے میں عوام الناس کا انداز فکر کچھ بھی ہو مگر چشم اعتبار گواہ ہے کہ شہاب الدین غوری اپنے روز و شب کے بیشتر لمحات میں اس لباس کو بہت غور سے دیکھتا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلیظ و کثیف ہوتا جا رہا تھا۔

ابتدائی چند ماہ میں شہاب الدین غوری کے اعصاب پر حسرت و یاس کی شدید کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ناامیدی کے حصار سے باہر نکلا اور نہایت زور و شور سے اپنی شکستہ صفوں کو درست کرنے لگا۔ یہ فوجی تیاریاں کم و بیش ایک سال تک جاری رہیں۔ آخر وہ ساعت آ پہنچی جس کا مسلمانوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے ساتھیوں سے فرما رہے تھے۔ ”میں نے اسے زندہ حالت میں گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کیا۔“ اور جواب میں پرتھوی راج ایک مسلمان درویش کے الہامی کلمات کا مذاق اڑا رہا تھا، اسی وقت شہاب الدین غوری نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کوئی بزرگ افغان سپہ سالار سے فرما رہے تھے۔

”مایوسیوں کے دائرے سے نکل اور اجمیر پر حملہ کر۔ اس بار خدا تجھے فتح عظیم سے سرفراز کرے گا۔“ بعض تاریخی کتابوں میں شہاب الدین غوری کا یہ خواب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”ایک مجلس نور آراستہ ہے۔ درودیوار سے تیز روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے خدام دست بستہ قطار در قطار کھڑے ہیں۔ شہاب الدین غوری بھی اس انسانی ہجوم میں موجود تھے۔ سامنے زرنگار تخت پر ایک روشن چہرہ بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ ان کے جاہ و جلال کا یہ عالم ہے کہ حاضرین کی نگاہیں دم بھر کے لئے اٹھتی ہیں اور فرش پر جم جاتی ہیں۔ پوری محفل پر گہرا سکوت طاری ہے۔ شہاب الدین غوری حیرت زدہ ہے کہ ایک ایک خادم کی شکل دیکھ رہا ہے مگر اسے یہ دریافت کرنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ یہ دربار کیسا ہے؟ اور اسے یہاں کس مقصد کے لئے لایا گیا ہے۔ ابھی غوری کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں کہ دفعۃً ایک خادم جو زرنگار تخت کے قریب کھڑا ہے، غوری کی طرف بڑھتا ہے پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم سے گزرتا ہوا بزرگ کے قریب پہنچ جاتا ہے۔“ شہاب الدین غوری حاضر ہے۔“ خادم نہایت ادب سے خم ہوتے ہوئے عرض کرتا ہے۔ بزرگ غوری کی طرف نہایت محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔

”خدا نے تجھے کافروں پر غلبہ عطا کر دیا اور ہندوستان کی عظیم سلطنت بخش دی۔“

بزرگ کا لہجہ شیریں تھا مگر الفاظ میں ایک ایسا جلال پوشیدہ تھا کہ غوری کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور فوراً ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

افغان سپہ سالار رات بھر ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار رہا۔ صبح ہوتے ہی شہاب الدین غوری نے مصاحبین خاص سے اپنا خواب بیان کیا۔ سب نے بظاہر ایک ہی تعبیر دی کہ اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار لمحہ آنے والا ہے..... مگر حقیقت سے کوئی بھی آشنا نہیں تھا۔ خواب کی تعبیر کا علم دنیا کا مشکل ترین علم ہے جو سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ علم تو خدا کی طرف سے کچھ مخصوص بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اس لئے شہاب الدین کا خواب بھی کچھ دن تک تشنہ تعبیر رہا۔

جب اس سلسلے میں غزنی کے اہل دانش سے رجوع کیا گیا تو ان لوگوں نے بیک زبان کہا کہ یہ اس کے ذاتی خیالات ہیں جو دماغ کے کسی گوشے میں نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب ان خیالات کو عملی شکل اختیار کرنے کا موقع نہیں ملتا تو یہ خواب کی حالت میں نظر آنے لگتے ہیں۔ غزنی کے دانشور کھل کر تو اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے مگر در پردہ وہ سب کچھ کہہ گئے تھے۔ ان کا اشارہ گزشتہ جنگ کی طرف تھا جس میں شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج سے شکست کھائی تھی..... اور اب شکست کا یہی احساس مختلف رنگوں میں ابھرا بھر کر متا رہتا تھا۔ غزنی کے دانشوروں نے مبہم انداز میں اس سے یہی بات کہی تھی

مگر جب وہ میدان کارزار میں راجپوت حکمران کو شکست نہ دے سکا تو خوابوں کی دنیا میں تخت بھدستان پر قابض ہو گیا۔

طلب علم سے اپنے خواب کی تعبیر میں کر غوری کے دل و دماغ پر ایک بار پھر گہری اداسیاں مسلط ہو گئیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ مایوسیوں کے حصار سے باہر آیا تھا اور پھر رات کے خواب نے اسے ایک گونہ سرت بخشی تھی لیکن جب غزنی کے دانشوروں نے مہذب لہجے میں اس کی ناکام خواہشات کا مذاق اڑایا تو وہ دوبارہ مغموم اور دل گرفتہ نظر آنے لگا۔ شہاب الدین غوری قطعی طور پر اپنے خواب کی توجیہ سے مطمئن ہو گیا تھا مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی روشن چہرہ بزرگ اور ان کے نورانی ہدایت کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ تمام ہوش و خرد کے جانے والے اسے مشورہ دیتے تھے کہ یہ دکھل خواب اب محض ایک نا آسودہ تمنا ہے جس کا حقیقی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

شہاب الدین غوری اپنے خیالات میں الجھ کر رہ گیا تھا اور قطعی طور پر اس کی فوجی منصوبہ سازی قفل کا شکار ہو گئی تھی۔ بالآخر ایک مختصر سے وقفے کے بعد افغان سپہ سالار نے ان ہی بزرگ کو دوبارہ خواب میں دیکھا۔ اس بار وہ بزرگ انتہائی پُر جلال لہجے میں فرما رہے تھے۔

”اے اسلام کے جانباز فرزند! خیالات کے طلسم سے نکل اور اپنی آنکھوں سے قدرت کی کرشمہ سازیوں کا تماشا دیکھ۔ خدا مایوس ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اس خواب نے شہاب الدین غوری کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اب کی مرتبہ وہ بزرگ اس طرح آئے تھے کہ ان کے روشن چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں تھے۔ افغان سپہ سالار نے اپنے مخصوص دوستوں سے مشورہ کیا اور اہل دانش کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

شہاب الدین غوری کے دوست خواب کی تعبیر تو نہ دے سکے مگر وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچ گئے کہ یہ مستقبل کے بارے میں ایک غیر معمولی تنبیہ ہے۔ انجام کار ایک ایسے شخص کی تلاش کی جو واقعتاً تعبیر کا علم رکھتا ہو ورنہ قیاس آرائیوں سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ پھر کئی دن کی جستجو کے بعد افغان سپہ سالار کو اس ہستی کا نشان مل گیا جسے شہر کی رونقوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے جو غزنی کے نواح میں کسی ویران مقام پر خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ شہاب الدین غوری نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب بیان کیا۔

بزرگ نے خواب کی تعبیر دیتے ہوئے کہا۔ ”تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں بہت جلد اس عظیم انسان کی زیارت کا شرف حاصل ہو گا جسے دیکھنے کے انتظار میں نہ جانے کتنی آنکھیں بجھ گئیں اور نہ جانے کتنے لوگ زیر خاک سو گئے۔ قلت افواج اور کثرت وسائل کے دوسوں میں مبتلا نہ ہو کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔ تم ان ہی مرد جلیل کے کہنے پر عمل کرو جو دوبار عالم خواب میں تمہیں اپنی زیارت سے شرف یاب کر چکے ہیں۔“

بزرگ نے شہاب الدین کے خواب کی تعبیر بیان کر دی تھی اور اپنی صلاحیت کشف کے ذریعے ان کے ان اندیشوں کو بھی بے نقاب کر دیا تھا جو فوجیوں کی قلیل تعداد کے باعث افغان سپہ سالار کے ذہن

میں پیدا ہو رہے تھے۔ غوری نے اپنی تسکین کے لئے خواب میں نظر آنے والی مبارک ہستی کا نام پوچھنا چاہا تو بزرگ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ ایک راز ہے جو وقت آنے پر خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

غوری ان تارک الدنیا بزرگ سے ملاقات کر کے واپس آ گیا اور پھر نئے عزائم کے ساتھ اپنے منتشر سپاہیوں کی صف بندی کرنے لگا۔ اس کے قریبی حلقے میں اکثر لوگ پرتھوی راج پر دوبارہ لشکر کشی کے مخالف تھے۔ ان کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ افغان سپاہی شکست کھا کر بکھر چکے ہیں۔ انہیں سمیٹنے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ دوسرے یہ کہ پرتھوی راج چوہان کو پہلا سبق یاد ہے، اس لئے وہ اپنی سرحدوں کو کھلا نہیں چھوڑے گا اور اب تک اپنی سپاہ میں کئی گنا اضافہ کر چکا ہوگا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی۔ مادی وسائل کی جنگ میں شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج چوہان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لئے اپنے فوجی ماہرین کے مضبوط دلائل سن کر غوری پر بھی مایوسی طاری ہو گئی تھی مگر پھر فوراً ہی اسے بزرگ کے الفاظ یاد آئے۔ ”خدا مایوس ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ اس کے بعد غوری کے ذہن میں مسلسل یہی الفاظ گونجتے رہے۔ یہاں تک کہ سوتے جاگتے یہی چند الفاظ اس کے تعاقب میں رہتے تھے۔ آخر افغان سپہ سالار کا ذہنی اضطراب ختم ہو گیا اور ایک طویل مدت کی بے قراری سے اسے نجات مل گئی۔ غوری نے اپنے بدن سے چپکے ہوئے خون آلود غلیظ و کثیف پیرہن کو دیکھا، پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

”ہاں! میرا خدا اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے ایک گناہ گار بندے کے جسم سے ذلت و شکست کے فرسودہ لباس کو اتار کر فتح کی خلعت زرنگار پہنائے۔“ شہاب الدین غوری کے یہ الفاظ پرتھوی راج چوہان کے خلاف کھلا اعلان جنگ تھے۔



بالآخر 588ھ میں شہاب الدین غوری ایک لاکھ سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر غزنی سے روانہ ہوا۔ اس بار غوری نے اپنے تمام نامور فوجی سرداروں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ وہی خلیجی، ترکی اور افغانی سردار تھے جو ترائن کی پہلی جنگ میں اسے تنہا چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔ شہاب الدین غوری نے مفرور سرداروں کو سخت سزائیں دے کر ان کی جانیں تو بخش دی تھیں مگر ساتھ ہی یہ احکام بھی جاری کر دیئے تھے کہ یہ لوگ اس کے سامنے نہ آئیں۔ یہ بڑی اذیت ناک سزا تھی۔ کئی سرداروں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہاب الدین غوری کے سامنے آنے کی کوشش کی تو اس نے یہ کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

”تم میری نظر میں دنیا کے سب سے زیادہ بد صورت لوگ ہو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مکروہ ترین چہرے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو اذیت پہنچاؤں۔“

ان معتبوب سرداروں کا خیال تھا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ شہاب الدین غوری کے غصے کی آگ بھی سرد ہو جائے گی..... اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر فوجی ضرورتیں غوری کو ان سرداروں کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور کر دیں گی۔ الغرض اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔ شہاب الدین غوری

کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر جب ان معتبوب سرداروں نے سنا کہ غوری اجیر پر حملہ کرنے کے لئے غزنی سے روانہ ہونے والا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ شہاب الدین غوری نے اپنے لشکر کے لئے نئے سردار منتخب کئے تھے اور انہیں ایسے فوجی لباس عطا کئے تھے جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی مملکت کے بادشاہ ہیں۔

جب مسلمانوں کا یہ لشکر پشاور کے قریب پہنچا تو ایک بوڑھا امیر شہاب الدین غوری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غوری اس بوڑھے امیر کی بہت عزت کرتا تھا۔

”جاں نثاروں کو اب تک یہ علم نہیں ہو سکا کہ جہاں پناہ کا ارادہ کیا ہے اور کس دشمن کی تباہی و بربادی کے لئے اتنا عظیم الشان لشکر لے کر سفر کی زحمت گوارا فرمائی ہے؟“ بوڑھے امیر نے بڑی عاجزی سے عرض کیا۔

شہاب الدین غوری نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔
 ”کیا تجھے معلوم نہیں کہ جس دن سے میں نے پر تھوی راج سے شکست کھائی ہے، اس روز سے نہ اپنی بیوی کا منہ دیکھا ہے اور نہ یہ خون آلود لباس تبدیل کیا ہے۔“
 ”میں جانتا ہوں سلطان!“ یہ کہتے کہتے بوڑھے امیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”تو کچھ نہیں جانتا۔“ شہاب الدین غوری اپنے ماضی کو یاد کر کے بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا.....
 ”بس میرا خدا جانتا ہے کہ یہ پورا سال میں نے انتہائی رنج و غم میں بسر کیا ہے۔ جن غوری اور خلجی سرداروں نے میری خدمت کو نظر انداز کر کے مجھے تنہا میدان جنگ میں چھوڑ دیا تھا، میں نے ان سے سلام دعا تک کو روا نہیں رکھا۔ مجھے ان نمک حرام امیروں سے کوئی امید نہیں ہے۔ مگر خداوند تعالیٰ کے بھروسے پر میں اس لشکر کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔“

”خداوند ذوالجلال آپ کو کامیاب و کامران اور دشمنوں کو ناکام و نامراد کرے۔“ بوڑھے امیر نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ یہ معتبوب امیر اس بار آپ کو مایوس نہیں کریں گے بلکہ پچھلی تمام کوتاہیوں اور غفلت شعار یوں کی تلافی کر دیں گے۔ آپ یقین کیجئے کہ وہ لوگ اپنے گناہ پر سخت ندامت محسوس کرتے ہیں۔ براہ کرم انہیں موقع دیجئے کہ وہ اپنے دامن پر لگے ہوئے بزدلی کے داغوں کو اپنے خون سے دھو ڈالیں۔“

بوڑھے امیر کی درخواست بڑی اثر انگیز تھی۔ اس کے لفظوں کی حرارت سے شہاب الدین غوری پکھل گیا اور اس نے اسی وقت دربار عام منعقد کیا۔ معتبوب امیر پیش کئے گئے۔ غوری نے اپنے مفرور سرداروں کا قصور معاف کر دیا اور انہیں قیمتی خلعت اور مرصع خنجر عطا کئے۔ سرداروں نے اس عنایت خسروانہ کے جواب میں حلف اٹھایا کہ اس بار وہ اپنے امیر کو مایوس نہیں کریں گے اور اہل کفر کے لئے ان ہی کی زمین کو تنگ کر دیں گے۔

دوسرے دن شہاب الدین غوری نے پشاور کو خیر باد کہا اور آگے بڑھا۔ پھر مسلمانوں کا یہ لشکر منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ یہاں پہنچ کر شہاب الدین غوری نے ان امیروں کو گراں بہا انعامات

سے نوازا جنہوں نے اس کی غیر موجودگی میں خیر خواہی اور نمک حلائی کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اس ہنگامہ خیز زمانے میں بھی لاہور کے مسلمان حاکم کی مدد کرتے رہے تھے تاکہ وہ گرد و پیش کے ہندو راجاؤں کا مقابلہ کر سکے۔

پھر لاہور پہنچ کر شہاب الدین غوری نے اپنے ایک معتمد امیر رکن الدین حمزہ کو اجمیر روانہ کیا اور اس کے ذریعے پر تھوی راج اور عام ہندوؤں کو اسلام کی دعوت دی۔

رکن الدین حمزہ نے اجمیر کے راج دربار میں باوازا بلند شہاب الدین غوری کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ”مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کفر کی بستیوں کا رخ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے اللہ اور رسول ﷺ کا پیغام سناتے ہیں تاکہ بے خبر اور نافرمان لوگوں کے لئے حجت قائم ہو جائے۔ اگرچہ پچھلی بار میرا جنگ کا ارادہ نہیں تھا لیکن تُو نے مجھے دھوکا دیا اور لشکر اسلام پر پیچھے سے وار کیا۔ پھر بھی میں تیرے اس تصور کو معاف کرتا ہوں۔ اگر تُو اسلام قبول کر لے تو پھر میرے اور تیرے درمیان کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اجمیر اور دہلی پر تیرا اقتدار بھی قائم رہے اور تجھے آخرت کی نعمتیں بھی میسر آجائیں۔“

پر تھوی راج نے مسلمان رکن امیر الدین حمزہ کی زبانی اسلام کا پیغام سنا اور بھڑک اٹھا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ تیرا سردار شہاب الدین غوری اتنی جلد اپنی شکست اور فرار کو بھول کر مجھے مذہب اسلام کی لوریاں سن رہا ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ میں اوّل و آخر راجپوت ہوں۔ اور ایک راجپوت تلوار کی جھنکار کے سوا کوئی آواز نہیں سنتا۔“

اس کے بعد پر تھوی راج نے شہاب الدین غوری کو انتہائی غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ میں یاد کیا اور سفیر اسلام رکن الدین حمزہ کو ذلیل کر کے اپنے دربار سے نکال دیا۔

رکن الدین حمزہ کے جاتے ہی پر تھوی راج چوہان نے ہندو دھرم کی حفاظت کے نام پر اپنے ہم مذہب حکمرانوں کو خطوط لکھے اور ان سے فوری طور پر مدد طلب کی۔ پر تھوی راج کے مراسلوں کے جواب میں ڈیڑھ سو راجہ اپنی فوج کے ہمراہ ترائن کے مقام پر جمع ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں نے پر تھوی راج کے اجتماعی لشکر کی تعداد سات لاکھ تحریر کی ہے۔ اگر ہم اسے ایک مبالغہ آمیز روایت قرار دیں، تب بھی پر تھوی راج کی فوجی طاقت شہاب الدین غوری سے چار گنا زیادہ تھی۔ تمام مسلمان اور ہندو مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ پر تھوی راج تقریباً چار لاکھ سپاہی لے کر مسلمان سپہ سالار کے مقابل آیا تھا۔ پر تھوی راج کو کثرت سپاہ کے ساتھ یہ رعایت بھی حاصل تھی کہ وہ اپنے علاقے میں جنگ کر رہا تھا۔ یہاں اسے نہ سامانِ رسد کی فکر تھی اور نہ دشوار گزار راستوں کا خوف تھا۔ اس کی فوجیں اپنی آشنائیں پر موسم کی خوشگوار یوں کے ساتھ جمع ہوئی تھیں۔ اور اس کا حریف ناسازگار موسم میں بہت دور سے آیا تھا۔

جنگی نقطہ نظر سے پر تھوی راج کو شہاب الدین غوری پر ہر طرح برتری حاصل تھی..... مگر جب قدرت کسی کو رسوا کرنا چاہتی ہے تو پھر کوئی حجت کام نہیں آتی۔

اس میں اب کیا کوئی دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

آخری آسمانی فیصلہ زمین پر نازل ہوا۔ پرتھوی راج چوہان کی ٹڈی دل فوج اپنے مورچوں سے باہر نکلی مگر خلاف توقع بہت جلد رزقِ خاک ہو گئی۔ راجپوتوں کی روایتی شجاعت ماضی کا ایک فراموش کردہ افسانہ ٹھہری۔ شہاب الدین غوری کی سپاہ تعداد میں بہت کم تھی لیکن اللہ نے مجاہدین اسلام کے دلوں کو تھام لیا تھا۔ یہاں تک کہ پرتھوی راج کی زندگی کے باب میں ذلت و بربادی کی آخری سطر تحریر کر دی گئی۔ بت پرستوں کی لاشیں خود ان کے گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو رہی تھیں، تمام دعوے باطل قرار پائے اور پھر دیکھنے والوں نے پرتھوی راج کو میدانِ جنگ سے فرار ہوتے دیکھا۔ بساطِ مکمل طور پر الٹ چکی تھی، وہ دیوتاؤں سے ایفاءِ عہد نہ کر سکے اور جان بچانے کے لئے ہندوؤں کے سب سے مضبوط مرکز اجمیر کو کسی ویرانے کی طرح لاوارث چھوڑ گئے۔



پرتھوی راج چوہان اس ارادے سے بھاگ رہا تھا کہ وہ شہاب الدین غوری کے دستِ قہر سے بچ گیا تو دہلی پہنچ کر ایک بار پھر راجپوتوں کی بکھری ہوئی قوت کو سمیٹنے کی کوشش کرے گا..... لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ جب مقررہ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو سارے جن و انس مل کر بھی اس ”وقتِ معلوم“ میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں کر سکتے۔ پرتھوی راج نے اپنے چند وفاداروں کے ساتھ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شہاب الدین غوری کے ایک فوجی دستے نے ”دریائے سرتی“ کے کنارے اسے جالیا اور ایک معمولی سی مزاحمت کے بعد ”فخر راجپوت“ زندہ گرفتار ہو گیا۔

جب پرتھوی راج کو زنجیریں پہنا کر شہاب الدین غوری کے سامنے لایا گیا تو برصغیر کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ کثرتِ افواج کا فلسفہ غلط ٹھہرا تھا اور جذبہ و عقائد کی برتری ثابت ہو گئی تھی۔ غوری نے چوہان کو اپنے خیمے میں بے دست و پا دیکھ کر کہا تھا۔

”بے شک! زمین و آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ خدا کے لئے ہے۔ اگر وہ کسی کو سر بلند کرنا چاہے تو پھر اس کائنات کی تمام طاقتیں مل کر بھی اسے پست نہیں کر سکتیں۔“ آج غوری کے ہونٹوں پر کسی مغرور فاتح کی طرح نغمہ لاف زنی نہیں تھا۔ ایک اقرار احسان شناسی تھا، ایک حرفِ عجز و انکسار تھا۔

پھر اس نے بتوں کی قدیم سرزمین پر سجدہ شکر ادا کیا اور اپنے رب کی تسبیح بیان کی۔ اسی دوران کچھ سپاہیوں نے شہاب الدین غوری کو خبر دی کہ یہاں ایک مسلمان درویش بھی گوشہ نشین ہیں، افغان سپہ سالار کے لئے اجمیر میں کسی کلمہ گو بزرگ کی موجودگی بڑی حیران کن تھی۔ وہ بے قرار سا ہو گیا۔ پھر اس کے مضطرب قدم اپنے چند معتمد سرداروں کے ہمراہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارگاہِ جلال کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فاتح ہند نے اس درویش بے سرو ساماں کے روئے مبارک کی طرف دیکھا جو بہت دنوں سے صحرائے باطل میں تنہا اذان دے رہا تھا۔ غوری کی آنکھیں جمالِ معرفت کی تاب نہ لاسکیں اور بے

اختیار سجدہ ریز ہو گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی۔ دماغ کے بعید ترین گوشے روشن ہو گئے۔ کئی ماہ قبل دیکھے جانے والے خوابوں کا ایک ایک عکس تازہ ہو گیا۔ جس ہستی محترم نے عالم خواب میں نمودار ہو کر شہاب الدین غوری کو اجیر پر حملے کا حکم دیا تھا، وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تھے۔

غوری کی نگاہوں کے سامنے سے تمام حجابات اٹھ گئے۔ افغان سپہ سالار جوش عقیدت میں بے تابانہ آگے بڑھا اور اپنی دستارِ فضیلت حضرت خواجہؒ کے قدموں میں ڈال دی۔

کلاہ خسروی، جس کے حصول کے لئے انسانی خون کے دریا بہائے جاتے ہیں آج وہی کلاہ اقتدار ایک مردِ درویش کے پائے مبارک پر رکھی ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے غوری کی دستار اٹھائی اور دوبارہ اس کے سر پر باندھتے ہوئے فرمایا۔

”تمہارے دشمن قوی اور بالادست تھے مگر خداوند ذوالجلال نے انہیں اپنی قدرت سے پست کر دیا۔ اب لازم ہے کہ تم بھی حکومت الہیہ کے سلسلے میں اپنی کوششیں تیز کر دو۔ عدل و احسان کو اپنا شعار بناؤ اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو ان کے مرکز کی طرف بلاؤ۔“

اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنی دعاؤں کے سائے میں شہاب الدین غوری کو رخصت کیا۔

روایت ہے کہ غزنی پہنچ کر شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ مفتوح حکمران کی آنکھیں نکال کر غوری نے اپنے قہر و نفرت کا اظہار کیا۔ افغان سپہ سالار کی طرف سے تشدد کے اس مظاہرے کا پس منظر پرتھوی راج کی وہ بزدلانہ سازش تھی جس نے ترائن کی پہلی جنگ میں شہاب الدین غوری کو نہ صرف شکست سے دوچار کیا تھا بلکہ افغان مجاہد کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ آج جب پرتھوی راج بیڑیوں میں جکڑا ہوا غوری کے سامنے آیا تو ماضی کے تمام زخم ہرے ہو گئے اور پھر وہ جوشِ جذبات میں حد سے گزر گیا۔ جس وقت پرتھوی راج کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکالی جا رہی تھیں، اس ساعت سنگین میں ”فخر راجپوت“ کو اپنی بوڑھی ماں کی وہ نصیحت یاد آرہی تھی۔ جس میں اس نے اپنے مغرور بیٹے کو مسلمان درویش کا احترام کرنے کی ہدایت کی تھی..... مگر قدرت جن کی سماعتوں پر پہرے بٹھا دیتی ہے، وہ ایک حرف سننے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اور جب شمشیرِ ازل پرتھوی راج کی شہ رگ کے قریب پہنچی تو اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے وہ الہامی الفاظ یاد آئے۔

”میں نے اسے بہ حکم خدا زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کیا۔“

یقیناً اس موقع پر راجپوت حکمران کے سینے میں بہت سی حسرتیں چل کر رہ گئی ہوں گی لیکن وقت گزر چکا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے پرتھوی راج کے کاندھوں سے گردن کا بوجھ ہلکا کر دیا گیا۔



اس عظیم الشان فتح کے بعد شہاب الدین غوری نے مفتوحہ علاقوں کا انتظام اپنے وفادار غلام قطب

الدین ایک کے سپرد کر دیا۔ ایک نے سید حسن مشہدی کو اجمیر کا داروغہ مقرر کیا اور ان کی زیر نگرانی پرتھوی راج کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ بظاہر وہ راجہ کہلاتا تھا مگر ایک ماتحت سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں تھی۔ تمام امور مملکت کے نگران حضرت سید حسن مشہدی تھے۔ آپ کو عام طور سے خنگ (سفید گھوڑا) سوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت حسن مشہدی ایک نہایت پارسا بزرگ تھے۔ عقائد کے اختلاف کے باوجود آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی فتح کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اہل ہندو اسلامی حکومت کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر ایک خفیہ سازش کے ذریعے پرتھوی راج کے بیٹے پر حملہ کیا گیا۔ عام ہندوؤں کی نظر میں وہ مسلمانوں کا غلام تھا اس لئے اجمیر اور گرد و نواح کے بت پرست اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخر پرتھوی راج کے ایک دور کے رشتہ دار بھیم راج کو آگے بڑھایا گیا۔ بھیم راج نے منتشر راجپوتوں کو جمع کیا اور پھر پوری طاقت کے ساتھ اجمیر پر حملہ آور ہوا۔ پرتھوی راج کا بیٹا ایک تو اس اچانک حملے سے بے خبر تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی فوجی طاقت بہت مختصر تھی۔ نتیجتاً اسے شکست ہوئی اور بھیم راج، اجمیر پر قابض ہو گیا۔ پھر کے پجاری اس فتح سے بہت خوش تھے کہ انہوں نے راجپوتوں کی سرزمین پر دوبارہ ہندو پرچم لہرا دیا تھا..... اس جنگ کا سب سے المناک پہلو یہ تھا کہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت سید حسن مشہدی بھی کافروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (آج بھی تارا گڑھ کی سب سے بلند چوٹی پر آپ کا مزار اہل دل کے لئے مرکز نظر ہے)

جب قطب الدین ایک کو یہ روح فرسا خبر ملی تو وہ کچھ دن کے لئے اُداس و غمگین نظر آنے لگا۔ عام سپاہیوں کا خیال تھا کہ وہ اس سلسلے میں فوری طور پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرے گا مگر ایک بڑی خاموشی سے اس حادثے کو برداشت کر گیا۔ بھیم راج نے قطب الدین ایک کے سکوت کو اس کی کم ہمتی پر محمول کیا اور پھر یہ ہندو حکمران اور زیادہ بے باک ہو گیا۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ ایک دوسری جنگی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ فی الوقت اجمیر کی شکست کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بھیم راج نے اس سیاسی مصلحت کو غلط مفہوم پہنایا اور قطب الدین ایک کے لشکروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ایک نے اس موقع پر بھی تغافل سے کام لیا مگر جب بھیم راج کی شراٹگیزیاں حد سے بڑھ گئیں تو 591ھ میں مسلمان حکمران پلٹ پڑا۔ قطب الدین ایک کا انداز ایسا ہی تھا جیسے جنگلی جانور کسی شیر کو بوڑھا سمجھ کر اس کے گرد اُچھل کود کر رہے ہوں..... اور جب وہ شیر جاگا تو جنگل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اگرچہ اس عرصے میں بھیم راج نے مذہب کے نام پر ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی لیکن وہ زیادہ دیر تک ایک کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ابتدائی مرحلے میں دونوں فریقوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی مگر ایک نے اپنی حکمت عملی سے دشمن پر قابو پا لیا۔ دوسرے معرکے میں راجپوتوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یہاں تک کہ ان کا سربراہ بھیم راج میدان جنگ سے فرار ہوتے ہوئے ذلت و رسوائی کے ساتھ مارا گیا۔ اب اجمیر پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور یہ پتھر ملی زمین تمام ناپسندیدہ عناصر سے پاک ہو گئی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی شدید نا سازگار موسم میں بھی پیغام حق سنار ہے تھے لیکن مسلمانوں کی دوسری فتح نے فضا کو

نہایت خوشگوار بنا دیا تھا جس کے نتیجے میں تبلیغ اسلام کا دائرہ لچک بہ لچک وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ قطار در قطار حضرت خواجہ کی بارگاہ عالیہ میں داخل ہو رہے تھے اور سینکڑوں دیوتاؤں کی بستی نغمہ تو حید سے گونج رہی تھی۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے رسول اور بندے ہیں۔“

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ رسالت مآب ﷺ کے حکم سے ہندوستان تشریف لائے تھے تو اس وقت آپؐ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی آپؐ کے ہمراہ تھے۔ آپؐ نے حضرت قطبؒ کو مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے دہلی مقرر فرمایا تھا اور خود اجمیر تشریف لے آئے تھے۔ ہندوستان کے دونوں اہم مراکز پر تبلیغ اسلام زور و شور سے جاری رہی۔ اگرچہ شروع میں بت پرستوں نے بہت زیادہ رخنہ اندازی کی لیکن خدا نے جلد ہی اہل باطل کو نیست و نابود کر دیا اور شہاب الدین غوری کے بعد قطب الدین ایک نے دور تک اسلامی پرچم لہرا کر ان لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کر دیں جو خدائے واحد کا پیغام پہنچانے کے لئے اپنے وطن، اپنی زمین اور اپنے عزیزوں سے آشنائی کے تمام رشتے توڑ آئے تھے۔ اب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تحریک اسلامی میں خلل ڈالنے والی کوئی آمرانہ طاقت موجود نہیں تھی۔ راجستھان کے سرکش راجپوت گردنیں جھکائے ہوئے بارگاہ خواجہؒ میں داخل ہو رہے تھے اور صدیوں کی بنجر زمین میں ایک ایسی فصل بوئی جا رہی تھی جس کی جڑیں آخرت تک پھیلی ہوئی تھیں۔ معتبر روایتوں کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ راجپوت حضرت خواجہؒ کے دست حق پرست پر ایمان لائے اور جو لوگ اس دولت لازوال سے محروم رہے ان کا بھی یہ حال تھا کہ وہ اپنی آخری سانس تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا احترام کرتے رہے۔ انتہا یہ ہے کہ جب دیوتاؤں کے ماننے والے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے تو حضرت خواجہؒ کے آستانے پر حاضری دیتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ آپؐ ان بت پرستوں کے ساتھ بھی خوش خلقی سے پیش آتے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے۔ بے شمار ہندو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں سے فیض یاب ہوئے۔ اس جذباتی موقع پر کبھی کبھی کچھ مسلمان آپؐ سے عرض کرتے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ بھی ان سے منہ موڑ لیجئے۔“

حضرت خواجہؒ ان مسلمانوں کو جواب دیتے ہوئے فرماتے۔ ”میں رحمت اللعالمین ﷺ کا غلام ہوں اور ایک غلام کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے احکام پر پوری دیانت داری کے ساتھ عمل کرے۔ سورج کی روشنی مومن و کافر میں امتیاز نہیں کرتی۔ برسات کا بادل سب انسانوں پر یکساں برستا ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت سورج کی کرن اور بارش کے پانی کی مانند ہے۔ اسلام میں جبر و اکراہ نہیں۔ جس کا جی چاہے اپنا رخ کعبے کی طرف کر لے اور جس کا دل چاہے اپنا چہرہ بت کدے کی جانب پھیر لے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ آج خدا نے مسلمانوں کو اپنے فضل سے اقتدار عطا کیا ہے۔ کل تک جو ضعیف و ناتواں تھے اب وہ بھرپور طاقت رکھتے ہیں۔ مگر ہم مسلمان، غیر مذہب کے لوگوں پر اپنے

عقائد مسلط نہیں کر سکتے۔ جبر و تشدد سے لوگوں کے راستے بدلے جاسکتے ہیں لیکن خدا اس عمل کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام امن و آشتی ہے، اسلام محبت و راستی ہے۔ مسلمان بیمار روحوں کا بھی مسیحا ہے اور مریض جسموں کا بھی معالج۔“

حضرت خواجہ کا یہی فراخ دلانہ طرز عمل تھا جس نے راجپوتوں کے صنم خانہ دل کو مسمار کر کے رکھ دیا تھا اور وہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر اس لین دین کے حصار میں داخل ہو گئے تھے جس کی پہلی آواز فاران کی چوٹیوں پر گونجی تھی۔ اُحد اور تارا گڑھ کی پہاڑیوں میں بظاہر بہت فاصلہ تھا مگر ہادی برحق علیہ السلام کے نام لیواؤں نے تمام فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اگر حضرت خواجہ، شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک کو ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے تو مقامی ہندوؤں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا اور بہادر راجپوتوں کی عبرت ناک ہلاکت پر مرثیہ پڑھنے والے بھی دور دور تک نظر نہیں آتے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اسلام دشمنوں سے خوفناک انتقام لینے پر قادر تھے لیکن آپؒ نے شر پسند شہریوں کے جسم پر خراش بھی نہ آنے دی۔ انہیں ہر طرح غوری اور ایبک کے قہر و غضب سے محفوظ رکھا۔ آپؒ نے اسلامی اخلاق کے عظیم الشان مظاہرے سے بت پرستوں کے دل جیتے۔ جگر مراد آبادی کے بقول۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فاتح ہند تھے۔ آپؒ نے تیز شمشیروں کی بجائے حسنِ عمل کے نرم و نازک ہتھیاروں سے یہ تاریخی جنگ لڑی۔ اگر حضرت خواجہؒ اسلامی تلوار کے بے دریغ استعمال کی اجازت دے دیتے تو پھر اس قدر طویل و عریض ملک میں اہل ہنود کا وجود کہاں باقی رہ جاتا؟ جن متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو مسلمانوں کے قتال و جدال سے شکوہ ہے، وہ اس زندہ حقیقت پر غور کریں۔



مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پورے انہماک سے انسانی روح کی بیماریوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؒ کی تعلیمات میں اسلام کی فطری سادگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی۔ اس لئے پتھروں، جانوروں اور درختوں کے پجاری دیوانہ وار کھنچے چلے آ رہے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی مجلس نورانی میں اعلیٰ ذات کے برہمن اور حقیر نسل کے اچھوت دونوں برابر تھے۔ صدیوں کی زخم خوردہ تہذیب پہلی بار اپنی جراحاتوں کا مرہم تلاش کر رہی تھی۔ طریقت کے تمام سلسلوں میں سلسلہ چشتیہ سب سے زیادہ رواداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نتیجتاً ہندوستان کے لوگ اس سلسلے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

خاندان چشتیہ کے کچھ بزرگ ”سماع“ سے شغف رکھتے تھے۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی عارفانہ کلام کو روح کی غذا سمجھتے تھے۔ آپؒ کے اس طرز عمل کے بارے میں کچھ تنگ نظر مخالفین کا خیال ہے کہ حضرت خواجہؒ کا ذوق سماع بھی ہندو موسیقی کے جواب میں تھا۔ اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ اہل ہنود زمانہ قدیم سے موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اس لئے انہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سماع میں روحانی طور پر بہت زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی۔ اسلام کے دشمن اور سلسلہ چشتیہ کے مخالفین اس

دلیل کے سہارے یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہندوؤں کے موسیقی آشنادل و دماغ کو اپنی طرف موڑنے کے لئے حضرت خواجہؒ نے ہندوستان میں ”سماع“ کو فروغ دیا تھا۔ یہ ایک متنازع موضوع ہے جو آئندہ صفحات میں زیر بحث آئے گا۔ مختصر عرض ہے کہ سلسلہ چشتیہ کی محفل سماع کو ہندوؤں کی بزم موسیقی سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ ہندوؤں کے یہاں قدم قدم پر سازوں کا بکثرت استعمال ہوتا تھا جو کئی ہزار سال گزر جانے کے بعد آج بھی موجود ہے جبکہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آلات موسیقی سے مکمل اجتناب فرماتے تھے۔ (اب یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں آنے والے صوفیوں نے احتیاط نہیں برتی اور سماع میں چنگ و رباب تک شامل کر دیئے گئے۔ بہر حال ان حضرات کا عمل باخبر مسلمانوں کے لئے حجت نہیں) جب سماع کی شکل بگڑتے بگڑتے قوالی تک پہنچ گئی تو پراگندہ ذہن لوگ برملا کہنے لگے کہ ہندوستان میں اسلام یا تو بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے یا پھر موسیقی کے ذریعے عوام کو نئے مذہب کی رغبت دلائی گئی ہے۔ دراصل مفسدین کی یہ الزام تراشیاں محض اس لئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تاریخ ساز مشن کی اہمیت کو کم کیا جائے..... مگر یہ ساری تگ و دو ایک احتقانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے نزدیک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ با اثر اور دل نواز شخصیت ہیں کہ جنہوں نے انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنے ورثے میں کم و بیش پچاس کروڑ مسلمان چھوڑے ہیں۔ آپؒ سراپا محبت و جمال تھے۔ اس ادائے خاص کو دیکھ کر تمام ہندو اور مسلمان حضرت خواجہؒ کو ”غریب نواز“ سمجھتے تھے۔ آج بھی بے شمار انسان آپؒ کے حقیقی نام سے واقف نہیں..... ”غریب نواز“..... اور وہ اس لفظ کے سوا کچھ جاننا بھی نہیں چاہتے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں غریبوں سے اتنی محبت کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا انسان گزرا ہو..... اور یہ اسلام کی بخشی ہوئی محبت ہی تھی کہ جس کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے دشمنوں کے دل بھی مسخر کر لئے تھے۔



اجمیر پر مسلمانوں کے مکمل اقتدار کے بعد بظاہر کافروں کی سرکشی ختم ہو گئی تھی مگر در پردہ سازشیں اب بھی جاری تھیں۔ بیشتر ہندو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مخالفت سے باز آچکے تھے۔ تاہم کسی کسی دل پر کفر کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ وہ غریب نواز کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ خادم نے ایک اجنبی شخص کے آنے کی اطلاع دی۔ آپؒ نے نو وارد کو فوراً ہی طلب کر لیا۔ اجنبی شخص نے آتے ہی بڑے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور پھر بیٹھتے ہی غریب نوازؒ کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

”میری دیرینہ آرزو تھی کہ آپؒ کی قدم بوسی سے شرف یاب ہو جاؤں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج اس نے مجھ گناہ گار و مفلس کی دعا سن لی۔ یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ ہے کہ میں آپؒ کا چہرہ مبارک دیکھ رہا ہوں۔“

اجنبی شخص کا انکسار اور عقیدت مندانہ لہجہ دیکھ کر حاضرین مجلس بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ خود حضرت خواجہؒ کے ہونٹوں پر بھی ایک جاں فزا تبسم نمایاں تھا۔ جب وہ شخص اپنی گفتگو تمام کر چکا تو غریب نوازؒ نے اس سے فرمایا۔

”آدمی کو فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ وقت بہت قیمتی شے ہے۔ اے بندہ خدا! میری جھوٹی تعریفیں چھوڑ اور اس کام کی تکمیل کر جس کے لئے تجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔“

آپؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی وہ اجنبی شخص دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگا۔ حاضرین مجلس اس کے جسم کی لرزش دیکھ کر حیران تھے۔ کچھ دیر تک اسے اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رہا۔ پھر جب اعصاب کسی قدر پرسکون ہوئے تو اس نے اپنے پیرہن کی جیب سے ایک تیز خنجر نکال کر فرش پر ڈال دیا اور خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

”غریب نواز! میں آپ سے بے حد عقیدت رکھتا ہوں مگر میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا۔ سیم وزر کی خواہش بڑی ہلاکت خیز شے ہے۔ اجمیر کا ایک مالدار ہندو مجھے بہت دنوں سے دولت کثیر کا لالچ دے کر ورغلا رہا تھا۔ میں نے اپنے جذبہ ناپاک کو دبانے کی انتہائی کوشش کی لیکن حرص و ہوس کی یلغار نے میرے دل و دماغ کو تباہ کر ڈالا۔ بہتر ہے کہ آپ بھی میرے قتل کا حکم جاری فرمادیں۔ شاید اس طرح میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔“ اجنبی، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پائے مبارک پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔

”اس شخص کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جواباً فرمایا۔

”میں اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے تجھے میرے قتل کے لئے خنجر فراہم کیا..... اور تجھ پر بھی کوئی الزام نہیں کہ تُو اپنے نفس سے مجبور تھا۔ مسلمان نفرت کے بدلے نفرت فروخت نہیں کرتا۔“

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اس اجنبی کو معاف کر دیا تھا مگر وہ بدستور آپؒ کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا..... ”جب تک آپ میرے حق میں دعائے خیر نہیں فرمائیں گے، میں اس وقت تک آستانہ عالیہ سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔“ اجنبی کی عجیب و غریب ضد تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم اور عقیدت مندا سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے مگر آپؒ نے اس پر اپنی محبتوں کے خزانے لٹا دیئے۔ جو شخص قتل کرنے آیا تھا، وہ خود حضرت خواجہؒ کی بارگاہ جلال میں پہنچ کر قتل ہو گیا۔ پھر اللہ نے اسے نئی زندگی بخشی۔ یہاں تک کہ وہ فسق و فجور سے تائب ہوا اور اس کے نفس کی ساری کثافتیں دور ہو گئیں۔ اس نے پاکباز زندگی بسر کی اور کئی بار حج کی سعادت حاصل کی۔ پھر طواف کے دوران ہی اپنے خالق سے جا ملا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا یہ خادم ”مجاورانِ مکہ“ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہے۔

ہے رشکِ اک جہان کو جوہر کی موت پر

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

نگاہِ مردِ مومن سے انسانی تقدیر کا بدل جانا کوئی طلسمی داستان نہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

کی حیاتِ پاک میں ایسے بے شمار مرحلے آئے کہ جب آپؐ نے ایک گناہ گار کو نظر بھر کے دیکھا اور اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ مشہور حدیث ہے۔

”مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔“

بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وہی مردِ مومن تھے جن کی ایک جنبش چشم سے روحوں کے خرابے آباد ہو جاتے تھے۔ صوفی حمید الدین ایک بڑے تارک الدین بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا شمار حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خلفاء میں ہوتا ہے۔ اجمیر سے چند میل کے فاصلے پر شہر ناگور آباد ہے۔ صوفی حمید الدینؒ اسی کے ایک موضع سواہی کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور روایت ہے کہ وہ اپنے آغازِ شباب میں ایک گم کردہ راہ انسان تھے۔ مالی حالت اس قدر خراب تھی کہ گزراوقات بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ لیکن اس مفلسی کے باوجود صوفی حمید الدینؒ کو خدا نے غیر معمولی حسن و جمال سے نوازا تھا۔ ان کے عشق میں مبتلا ہو کر بہت سی عورتیں اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ صنفِ نازک کی اس وارفتگی نے خود ان کے دل و دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ صوفی حمید الدینؒ اور ان کے کچھ احباب بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ ایک طویل عرصے تک یہ مشغل جاری رہا۔ پھر انہیں خدا نے ہدایت بخشی۔

جب صوفی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روحانی کمالات کی شہرت سنی تو ایک روز سلطان الہندؒ کے دربارِ معرفت میں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے چہرہ مبارک پر نظر پڑی، ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئے۔ پھر جب کچھ دیر بعد طبیعت بحال ہوئی تو تاجدارِ روحانیت سے کہنے لگے۔

”مجھے غلامی کی سند عطا کیجئے۔“ صوفی حمید الدین کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔

”پہلے اپنے صنم خانہ دل کی تو خبر لو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ”جہاں سینکڑوں بت سجائے جاتے ہوں وہاں عشق الہی کا گزر نہیں ہوتا۔ ایک کو پانے کے لئے ہزاروں سے ترکِ تعلق کرنا پڑتا ہے۔“

”خدا کی قسم! میں تمام اصنامِ خیالی کو ریزہ ریزہ کر دوں گا۔“ صوفی حمید الدینؒ رقتِ قلب کے ساتھ التجا کر رہے تھے۔ ”اب اس کے سوا میرے دل ویراں میں کوئی نہیں آئے گا۔“ ان کی یہ بے اختیاری دیکھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت متاثر ہوئے اور پھر صوفی حمید الدینؒ کو اپنے حلقہٴ ارادت میں شامل فرمالیا۔

گناہوں سے تائب ہونے کے بعد جب پرانے ہم مشرب دوستوں نے انہیں کھوئی منزل کی جانب بلایا تو صوفی حمید الدینؒ بڑے جذب کے عالم میں کہنے لگے۔

”میں دنیا کی طرف جانے والے تمام راستے بھول گیا۔ اب اگر بہشت کی حوریں بھی میرے سامنے آجائیں تو پتہ نہیں کہ میں انہیں دیکھوں گا یا نظر انداز کر دوں گا۔“

کیف و نشاط میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنے دیرینہ ساتھی کا جواب سن کر حیران رہ گئے۔ وہ زندگی کی

آشارا ہوں کو چھوڑ کر اتنی دور نکل آئے تھے کہ حرص و ہوس کی کوئی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر صوفی حمید الدین ناگوریؒ کی طبیعت کا انقلاب ہندوستان کی روحانی تاریخ میں ایک یادگار حیثیت اختیار کر گیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگ بھی انہیں ”شیخ المشائخ“ اور ”سلطان التارکین“ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہ سب کچھ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا فیضانِ نظر تھا۔



حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سراپا جمال و محبت تھے۔ کیا بھی ناخوشگوار موسم ہوتا مگر دیکھنے والوں کو آپؒ کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک دل نواز تبسم نظر آتا۔ سرزمین ہند کا ایک ایک گوشہ جاہلوں اور سرکشوں سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے دربارِ معرفت میں کبھی کبھی نہایت بے ہودہ اور گستاخ لوگ آتے تھے لیکن آپؒ ان کے سامنے بھی اسلام کی بے مثال رواداری اور محبت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی سنگ دلی نرمی میں تبدیل ہو جاتی اور وہ تائب ہو کر پارساؤں جیسی زندگی بسر کرنے لگتے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنی پوری زندگی میں نہ کسی کو بد عادی اور نہ کسی نے آپؒ کو حالتِ غضب میں دیکھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے طویل دورِ حیات میں بس دو مواقع ایسے آئے تھے کہ جب آپؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ ایک وہ لمحہ تھا جب پرتھوی راج چوہان کے ظلم و ستم سے خلقِ خدا تنگ تھی اور آپؒ نے مجبور ہو کر راجپوت حکمران کی ہلاکت کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ اگر اس واقعہ کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ان کیفیات کا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ستم رسیدہ انسانوں کی نجات کے لئے حضرت خواجہؒ کی ایک کوشش تھی جسے اللہ نے فتح و نصرت سے ہمکنار کیا..... دوسرا لمحہ وہ تھا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ایک مرید کو ایک سود خور شخص نے ذلیل کرنا چاہا تو آپؒ اپنے خدمت گار کی یہ رسوائی برداشت نہ کر سکے اور لوگوں نے دیکھا کہ اس وقت آپؒ کی شانِ جلالی کا اظہار ہو رہا تھا مگر یہاں بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا غصہ اپنے نفس کی خاطر نہیں تھا۔

اس واقعہ کے راوی آپؒ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔ حضرت قطبؒ فرماتے ہیں..... ”میں عرصہ دراز تک اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر رہا ہوں مگر میں نے کبھی آپؒ کو غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ سوائے ایک بار کے، جب غریب نوازؒ اپنے مرید شیخ علیؒ کے ساتھ حجرے میں قیام فرماتے تھے۔ اچانک ایک شخص خانقاہ میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی شیخ علیؒ کا گریبان پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اور اپنی زبان سے نہایت نازیبا کلمات ادا کرنے لگا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ اس لئے آپؒ نے بد تہذیبی کے مظاہرے کی وجہ دریافت کی۔ اجنبی نے غضب ناک لہجے میں بتایا کہ شیخ علیؒ اس کا قرض دار ہے اور مسلسل وعدے کرنے کے باوجود رقم کی ادائیگی نہیں کر رہا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجنبی شخص سے قرض کی رقم پوچھی تو صرف چند پیسوں کی بات تھی۔ آپؒ نے قرض خواہ کو محبت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے،

وہاں کچھ دن اور صبر کر لے۔ اس وقت کوئی بھی شریف النفس انسان ہوتا تو حضرت خواجہ کی گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھ لیتا..... مگر وہ سود خور اپنی حد سے گزر گیا تھا اور اس نے تمام آداب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کی بس ایک ہی ضدھی کہ وہ اسی وقت شیخ علیؒ سے اپنے پیسے لے کر جائے گا ورنہ تشدد کے ذرائع استعمال کرے گا۔ یہ ایک بڑا جارحانہ عمل تھا۔ پھر بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اتمام حجت کے طور پر اسے آخری وقت تک سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ مصالحت کا ایک لفظ بھی سننے کو آمادہ نہیں ہوا تو آپؒ نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ یہ وہی چادر تھی جسے حضرت خواجہ غریب نوازؒ اپنے دوش مبارک پر ڈالے رہتے تھے۔

اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر آپؒ نے غضب ناک لہجے میں اس اجنبی شخص سے فرمایا۔ ”علیؒ کا گریبان چھوڑ دے اور اپنی رقم زمین پر سے اٹھا لے۔“

ابھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ پوری چادر نقرئی سکوں سے بھر گئی۔ اجنبی بدحواس ہو گیا اور شیخ علیؒ کا گریبان چھوڑ کر دولت کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھنے لگا۔ اسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو سکوں کے ڈھیر سے اپنی مطلوبہ رقم اٹھانے لگا۔ سود خور نے اپنی پوری زندگی میں دولت کا اتنا بڑا انبار نہیں دیکھا تھا۔ کثرت مال نے اسے بددیانتی پر اکسایا، چند لمحوں میں نیت بگڑ گئی اور پھر اجنبی شخص نے اپنی رقم سے کہیں زیادہ سکے اٹھا کر جیب میں ڈال لئے۔ اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس سے پوچھا کہ اب تو شیخ علیؒ کی طرف تیرا کوئی مطالبہ باقی نہیں رہا؟ سود خور نے اثبات میں جواب دیا اور تیزی کے ساتھ خانقاہ سے نکل کر چلا گیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس چوری کی خبر نہ ہو جائے۔ مگر آپؒ ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی قصد انجان بن گئے تھے۔

جب سود خور چلا گیا تو حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اپنے مرید شیخ علیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ تو اس ذاتِ بے نیاز کی دستگیری ہے کہ وہ اپنے عاجز بندوں کی مشکل کشائی فرماتا ہے اور انہیں اہل دنیا کے سامنے رُسا ہونے سے بچا لیتا ہے..... مگر بندگی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان سے حاجت روائی کی اُمید رکھے۔ قرض اور درویشی میں کوئی نسبت نہیں۔“

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں..... کچھ دن بعد میں نے اس اجنبی سود خور کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا لیکن اس بار وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے بیمار ہے۔ سارا غرور و تکبر رخصت ہو چکا تھا۔ اب وہ بھکاری کی مانند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پائے مبارک پر سر رکھے رو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ بالکل خشک ہو چکا ہے اور کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹک رہا ہے۔ حضرت

سلطان الہند نے دریافت کیا کہ اب کیا تکلیف ہے؟ اجنبی نے گریہ وزاری کرتے ہوئے بتایا کہ جس دن وہ اپنی رقم لے کر گھر گیا، اسی روز اس کے دائیں ہاتھ میں شدید درد اٹھا۔ شہر کے تمام طبیبوں سے رجوع کیا مگر وہ درد ناقابل علاج ٹھہرا۔ پھر کچھ دن بعد دوسری آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ درد تو ختم گیا لیکن ہاتھ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر اجنبی نے اپنا بے ہنگم مفلوج ہاتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سامنے پیش کر دیا۔

سلطان الہند نے جواباً فرمایا۔ ”میں کوئی طبیب نہیں ہوں۔ کسی اچھے معالج کو دکھاؤ۔“
سود خور دوبارہ زار و قطار رونے لگا اور پھر اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ حضرت خواجہ کا مجرم ہے۔ اس نے شیخ علیؒ کے قرض کی ادائیگی کے دن اپنے مطالبے سے زیادہ سکے اٹھا لئے تھے۔ پھر یہی چوری اس کے لئے عذاب جاں بن گئی۔ اب وہ اپنے جذبات حرص و ہوس پر سخت نادم ہے۔ اگر حضرت خواجہؒ نے اسے معاف نہیں کیا تو وہ تمام عمر اسی طرح زمانے کی ٹھوکروں میں رہے گا۔

اجنبی کا لہجہ اس قدر رقت آمیز تھا کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کو اس پر رحم آ گیا۔ تاہم آپؒ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے شخص! تو میرا مجرم نہیں۔ سبکوں کا وہ انبار تو اللہ کے خزانوں میں سے ایک حقیر خزانہ تھا۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی بندہ چوری کر کے اپنا رزق حاصل کرتا ہے یا اسے حلال روزی کی جستجو ہوتی ہے؟ ہر انسان مقررہ وقت پر اپنا نامہ اعمال دیکھ لے گا۔ تیرے ہاتھ کا اس طرح سوکھ جانا چوری کے باعث نہیں، شیخ علیؒ کی دل آزاری کا سبب ہے۔ اگر وہ تجھے معاف کر دے تو پھر میں بھی تیری صحت یابی کے لئے بارگاہ خداوندی میں عرض کر دوں گا۔“

وہ شخص بے قراری کے عالم میں اٹھا اور اس شخص کے قریب پہنچا جہاں حضرت شیخ علیؒ اپنے پیرو مرشد کے لئے کھانا پکا رہے تھے۔ اگرچہ شیخ علیؒ اس شخص کی طرف سے بہت آزرہ خاطر تھے لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بنیادی تعلیم ہی یہی تھی کہ دشمنوں کو بھی معاف کر دو۔ شیخ علیؒ نے پیرو مرشد کی تربیت کے زیر اثر اس شخص کو دل کی گہرائی سے معاف کر دیا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نماز ادا کرنے کے بعد اجنبی کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور اپنا دست مبارک اس کے مفلوج ہاتھ پر تین مرتبہ پھیرا۔ اجنبی کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے خون کی گردش اچانک تیز ہو گئی ہو۔ زندگی کی حرارت سے محروم ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ چند روز بعد وہ شخص مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

یہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بڑی کرامت تھی کہ خدا نے آپؒ کو ایک خاص اندازِ مسیحائی بخشا تھا جس کے اثر سے اجنبی کا جسمانی عارضہ ختم ہو گیا تھا لیکن اس کرامت کا زیادہ روشن پہلو یہ تھا کہ وہ سود خور مریض صحت یاب ہو کر اپنے گھر واپس نہیں گیا۔ ایک بار آپؒ کے آستانے پر حاضر ہوا تو پھر اسی در کا پابند ہو کر رہ گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل تک جو شخص حرص و ہوس کا غلام تھا، آج اس کے قلب کی

تمام کثافتیں دور ہو گئی تھیں۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنا سارا مال و زر خدا کی راہ میں لٹا رہا تھا۔ روح پر برسوں کے چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ رہے تھے اور قلب کی تاریکیوں سے تیز روشنی کی ایک کرن پھوٹ رہی تھی۔

لوگوں نے اس کی طبیعت کا یہ انقلاب دیکھ کر پوچھا۔ ”تُو نے اپنی متاعِ حیات اتنی آسانی سے لٹا دی۔ اب کس کے سہارے زندہ رہے گا؟“

اس نے سرِ بازارِ نعرۂ مستانہ بلند کیا اور دنیا والوں سے چیخ کر کہا۔ ”میں انسانی خون میں ڈوبی ہوئی دولت تمہیں واپس کرتا ہوں۔ مجھے غریب نواز کی ایک نظر کافی ہے۔“



حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی چشمِ کرم نے اجمیر کے باشندوں کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ بت پرست اپنے صنم خانوں کو توڑ کر مسجدیں تعمیر کر رہے تھے۔ سود خوری جن کا آبائی مذہب تھا، وہ اپنی زندگی کا تمام سرمایہ اللہ کی راہ میں بے دریغ لٹا رہے تھے۔ جن کے بازارِ ہوس میں نسوانی عزت و آبرو کی بولیاں لگائی جاتی تھیں، وہ ناموسِ زن کے محافظ بن گئے تھے، جن کی راتیں شرابِ سرخ سے روشن تھیں، وہ ہمیشہ کے لئے کوچۂ لذت و خمار سے نکل آئے تھے، جو قمار خانہ وقت میں اپنی عورتوں تک کو ہار جاتے تھے، وہ زندگی کی بساط پر محنت و جفاکشی کی بازی کھیل رہے تھے۔ پپیل کے درختوں، زہریلے سانپوں، اڑتے پرندوں، گھاس چرتے جانوروں اور بہتے دریاؤں کو خدا ماننے والے اب ایک معبود کے آگے سجدہ ریز تھے اور یہ سب کچھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا فیضانِ نظر تھا۔

ایک طرف اہل اجمیر اپنی خوش بختی پر ناز کر رہے تھے اور دوسری طرف حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے بعض عقیدت مندوں کو آتشِ فراق نے جلا ڈالا تھا۔ ان سوختہ جانوں میں سرفہرست آپؒ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ جب سلطان الہندؒ تبلیغِ اسلام کے لئے اجمیر تشریف لائے تھے اس وقت آپؒ نے اپنے جانشین کی حیثیت سے حضرت قطبؒ کو دہلی میں متعین فرما دیا تھا، پھر آپؒ بت پرستوں سے جنگ کرنے میں اس قدر مصروف ہو گئے تھے کہ کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا۔

اس دوران حضرت قطبؒ دہلی سے مسلسل خطوط لکھتے رہے۔ ہر عریضے میں ایک ہی التجا ہوتی تھی کہ پیر و مرشد چند دنوں کے لئے دہلی تشریف لا کر اس شہر کے باشندوں کو بھی قدمِ بوسی کی دولت سے سرفراز فرمائیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو حضرت قطبؒ کی بے قرار یوں کا شدید احساس تھا مگر آپؒ اپنی زندگی کے جس عظیم مقصد کی خاطر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے، ابھی اس کی تکمیل کا وقت نہیں آیا تھا۔ بالآخر جب ایک طویل کشمکش کے بعد حق کو باطل پر فتح حاصل ہو گئی اور راجستھان کے بت پرست قطار در قطار حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو سلطان الہندؒ نے دہلی جانے کا ارادہ فرمایا۔ اجمیر کے باشندوں کو غریب نوازؒ کے عزم کی اطلاع ہوئی، نو مسلم عقیدت مندوں کا ایک ہجوم خانقاہ کے سامنے رو کر فریاد کرنے لگا۔

”اب ہماری حیات و موت آپ کے دامن سے وابستہ ہے۔ ابھی تو ہم نے نئی زندگی کے آداب

بھی نہیں سیکھے ہیں۔ پھر آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟“ اجمیر میں ایک حشر سا برپا تھا۔ ”انا ساگر تو آپ ہیں۔ جب پانی ہی خشک ہو جائے گا تو تشنہ لب کیسے جئیں گے؟“ فطرتاً انتہا پسند ہونے کی وجہ سے راجپوتوں کی عقیدت و محبت بھی شدید تھی۔ اس لئے حضرت خواجہؒ بھی ان کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر ان لوگوں کی دلجوئی بھی ضروری تھی جو اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر نئے عقائد کی پناہ میں آئے تھے۔ غرض ان تمام باتوں کے پیش نظر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سفر کا ارادہ تبدیل کر دیا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ حضرت خواجہؒ کی اصلاحی تحریک فروغ پاتی رہی اور اس کے ساتھ ہی آپؒ کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حضرت قطبؒ کے حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے خطوط پیہم آتے رہے اور آپؒ مرید باصفا کو ہر بار ان الفاظ میں تسلی دیتے رہے۔

”فرزند! اللہ پر بھروسہ رکھ۔ میں بہت جلد تم سے آملوں گا لیکن وصال و فراق کے اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہ دو۔ انسان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے لئے رشتے قائم کرے اور اسی کی خاطر دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔“

جب اس قسم کے خطوط دہلی پہنچے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آبدیدہ ہو گئے۔ آپؒ پیر و مرشد کے مزاج سے واقف تھے، اس لئے زیادہ اصرار نہ کر سکے۔ تاہم کچھ دن بعد ایک نئے انداز سے خط تحریر کیا۔

”شیخ محترم! یہ امر واقع ہے کہ میری طرف سے مسلسل خود غرضی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ نگاہ شوق صبح و شام سر رہ گزر بھٹکتی رہتی ہے اور ناکام و نامراد لوٹ آتی ہے۔ روز بزم انتظار آراستہ کرتا ہوں مگر میں نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آپ کس قدر سنگین محاذ پر طاغوتی قوتوں سے بدسر پیکار ہیں۔ خادم نے اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب غلام کے لئے فراق کی ایک ساعت بھی گراں ہے۔ خطوط میں آپ کے فرمودات مقدسہ پڑھ کر دماغ تو اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے لیکن دیدہ و دل روزِ اول کی طرح پیا سے ہیں۔ آنکھیں انسانی ہجوم میں آپ کے چہرہ مبارک کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ انہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں۔ دل اسی بزم نور کو ڈھونڈتا ہے جہاں اس نے زندگی حاصل کی تھی۔ میری حیثیت ایک بیمار کی سی ہے۔ لہذا آپ نے جلد مسیحائی نہ کی تو مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے نہایت پرسوز انداز میں اپنی قلبی کیفیات کا اظہار کیا تھا۔ آخر میں اس طرح درخواست کی گئی تھی۔

”میں خواجہ خواجگاں کی ایک نگاہ کرم کا طالب ہوں۔ سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ بس سلطان الہندؒ کے حکم کا انتظار ہے۔ مجھے اپنی غلامانہ نسبت پر یقین ہے کہ غریب نوازؒ اس گداگر کو قدم بوسی کی اجازت مرحمت فرما دیں گے۔“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ سوچ کر خط تحریر کیا تھا کہ یا تو پیر و مرشد انہیں اجمیر حاضر

ہونے کی اجازت دے دیں گے یا پھر ازراہ کرم نوازی خود دہلی تشریف لے آئیں گے۔ قارئین کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے کسی مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آپؒ احترام مرشد میں اپنی دلی کیفیات کو صحیح طور پر بیان ہی نہ کر سکے۔ ورنہ حضرت قطبؒ تو وہ جاں نثار تھے کہ آپؒ تیرہ سال کی عمر میں ماں باپ، عزیز واقارب، احباب و غمگسار اور وطن کو چھوڑ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس کم سنی میں خون اور زمین کے نازک رشتوں کو توڑ دینا یقیناً محبت کی اعلیٰ مثال تھی۔ پھر اس کے بعد حضرت قطبؒ ایک اور آزمائش سے گزرے۔ آپؒ کو والدین کی یاد بھی آئی، ہوائے وطن نے سرگوشیوں میں دوستوں کے پیغام بھی سنائے، دیار غیر میں آشنا مٹی کی خوشبو بھی مہکی۔ بچپن کے شناسا درو دیوار نے صدائیں بھی دیں مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ایک لمحے کے لئے بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور حضرت خواجہؒ کی محبت میں تمام حوالوں کو فراموش کر دیا۔ اور آج اسی جاں نثار مرید نے مرشد کے روبرو اپنے دل کا درد بیان کیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یہ خط پڑھا تو بے قرار ہو گئے۔ آپؒ نے فوراً حضرت قطبؒ کو جواب تحریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ”فرزند! تمہارا یہ اضطراب درویشی کی نگاہ میں لائق ستائش ہے۔ میں کسی بھی حالت میں تمہارے جذبات سے بے خبر نہیں رہا۔ یہاں کے لوگ ابھی اسلامی معاشرت کے آداب سے ناواقف ہیں۔ ان کی اصلاح حال کے لئے اجمیر میں میرا قیام بے حد ضروری تھا۔ خداوند ذوالجلال نے تحریک اسلامی کو عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اب میں کسی حد تک مطمئن ہوں۔ تم نے قدم بوسی کی اجازت طلب کی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں تم سے ملنے کے لئے کتنا بے چین ہوں۔ دہلی میں تمہاری ہمہ وقت موجودگی ناگزیر ہے۔ بھٹکے ہوئے مسافروں کو مسلسل دعوت حق دیتے رہو۔ وہ کسی نہ کسی دن اپنی حقیقی منزل کی طرف پلٹ ہی آئیں گے۔ کفر کے بہت سے آہنی قلعے ضرب لا الہ سے مسمار ہو چکے ہیں۔ بس اب ہندوستان کے گوشے گوشے میں پرچم حق لہرانے ہی والا ہے۔ باطل ذلت آمیز شکست کھا کر کارزار ہستی سے فرار ہو چکا ہے اور حق تو یہ ہے کہ باطل فرار ہونے ہی کے لئے ہے۔ تمہیں اجمیر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہاری قربتوں کی سعادت حاصل کرنے کے لئے عنقریب دہلی پہنچنے والا ہوں۔ میرا انتظار کرو۔“

یہ خط ارسال کرنے کے کچھ عرصے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے مریدوں، عقیدت مندوں اور اجمیر کے دیگر شہریوں سے فرمایا۔

”میں نے اپنی زندگی تم لوگوں کے لئے وقف کر دی ہے مگر اجمیر سے باہر بھی کچھ اہل دل آباد ہیں۔ زمانہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے اپنے حقوق طلب کر رہے ہیں لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میں آج تک اپنے اس فرض کی ادائیگی نہ کر سکا۔“ حاضرین مجلس حضرت خواجہؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب غریب نواز دہلی تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی جب حضرت خواجہؒ نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو لوگوں کے آنسو دیکھ کر آپؒ کے قدم رک گئے تھے۔ اب وہی صورت حال دوبارہ ظاہر

ہوئی تو حسب سابق عقیدت مندوں کے حلقے میں اضطراب پھیل گیا اور لوگ بے اختیار رونے لگے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اہل اجیر کی گریہ و زاری سے متاثر ہو کر فرمایا۔ ”جب تک تم لوگ مجھے اجازت نہیں دو گے، اس وقت تک میں دہلی نہیں جاؤں گا۔“ یہ خُسنِ اخلاق اور عجز و انکسار کا ایک ایسا نمونہ تھا کہ جسے دیکھ کر اہل مجلس حیران رہ گئے۔ حضرت خواجہؒ کی اجازت طلبی ایسی ہی تھی جیسے کوئی شہنشاہ اپنے غلاموں سے کچھ مانگ رہا ہو۔ وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے زار و قطار رو رہے تھے، اچانک ان کی آنکھیں خشک ہو گئیں اور چہرے سوال بن کر رہ گئے۔

پھر ایک راجپوت سردار ہمت کر کے کھڑا ہوا اور ادب سے سر جھکا کر عرض کرنے لگا۔ ”ہم تو آپ ہی کی صورت دیکھ کر زندہ رہتے ہیں۔ اگر یہ روشن چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو ہماری دنیا ہی تاریک ہو کر رہ جائے گی۔“

جیسے ہی اس شخص نے اپنی بات مکمل کی، دوسرا راجپوت گردن خم کئے ہوئے اپنی جگہ ایستادہ ہو گیا۔ ”ہماری نظر میں آپ دنیا کے ہر شہنشاہ سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ کے ذریعے ہدایت حاصل کی ہے، اس لئے آپ ہی ہمارے سردار ہیں۔“ راجپوت جوشِ جذبات میں بول رہا تھا۔ ”ہم آپ کے احسانات کا قرض اپنی جانیں دے کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا کوئی عمل بے ادبی میں شمار ہوتا ہو؟ بے شک ہم اس احترام کا مظاہرہ نہیں کر سکے جو آپ کے شایانِ شان تھا۔“ راجپوت سردار، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عزمِ سفر کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید آپؒ اس غیر مہذب قوم کی کسی گستاخی سے دلبرداشتہ ہو گئے ہیں اور اس علاقے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دہلی تشریف لے جا رہے ہیں۔

آخر میں وہ راجپوت دست بستہ آگے بڑھا جو پرتھوی راج چوہان کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور جس نے شہاب الدین غوری کے حملے سے پہلے تمام سرکاری اعزاز ٹھکرا کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ ”کیا اجیر کی سرزمین دوبارہ ان مبارک قدموں کو چھونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے گی؟ اگر حضور دہلی جانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو پھر ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے چلئے کہ آپ کے سوا ہمارا یہاں کون ہے؟ یہ گھر تو آپ ہی کے دم سے آباد ہیں۔ جن مکانوں پر شیخ کا عکس نہ ہو وہ مُردہ روحوں کا مسکن ہیں۔“ راجپوت سردار نے اپنے جذبوں کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔

اس کے بعد دوسرے عقیدت مندوں نے بھی اپنی بے قرار یوں کا اظہار کیا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ بہت دیر تک ان لوگوں کے اضطراب کا حال سنتے رہے۔ پھر آپؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”نہ تم نے کوئی گستاخی کی ہے اور نہ کسی بے ادبی کے مرتکب ہوئے ہو۔ اگر تم سے یہ جرم بھی سرزد ہو جاتا تو میں تمہیں معاف کر دیتا۔ میرا اور تمہارا رشتہ ناقابلِ شکست ہے۔ اسلام کے زیر سایہ آنے کے بعد ہم سب برابر ہیں۔ اب کوئی فرق باقی رہے گا تو وہ صرف عبادت اور پرہیزگاری کے سبب ہو گا۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری ہدایت کے لئے کتنے دور دراز مقام سے یہاں بھیجا گیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہاں اگر مالک کائنات یہی چاہتا ہے تو پھر انسان کو ہر حال میں

راضی بہ رضا رہنا چاہئے۔ تمہارے لئے اللہ اور رسول ﷺ کی گواہی کافی ہے۔ بس اسی ایک کلمہ مقدس کو بچا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ فنا ہو جانے والا ہے۔ اسلام میں شخصیت پرستی حرام ہے۔ اگر میں تمہارے درمیان سے اٹھ جاؤں تو اپنے گریبان چاک نہ کرنا۔ میں بحکم خدا واپس آؤں گا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک خادم کو اپنے ہمراہ لیا اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہزاروں لوگ اُداس چہروں اور غم ناک آنکھوں کے ساتھ آپؒ کو رخصت کرنے کے لئے دور تک آئے۔



حضرت سلطان الہندؒ اپنی زندگی میں دوسری بار دہلی تشریف لائے تھے۔ پہلی مرتبہ اس وقت آپؒ کا گزر ہوا تھا جب اس تاریخی شہر پر سمرات پر تھوی راج چوہان کی حکومت تھی۔ مگر آج اس علاقے کا نقشہ بدل چکا تھا۔ شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اسلامی سلطنت کی سرحدیں دُور دُور تک پھیلا دی تھیں۔ دہلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نماز شکر ادا کی اور پھر اپنے خلیفہ اکبر قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمایا جو آپؒ کے استقبال کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ ”کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم غریب الوطن لوگ اپنی زندگی میں فتح و نصرت کا ایسا یادگار لمحہ بھی دیکھیں گے۔ ہر طرف کلمہ توحید کی گونج ہے، اذانوں کا نور ہے اور بلند عمارتوں پر لہراتا ہوا اسلامی پرچم ہے۔ بے شک! تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جو عالموں کا پالنے والا ہے۔“

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے دہلی میں کئی ماہ تک قیام فرمایا۔ جیسے جیسے آپؒ کی آمد کی خبر عام ہوتی گئی، لوگ سلطان الہندؒ کی خانقاہ کے دروازے پر جمع ہونے لگے۔ آنے والوں میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی، غریب بھی تھے اور امراء وقت بھی۔ کوئی برسوں سے بیمار تھا اور کوئی بے اولاد۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے امتیاز مذہب و ملت کے بغیر سب کے لئے دعائیں کیں۔ اللہ نے بیماروں کو شفا بخشی اور بنجر زمینوں کو فصل مراد سے سرسبز و شاداب کر دیا۔ تذکرہ نویسوں نے مستند حوالوں سے تحریر کیا ہے کہ اس مختصر سے عرصے میں حضرت خواجہؒ کی ذات گرامی سے اس قدر کرامتوں کا ظہور ہوا کہ دہلی میں ہلچل سی مچ گئی۔ جن بت پرستوں کو قطب الدین ایبک کی شمشیر اقتدار بھی مسلمان نہیں کر سکی تھی، وہ حضرت سلطان الہندؒ کا چہرہ مبارک دیکھتے ہی ایمان لے آئے۔ ایک روایت کے مطابق سینکڑوں منکرین حق نے خدائے واحد کے آگے سر جھکا دیا اور صد ہا پتھر کے پجاریوں نے اپنے اصنام خیالی کو ریزہ ریزہ کر کے عقائد کا نیا شہر بسالیا۔ ایسا شہر جس کے در و دیوار شمع حرم سے فروزاں تھے۔

اس موقع پر بعض تنگ نظر لوگوں نے کم ظرفی کے مظاہرے بھی کئے۔ یہ مسلمانوں کا وہ گروہ تھا جو مذہب کے نام پر سیم و زر کی تجارت کر رہا تھا۔ اس جماعت کے افراد بظاہر متقی اور پرہیزگار نظر آتے تھے لیکن درپردہ آسائش دنیا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان لوگوں نے شریعت کی آڑ لے کر ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ مسند علم پر بیٹھنے والے، سلطان قطب الدین ایبک کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے اور اپنی اسی قربت و رسائی سے فائدہ اٹھا کر فرمانروائے ہند کے کان بھرنے لگے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذوقِ سماع پر اعتراض کیا گیا کہ درویشی کی یہ رسم

مذہب کے خلاف ہے۔ اس سے عام مسلمانوں میں گمراہی پھیل رہی ہے۔ اگر معین الدین چشتی کو اس عمل سے باز نہیں رکھا گیا تو بڑے فتنے پیدا ہو جائیں گے۔ بعض علماء نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ حضرت خواجہ کو دہلی کی حدود سے دور کر دیا جائے۔

سلطان قطب الدین ایک ایک مردِ حق پرست کے خلاف الزام تراشیوں کے افسانے سناتا رہا۔ مخالف علماء اپنے سرکاری عہدوں کے نشے میں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے گرد سازشوں کا حصار کھینچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن جب نتائج سامنے آئے تو انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان قطب الدین ایک نے اس گروہ کے نمائندوں کو تلخ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے بھی ہو کہ خواجہ معین الدین چشتی کون بزرگ ہیں؟“ ایک کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ میں گہرا طنز پوشیدہ تھا مگر علماء کی جماعت جوشِ حسد میں سلطان کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکی۔

ایک درباری عالم جن کے لباس سے شانِ امارت جھلکتی تھی، تضحیک آمیز لہجے میں بولے۔ ”سنا ہے کہ وہ درویشی کا خرقہ پہن کر سیستان کی طرف سے آئے ہیں۔ اب ان کا یہی مشغلہ ہے کہ ایک گوشے میں بیٹھ کر سماع سنتے رہیں۔ ان کی خانقاہ کے دروازے پر ہر وقت بے عمل لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور دنیا والے ایسی گوشہ نشینی کو اسلام سمجھ بیٹھے ہیں۔“

ابھی ان عالم موصوف کی گفتگو مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے عالم درمیان میں بول پڑے۔ ”کیسی عجیب بات ہے کہ کم نظروں نے زرد و سبز لباس کو مذہب کی علامت سمجھ لیا ہے..... اور وہ لوگ جو شب و روز مخلوقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہیں، اسلام کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں ان کا کوئی پرسانِ حال ہی نہیں۔ افسوس! رہبانیت کا درس دینے والوں کے گرد انسانوں کا ہجوم ہے اور زندگی کے ہر محاذ پر جہاد کرنے والے اس طرح تنہا کھڑے ہیں کہ کوئی ان کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔“

درباری عالم کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا اور وہ اپنی زندگی کو اسلامی عمل کا بہترین نمونہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابھی تیسرے درباری عالم، لب کشائی کرنے والے تھے کہ سلطان قطب الدین ایک نے ان کی تقریر کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ”بس آپ حضرات خاموش ہو جائیں۔ میں تمام دلائل سن کر ان کی حقیقت کو سمجھ چکا۔“ سلطان کے لہجے میں شدید ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”تم اس شخص کو رہبانیت کا طعنہ دیتے ہو جو اللہ کا پیغام سنانے کے لئے اپنی نسل اور زمین کے تمام رشتے توڑ کر دیارِ غیر میں چلا آیا۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ وہ توحید و رسالت کی دعوت لے کر صحراؤں، میدانوں اور دریاؤں میں تنہا بھٹک رہا ہے۔ تم ایسے شخص کو راہب کہتے ہو؟ تمہیں خدا سے ڈر نہیں لگتا؟ اقتدار خود جس کے دروازے پر شاہانہ مراعات لے کر حاضر ہوا، جس نے دنیا کی ہر آسائش سے منہ موڑ لیا، تم اس پر بے عملی کا الزام عائد کرتے ہو؟ تم لوگ قطعاً نہیں جانتے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کون ہیں؟ حضرت خواجہ تو وہ ہیں کہ جن کے در

پر میرے آقا شہاب الدین غوری حاضر ہوئے تھے اور ان کی دعاؤں سے اللہ نے لشکر اسلام کو عظیم الشان فتح بخشی تھی۔“ سلطان قطب الدین ایک نے جس طرح حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی شان میں قصیدہ پڑھا، اسے سن کر تمام درباری علماء کے چہرے اتر گئے۔ دراصل وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ شہاب الدین غوری، پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر بارگاہ سلطان الہندؒ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت قطب الدین ایک بھی ایک غلام کی حیثیت سے افغان سپہ سالار کے ہمراہ تھا..... اور آج جب کئی سال بعد علمائے ظاہری نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات گرامی پر تنقید کی تھی تو ایک نے اپنی عقیدت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے بعد مخالفین مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکے تھے۔



ان ہی دنوں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دوسرے فقراء دہلی کے ساتھ جنگل کی سیر میں مصروف تھے کہ اچانک ایک نوجوان شہسوار سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کا گھوڑا برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ نوجوان قریب آیا اور اس کی نظر بزرگان دین پر پڑی، وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ شہسوار کے کاندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شکار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نوجوان اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر آگے بڑھا اور جب نزدیک آگیا تو اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دوسرے بزرگوں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ پھر کچھ دور تک اسی طرح پیدل چلتا رہا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور کسی آندھی کی طرح جنگل میں داخل ہو کر روپوش ہو گیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یکایک ٹھہر گئے اور بہت دیر تک اس راستے کو دیکھتے رہے جدھر سے نوجوان گزرا تھا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے پیرومرشد کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو فوراً ہی محسوس کر لیا۔

”شیخ محترم! کیا کوئی عجیب شے پیش نظر ہے؟“ حضرت قطبؒ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں قطب! میں اس نوجوان کی شکل میں قدرتِ خداوندی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اثر انگیز لہجے میں فرمایا۔ آپؒ کی بات سن کر دوسرے بزرگ بھی ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔ ”یہ فقیر دوست نوجوان ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ ہم لوگوں کے احترام میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا تھا اور اس وقت تک دوبارہ سواری کی پشت پر نہیں بیٹھا، جب تک ہمارے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ حائل نہیں ہو گیا۔ یہ ادب اور انکسار کی روشن علامت ہے۔“

”وہ ایک عام سانو جوان ہے۔“ دوسرے بزرگ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بات کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”اگر وہ کوئی امیر ہوتا تو ہم نوجوان کے اس عمل کو انکسار کا نام دے سکتے تھے۔“

”انکسار ہر حال میں انکسار اور ادب بہر صورت ادب ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ”نوجوان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ درویشوں کی صحبت پسند کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل دونوں جہاں میں سعادت کا سبب بنے گا۔ وہ بزرگان دین کے حلقہ اثر میں ہے۔ خدا اسے اس وقت تک زمین سے نہیں

اٹھائے گا، جب تک وہ تاج شاہی نہیں پہن لے گا۔“ حضرت خواجہ غریب نوازؒ عالم جذب میں فرما رہے تھے۔ ”اقبال اس پر سایہ فلک ہے۔ تخت ہندوستان اس کا انتظار کر رہا ہے کہ وہ آئے اور عدل و انصاف کے ساتھ لوگوں پر حکومت کرے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الہامی کلمات سن کر تمام بزرگ حیران رہ گئے مگر حضرت قطبؒ کو اس پیش گوئی پر ذرا بھی حیرت نہیں تھی کیونکہ آپؒ اپنے پیرومرشد کے عارفانہ مقام سے واقف تھے۔

اس طرح وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ دہلی کے باشندے خوش نصیب تھے کہ انہیں ہندوستان کے سب سے بڑے ولی اللہ کی صحبت حاصل تھی۔ اس مختصر سے عرصے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے بے شمار بندگانِ خدا کا جسمانی اور روحانی علاج کیا۔ جاگداز ساعت قریب آئینہ جب اس مسیحا نے اپنا سامان سفر باندھنا شروع کیا۔ یہ تو اردو زبان کا ایک محاورہ ہے جو کسی شخص کی روانگی کے وقت استعمال کیا جاتا ہے ورنہ حضرت سلطان الہندؒ کا سامان سفر ہی کیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے تھے تو آپؒ کا کل اثاثہ ایک جوڑا کپڑوں، ایک جاء نماز اور پانی کے ایک برتن پر مشتمل تھا، آپؒ نے اسی حالت میں صرف ایک خادم کے ساتھ سرزمین دہلی پر قدم رکھے۔ دہلی میں معاشی اعتبار سے فارغ البال لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اکثر حضرات نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے قیمتی تحائف بطور نذر پیش کئے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے ان لوگوں کو خوش کرنے کے لئے تمام نذریں قبول کر لیں مگر فوراً ہی ان اشیاء کو درویشوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ امرائے شہر نے بھی ایک بڑی رقم خدمت عالیہ میں پیش کی۔ حضرت خواجہؒ نے اس ڈھیر کو بھی محتاجوں کے درمیان کھڑے کھڑے لٹا دیا اور پھر دہلی سے رخصت ہوئے تو آپؒ کی ظاہری حالت روزِ اوّل سے مختلف نہیں تھی۔ دہلی کے بے شمار باشندے آپؒ کو الوداع کہنے کے لئے بہت دور تک ساتھ ساتھ آئے تھے۔ آپؒ انہیں بار بار منع فرما رہے تھے۔

”لوگو! میری محبت اپنی جگہ لیکن عقیدت کا یہ مظاہرہ ایک کارِ عبث ہے۔ جس انسان کو ساری دنیا سے بچھڑ کر اکیلا ہی جانا ہے، اس کے لئے اتنا اہتمام فضول ہے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مسلسل تلقین کے باوجود انسانی ہجوم دہلی سے نکل کر کئی میل تک اپنے مسیحا کو رخصت کرنے گیا تھا۔ عام لوگوں کے چہروں پر گہری اُداسیوں کی جھلک تھی۔ کچھ بزرگانِ دین بھی مغموم نظر آ رہے تھے..... اور ان لوگوں کی خوشی کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا جن کے علم کی دکانیں حضرت خواجہؒ کی موجودگی کے باعث بند ہو گئی تھیں۔ غرض بندگانِ خدا کے اس ہجوم میں اگر کوئی شخص سب سے زیادہ دل گرفتہ تھا تو وہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ پیرومرشد سے آپؒ کی محبت ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ اگر ہم اس محبت کو ثابت کرنے کے لئے ”باپ اور بیٹے“ کا حوالہ بھی پیش کریں تو یہ بھی ناکافی ٹھہرے گا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے شیخ کو رخصت کرتے وقت اس طرح رو رہے تھے کہ جیسے کسی شخص کا سرمایہ حیات لٹ رہا ہو۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے اس عظیم مرید و شاگرد کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”فرزند! ہمارا ملنا اور بچھڑنا

سب اللہ کے لئے ہے۔ زندگی نے وفا کی تو میں بہت جلد تم سے دوبارہ آملوں گا۔“ یہ آخری الفاظ تھے جو حضرت سلطان الہندؒ کی زبان مبارک سے دہلی کی سرزمین پر ادا ہوئے تھے۔ پھر آپؐ اس تاریخی شہر سے رخصت ہو گئے۔

دوبارہ اجمیر پہنچنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مقصد عظیم کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اجمیر کے باشندے آپؐ کی واپسی پر اتنے خوش تھے کہ گلی گلی جشن جیسا سماں تھا اور گھر گھر چراغ روشن کئے گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے سلطان الہندؒ کی معاشرتی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا۔ اب تک آپؐ تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ روایت ہے کہ ایک دن کسی شخص نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی مجردانہ زندگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”معین الدین چشتیؒ ہر طرح پابند شریعت ہیں مگر آپؐ کی ذات میں نمایاں کمی یہ ہے کہ شادی شدہ نہیں ہیں۔“ کہنے والے نے رسالت مآب ﷺ کی حیات پاک کی مثال دیتے ہوئے کہا۔ ”پیغمبر اسلام ﷺ نے شادی کو نہ صرف پسند فرمایا ہے بلکہ فارغ البالی کی صورت میں اسے لازمی قرار دیا ہے۔“ جب ایک خادم نے یہ بات گوش گزار کی تو آپؐ نے فرمایا۔

”وہ سچ کہتا ہے۔ مجھ میں یہ کمی ہے لیکن اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے بندے کی تمام کوتاہیوں کا ازالہ کر دے۔“

اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بزرگان دین کو سنت رسول ﷺ کا عملی سبق دینے کے لئے شادی کر لی۔

شادی کے سلسلے میں دوسری روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ایک رات رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب ﷺ فرما رہے تھے۔ ”معین الدین! تم پر لازم ہے کہ ہماری ایک ایک سنت کو زندہ کرو۔“

حضرت خواجہؒ کی آنکھ کھلی تو آپؐ پر لرزہ طاری تھا۔ سلطان الہندؒ کو خواب کے ذریعے تجدید سنت کی ہدایت کی گئی تھی۔ آپؐ کئی دن تک آزرده خاطر رہے اور اپنے ایک ایک عمل کا محاسبہ کرتے رہے۔ حضرت خواجہؒ مسلسل غور و فکر میں ڈوب گئے تھے اور ہر لحظہ یہی سوچ رہے تھے کہ آپؐ سے کون سی سنت ترک ہوئی ہے؟ اچانک ایک روز آپؐ کو اپنی غیر شادی شدہ زندگی کا خیال آیا اور اس طرح مضطرب ذہن نے خواب کی تعبیر تک رسائی حاصل کر لی۔

یہ عجیب و غریب راز ہے کہ جس رات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا، اس رات قلعہ ”پٹلی“ کے حاکم ملک خطاب نے لشکر کفار پر حملہ کیا۔ دونوں فریقین میں بہت دیر تک خونی معرکہ گرم رہا۔ اہل ہنود نے بڑی شجاعت کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر ملک خطاب کو فتح حاصل ہوئی۔ ہندو راجہ گرفتار ہو کر قتل ہو یا کسی خفیہ راستے سے فرار ہو گیا، تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا مگر یہ طے شدہ امر ہے کہ کفار کو ہولناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ راجہ کی جوان لڑکی قید ہوئی اور پھر مسلمان سپاہیوں نے اسے حاکم پٹلی کے سامنے پیش کر دیا۔ دوسرے دن

ملک خطاب اس لڑکی کو لے کر سلطان الہند کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے بعد عرض کرنے لگا۔

”یہ لڑکی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے ایک کنیز کی حیثیت سے قبول فرمائیں۔“

”میں کسی کنیز یا خادمہ کی حاجت نہیں رکھتا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ملک خطاب کی درخواست مسترد کرتے ہوئے فرمایا۔ ”درویش کو یہ آسائشیں زیب نہیں دیتیں۔ اگر یہ لڑکی اپنی خواہش سے اسلام قبول کر لے تو اپنی فوج کے کسی اعلیٰ عہدیدار سے اس کی شادی کر دو۔ اسلام میں جبر و اکراہ جائز نہیں۔ اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ یہ ایک بے کس و مجبور عورت ہے۔ یہ جہاں جانا چاہے اسے جانے دو۔ اگر شکست خوردہ افراد دوبارہ سرکشی پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں بھی پناہ دے دو۔ کفار کے ساتھ بھی محبت سے پیش آؤ تا کہ وہ اپنے لوگوں کے سامنے اسلام کے حسن سلوک کا ذکر کر سکیں۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ واضح الفاظ میں انکار کر چکے تھے لیکن ملک خطاب مسلسل اصرار کرتا رہا۔ وہ اس طرح سلطان الہند کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجبوراً آپؒ کو سخت لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ”یہ تمہاری قیدی ضرور ہے مگر تمہیں اس پر اپنی مرضی مسلط کرنی نہیں چاہئے۔ نسوانی مجبوریوں کا احساس کرو اور اسے آزاد چھوڑ دو۔ یہ خود جس طرف چاہے گی، چلی جائے گی۔“

حاکم پٹلی لا جواب ہو گیا اور شکستہ دلی کے ساتھ بارگاہ سلطان الہند سے اٹھا۔ اس نے مفتوح راج کماری کو چلنے کا اشارہ کیا مگر اہل مجلس اس وقت حیران رہ گئے جب لڑکی نے ملک خطاب کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسے سمجھایا لیکن لڑکی نے ایک عجیب دلیل کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ ہی کا تو فرمان ہے کہ مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ مسلمان ہو کر اپنی باقی زندگی آپ کے قدموں میں بسر کروں۔“ لڑکی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ انکار نہ کر سکے۔ ملک خطاب تو دل سے یہی چاہتا تھا۔ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

کچھ دن بعد اس ہندو لڑکی نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے دین اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کا نام امتہ اللہ رکھا اور پھر آپؒ نے اسی لڑکی سے شادی کر لی۔

بی بی امتہ اللہ ایک نہایت پارسا خاتون تھیں۔ آپؒ کے کردار نے غیر مسلم عورتوں کو بہت زیادہ متاثر کیا اور اس طرح تحریک اسلامی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ بی بی امتہ اللہ کے بطن سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی صاحبزادی بی بی حافظہ جمالؒ پیدا ہوئیں جن کا ہندوستان کی پاکباز عورتوں میں بلند ترین مقام ہے۔ سلطان الہند کے پانکٹی میں آپؒ کا مزار مبارک ہے۔



مستند تاریخی کتابوں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دوسری شادی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس

شادی کی تفصیل ”سیر الاقطاب“ کے مصنف شیخ الہندؒ نے اس طرح بیان کی ہے کہ سلطان قطب الدین ایک نے سید حسن مشہدیؒ کی شہادت کے بعد سید وجیہ الدین چشتیؒ کو اجیر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام بی بی عصمت تھا۔ جب سید وجیہ الدین بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پریشان رہنے لگے تو ایک دن آپؒ نے حضرت امام جعفر صادقؑ کو خواب میں دیکھا۔ امام فرما رہے تھے۔ ”فرزند! تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رسالت مآب ﷺ کا حکم ہے کہ اپنی لڑکی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زوجیت میں دے دو۔“

صبح بیدار ہوتے ہی سید وجیہ الدین مشہدیؒ، حضرت سلطان الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔ اگرچہ حضرت خواجہ شادی شدہ تھے لیکن سرور کونین ﷺ کا حکم سنتے ہی آپؒ عقد کے لئے تیار ہو گئے۔

بی بی عصمتؒ سے آپؒ کے تین صاحبزادے خواجہ فخر الدینؒ، خواجہ ضیاء الدینؒ اور خواجہ حسام الدینؒ پیدا ہوئے۔ خواجہ فخر الدینؒ بڑے باجروت اور جلالی بزرگ تھے۔ آپؒ نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ رسول عربی ﷺ کے پیغام کی سر بلندی کے لئے ہر وقت میدان جہاد میں سربکف رہتے تھے۔ بالآخر کفار کے ساتھ ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔ حضرت خواجہ فخر الدینؒ کا مزار مبارک ریاست کشن گڑھ کے قصبے ”سروار“ میں ہے۔ یہ جگہ اجیر سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ آپؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے وصال کے بعد تیس سال تک زندہ رہے۔

حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے جلال کا یہ عالم تھا کہ اکثر جذب کے عالم میں فرمایا کرتے تھے۔ ”جسے باپ کے دروازے سے کچھ نہ ملے وہ بیٹے کے یہاں چلا آئے، خدا اس کی مراد پوری کرے گا۔“ حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے اس فرمان کا مفہوم یہ تھا کہ جو لوگ والد محترم (حضرت خواجہؒ) کے مزار مبارک پر حاضر ہوتے ہیں اور ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، وہ بیٹے (فخر الدینؒ) کے آستانے پر چلے آئیں۔ اللہ ان کے خالی دامن بھر دے گا۔ یہ محض ایک روایت نہیں۔ آج بھی ہندوستان میں ایسے بے شمار لوگ نظر آتے ہیں جنہیں ذاتی طور پر حضرت خواجہ فخر الدین چشتیؒ کے اس قول کا تجربہ ہو چکا ہے۔ آخر یہ کیا راز ہے؟ اسے آج تک کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔ قدرت جس طرح چاہے زمین پر اپنی نشانیاں ظاہر کرے۔ مختصر یہ کہ حضرت خواجہ فخر الدینؒ وہ بزرگ ہیں کہ جن کے ذریعے خالق کائنات نے حضرت سلطان الہندؒ کی نسل کو فروغ دیا۔



شادی کے کئی سال بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ایک بار پھر دہلی تشریف لے گئے۔ اس وقت سلطان قطب الدین کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ شمس الدین التمش ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ایک بار تیرکمان لئے ہوئے حضرت سلطان الہندؒ کے سامنے سے گزرا تھا اور جسے دیکھ کر آپؒ نے فرمایا تھا کہ خدا اس نوجوان کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھائے گا، جب تک تاج و تخت اس کا مقدر نہ بن جائیں۔

پھر گردشِ ماہ و سال نے کروٹ لی۔ التمش فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوا۔ کئی جنگیں لڑیں اور میدانِ کارزار میں کئی کارنامے انجام دیئے۔ سلطان قطب الدین ایبک کی محبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے التمش سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ پھر جب 607ھ میں ایبک دنیا سے رخصت ہوا تو التمش، سلطان شمس الدین کے نام سے ہندوستان کا خود مختار حکمران بن گیا۔ جو لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیش گوئی سے باخبر تھے، انہیں ایک عارف کی مستقل بنی پر کوئی حیرت نہیں تھی۔ مگر جب یہ خبر دہلی میں عام ہوئی تو اہل شہر کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک انسان کی آنکھیں دس بارہ سال بعد وقت کے پردے پر ابھرنے والے مناظر کو کس طرح دیکھ سکتی ہیں؟ پھر یہ خبر اڑتے اڑتے سلطان شمس الدین التمش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی کہ دہلی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نام کے ایک بزرگ گوشہ نشین ہیں اور ان کے پیرو مرشد نے ان کے اقتدار میں آنے کی پیش گوئی بہت پہلے کر دی تھی۔ التمش کو اس واقعہ نے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالآخر وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملنے کے لئے آپؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ التمش پہلی ہی ملاقات میں حضرت قطبؒ سے اس قدر متاثر ہوا کہ پھر ہمیشہ کے لئے اس در کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اس طرح حضرت خواجہؒ کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی کہ التمش ایک فقیر دوست انسان ہے۔ تاریخی کتابوں میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نہ صرف درویشوں کو پسند کرتا تھا بلکہ اپنے کردار کے اعتبار سے وہ خود بھی درویش تھا۔ التمش نے حضرت خواجہؒ کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل کیا اور نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”خواجہ! خواجگاں! ہند کے حقیقی سلطان آپ ہیں۔ میری حیثیت تو محض ایک غلام کی سی ہے۔“
التمش کا لہجہ پُر سوز تھا اور ایک ایک لفظ سے صداقت جھلک رہی تھی۔ ”میں آپ ہی کی دعاؤں سے اس درجے تک پہنچا ہوں۔“

”جس کا نام کاتبِ تقدیر نے سلطانوں کی فہرست میں لکھا ہو، وہ سلطان ہو کر رہے گا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کی بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ”ہم درویشوں کو سلطانوں سے کیا غرض؟ وہ تو قدرت کا ایک فیصلہ تھا جو اس عاجز پر ظاہر ہو گیا تھا ورنہ ساری کائنات مل کر خدا کے کاموں کو متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ جب کسی کو دینا چاہتا ہے تو اپنی بخشش و عطا کا جواز تلاش نہیں کرتا۔ سننے پر آتا ہے تو گناہ گاروں کی سس لیتا ہے۔ نہیں سننا چاہتا تو پارساؤں کی گریہ و زاری بھی اسے متوجہ نہیں کرتی۔ جب دولت و اقتدار کے مظاہرے دیکھ کر تمہارا نفس سرکشی پر آمادہ ہونے لگے تو اپنے دورِ غلامی کو یاد کر لینا۔ اگر تم نے سچائی کے ساتھ اپنی حقیقت پر غور کیا تو فریب دنیا میں مبتلا نہیں ہو گے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس قدر اثر انگیز لہجے میں انسانی عروج و زوال کی نقشہ کشی کی تھی کہ سلطان شمس الدین التمش رو پڑا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا ایک ایک گوشہ روشن ہو گیا۔

التمش نسلی طور پر غلام نہیں تھا۔ وہ ترکوں کے البری قبیلے کے سردار ایلیم خان کا بیٹا تھا۔ وہ صورت و

سیرت کے اعتبار سے اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز نظر آتا تھا۔ آخر التمش کی صفات اس کی دشمن جاں بن گئیں۔ حقیقی بھائیوں اور دیگر رشتے داروں نے التمش کو باپ سے جدا کر کے ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کچھ دن تک وہ طوق غلامی پہن کر آقا کی جنبش چشم کا منتظر رہا۔ پھر ایک دوسرے تاجر حاجی بخاری نے اسے خرید لیا۔ پھر بخاری نے التمش کو حاجی جمال الدین کے حوالے کیا۔ غلام ایک ہی تھا مگر آقا بدلتے جا رہے تھے۔ حاجی جمال الدین اسے لے کر غزنی پہنچا۔ اہل غزنی نے اس وقت التمش جیسا خوبصورت ترکی غلام نہیں دیکھا تھا۔ پورے غزنی میں شہر سا مچ گیا۔ پھر یہ خبر شہاب الدین غوری تک پہنچی۔ غوری نے حاجی جمال کو اس کے غلام کے ساتھ دربار سلطانی میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حاجی جمال کے پاس التمش کے علاوہ ایک اور غلام بھی تھا۔ شہاب الدین غوری نے دونوں غلاموں کی قیمت دو ہزار دینار لگائی جو اس زمانے کے مطابق بہت بڑی رقم شمار کی جاتی تھی۔ حاجی جمال الدین نے اس قیمت پر اپنے غلاموں کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ شہاب الدین غوری نے تاجر کے جواب کو گستاخی سمجھ کر حکم دیا کہ افغانستان کا کوئی شخص ان غلاموں کو خریدنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمان شاہی سے سرتابی کرنے کی جرأت کس میں تھی؟ نتیجتاً حاجی جمال ایک سال تک غزنی میں مقیم رہا لیکن کسی نے اس کے غلاموں کی قیمت لگانے کی ہمت نہیں کی۔ اگرچہ التمش کا حسن ظاہری دیکھ کر بے شمار خریدار اس کے گرد سمٹ آئے تھے۔ ہر سرمایہ دار اپنی دولت کی بنیاد پر اس ترکی غلام کو حاصل کرنا چاہتا تھا مگر شہاب الدین غوری کے خوف سے کوئی آگے بڑھ کر التمش کی بولی لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر حاجی جمال ناکام و نامراد ہو کر واپس بخارا چلا گیا۔ پھر کچھ دن بعد وہ دوبارہ غزنی آیا۔ التمش کو دیکھنے کے لئے ایک بار پھر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی لیکن کوئی بھی دولت مند شہاب الدین غوری کے خوف سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کر سکا۔

حاجی جمال بھی اپنے اس نقصان کی وجہ سے سخت پریشان تھا کہ اچانک التمش کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اسی زمانے میں قطب الدین ایبک، راجہ نہرولا کو شکست دے کر غزنی پہنچا۔ شہاب الدین غوری، ایک کے اس کارنامے سے بہت خوش تھا۔ اتفاقاً قطب الدین ایبک نے لوگوں کی زبانی التمش کے حسن کا شہرہ سنا۔ غوری کے ذہن پر ایبک کی عظیم الشان فتح کے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ اس لئے قطب الدین ایبک نے وقت سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنے آقا شہاب الدین غوری سے التمش کو خریدنے کی اجازت طلب کی۔ غوری نے ایبک کی وفاداریوں کے سبب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار تو نہیں کیا، پھر بھی اتنا ضرور کہا۔

”میں ایک بار لوگوں کو اس غلام کے خریدنے سے منع کر چکا ہوں۔ اس لئے اب یہ مناسب نہیں ہے کہ میں دوبارہ اسے غزنی کے بازار میں فروخت ہونے کی اجازت دوں۔ اگر تم اسے خریدنا ہی چاہتے ہو تو وہ سوداگر تمہارے پاس دہلی پہنچ کر اپنے غلام کو بیچ سکتا ہے۔“

شہاب الدین غوری کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد قطب الدین ایبک نے کچھ دنوں تک غزنی میں قیام کیا۔ پھر اپنے وزیر نظام الدین کو چند اہم ذمہ داریاں سونپ کر دہلی چلایا۔ اس کے ساتھ ہی

نظام الدین کو ہدایت بھی کر گیا کہ کام ختم ہوتے ہی غلاموں کے تاجر حاجی جمال کو اپنے ہمراہ لے کر خود بھی دہلی پہنچ گئے۔ گردش روز و شب کا عمل جاری رہا۔ انجام کار حاجی جمال، التمش کو لے کر ایک کے دربار میں حاضر ہوا۔ قطب الدین ایک نے دونوں غلاموں کو ایک لاکھ جیتل (سکہ رائج الوقت) میں خرید لیا۔ ایک ہی نے اس کا نام التمش رکھا تھا۔ وہ ایک کو اس قدر پسند تھا کہ حاجی جمال سے سودا طے پاتے ہی اس نے التمش کو بیٹا بنا کر درباریوں میں داخل کر لیا۔ پھر اس ترکی غلام نے میدان کارزار میں کئی معرکے سر کئے۔ آخر لوگوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ سلطان قطب الدین ایک کی فوج میں التمش سے زیادہ شجاع کوئی دوسرا سپاہی موجود نہیں تھا۔ التمش کی ان ہی صفات سے متاثر ہو کر ایک نے اپنی ایک بیٹی بھی اس کے نکاح میں دے دی۔ یہاں تک کہ 607ھ میں سلطان قطب الدین ایک کا انتقال ہوا تو ہندوستان کا تخت التمش کا منتظر تھا۔ یہ ہے ایک غلام کی مختصر داستانِ حیات۔ التمش ایک سازش کے ذریعے اپنے قبیلے سے بچھڑ کر غلامی کی لعنت میں مبتلا کیا گیا۔ مگر کون جانتا تھا کہ ایک عام سردار کا بیٹا مختلف آزمائشوں سے گزر کر ہندوستان کی نئی تاریخ رقم کرے گا۔

آج وہی غلام سلطان شمس الدین کی حیثیت سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا اور جب سلطان الہندؒ نے التمش کو اس کا دورِ غلامی یاد دلایا تھا تو ایک مطلق العنان حکمران کے ماتھے پر ہلکی سی شکن بھی نمودار نہیں ہوئی تھی بلکہ عجز و انکسار کے باعث اس کا سر جھک گیا تھا اور آنکھوں سے اشک ہواں ہو گئے تھے۔ پھر سلطان شمس الدین التمش نے رقت آمیز لہجے میں سلطان الہندؒ سے عرض کیا تھا۔

”اے معرفت کے تاجدار! یہ غلام آزمائش کے اس راستے پر تنہا کھڑا ہے کہ جہاں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہیں۔ دعا کیجئے کہ میں اس راہ سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤں..... اور یہ بھی دعا فرمائیے کہ جس ذات پاک نے میری غلامی کی زنجیریں کاٹ کر مجھے تاج شاہی پہنایا ہے میں اس کی مرضی کو زمین پر نافذ کر سکوں..... اور یہ بھی دعا فرمائیے کہ میں اپنے نفس کے شر سے محفوظ رہوں اور بندگانِ خدا میرے شر سے محفوظ رہیں۔“ حاضرین مجلس یہ سوچ کر حیرت زدہ تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک آزاد حکمران کو اس قدر عاجزانہ لہجے میں بولتے ہوئے دیکھا تھا مگر جو اہل نظر تھے وہ اس راز کو جانتے تھے کہ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جلال کا اثر تھا۔

سلطان! تم شروع ہی سے بزرگانِ دین کی دعاؤں کے زیر اثر ہو۔ قدرت کی آزمائش کے عجیب انداز ہیں۔ کسی سے تاج شاہی چھین کر آزمایا جاتا ہے اور کسی کو مسند اقتدار پر بٹھا کر امتحان کی بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کامیاب وہی ہے جو شعلوں کے درمیان رہ کر بھی اپنے دامن کو محفوظ رکھے۔ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ پھر اس فقیر کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ ہی تمہارا دستگیر اور اللہ ہی مشکل کشا۔ عدل و انصاف کو قائم رکھو کہ اللہ بھی بادشاہِ عادل کو محبوب رکھتا ہے۔“ حضرت خواجہؒ نے سلطان پر اپنی دعاؤں کی بارش کر دی اور التمش، سلطان الہندؒ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر رخصت ہو گیا۔

جب سلطان شمس الدین التمش بارگاہِ غریب نوازؒ سے اٹھ کر جا رہا تھا تو لوگوں نے سنا۔ والی

ہندوستان انتہائی جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنی سلطانی پر شمشیر و سنان کی گواہی قبول نہیں کرتا۔ مجھے سلطان الہند نے اپنی زبان مبارک سے سلطان فرمادیا، اس لئے میں سلطان ہوں۔“ اگر لوگ شمس الدین التمش کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی بزرگی کو بہترین خراج عقیدت ہے۔

واقعات کے اسی پس منظر میں سلطان شمس الدین کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں حضرت شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اکبر مشہور بزرگ حضرت حمید الدین ناگوری بغداد سے دہلی تشریف لائے تھے۔ قاضی صاحب کو سماع سے بہت زیادہ شغف تھا۔ مقامی درویشوں نے جن میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی بھی شامل تھے، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے اعزاز میں سماع کی مجلسیں منعقد کیں۔ دہلی کے علماء سماع کے سخت مخالف تھے۔ اس لئے انہیں قاضی صاحب اور دوسرے صوفیاء سے پر خاش ہو گئی۔ خصوصاً مولانا رکن الدین سمرقندی جو اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، درویشوں کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔

ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے محل کے قریب مجلس سماع منعقد ہوئی جس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت قاضی حمید الدین ناگوری بھی شریک تھے۔ مولانا رکن الدین سمرقندی کو خبر ملی تو وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے تاکہ مجلس سماع کو روک سکیں۔ جب قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا رکن الدین آئے ہیں تو آپ نے صاحب خانہ سے فرمایا۔ ”تم کہیں چھپ جاؤ تاکہ جب مولانا رکن الدین آئیں اور تم سے اندر آنے کی اجازت طلب کریں تو تمہیں غیر حاضر پا کر واپس چلے جائیں۔ اور اگر تمہاری اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہوں تو اس فعل کو خلاف شرع قرار دے کر ان کا مواخذہ کیا جائے۔“

صاحب خانہ نے ایسا ہی کیا۔ مولانا رکن الدین سمرقندی آئے مگر مالک مکان کو موجود نہ پا کر واپس چلے گئے۔ اس طرح یہ معاملہ ٹل گیا مگر دوسرے علماء بھی سماع کے خلاف تھے۔ نتیجتاً حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور دوسرے صوفیاء کے خلاف علماء کی تحریک زور پکڑ گئی۔ التمش کے دربار کے دو مشہور عالم ملا عماد الدین اور ملا جلال الدین، قاضی صاحب کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مختصر یہ کہ ان دونوں علماء نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے التمش کو مجبور کیا کہ وہ حکم شاہی کے ذریعے سماع کی محفلوں پر پابندی عائد کر دے۔ والی ہندوستان نے ایک خصوصی مجلس میں حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کو دعوت دی کہ وہ علماء کے اعتراضات کا جواب دیں۔

ملا عماد الدین اور ملا جلال الدین نے بیک وقت حضرت قاضی حمید الدین ناگوری سے سوال شروع کیا۔ ”شرع میں سماع حلال ہے یا حرام؟“ قاضی صاحب نے پر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”سماع اہل حال کے لئے حلال ہے اور اہل قال کے لئے حرام۔“

علماء کے سوال کا جواب دینے کے فوراً بعد حضرت قاضی حمید الدین ناگوری سلطان شمس الدین سے

مخاطب ہوئے۔ ”آپ کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ تو یاد ہو گا جب آپ غلام تھے اور آپ کے آقا کے گھر میں محفل سماع منعقد تھی۔ آپ اس محفل میں رات بھر شمع لے کر کھڑے رہے تھے۔ ان اہل حال فقیروں کو آپ کی یہ خدمت بہت پسند آئی تھی اور ان ہی فقیروں کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہت کے منصب تک پہنچایا۔“

حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی بات سن کر سلطان شمس الدین التمش کی نظروں کے سامنے پورا ماضی روشن ہو گیا اور پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ والی ہندوستان نے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ قاضی صاحب کو رخصت کیا اور خود بھی سماع کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ پھر یہ ذوق اس قدر بڑھا کہ سلطان شمس الدین التمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔



اسی زمانے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عظمتوں پر روشن عیاں ہے۔ سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت قطبؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو چکے تھے اور اپنی روحانی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لئے ملتان سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سرزمین دہلی پر قدم رکھا تھا، اس سے چند روز پہلے ہی بابا فریدؒ نے اپنی چلہ کشی شروع کی تھی اور ایک علیحدہ کمرے میں بند ہو کر سخت ریاضت کر رہے تھے۔ اچانک ایک دن حضرت سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے پوچھا۔

”اب تو بڑے بڑے شہسوار تمہارے لشکر معرفت میں شامل ہو کر نفس کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔“
 ”یہ سب پیر و مرشد کی نگاہ کرم کا اثر ہے۔“ حضرت قطبؒ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ ”میں تو خود آپ کے لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔“

”سنا ہے کہ ملتان کا رہنے والا کوئی مجاہد تمہارے زیر تربیت ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اشارہ بابا فریدؒ کی طرف تھا۔

”شیخ تو ضرور اس بات سے واقف ہیں۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے عرض کیا۔
 ”قطب! ہمیں بھی دکھاؤ اس نو وارد کو چہ عشق کو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی نواؤں میں بڑا سوز ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے عجیب انداز میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

حضرت قطبؒ، پیر و مرشد کی اس کریمانہ فرمائش پر فرط عقیدت سے رونے لگے۔ پھر حضرت خواجہؒ کو لے کر اس کمرے کی طرف گئے جہاں بابا فریدؒ ساری دنیا سے کٹ کر ایک گوشہ تنہائی میں مصروف ریاضت تھے۔ (تصوف کی اصطلاح میں چلہ کشی اور ادو وظائف کے اس طریقے کو کہتے ہیں جس میں عامل دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر ایک مخصوص جگہ پر کم سے کم چالیس دن تک ریاضت کرتا رہتا ہے۔ بعض عملیات میں یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ عامل کسی انسان کا چہرہ نہ دیکھے، یہاں تک کہ اسے کھلا آسمان بھی نظر نہ آئے۔ اس وقت بابا فریدؒ بھی اسی انداز کی چلہ کشی کر رہے تھے۔ دن بھر روزہ رکھتے

تھے۔ افطار کے وقت حضرت قطبؒ کا ایک خادم دروازہ کھول کر جو کی روٹی اور نمک کا پانی اس طرح اندر رکھ دیتا تھا کہ وہ بابا فریدؒ کو نہ دیکھ سکے..... مگر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بابا فریدؒ کو دیکھنا چاہا تو چلہ کشی کے تمام آداب بالائے طاق رکھ دیئے گئے اور عمل کی ساری شرائط ختم کر دی گئیں کیونکہ اس سرزمین پر حضرت سلطان الہندؒ تو خود سب سے بڑے عالم تھے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر پیر و مرشد سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ اس طرح کمرے میں داخل ہوئے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ سلطان الہندؒ نے ایک خاص نگاہ کرم سے معرفت کی منزل کے نوجوان مسافر کو دیکھا۔ بابا فریدؒ آنکھیں بند کئے استغراق کے عالم میں ایک چٹائی پر بیٹھے تھے اور ان کے ہونٹوں کو آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی۔ وہ کوئی اسم الہی تھا یا قرآن کریم کی کوئی آیت مقدس تھی جس کا بابا فریدؒ ورد کر رہے تھے۔ ”فرید! آنکھیں کھولو!“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے نوجوان مرید کو بڑی محبت سے پکارا۔ ”دیکھو تو کون آیا ہے؟“

حضرت بابا فریدؒ پیر و مرشد کی آواز سن کر لرز گئے۔ کئی دنوں کا سکوت زائل ہو گیا اور آپؒ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بابا فریدؒ اس بات پر سخت حیران تھے کہ پیر و مرشد نے چلہ کشی کی مدت ختم ہونے سے پہلے آپؒ کو کیوں پکارا تھا؟ پھر کچھ دیر بعد جب بابا فریدؒ حیرت و استعجاب کے حصار سے باہر نکلے تو اپنے سامنے ایک روشن چہرہ بزرگ کو کھڑے ہوئے پایا۔

”فرید! اپنی خوش بختی پر ناز کرو کہ جس کے رُوءے مبارک کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہزاروں انسان سالہا سال سے ترس رہے ہیں وہ خود چل کر تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہے۔“ بابا فریدؒ نے سراپیمگی کے عالم میں حضرت خواجہؒ کی طرف دیکھا اور پھر آپؒ کا جسم کاپنے لگا۔

”تم آفتابِ چشتیہ کو نہیں پہچانتے؟“ حضرت قطبؒ نے بابا فریدؒ کو دیکھ کر کہا۔ ”یہ ہیں تمہارے پیر و مرشد کے شیخ محترم خواجہؒ خواجگاں، سلطان الہند، حضرت معین الدین چشتیؒ۔“

یہ سنتے ہی بابا فریدؒ کے جسم کی لرزش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے احترام میں کھڑا ہونا چاہا مگر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکے۔ دوبارہ کوشش کی، پھر بھی ناکام رہے۔ بابا فریدؒ نے یہ عمل کئی بار دہرایا لیکن آپؒ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر یہ نوجوان سالک اپنی بے بسی پر رو پڑا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے بابا فریدؒ کی یہ حالت دیکھی تو خود آگے بڑھے اور قریب پہنچ کر فرمایا۔ ”فرزند! اٹھو۔“

بابا فریدؒ نے اپنے جسم کی پوری طاقت کو بروئے کار لا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر ناتوانی کا غلبہ برقرار رہا۔ حضرت بابا فریدؒ گنج شکرؒ نے خود اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے پیر و مرشد کی خانقاہ کے ایک حجرے میں پہلی بار حضرت سلطان الہندؒ کو دیکھا تو مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ میں کاپنے لگا۔ احتراماً اٹھنا چاہا تو ایسا محسوس ہوا جیسے جسم و روح کی تمام قوتیں سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔

آخر حضرت خواجہ غریب نوازؒ قدرے خم ہوئے اور پھر آپؒ نے اپنا دست مبارک بابا فریدؒ کی پشت پر

رکھ دیا۔ ملتان کے نوجوان درویش کی ساری گمشدہ طاقتیں لوٹ آئیں۔ بابا فریدؒ لرزتے قدموں سے کھڑے ہوئے اور کانپتے لہجے میں حضرت سلطان الہندؒ کو سلام عقیدت پیش کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نہایت شفقت و محبت سے آپؒ کو گلے لگا لیا پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

”قطب! تم ایسے شاہین کو زیر دام لائے ہو جس کی پرواز آسمانوں کی بلند ترین فضاؤں میں ہے۔“
اپنی اس ملاقات کے بارے میں حضرت بابا فریدؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں زندگی بھر اس لمحے کو فراموش نہیں کر سکتا جب سلطان الہندؒ نے مجھے گلے لگا کر میرے سینے کو روشن کر دیا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس فقیر کو سب کچھ دے گیا جو سالوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عارفانہ مقام کی یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ بابا فریدؒ جیسے عظیم صوفی آپؒ کے جلال روحانی کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے اور علم و فضل کے باوجود ان کی زبان میں ایک لفظ ادا کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت خواجہؒ کی فراست نظر بھی ایک عجیب کرامت تھی کہ آپؒ کی روشن آنکھیں ماہ و سال کی گہری نقاب میں پوشیدہ واقعات کو بھی آسانی سے دیکھ لیا کرتی تھیں۔ حضرت خواجہؒ نے پرتھوی راج چوہان اور سلطان شمس الدین التمش کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بہ حرف پورا ہو کر رہا۔ یہ پیش گوئیاں اس وقت کی گئی تھیں جب پرتھوی راج شہاب الدین غوری کے مقابلے میں کم سے کم چار گنا فوجی طاقت کا مالک تھا اور شمس الدین التمش کی پیشانی پر غلامی کے کئی داغ روشن تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پرتھوی راج چوہان اس قدر ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو گا اور التمش اتنی آسانی سے قبائے غلامی اتار کر خلعت شاہی پہن لے گا۔ حالات و شواہد کے پیش نظر مادہ پرست قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے اندیشے بھی درست ثابت ہو جاتے ہیں مگر ہم اسے فراست نظر کا نام نہیں دے سکتے۔ فراست نظر صرف اہل ایمان کا ورثہ ہے۔ جب کوئی مرد حق آگاہ، مستقبل کی طرف دیکھتا ہے تو قدرت اس پر ایک ایک ذرے کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ بلاشبہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھ بھی پس دیوار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور اپنی اسی صفت کے باعث سلطان الہندؒ پورے ہندوستان میں بے مثال تھے۔ یہی وہ فراست نظر تھی جس کے ذریعے حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے بابا فریدؒ کو مقام بلند کی بشارت دی تھی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ ملتان کے ایک یتیم بچے کے دروازے پر شاہان وقت بھی سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور دیگر عقیدت مندوں میں علم و عرفان کی دولت تقسیم کرنے کے بعد حضرت سلطان الہندؒ ایک بار پھر اجمیر تشریف لے گئے۔ اگرچہ اہل دل پر یہ سانحہ گراں گزرتا تھا لیکن وہ مرضی شیخ کے آگے مجبور تھے۔ حضرت خواجہؒ نے اہل دہلی پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ سرزمین اجمیر ہی آپؒ کی تبلیغ کا مرکز رہے گی اور اسی مرکز میں آپؒ ساری زندگی بسر کریں گے۔ دہلی کے باشندے حضرت خواجہؒ کے مستقل قیام سے مایوس ہو چکے تھے، لیکن آپؒ نے

انہیں اپنی رفاقتوں سے محروم نہیں کیا تھا۔ معتبر تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ سلطان الہند ایک بار قطب الدین ایبک کے دورِ اقتدار میں اور دو بار شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں دہلی تشریف لائے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا آخری سفر بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا مگر ایک اذیت ناک واقعے نے ضعف و ناتوانی کے باوجود آپؒ کو دہلی آنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

یہ 633ھ کا زمانہ تھا۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنی عمر کے چھیا نوے سال پورے کر چکے تھے۔ فطرت کا عمل جاری تھا اور سلطان الہند کی حیاتِ مبارک آخری مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ طویل عبادت و ریاضت اور مسلسل نفس کشی نے آپؒ کو حد سے زیادہ لاغر بنا دیا تھا۔ ان ہی دنوں ایک ایسا درد انگیز واقعہ پیش آیا کہ حضرت خواجہ جیسے صابر و شاکر انسان بھی مصروفِ آہ و فغاں ہو گئے۔ دہلی میں حضرت قطب کے گردان کے مخالفین نے سازش کا آہنی حصار کھینچ دیا تھا اور سلطان الہند کا خلیفہ اکبر اپنی زندگی کے نازک ترین موڑ پر تنہا کھڑا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک رات خواب میں حضرت قطب کو دیکھا جو بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔

جب سلطان الہند نے اس پریشانی کا سبب پوچھا تو عرض کرنے لگے۔ ”شیخ محترم! اس وقت آپ کا یہ خادم سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ مجھ پر ایک ایسی تہمت لگائی جا رہی ہے جسے سننے کے بعد اہل شہر حیران رہ گئے ہیں۔ میں اپنی صفائی میں تمام دلائل پیش کر چکا ہوں مگر دشمنوں نے دولت کے ذریعے انسان کا دل، ضمیر، دماغ، یہاں تک کہ ایمان بھی خرید لیا ہے۔ لوگ خدا سے نہیں ڈرتے مگر میں خوشی میں نہمی اور مصیبت میں بھی اپنے خدا ہی کو پکارتا ہوں۔ میرا وہی دستگیر ہے، وہی میرا مشکل کشا۔ میں نے دہلی کے باشندوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ آپ کی جدائی بھی گوارا کر لی لیکن آج مجھے میری قربانیوں کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ میں وقت کی عدالت میں ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیے کہ خاندانِ چشت کے اس غلام کی آبرو برقرار رہے اور یہ سنگین گھڑی سلامتی کے ساتھ گزر جائے۔“ اتنا کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ رو پڑے تھے۔

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے عالمِ خواب ہی میں اس جانباز طریقت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا دیا۔ ”قطب! صبر کرو۔ زمانے کو کتنا ہی ناگوار گزرے مگر اہل یقین ہر حال میں غالب رہیں گے۔ شکست تمہارے دشمنوں کا مقدر بن چکی ہے۔ انہیں اپنی تمام قوتیں آزما لینے دو۔ عنقریب ان کی گردنیں طوقِ رسوائی کے بوجھ سے جھک جائیں گی۔ خاندانِ چشت کے لئے اللہ کافی ہے۔ خدا کی قسم! وہ اپنی کوششوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سلطان التمش سے کہو کہ اس مقدمے کو میری آمد تک ملتوی کر دیا جائے۔“ خواب ختم ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؒ کی روح پر ایک بار گراں تھا جس کے اثرات سے ساری رات سو نہ سکے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔

نماز ادا کرتے ہی حضرت سلطان الہند نے اہل خانہ کو اپنے سفر سے آگاہ کیا۔ خدام کو چند ضروری ہدایات دیں اور دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شریکِ حیات اور چند قریبی افراد نے اچانک روانگی کا سبب پوچھا تو بس اتنا فرمایا۔ ”قطب مجھ سے زیادہ ناتواں ہوا گیا ہے۔ اسے میری تیمارداری کی شدید ضرورت

ہے۔“ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس عالم میں اپنے سفر کا آغاز کیا کہ ایک عام انسان چند میل چلنے کا بھی تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔



دہلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ حضرت قطبؒ کے مخالفین جوشِ مسرت میں آپے سے باہر ہو گئے تھے اور عقیدت مندوں کے حلقے میں شدید اضطراب نمایاں تھا۔ بعض مرید اور خادم تو روتے روتے بے حال ہو گئے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش حیران تھا اور پھر یہ حیرت لحظہ بہ لحظہ وحشت و پریشانی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

وہ بڑا سنگین وقت تھا جب ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی نے سر دربار سلطان شمس الدین التمش سے انصاف مانگتے ہوئے کہا تھا۔ ”شہنشاہ! اس بد نصیب بچے کی طرف دیکھئے جو اپنے باپ کی زندگی میں یتیم ہو چکا ہے۔“ عورت کی دردناک آواز پورے دربار میں گونج رہی تھی۔ ”اور اس مظلوم بیوی کی طرف دیکھئے جس نے شوہر کی موجودگی میں بیوگی کا لباس پہن لیا ہے۔“

”اس بچے کا باپ کون ہے؟“ التمش بھی عورت کی فریاد سے متاثر ہو گیا تھا۔ ”تمہیں ہمارے عدل پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“

”مجھے اندیشہ ہے کہ سلطان اس شخص کا نام سننا گوارا نہیں کریں گے۔“ کسی نامعلوم خوف سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اگر وہ کوئی وزیر سلطنت یا امیر شہر بھی ہے تو التمش کے دائرہ انصاف سے باہر نہیں۔“ والی ہندوستان یکا یک غضب ناک ہو گیا تھا۔

”مجھے میرے بچے کے ساتھ جاں بخشی کا یقین دلایا جائے۔“ اب عورت ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ ”ظالم کی گردن اور ہماری شمشیر عدل میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ وقارِ سلطانی تمہیں ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔“ سلطان شمس الدین التمش نے عورت کو پناہ دے دی تھی۔

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی۔ ”اس بچے کے باپ قطب الدین بختیار کاکی ہیں۔“

اہل دربار کی سانسیں رک گئیں اور والی ہند سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا۔ حاضرین کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر عورت مسلسل گریہ و زاری کر رہی تھی اور بار بار سلطان شمس الدین التمش کے انصاف کو آواز دے رہی تھی۔

آخر التمش کو اپنی زندگی کا سب سے ناگوار فرض انجام دینا پڑا۔ حضرت قطبؒ کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا۔ سلطان الہندؒ کے خلیفہ اکبر پر ایک عجیب الزام تھا۔

”میں نے اس خاتون کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے عورت کے بیان کردہ رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ حضرت قطبؒ ہی اس بچے کے باپ ہیں۔“ عورت

مسلسل قسمیں کھا رہی تھی۔ خدا کو درمیان میں لانے کے بعد اور کیا باقی رہ گیا تھا؟
حضرت قطبؒ کے ہونٹوں پر مہر خاموشی تھی اور اہل دربار اس عظیم الشان قصر ولایت کی دیواروں کو
لرزتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عورت سے کہا گیا کہ الزام غلط ہونے کی صورت میں اسے سخت ترین سزا
بھی دی جاسکتی ہے لیکن وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے دعوے پر اصرار کرتی رہی۔

عدالت برخواست ہو گئی۔ اسی رات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے پیرومرشد کو خواب
میں دیکھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرما رہے تھے۔ ”سلطان سے کہو کہ میری آمد تک اس مقدمے
کی کارروائی کو ملتوی کر دیا جائے۔“

دوسرے دن حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ معین
الدین چشتیؒ کا پیغام پہنچا دیا اور پھر سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ سلطان الہندؒ کے تشریف لانے کے
بعد از سر نو عورت کی رودادِ غم سنی جائے گی اور پھر حقائق کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت قطبؒ
کے عام عقیدت مند اور مرید اس اعلان کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ اس طرح کچھ دن کے لئے یہ
خوفناک طوفان تھم گیا تھا مگر بعض بااثر درباریوں کا اصرار تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان کے
خیال میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مجرم ثابت ہو گئے تھے کیونکہ عورت کو نہ پہچاننے کی دلیل کوئی
وزن نہیں رکھتی تھی۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ ایک شریف عورت بھرے دربار میں اس طرح خود کو بے
عزت نہیں کر سکتی تھی۔ اس گروہ کو یقین تھا کہ اس عورت کا دعویٰ درست ہے اور سلطان محض اس لئے
حضرت قطبؒ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ ان کا مرید ہے۔“

سلطان شمس الدین التمش نے انتہائی سخت الفاظ میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر حسن ظن رکھتا ہوں کہ اگر عدالت جرم ثابت بھی کر دے تو
میں اپنی آخری سانس تک انہیں بے گناہ سمجھتا رہوں گا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں
کہ مقدمہ نہایت پیچیدہ ہے، اس لئے ہمیں کچھ دن انتظار کر کے حقائق کو تلاش کرنا پڑے گا۔“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے مقدمے کے التوا کے بارے میں فرمایا تھا۔ ”میں سلطان کے
تعاون سے روپوش ہو کر دہلی نہیں چھوڑوں گا۔ اس شہر میں میرا قیام اس وقت تک رہے گا جب تک
عدالت میری بے گناہی ثابت نہ کر دے یا پھر مجھے مجرم قرار دے دیا جائے۔ میں اپنے مقدمے کی
پیروی کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے میں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔
اب وہی دہلی تشریف لا کر اس کارروائی کو آگے بڑھائیں گے۔“

”حضرت خواجہؒ کا اس مقدمے سے کیا تعلق ہے؟“ ایک بااثر درباری نے سوال کیا۔ ”وہ اس سلسلے
میں کیا کر سکتے ہیں؟“ درباری سردار کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔
”مجھے پیرومرشد نے یہی حکم دیا ہے کہ میں اس حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔“

بات ختم ہو گئی تھی مگر سرگوشیاں اب بھی جاری تھیں۔ امرائے دہلی میں سے جو لوگ حضرت قطبؒ

کے غیر معمولی اثرات کو ناپسند کرتے تھے انہیں یہ التواء سخت ناگوار تھا۔ ان کے خیال میں مقدمے کی شکل بگاڑنے کے لئے حضرت قطبؒ کو یہ مہلت دی گئی تھی۔ مخالفین کے نزدیک مہلت خطرناک تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے دوبارہ اس مظلوم عورت کو شمس الدین التمش کے دربار میں پیش کیا۔

”مجھے سلطان کے عدل و انصاف پر پورا یقین ہے۔ مگر اس طویل عرصے میں میری اور بچے کی گزر بسر کس طرح ہوگی؟“ عورت نے اپنی غربت و افلاس کا ماتم کرتے ہوئے والی ہندوستان کے سامنے دامن پھیلا دیا تھا۔

”تمہیں ساری مراعات بخشی جائیں گی۔“ سلطان شمس الدین التمش نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا اور پھر عورت کو سرکاری مہمان خانے میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد سلطان نے کئی بار عورت کو تنہائی میں طلب کیا۔ اسے حضرت قطبؒ کی روحانی عظمت کے بارے میں بتایا، سازش کے امکانات پر روشنی ڈالی مگر وہ اپنی بات پر قائم رہی۔ عورت تسلسل کے ساتھ ایک ہی بیان دے رہی تھی۔ ”قطب الدین بختیار کاکیؒ اس بچے کے باپ ہیں اور میں ان کی غیر شرعی بیوی۔“

سلطان التمش لرز کر رہ گیا۔ اگرچہ وہ بھرے دربار میں حضرت قطبؒ کی بے گناہی کا اقرار کر چکا تھا لیکن کبھی کبھی شیطانی وسوسے اس کے ذہن کو تہہ و بالا کر دیتے تھے۔ کبھی وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ خدا عنقریب اس سازش کا پردہ چاک کر دے گا اور کبھی وہ خیالوں میں حضرت قطبؒ کے کردار کی بلند ترین عمارت کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ فرمانروائے ہند کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور وہ ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ اکثر اس کی نم آلود آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ زیر لب خدا کو یکارنے لگتا۔

دہلی کے در و دیوار پر وحشت خیز سناٹا تھا۔ شہر کے بیشتر لوگ اُداس تھے کہ ان کا روحانی پیشوا تہمت کی خوفناک آندھیوں کی زد میں تھا..... اور خود حضرت قطبؒ کی یہ حالت تھی کہ آپؒ کی بے چین نگاہیں اس شاہراہ پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے والے تھے..... مگر ابھی اہل یقین کے لئے اذیت و کرب کے طویل لمحات باقی تھے اور اجمیر سے دہلی بہت دور تھا۔

راہوں سے غبار اٹھتا رہا، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے مسافر آتے رہے مگر ان میں وہ ذات گرامی شامل نہیں تھی جس کا حضرت قطبؒ کو شدید انتظار تھا۔ دہلی کی شاہراہ خاص کو تکتے تکتے اہل دل کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں مگر آنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

ایک بار پھر مخالفین کی شورش نے سراٹھایا۔ دہلی زبان میں سلطان شمس الدین کو جانبدار کہا گیا۔ سرگوشیوں میں فرمانروائے ہند پر اس طرح نکتہ چینی کی گئی کہ اب اس مقدمے کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تک کہ دہلی کے باشندے اپنے شب و روز کے ہنگاموں میں الجھ کر سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ سلطان شمس الدین التمش جیسے عادل بادشاہ پر بڑی جارحانہ تنقید تھی۔ خود مختار حکمران لرز کر رہ گیا۔ کئی بار اس کے دل میں آیا کہ فتنہ و شر پھیلا نے والوں کی لمبی زبانیں کاٹ دے مگر وہ دستورِ دل سے مجبور تھا۔

خوفِ خدا نے التمش کو طاقت کے استعمال سے باز رکھا ورنہ ایک لمحے میں تہمتوں اور افواہوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ پھر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مقدمہ عدالت میں لایا گیا تو دولت شاہی کے ذریعے قاضی کا ضمیر خرید لیا جائے گا۔ دریدہ دہن لوگوں کو کسی طرح بھی قرار نہیں تھا۔ سلطان کے جاسوس اسے یہ اذیت ناک خبریں مسلسل پہنچا رہے تھے۔ آخر التمش سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت قطبؒ کی بارگاہ میں داخل ہوا۔

”سیدی!“ سلطان شمس الدین کا لہجہ افسردہ تھا۔ ”میں اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دوبارہ الزام تراشیوں کا ذکر کر کے شیخ محترم کو اضطراب میں مبتلا کروں۔ مجھے عمر بھر اذیت میں رکھنے کے لئے یہی احساس کافی ہے کہ میرے دورِ حکومت میں آپ کے لباس مبارک کو داغ دار کیا گیا۔ اب مخالفین کو یہ شکایت ہے کہ میں انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں۔“

”میں عدالت میں پیش ہونے کے لئے پہلے بھی تیار تھا اور اس وقت بھی آمادہ ہوں۔ معاذ اللہ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بہانہ سازی سے کام نہیں لیا ہے۔ پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ وہ جب تک تشریف نہ لے آئیں اس وقت تک کے لئے ساری کارروائیاں ملتوی کر دی جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ پیر و مرشد ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ بہر حال اہل شہر کچھ دن اور صبر کریں۔ شاہی عدالتیں زیادہ عرصے تک زحمت کش انتظار نہیں رہیں گی۔ سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے ہی والے ہیں۔“ انتہائی ضبط کے ابوجہ حضرت قطبؒ کے دل کا درد لفظوں میں جھلکنے لگا تھا۔

”عام لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان الہندؒ بہت زیادہ ضعیف ہو چکے ہیں۔ جسم کی یہ ناتوانی اس طویل سفر میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔“ شمس الدین التمش نے حضرت قطبؒ کے روبرو ان اندیشوں کا اظہار کیا جن کی بازگشت دہلی کی ایک ایک گلی میں سنائی دے رہی تھی۔

”انسانی عقل ایک محدود دائرے میں گردش کر سکتی ہے۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ ”بے شک! سلطان الہندؒ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ تقاضائے فطرت تو یہی ہے کہ اس عمر میں انہیں طویل سفر سے گریز کرنا چاہئے مگر ان حضرات کی کرم فرمائوں کو کیا کہوں کہ جنہوں نے پیر و مرشد کو دہلی آنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ سلطان الہندؒ صرف میری خاطر یہ تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ آخر اہل دنیا کو اس بات پر فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ حضرت خواجہؒ یہاں کس طرح پہنچیں گے؟ میں جس خدا کی پرستش کرتا ہوں اور جس کی کارسازی پر یقین رکھنا ایمان کی شرطِ اول ہے، وہی خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لئے زمین کے فاصلوں کو سمیٹ دے اور برسوں کے سفر کو لمحوں میں طے کرادے۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اس طرح بول رہے تھے جیسے آپؒ اپنی آنکھوں سے قدرتِ خداوندی کو زمین پر نازل ہوتے دیکھ رہے ہوں۔

سلطان شمس الدین التمش کچھ دیر تک بارگاہِ شیخ میں باادب بیٹھا رہا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔ فتنہ پردازوں نے دوبارہ سلطان کے رویے پر تنقید کی تو فرمانرواے ہند کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ شریکین ہیں۔ مگر خدا مقرب من لوگوں کو بے غلبہ کر دے گا۔ شریکین
اس بات کا انتہار کرتا رہا کہ شاید مقصد میں اپنی حرکتوں سے باز آجائیں لیکن وہ قہر خداوندی سے نکل
جاتے۔ جس مرد خدا کی سیٹھی سے بے شمار مریضوں نے شفا پائی، ہزاروں محسوس کو تک و تنی سے
ات ملی، لا تعداد گمراہوں نے ہدایت حاصل کی، آج وہی ذات گرامی خوفناک تہمتوں کا جفہ من کر رہ
لی ہے۔ کیا اہل شہر حضرت قطب کی خدمات کا صلہ اس طرح دینا چاہتے ہیں؟ میں اس مرد بزرگ سے
مساہد ہوں کہ میرے دور اقتدار میں یہ اذیت ناک واقعہ پیش آیا۔ اگرچہ کسی دلیل کے بغیر کوئی دعویٰ
میں کیا جاسکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ بعض دنیا داروں نے حضرت قطب کے خلاف یہ شرمناک سازش
کی ہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ ان کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ کیا انہیں قدرت کے
مراج کا اندازہ نہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنے نام لیاؤں کو زمین پر تنہا چھوڑ دیتا ہے؟ ایسا ہرگز
نہیں۔ یہ تو حضرت قطب الدین بختیار کاکی پر ایک آزمائشی لمحہ ہے جو بہر حال سلامتی سے گزر جائے گا۔
لوگ میری خاموشی پر معترض ہیں اور عدالت عالیہ کو مستقل بدنام کیا جا رہا ہے۔ کیا انہیں اس بات کا علم
نہیں کہ اللہ نے اپنے بندے شمس الدین اتمش کو اس ملک میں بے پناہ اختیارات عطا کئے ہیں۔ اگر میں
یہاں تیار ہوتا اور حضرت قطب کو بچانے کی کوشش کرتا تو پھر یہ مقدمہ عدالت میں کس طرح پیش کیا جاسکتا
تھا؟ جو لوگ میری نرم دلی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آئندہ اس قسم
کی سرکوشیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ میں سر دربار اعلان کر چکا ہوں کہ حضرت سلطان الہند کی آمد
کے بعد اس مقدمے کے فیصلے کا اعلان کیا جائے گا۔ جب اس عورت نے بھرے مجمع میں حضرت قطب
الدین بختیار کاکی پر الزام تراشی کی ہے تو پھر قانونی کارروائی بھی برسر عام ہوگی۔“

سلطان شمس الدین اتمش نے انصاف کے نام پر فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو درپردہ سخت تنبیہ کی
تھی۔ پھر اہل شہر نے دیکھا کہ حکومت پر تنقید ختم ہو گئی تھی لیکن اشاروں میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔
لوگوں کے سیاہ قلب اور پراگندہ ذہن اب بھی خوف خدا کے احساس سے عاری تھے۔

بظاہر انہوں اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ رک گیا تھا مگر حضرت قطب کی بے قرار یوں کا وہی عالم تھا۔
آپ کی مضطرب نگاہیں مستقل اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر حضرت خواجہ معین الدین
چشتی دہلی پہنچنے والے تھے۔ یہ انتظار کسی عام انسان کا نہیں تھا۔ یہ ایک ایسے مرد پاکباز کا انتظار تھا جو اپنی
بے گناہی ثابت کرنے کے لئے وکیل کی راہ تک رہا تھا۔ ایسا وکیل جس کی موجودگی مقدمے کی نوعیت کو
یکسر بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔



آخر کشمکش انتظار ختم ہوئی۔ اہل دل جن کی نبض ڈوبی جاتی تھی، اب انہیں نئی زندگی کا احساس ہو رہا
تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی طویل مسافت طے کرنے کے بعد دہلی تشریف لے آئے تھے۔ اس
سے پہلے بھی سلطان الہند نے اس تاریخی شہر میں دو بار قیام فرمایا تھا مگر آج آپ کی آمد کے باعث دہلی
کے مسلمان باشندے ہجان انگیز خوشی سے سرشار تھے۔ انسانی ہجوم گھروں سے نکل کر ”مہرولی“ کی

طرف بڑھ رہا تھا جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے اپنی نئی خانقاہ تعمیر کی تھی۔

جب حضرت قطب الدین بختیار کاکی دہلی تشریف لائے تھے تو آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حکم سے ”کیلوکھڑی“ میں سکونت اختیار کی تھی۔ کیلوکھڑی دہلی کا مضافاتی علاقہ تھا اور یہ جگہ مرکزی شہر سے بہت دور واقع تھی۔ حضرت قطب فطری طور پر شہر کے ہنگاموں اور شور و غل سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ مگر جب سلطان شمس الدین التمش آپ کا مرید ہوا تو آپ کیلوکھڑی کو چھوڑ کر مہرولی تشریف لے آئے۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہ تھی کہ سلطان امور سلطنت سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ حضرت قطب کی قدم بوسی کو حاضر ہوتا تھا۔ محلات شاہی اور کیلوکھڑی کے درمیان زیادہ فاصلہ ہونے کے سبب شمس الدین التمش کو واپسی میں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے حضرت کے روبرو اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بارگاہ شیخ میں روزانہ حاضری دینا چاہتا ہے۔ حضرت قطب، سلطان کی گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے تھے، اس لئے آپ نے محض اس کے جذبہ عقیدت سے مجبور ہو کر مہرولی میں قیام فرمایا۔ اس وقت حضرت سلطان الہند مہرولی کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ لوگ قطار در قطار آتے گئے اور خانقاہ کے باہر جمع ہوتے رہے۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار تھی۔ آخر غریب نواز بندگان خدا کی دلجوئی کے لئے خانقاہ کے دروازے پر تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ آپ کے چہرہ مبارک سے شدید نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر بھی ہونٹوں پر وہی جاں نزا تبسم موجود تھا۔ آپ کی یہ شان جمالی دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ حضرت سلطان الہند کو اپنے درمیان پا کر ہجوم کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ کچھ لوگ ادب و احترام سے سر جھکائے ہوئے آگے بڑھے اور پھر حرف شکایت ان کی زبان پر آ گیا۔

”آپ ان فتنہ پردازوں کے حق میں بد دعا کر دیجئے جو حضرت قطب الدین بختیار کاکی پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ اب ہم لوگوں سے یہ اذیت ناک صورت حال برداشت نہیں ہوتی۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انسانی ہجوم کو دیکھا۔ ہر آنکھ میں رنج و الم کا دھواں تھا اور ہر چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

”میں خوش ہوں کہ تم نے اس آزمائش کے وقت میں اہل ہوس کا ساتھ نہیں دیا۔ اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔“ حضرت سلطان الہند نے اہل درد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ تم نے قطب کے غم کو اپنا غم سمجھا۔ قطب کو میں نے دہلی میں متعین کیا تھا۔ اس لئے قطب کی ذات میری ذات ہے۔ وہ الزام تراشیاں قطب پر نہیں، براہ راست میں ان کا ہدف ہوں۔“ یہ کہتے کہتے حضرت سلطان الہند کے چہرہ مبارک پر ہلکا سا عکس جلال ابھر آیا تھا۔ آپ نے دوبارہ مجمع کی طرف دیکھا اور پُر جوش لہجے میں فرمانے لگے۔

”ہم سب رحمت اللعالمین ﷺ کی امت ہیں۔ اگر تم بھول گئے ہو تو میں تمہیں یاد دلا دوں کہ دشمنوں کو دعا دینا آقا کی ممتاز ترین سنت ہے۔ جو لوگ آقا کی غلامی کا دم بھرتے ہیں انہیں ہر حال

میں صبر کرنا چاہئے۔ اپنے کاموں کو اللہ کے سپرد کر کے کسی طرف دیکھنا شرک ہے۔ اللہ کی کار سازی پر یقین رکھو اور انتظار کرو کہ پردہ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے؟“

یہ کہہ کر آپؐ خانقاہ کے اندر تشریف لے گئے اور انسانی ہجوم اس طرح منتشر ہو گیا کہ ہر شخص اپنی جگہ سرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں سے دلی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ ہر حال میں حضرت خواجہؒ کو شرمسار اور حضرت قطبؒ کو گناہ گار دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی پست فطرتیں مسلسل اس بات کا تقاضا کر رہی تھیں کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکیں اور یہ مردِ حق اہل شہر کے نزدیک معتب و مجرم قرار پائے۔

جیسے ہی سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی آمد کی خبر ہوئی، وہ فوراً قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ آپؐ کے روبرو پہنچ کر سلطان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ وہ رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ”خواجہ خواجگاں! میرے حال زار پر کرم فرمائیے کہ اب دنیا داروں کا رویہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔“

”سلطان! دنیا نے تو اہل ایمان کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ آئندہ بھی تم اس کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شمس الدین التمش کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہارا منصب بڑا ہے، اس لئے تمہیں زیادہ صابر ہونا چاہئے۔“

”شیخ محترم! یہ معاملہ اس ذاتِ گرامی کا ہے جو ہمارے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔“ جوشِ جذبات میں فرماں روائے ہند کی آواز لرز رہی تھی۔ ”جسے دیکھ کر اہل ایمان روشنی حاصل کرتے ہیں اگر اس کی شخصیت ہی تمہتوں کی زد میں آ جائے تو پھر جہل و گمراہی کی سیاہ رات کہاں جا کر ٹھہرے گی؟“ سلطان شمس الدین التمش کی باتوں سے شدید کرب نمایاں تھا۔

”سلطان! خدا تمہیں حسن نیت کا صلہ دے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑی محبت سے فرمایا۔ ”تم نے جس طرح قطب کی عزت و توقیر کی ہے اللہ بھی تمہیں دونوں جہان میں سر بلند کرے گا۔“

”میں جب تک زندہ رہوں گا، دل کی یہ خلش بھی برقرار رہے گی کہ میرے دورِ حکومت میں حضرت قطبؒ کے پاکیزہ لباس کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی۔“ یہ کہتے کہتے سلطان التمش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”خواجہ خواجگاں! میں بھی دوسروں کی طرح آپؐ کا اور حضرت قطبؒ کا مجرم ہوں۔“

”سلطان! خالق کائنات تمہارے دل کی اس سوزش کو ہمیشہ قائم رکھے کہ یہ گداز ہی بندے کو اللہ تک پہنچاتا ہے اور یہ عجز و انکسار ہی میزانِ عدل قائم کرتا ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماں روائے ہند کے جذبہ عقیدت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ”دنیا اپنا کام کر رہی ہے، تم انصاف کے تقاضے پورے کرو۔ قطبؒ پر سرِ دربار الزام لگایا گیا تھا، اس لئے یہ مقدمہ سرِ دربار ہی طے ہو گا۔ اہل شہر کو بتا دو کہ کل عدالت آراستہ ہوگی۔ پھر خدا جسے چاہے گار سوا کرے گا اور جسے چاہے گا عزت و تکریم

بخنے گا۔“

سلطان التمش بارگاہِ خواجہؒ سے اُلٹے پاؤں رخصت ہوا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پورا دہلی ایک ایسے اعلان سے گونجنے لگا جس کی دھمک لوگوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دن تاریخِ ہندوستان کا ایک یادگار دن تھا۔ لوگ اپنے کاروبار معطل کر کے دربارِ شاہی کی طرف جا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اہل شہر کو اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ مسلمان تو مسلمان، مقامی ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد قلعے کے چاروں طرف رواں دواں تھی۔ پتھر کے پجاری دل میں بہت خوش تھے۔ جن مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں سے تخت و تاج چھینا تھا آج اسی قوم کا روحانی پیشوا ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونے والا تھا۔ اہل ہنود میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد ہر مقام پر مسلمانوں کو زُور سوادیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ خود مسلمانوں میں بھی علماء کا ایک گروہ حضرت قطبؒ کی بدنامی پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس حضرت قطبؒ کے عقیدت مند اُداس نظر آ رہے تھے۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر دل مصروفِ دعا تھے۔ یہ ہجوم قلعے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ عام انسانوں کو دربار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفہ اکبر حضرت قطبؒ کے ہمراہ تشریف لائے۔ قلعے کے باہر کھڑے ہوئے بے شمار انسانوں کے سر عقیدت سے جھک گئے۔ سپاہی جو پہرے پر موجود تھے انہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ حقیقی بادشاہت اسے کہتے ہیں۔ سلطان التمش، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو شاہی اعزاز و احترام کے ساتھ دربار تک لانا چاہتا تھا مگر آپؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس خاطر مدارات سے سلطان کی جانبداری ظاہر ہوگی اور عدالت کا وقار مجروح ہو جائے گا۔

جیسے ہی سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ دربار میں داخل ہوئے، بام و در پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سلطان شمس الدین التمش احتراماً اپنی نشست سے اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی تمام امراء دربار بھی کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ قاضی عدالت کو بھی اپنے فرماں روا کی تقلید کرنی پڑی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دربار کا یہ رنگ دیکھا تو بلند آواز میں فرمایا۔

”آج احترام کا یہ مظاہرہ جائز نہیں۔“ پھر آپؒ نے قاضی سے پوچھا۔ ”کیا مدعی عورت اور اس کا بچہ عدالت میں حاضر ہو چکے ہیں؟“

”جی ہاں! عورت اپنے بچے کے ہمراہ دربار میں موجود ہے۔“ قاضی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

”عورت کا دعویٰ ہے.....“

اس سے پہلے کہ قاضی صاحب کی بات مکمل ہوتی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔

”جس دعوے کی زمانے میں تشہیر ہو چکی، اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف عورت اور اس کے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

قاضی عدالت نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ایک عورت اس طرح دربار سلطانی میں داخل ہوئی کہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹی ہوئی تھی اور اس کی گود میں تقریباً دو ماہ کا شیرخوار بچہ تھا۔ عورت آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی قاضی کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ سلطان شمس الدین التمش سے لے کر دربار کے پہرے دار تک اپنی اپنی جگہ ساکت تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطبؒ کے عارفانہ جلال نے لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ آخر سلطان الہندؒ آگے بڑھے اور انتہائی نرم لہجے میں عورت سے مخاطب ہوئے۔

”خاتون! یہ کیسی قیامت ہے کہ تم جیسی خانہ دار عورت کو بھرے دربار میں اپنا حق طلب کرنے کے لئے آنا پڑا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ دراصل آپؒ کو اس حیا سوز واقعہ سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔ اس لئے عورت سے گفتگو کرتے وقت حضرت سلطان الہندؒ کو ناقابل بیان اذیت کا احساس ہو رہا تھا۔

”میں خود اپنا گھر چھوڑ کر یہاں تک نہیں آئی ہوں۔“ عورت نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ”میری رسوائی کا سبب ان سے پوچھئے۔“ عورت نے حضرت قطبؒ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں چھپا ہوا تھا۔

”معزز خاتون! تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت سے حضرت قطبؒ کے بارے میں سوال کیا۔

”دنیا میں مجھ سے زیادہ ان کے متعلق کون جان سکتا ہے؟“ یہ کہتے کہتے عورت رونے لگی تھی۔ ”یہ میرے غیر شرعی شوہر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں نظریں پھیر لیں اور اپنے ہر وعدے کو فراموش کر دیا۔ اب میں ایک بے سہارا عورت اپنے جسم پر تہمتوں کے داغ سجائے ہوئے در در بھٹک رہی ہوں۔“ عورت بڑے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔

”یہ تمہارا غیر شرعی شوہر ہے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ آپؒ کو قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ عورت اس بے باکی کے ساتھ حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کرے گی۔

”یہ شخص جو کمسنی کے عالم میں اپنا گھر چھوڑ کر بندگانِ خدا کو ہدایت دینے کے لئے نکلا تھا، جسے میں نے اپنے بچے کی طرح پرورش کیا ہے، جس کے کردار کی بلندی کو سارا عالم جانتا ہے، وہ اتنا عہد شکن اور سیاہ کار بھی ہو سکتا ہے؟“ انتہائی برداشت کے باوجود سلطان الہندؒ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی۔ ”کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتیں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑے جذباتی انداز میں عورت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اگر کوئی بھٹکا ہوا مسافر منزل کی طرف لوٹ آئے تو اسے گم کردہ راہ نہیں کہہ سکتے..... ابھی وقت ہے کہ تم رجوع کر لو۔ کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اگر بندہ تائب ہو جائے تو اللہ اسے معاف نہ کرے۔“

”جب میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو کس بات سے توبہ کروں؟“ عورت غم زدہ ہونے کے باوجود بہت بے باکی سے بول رہی تھی۔ ”خوفِ خدا تو انہیں نہیں آتا جو دوسروں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔“

”اہل دربار! تم گواہ رہنا کہ حجت پوری ہو چکی۔“ یکا یک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں تبدیلی آگئی تھی اور ان کے الفاظ سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر ایوانِ شاہی کے در و بام ساکت ہو گئے۔ ”میں نے تجھے دوزخ کی اس نادیدہ آگ سے بچانا چاہا جسے تیری بیمار آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر انسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ کسی کو عذابِ آسمانی سے محفوظ رکھ سکے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔“ حضرت سلطان الہندؒ اس عورت سے مخاطب تھے جو بہت دیر سے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کر رہی تھی۔ ”تُو نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کاش! تجھے کوئی بتاتا کہ کسی معصوم انسان پر تہمت طرازی کتنا بڑا گناہ ہے۔“

”عدالت میں وعظ و نصیحت کی کوئی گنجائش نہیں۔“ قاضی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”دنیا میں کسی بھی انسان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ عورت کے بیانات کو صرف اس لئے جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ ملزم خانقاہ میں بیٹھنے والا ایک بڑا خرقہ پوش ہے۔“

قاضی عدالتِ دہلی کے ممتاز علماء کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پورے گروہ کو سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں بڑے بڑے عہدے حاصل تھے۔ یہ علمائے ظاہر نظام خانقاہیت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان تمام حضرات کو صوفیوں کے مسلک سے خاص عداوت تھی۔ یہ لوگ خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویشوں کو بے عمل سمجھ کر ان کے طرزِ زندگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ آج قاضی عدالت اپنے اسی فطری تعصب کا مظاہرہ کر رہا تھا تا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے تمام عقیدت مند سلطان شمس الدین التمش کی نگاہ میں بے وقعت ہو جائیں۔

”قاضی محترم! آپ کا یہ قول درست ہے کہ کوئی بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس طرح بول رہے تھے کہ آپؒ پر شیریں سخنی ختم ہو چکی تھی۔ ”خانقاہ کے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھنے والے بھی مجرم ہو سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ شخص قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ کی نظر میں گناہ گار ہے؟“ حضرت سلطان الہندؒ نے قاضی عدالت سے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔

قاضی چند لمحوں کے لئے حیران رہ گیا پھر اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”اس مقدمے کا تعلق میری ذات سے نہیں۔ اگر میں قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بے گناہ سمجھ بھی لوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ یہ کرسی عدالت ہے جس پر مجھے حضرت سلطان کے حکم سے بٹھایا گیا ہے، اس کرسی پر بیٹھنے والا ملزم سے ثبوت طلب کرتا ہے۔ مجھے قطب الدینؒ سے کوئی پُر خاش نہیں۔ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کریں اور باعزت طور پر اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ جائیں۔“ قاضی عدالت بظاہر نہایت معقول لہجے میں گفتگو کر رہا تھا مگر اہل نظر جانتے تھے کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ حضرت قطبؒ کی عوامی شہرت اور روحانیت کے بلند درجات سے حسد رکھتا تھا۔ بغض و کینہ کی اس آگ نے قاضی کو یہاں تک جلایا تھا کہ اس کے دل و دماغ سیاہ ہو کر رہ گئے تھے اور اب اس کثافت کے باعث وہ حضرت قطبؒ کو سرِ دربار رسوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا اللہ کی راہ میں قطبؒ کا یہ طویل ترین سفر اس کی بے گناہی کے لئے کافی نہیں؟“ حضرت خواجہ

معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کی محاصمانہ گفتگو سن کر سوال کیا۔

”عدالت کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں کہ ایک شخص دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں مسلسل جاگ کر عبادت کرتا ہے۔“ قاضی عدالت کا لہجہ تلخ تو نہیں تھا مگر اس سے بے مروتی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ”زہد و تقویٰ اپنی جگہ ہے اور ایک عورت کا دعویٰ اپنی جگہ۔ قطب الدینؒ کی عبادت و ریاضت محض خدا کے لئے ہے۔ وہ اپنے اس فعل کے لئے اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ہم ان سے اس سلسلے میں باز پرس کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ عدالت میں ایک عورت نے اپنی حق تلفی کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ ہم اسی دعوے کی روشنی میں قطب الدینؒ سے ان کی بے گناہی کا ثبوت مانگتے ہیں۔ اس ذیل میں یہ دلیل قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ ایک شخص کتنا متقی اور پرہیزگار ہے۔“

”پھر کس طرح بے گناہی کا ثبوت پیش کیا جائے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔

”قطب بارہا اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ مدعی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عدالت اس اعلان کو کیوں کافی نہیں سمجھتی؟“

”اپنے بارے میں ملزم کی اپنی گواہی قانونی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“ قاضی عدالت نے اعتراض کیا۔ ”عدالت کی نظر میں اس بات کی اہمیت ہے کہ ملزم کی بے گناہی پر غیر متعلق افراد کس انداز میں شہادت پیش کرتے ہیں؟“

”اگر آپ کا معیار شہادت یہی ہے تو پھر پورا ہندوستان قطبؒ کی معصومیت پر گواہی دے رہا ہے۔ مگر بد قسمتی سے آپ ان آوازوں کو سننے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ تمام لوگ قطب الدینؒ کے عقیدت مند ہیں اور عقیدت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔“ قاضی عدالت نے دوسرا اعتراض اٹھایا۔ ”عقیدت میں انسان بہرہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنے ممدوح کے خلاف کوئی بات سننے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ گواہیاں ان لوگوں کی قبول کی جاتی ہیں جو غیر جانبدار ہوتے ہیں۔“

”آپ کا یہ نقطہ نظر مجہول ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

”شہادت کے پیش ہوتے وقت صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ گواہ صادق القول ہے یا کاذب؟ سود خور ہے یا رزق حلال کھانے والا؟ صراطِ مستقیم پر چلنے والا ہے یا گم کردہ راہ؟ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھتا ہے یا دنیا کی ہوس؟ بد معاملہ ہے یا امانت دار؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اسلامی عدالت میں پیش ہونے والے ایک گواہ کی صفات اس طرح بیان فرما رہے تھے کہ پورے دربار پر سناٹا طاری تھا۔

ایک مرد کامل کی جرأتِ گفتار دیکھ کر قاضی عدالت کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اہل دربار کی نظروں میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں کو جھٹلانے لگا۔

”میں فقہ کا عالم ہوں اور اسلامی قانون کی باریکیوں کو خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویش سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔“ علم ظاہری کے خمار نے قاضی عدالت کے ہوش و حواس چھین لئے تھے اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ایک عام خرقہ پوش انسان سمجھ کر گفتگو کر رہا تھا اور اس کی لاف زنی کو دیکھ کر سلطان شمس الدین التمش اور بیشتر درباریوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے تھے۔ مگر عدالت کے احترام میں کسی ایک شخص نے بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو اس مزاج کے انسان ہی نہیں تھے۔ آپؒ نے قاضی عدالت کی تلخ بیانی کو ایک دلنواز تبسم کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

”بے شک! آپ اسلامی قانون کا بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اگر آپ میں قانون دانی کی یہ غیر معمولی صفت موجود نہیں ہوتی تو پھر کرسی عدالت پر کس طرح جلوہ افروز ہوتے؟“ یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ نے قاضی عدالت کی طرف غور سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر شرمساری کی ہلکی سی علامت بھی نمایاں نہیں تھی۔ منصب قضا کے عہدے پر فائز ہونے کے احساس نے اس کے سر کو کچھ اور بلند کر دیا تھا۔

”اگر آپ قطبؒ کی گواہی کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر عورت کی طرف سے چار گواہ پیش کریں جو اس کو خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے خرقہ پوش کی غیر شرعی بیوی ثابت کر سکیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”جب آپ کی عدالت قطبؒ کے انکار کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر عدالت کے تنہا اقرار کو مقدمے کی بنیاد کیوں بنایا جا رہا ہے؟“ حضرت سلطان الہندؒ نے ایک عقلی اور مذہبی دلیل پیش کی جسے سن کر اہل دربار حیران رہ گئے اور قاضی بھی سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا۔

”عورت کے گواہ عدالت میں موجود ہیں۔“ قاضی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”پھر انہیں تمام حاضرین کے سامنے پیش کیا جائے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اصرار کیا۔ ”جب تم لوگوں نے ایک مرد خدا کو تماشا بنا ہی دیا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس شہر کے دوسرے پاس بھی بے نقاب ہو جائیں۔“ اب حضرت سلطان الہندؒ کے لہجے میں جلال ظاہر ہونے لگا تھا۔

”عورت کے دعوے کی صحت پر گواہی دینے والے عدالت کے سامنے حاضر ہوں۔“ قاضی نے دربار کی پچھلی صفوں پر نظر ڈالتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے صدر دروازے کے قریب سے چار تنومند افراد اٹھے اور دبے قدموں سے جھکتے ہوئے آگے بڑھے۔ اہل دربار نے ان لوگوں کو دیکھا۔ وہ اپنے لباس سے درمیانی طبقے کے لوگ نظر آتے تھے مگر ان کے چہروں پر سختی اور بے رحمی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ چاروں قاضی عدالت کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

ابھی قاضی ان سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ گواہوں سے مخاطب ہوئے۔ ”تم یہ بات کس طرح کہتے ہو کہ مدعی عورت، قطبؒ کی غیر شرعی بیوی ہے اور یہ بچہ اس کی غیر

قانونی اولاد؟“ حضرت سلطان الہند کی آواز سن کر ایک بار پھر دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔
مقدمہ تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور حاضرین اس الزام تراشی کا منطقی نتیجہ جاننے کے لئے بے قرار تھے۔ چاروں گواہوں نے بیک وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا۔ پھر یکایک ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

”بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکی سے اس عورت کا کیا رشتہ ہے؟“ قاضی عدالت عدالت نے گواہوں سے سخت لہجے میں کہا۔

گواہوں کی مایوس نگاہیں پلیٹیں اور چاروں آدمی قاضی کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہو یا پھر اس کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

”تم بولتے کیوں نہیں؟“ قاضی عدالت کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔

گواہوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور کبھی قاضی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان سے بیان دینے کے سلسلے میں مسلسل کہا جا رہا تھا لیکن وہ اب تک اپنی زبانوں سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکے تھے۔ اہل دربار نے دیکھا کہ گواہوں کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کی قوت گویائی سلب کر لی گئی ہو۔ سلطان شمس الدین سے لے کر ایک ایک درباری تک، سب کے سب حیران تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لوگوں کو اس قدر طمطراق اور یقین کے ساتھ بطور گواہ پیش کیا گیا تھا، ان کی زبانیں اس طرح گنگ ہو جائیں گی۔

”بولو! میری مجبوریوں پر گواہی دو۔“ ناگہاں وہ عورت سر دربار چیخنے لگی۔ ”عدالت کو بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکی اس مظلوم بچے کے باپ ہیں۔“ عورت ان گواہوں کو مخاطب کر کے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔ ”تم تو سارے حالات سے آشنا ہو، پھر تمہیں کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کیا اس دنیا میں ایک ستم رسیدہ عورت کا کوئی پُرسان حال نہیں؟ کیا ایک شخص کے تقدس کا بھرم رکھنے کے لئے انصاف کے تمام تقاضوں کو پامال کر دیا جائے گا؟“ گواہوں کو خاموش دیکھ کر عورت پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اس کی گریہ وزاری سے پورا دربار گونجنے لگا تھا۔

”خاتون!“ دفعۃً دربار میں سلطان شمس الدین التمش کی آواز ابھری۔ ”ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے دعوے سے ہندوستان کی ایک عظیم مذہبی شخصیت شدید بدنامیوں کی زد میں آ جائے گی، تمہیں انصاف فراہم کرنے کی پوری کوشش کی مگر آج صورت حال یہ ہے کہ تمہاری مظلومیت پر گواہی دینے کے لئے ایک شخص بھی موجود نہیں۔“ یہ کہتے کہتے سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”غل الہی!“ عورت خوف سے کانپنے لگی۔ ”یہ لوگ جو کل تک چیخ چیخ کر میرے حق میں گواہیاں دے رہے تھے، آج رعب شاہی نے ان کی زبانوں پر مہر لگا دی ہے۔“ عورت کے بہتے ہوئے آنسو رک نہ تھے اور اب وہ نئے انداز میں اپنی وکالت کر رہی تھی۔ ”گواہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلطان کو قطب الدین بختیار کاکی سے کیا نسبت ہے؟ اسی نسبت نے ان کی قوت گویائی چھین لی ہے۔ وہ غل الہی کے پیر و مرشد۔ خلاف کس طرح گواہی دے سکتے ہیں؟ انہیں اپنے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ اگر قاضی

عدالت ان سے تنہائی میں بیان لیں تو یہ سب کچھ بتا دیں گے۔“ عورت نے اپنی ذہانت سے مقدمے کو نیا رخ دینے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں نکل الہی! میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ جلال شاہی نے انہیں خوف زدہ کر دیا ہے۔“ جیسے ہی عورت کی گفتگو ختم ہوئی، قاضی عدالت بول پڑا۔ اہل دربار ایک منصف کی اس حرکت پر چونک اٹھے۔ اب بیشتر لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ قاضی عدالت اس مقدمے میں جانبداری سے کام لے رہا ہے۔ ”سچائی کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔“ سلطان شمس الدین التمش غضب ناک ہو گیا۔ ”اگر فرماں روائے وقت بھی کوئی جرم کرتا ہے تو لوگوں کو پوری صداقت کے ساتھ گواہی دینی چاہئے۔ جب ایک معزز ترین انسان پر سر دربار اتنا گھناؤنا الزام عائد کیا گیا ہے تو مقدمے کی کارروائی بھی سب کے سامنے ہوگی۔ اگر یہ چاروں گواہ جھوٹے ثابت ہوئے تو انہیں تہمت طرازی کے جرم میں سخت ترین سزا سے گزرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر سلطان شمس الدین التمش خاموش ہو گیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ التمش کا یہ اعلان سنتے ہی تمام گواہوں کے چہرے اس طرح زرد ہو گئے تھے جیسے وہ اپنے عقب میں موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن رہے ہوں۔ ایک بار پھر ان چاروں نے پوری توانائی کے ساتھ بولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ابھی یہ اذیت ناک کشمکش جاری تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ان بد نصیب انسانوں پر رحم آ گیا۔ ”سلطان! یہ زر خرید غلام مجبور ہیں۔ ان کی زبانوں نے ہمیشہ کے لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔“

”سیّدی! پھر یہ مسئلہ کس طرح طے ہوگا؟“ سلطان شمس الدین التمش نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عرض کیا۔

”جس ذات بے نیاز نے اپنے عاجز بندے معین الدین کو اس ضعیفی کے عالم میں اجمیر سے دہلی تک پہنچایا ہے، وہی اس نازک مقام پر بھی دستگیری کرے گا۔“ سلطان التمش کے سوال کا جواب دے کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ، قاضی عدالت سے مخاطب ہوئے۔ ”بے شک آپ کا علم وسیع ہے مگر دل و دماغ کشادہ نہیں ہیں۔ اسلامی قانون کے مطابق منصف کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مقدمے کے دوران آخری لمحے تک غیر جانبدار رہے۔ میں اس کا گلہ نہیں کرتا کہ آپ نے قطبؒ سے حسن ظن نہیں رکھا۔ مجھے شکایت ہے کہ آپ نے ایک مردِ حق سے بدگمانی کی۔ ثبوت طلب کرنا یقیناً انصاف کا تقاضا ہے مگر الزام تراشی کر کے والوں کو سہارا دینا عدل کا خون ہے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حقیقت بیانی سے قاضی عدالت کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع میں کسی بہانہ سازی سے کام لیتا، حضرت سلطان الہندؒ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا۔

”اب ساری وضاحتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ عدالت کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ اپنے ذرائع سے دونوں فریقوں کے بارے میں تحقیقات کرائی۔ اسے اس بات کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ الزام تراشی کرنے والی عورت کون ہے اور جس پر الزام عائد کیا گیا ہے وہ کس کردار کا مالک ہے؟ مقدمے کی

کارروائی سے پہلے اس حقیقت کا ادراک ضروری تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لوگ اپنے انجام سے اس قدر بے پرواہ ہو گئے ہیں کہ پارساؤں کے لباس کو داغ دار کرتے وقت انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ میں یہاں کچھ ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو قطب کی رسوائی پر مطمئن نظر آتے ہیں لیکن اہل دنیا کا یہ اطمینان بہت عارضی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ آنے والے لمحے ان کے سکون کو غارت کر کے رکھ دیں گے۔ لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ قطب اپنی بے گناہی ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ افسوس! وہ یہ راز نہیں جانتے کہ میرا خدا قطب کو کسی کی بے گناہی کا محتاج نہیں کرے گا۔“

یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس عورت کی طرف دیکھا جو بے کسی کا مجسمہ بنی ہوئی سر دربار کھڑی تھی۔

”خاتون! اس بچے کے چہرے سے چادر ہٹا دو۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے مدعی عورت سے فرمایا۔

”تمہارا بچہ خود اہل دربار کو بتا دے گا کہ اس کا باپ کون ہے؟ تمہیں اب مزید انتظار کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔“ جیسے ہی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، پورے دربار پر سکوت مرگ طاری ہو گیا۔ ہر شخص حیرت زدہ تھا اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خود عورت بھی چند لمحوں کے لئے کسی پتھر کی طرح ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔ ”یہ دو ماہ کا شیر خوار بچہ کس طرح بولے گا؟“ کسی نامعلوم خوف کے اثر سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

”آج اس کے بولنے کا دن ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جواباً فرمایا اور پھر قاضی عدالت سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ کی عدالت میں یہ معصوم گواہ موجود ہے۔ کیا قانون اس کی شہادت قبول کر لے گا؟“ حضرت سلطان الہندؒ کا سوال بڑا عجیب تھا۔

”شہادت تو بہت دور کی بات ہے، یہ بچہ بولے گا کس طرح؟“ قاضی کی زبان میں لکنت صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”جس نے بچے کو پیدا کیا ہے وہی اپنے ایک بندے کی خاطر اسے قوت گویائی بھی عطا کرے گا۔“ آج اجیر کا ایک خرقہ پوش اس طرح بول رہا تھا کہ علمائے ظاہری کی عقل ٹھوکریں کھا رہی تھی اور فرط حیرت سے آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں۔

”مگر یہ سب کچھ خلاف فطرت ہے۔“ اب قاضی عدالت کی آواز کی لرزش پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔

”اللہ ہر شے پر قادر ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ”فطرت بھی اس کے حکم کی تابع ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنا حکم نافذ کرتا ہے۔ آپ قدرت کے رازوں کو سمجھنے کی بجائے اس بچے سے اس کے باپ کا نام و نشان دریافت کریں۔“

اب قاضی عدالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کرسی انصاف سے نیچے اتر آئے اور اپنی زندگی کے ایک ناقابل بیان مرحلے سے گزرنے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ

اچانک سلطان شمس الدین التمش بول پڑا۔

”آپ سلطان الہند کی بات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ انصاف کی تلاش میں منصف کو تو جان لیوا راستوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ تو ایک آسان مرحلہ ہے۔“

والی ہندوستان کی مداخلت نے قاضی کو کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ناگوار انداز میں انصاف کی مسند سے نیچے اُترا اور پھر آہستہ آہستہ عورت کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے کہنے پر عورت نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے بچے کا منہ کھولا۔ وہ ایک خوبصورت بچہ تھا جو بہت دیر سے اپنی ماں کی آغوش میں سو رہا تھا اور اسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی پیدائش کے سبب دہلی میں کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔ جیسے ہی دربار کی روشنی بچے کے چہرے پر پڑی، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور رونے لگا۔

”یہ رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔“ قاضی عدالت کا لہجہ تمسخر آمیز تھا۔

”آپ اس سے اس کے باپ کا نام پوچھیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے قاضی کے تضحیک آمیز رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

قاضی بادل ناخواستہ بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے جبراً تیز آواز میں پکار کر کہا۔ ”بچے! کیا تُو اپنے باپ کا نام جانتا ہے؟“

اہل دربار اپنی اپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے تھے اور ان کی سماعتیں بچے کا جواب سننے کی منتظر تھیں۔ مگر بچے پر قاضی کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور روتا رہا۔ قاضی نے دوسری بار اور پھر تیسری بار اپنا سوال دہرایا لیکن جواب میں بچے کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ قاضی عدالت جو چند لمحوں کے لئے وحشت زدہ ہو گیا تھا، مطمئن نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز ہنسی تھی اور وہ بار بار حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے سلطان الہند کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہا ہو کہ اتنے کم سن بچے بات نہیں کرتے۔ چاہے کوئی شخص اپنی کرامت کا سہارا لے لے مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ بچہ مسلسل روتا رہا تھا۔ اب عورت کی وحشت بھی ختم ہو گئی تھی اور وہ حسب سابق بے باک انداز میں سلطان شمس الدین التمش سے کہہ رہی تھی۔

”طل الہی! کب تک ایک مجبور عورت کا اس طرح مذاق اڑایا جائے گا؟ میں پہلے ہی بہت تماشا بن چکی ہوں۔ اب اس جان حزیں پر کرم کیجئے اور عدالت کو حکم دیجئے کہ وہ مجھے مزید تماشا نہ بنائے۔“ عورت نے ایک بار پھر اپنے دردناک لہجے سے عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش عورت کی فریاد کا کوئی جواب دیتا، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی پُر جلال آواز ابھری۔ ”بچے! خاموش ہو جاؤ۔“

کچھ دیر پہلے دربار میں جو ہلچل سی پیدا ہوئی تھی، وہ اچانک ختم ہو گئی۔ پھر اہل دربار نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ بچہ جو اپنی ماں کی آواز سن کر بھی خاموش نہیں ہوا تھا، وہ حضرت خواجہ غریب نواز کے پکارتے ہی چپ ہو گیا۔

”اے بد نصیب روح! تیرے ماں باپ نے تیری معصوم جان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت تجھے کس نام سے یاد کرے گا؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ شیر خوار بچہ آپ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہا ہو۔ پھر سلطان الہند نے قاضی عدالت اور فریادی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگے۔ اچانک حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے دربار کی چھت پر نظر ڈالی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے آپ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں مگر درمیان میں سرخ پتھر حائل تھے۔

”خدا یا! تُو اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ اذیت ناک حقیقت دنیا پر ظاہر نہ ہو مگر تُو علیم وخبیر ہے کہ کچھ عاقبت نا اندیش لوگوں نے میرے اور میرے قطب کے لئے عافیت کا کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ خداوند! تیرا یہ عاجز بندہ معین الدین، تجھ سے رحم اور معافی کا طالب ہے۔“

حضرت سلطان الہند نے یہ مختصر سی دعا مانگی اور پھر بچے کے بہت نزدیک آ گئے۔ اہل دربار کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔ جو لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مقام روحانی سے ذرا بھی واقف تھے، ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب چند لمحوں بعد ہی کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش آنے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلطان الہند نے اپنا دایاں ہاتھ بچے کے ہونٹوں پر رکھ دیا، پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”اے جان معصوم! تُو بے قصور ہے۔ ہر شخص کو اپنے گناہوں کا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ میں تجھے تکلیف دینا نہیں چاہتا مگر تیرے ماں باپ نے ایک ایسے شخص پر تہمت لگائی ہے جو مجھے رُوئے زمین پر سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تجھے کیا پتہ کہ میں کتنی راتوں سے بے خواب ہوں۔ میری بے قرار یوں کی طرف دیکھ..... اور قاضی عدالت کو..... اور اہل دربار کو اور ان لوگوں کو جو قطب کی رُسوائیوں پر جشن منا رہے ہیں، اپنے باپ کا نام بتا دے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی پُر جلال آواز ابھری اور لوگوں کے دلوں میں اُترتی چلی گئی۔ لوگوں کی آنکھیں گردش کرنا بھول گئی تھیں۔ ہونٹ ساکت تھے اور چہروں پر حیرت کے سائے لرز رہے تھے۔

”السلام علیکم سلطان الہند!“ دفعۃً دربار میں بچے کی باریک سی آواز سنائی دی۔ لوگ شدید اضطراب میں اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ زندہ حقیقت تھی کہ دو ماہ کا بچہ نہایت صاف لہجے میں بول رہا تھا۔

”بچے! تم پر بھی اللہ کی سلامتی ہو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اس جان معصوم کو دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ”اہل دربار کو اپنے باپ کا نام بتاؤ۔“

ایک ثانیے کے لئے دربار پر گہرا سکوت چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے بچے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”میرا باپ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا ایک معزز سردار ہے۔“ یہ کہہ کر بچے نے اس شخص

کا نام بتا دیا اور خاموش ہو گیا۔

اس انکشاف کے بعد دربار شاہی میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ عورت پر اس قدر لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر فرش پر گرتی، حضرت خواجہؒ کے دستِ کرم نے اسے سہارا دیا اور وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دربار میں موجود لوگوں کو وحشت زدہ انداز میں دیکھتی رہی اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

پھر لوگوں نے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا جو بہت دیر سے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ جب قدرت نے آپؐ کی بے گناہی کے لئے غیب سے ایک عجیب و غریب ثبوت فراہم کر دیا تو بے اختیار پیرو مرشد کے سینے سے لگ گئے اور اتنا روئے کہ آپؐ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بڑا رقت آمیز سماں تھا۔ تمام اہل دربار رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ پھر سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

”فرزند! یہ آزمائشیں تو ہمیشہ سے اہل ایمان کا مقدر رہی ہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ وقت کی عدالت میں معصوم ٹھہرے مگر یہاں کچھ جاں سوختہ عشق ایسے بھی گزرے ہیں جو دنیا کی بخشی ہوئی تہمتوں کو اپنے کفن میں سجا کر زمانے سے رخصت ہو گئے۔ اب ان کے مقدمات کا فیصلہ میدانِ حشر میں ہو گا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا مجرم اسی دربار میں موجود ہے..... ورنہ تم اس سیاہ کار دنیا میں کس سے انصاف مانگنے جاتے۔“ یہ کہہ کر سلطان الہندؒ نے حضرت قطبؒ کو علیحدہ کیا اور پُر جلال لہجے میں دوبارہ فرمایا۔

”فرزند! انتظار کرو۔ ابھی خدا کچھ اور چہروں کو بھی بے نقاب کرے گا۔“

اب لوگوں کی نظریں اس معزز سردار کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو قیمتی خلعت پہنے ہوئے دربار کی سب سے اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں جھلکی ہوئی تھیں اور چہرہ احساسِ جرم کے پسینے میں تر تھا۔ اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش اس سے کوئی جواب طلبی کرتا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عجیب مجذوبانہ انداز میں بڑبڑاتا ہوا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف بڑھا۔

”دنیا مجھے وادیِ اجل میں لے گئی۔ ہوس نے میری سانسیں غصب کر لیں۔ پھر میرے نفس نے مجھے ہلاک کر دیا۔ آنکھیں بھی ظلمتِ اسیر، دل میں بھی اندھیرا۔ اے روشنی! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟“

لوگ سمجھ رہے تھے کہ سردار ہوش میں نہیں ہے مگر حقیقتاً وہ بہت با ہوش تھا۔ لرزتے قدموں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نزدیک پہنچا اور پھر آپؐ کے پائے مبارک پر سر رکھ کر رونے لگا۔

”شاہا! میری روشنی تیرے پیروں سے اٹھنے والے گرد و غبار میں پوشیدہ ہے۔ مجھے کچھ دیر اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے کہ شاید اس گداگر کو سورج کی چند کرنیں بھیک میں مل جائیں۔“ سردار کی آواز بہت اثر انگیز تھی۔ مجرم ہونے کے باوجود اس کا طرزِ گفتار اہل دربار کو متاثر کر رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سردار کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے نحیف ہاتھوں سے سہارا دے کر اسے زمین سے اٹھایا۔

”اہل دل پر قیامت نازل کرنے کے بعد، روشنی کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے؟“ حضرت خواجہؒ کے

ارشاد سے قبل ہی سلطان شمس الدین بول پڑا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فرمانروائے ہند کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ”تجھے معلوم ہے کہ تیری تہمت طرازی سے اہل دلی کا کیا نقصان ہوا ہے؟ لوگ عظیم الشان مذہبی شخصیات کے بارے میں بھی اعتبار رکھونے لگے ہیں۔ اس زیاں کا حساب کون دے گا؟“

”اہل دہلی تبھی خسارے میں نہیں رہے۔“ سردار نے سلطان التمش کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ ”اے ذات والا حشم! یہ میرا ہی گناہ ہے کہ جس نے لوگوں کو مزید دولت یقین بخشی ہے۔ اگر مجھ سے اس جرم کا ارتکاب نہ ہوتا تو حضرت خواجہ کی یہ کرامت بھی ظاہر نہ ہوتی۔ اکثر لوگ معرفت کے سمندر کی کچھ گہرائیوں سے ناواقف ہی رہ جاتے۔“ سلطان التمش کے غضب ناک ہونے کے باوجود سردار کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔

”کیا حضرت خواجہ کی تعریف و توصیف اس لئے ہے کہ تجھے اپنے سر پر موت سا یہ فلک نظر آ رہی ہے؟“ والی ہندوستان کے لہجے سے بدستور قہر و نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ ”اس سے پہلے تیری زبان کیوں مفلوج ہو گئی تھی؟ حضرت قطب الدین بختیار کاکی بھی تو ان ہی کے خلیفہ اکبر ہیں۔ جب ایک مرد حق کی برگزیدہ شخصیت تہمتوں کی آندھیوں کی لپیٹ میں تھی، اس وقت تو نے اقرار جرم کیوں نہیں کیا؟“ سلطان التمش کی قہر آلود آواز سے پورا دربار گونج رہا تھا۔

”سلطان ذی جاہ! میں موت سے نہیں ڈرتا۔“ سردار نے انتہائی بے باک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے درباری علماء نے کہا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے یہ درویش عملی زندگی سے دور ہوتے ہیں۔ یہ خرقہ پوش پہلے جاہل اور توہم پرست انسانوں کے کمزور دماغوں کو متاثر کرتے ہیں پھر ان ہی بے نظر لوگوں کی عقیدت کے سہارے یہ اپنی مسندوں کو آراستہ کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ضرورت مند دنیا ان کے گرد جمع ہونے لگتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی بھی ایسے ہی بے عمل درویش ہیں جن کے نظام خانقاہی سے اسلام کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلطان معظم صوفیوں کے حلقہ اثر میں آچکے ہیں اور اب درپردہ ہندوستان پر ان ہی خرقہ پوشوں کی حکومت ہوگی جس کے نتیجے میں حضرت قطب سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اپنے اپنے عہدوں سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ یہ اہل اقتدار کے لئے ایک بھیانک خبر تھی۔ میں اپنے جہل کے باعث ان باتوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا۔ دولت و اقتدار کے نشے نے مجھے یہ توفیق بھی نہیں بخشی کہ میں خود حضرت قطب کی خانقاہ میں حاضر ہو کر ان انواہوں کی تصدیق کرتا۔ آخر میرے نفس نے مجھے کھلا فریب دے دیا اور میں ہوس کی آندھیوں میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پھر حضرت قطب کی بے داغ شخصیت کو آلودہ کرنے کے لئے ایک ناپاک منصوبہ تیار کر لیا۔ اس سازش میں کچھ علمائے وقت اور کچھ ارباب اختیار شامل تھے لیکن میں اس منصوبے میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ سلطان ذی حشم کے دربار میں ایک بااثر شخص ہونے کی وجہ سے مجھے پورا یقین تھا کہ میرے خلاف کوئی زبان بھی جنبش نہیں کر سکے گی..... اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے درویشوں کے عقیدت مندوں سے یہ بھی سنا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے روشن ضمیر ہوتے ہیں۔ مجھے اس غیر فطری بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایک انسان پس دیوار کس طرح دیکھ سکتا

ہے؟ جب حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کی گئی اور وہ بہت دن تک اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش نہیں کر سکے تو درویشوں کی روشن ضمیری سے میرا اعتبار اٹھ گیا اور پھر اس منصوبے کے تمام شرکاء یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ حضرت قطبؒ کی روحانی عظمتوں کا مینار ہمیشہ کے لئے منہدم ہو چکا ہے۔ مگر حضرت خواجہؒ کی چشم گرہ کشا نے گناہ گار عقل کے تمام طلسمات کو تار تار کر دیا۔ اب روشن ضمیری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟“ یہ کہہ کر سردار، حضرت قطبؒ کی طرف مڑا۔

”میں آپ کا مجرم ہوں۔ اسلامی شریعت نے تہمت طرازیوں کے لئے جو سزا مقرر کی ہے مجھے اس سے زیادہ سخت سزا دی جائے تاکہ میرے بعد آنے والے عبرت حاصل کر سکیں۔“ سردار کی آواز سے کسی قسم کی دہشت نمایاں نہیں تھی۔ پھر بھی اس کا لہجہ اثر انگیز تھا۔ ”میں اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے پہلے شہنشاہ معرفت سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنے دست مبارک کو بوسہ دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میرا جرم تو اتنا سنگین ہے کہ مجھے اس میں رعایت اور معافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب میرے لئے یہ امر باعث تسکین ہو گا کہ ایک مرد خدا کے جسم کو چھو لوں اور اگر زندہ بچوں تو تمام عمر اس اعزاز پر فخر کروں۔“ یہ کہہ کر سردار نے درخواست گزار نظروں سے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ جو کچھ دیر پہلے بہت ادا اس نظر آ رہے تھے، اب آپؒ کے ہونٹوں پر وہی جاں فزا تبسم لوٹ آیا تھا۔

اہل دربار نے دیکھا کہ اچانک حضرت قطبؒ نے اپنا ہاتھ سردار کی طرف بڑھا دیا اور پھر بڑے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ احترام کی اس رسم کو فروغ دے۔ یہ ایک گمراہ کر دینے والی رسم ہے جس سے انسانی نفس بڑے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فقیر بھی اپنے عقیدت مندوں کے لئے عزت و احترام کے اس مظاہرے کو روا نہیں رکھتا مگر آج تجھے اجازت ہے۔“

جیسے ہی حضرت قطبؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، سردار نے بے قرار ہو کر حضرت قطبؒ کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور پھر حاضرین دربار نے اسے ہچکیوں کے ساتھ روتے دیکھا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک سنگ دل انسان تھا مگر آج رویا تو اس طرح کہ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ انسانی فطرت کے اس انقلاب پر تمام اہل دربار حیران تھے۔ جب اس کے دل کا غبار دھل گیا تو وہ سیدھا کھڑا ہوا اور پھر فوراً ہی حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ حضرت قطبؒ نے سردار کو اٹھایا اور پھر نہایت پرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔

”لوگ اپنا کام کر چکے، جسے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا اور خدا کو جو کچھ ظاہر کرنا تھا، ظاہر کر چکا۔“ یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کی طرف دیکھا۔ ”سلطان! آپ نے اس بوریا نشیں سے حسن ظن رکھا، خدا آپ کو جزائے خیر دے..... اور جن لوگوں نے مجھے بے گناہ سمجھا، انہیں بھی خدا حسن نیت کا صلہ دے۔ میں نے اس عورت کو بھی معاف کیا جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر مجھے بدنام کرتی رہی۔ دربار شاہی کا یہ معزز سردار بھی میری نظر میں بے قصور ہے۔ اگر یہ اپنے

آپ کو مجرم سمجھتا ہے تو میں اس کی تالیف قلب کے لئے اسے بھی معاف کرتا ہوں۔ قاضی عدالت کی جانب داری کے باوجود میری طرف سے ان پر بھی کوئی الزام نہیں۔ وہ محترم افراد جو اس درویش کی موجودگی کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک خرقہ پوش دنیا داری کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا۔ اسے اپنی ہی ذات کے محاسب سے فرصت نہیں ہے، پھر یہ فقیر کسی دوسرے کے حال پر کیا نظر رکھے گا؟ خدا رحیم و کریم ہے، وہ اپنے عاجز بندے قطب الدین کے گناہوں کو بھی معاف کرے اور انہیں بھی اپنی بے مثال رحمت کے صدقے میں بخش دے جو اپنے عہدہ و منصب کو دائمی سمجھ کر روزِ حساب کو بھول گئے ہیں۔“

تمام دربار پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھر حضرت قطبؒ نے درباری سردار سے مخاطب ہو کر فرمایا۔
”عورت اور بچے کو ان کے جائز حقوق دے دو۔ بس تم سے میری یہی درخواست ہے۔“
حضرت قطبؒ کی شانِ کریمانہ دیکھ کر سردار پر ایک بار پھر گریہ طاری ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت سلطان الہندؒ کے پیچھے پیچھے اس طرح دربار سے تشریف لے گئے کہ شمس الدین التمش کے ساتھ تمام حاضرین احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں مردانِ حق شاہی محل سے باہر آئے تو دور تک راستے کے دونوں جانب بے شمار انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں حضرت سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ کے عقیدت مند بھی تھے اور وہ تماشا شائی بھی جو ایک مرد بزرگ کی رسوائیوں کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے..... مگر بدخواہوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ خدا نے حضرت قطبؒ کی پارسائی کو اہل دنیا پر اس طرح ظاہر کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تو اس مجرم سردار کو معاف کر کے چلے گئے تھے لیکن بعض بااثر درباریوں نے اسے سنگین سزا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ خود سردار بھی اپنے جرم کے احساس سے بار بار چیختا تھا۔

”مجھے عبرت ناک سزا دو تا کہ آئندہ کوئی بدکار شخص کسی پارسا کی طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ میرے ہاتھ کاٹ دو، زبان قطع کر دو اور منہ کالا کر کے اطرافِ دہلی میں پھراؤ، کوچہ کوچہ اعلان کراؤ کہ یہ حضرت قطبؒ کا مجرم ہے اور اس کی یہی سزا ہونی چاہئے تھی۔“ احساسِ جرم کی شدت نے سردار کو بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش پر لوگوں کا دباؤ بڑھتا رہا لیکن فرمانروائے ہندوستان نے یہ کہہ کر سزا دینے سے انکار کر دیا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے مجرم کو معاف کر چکے ہیں۔

پھر ایک دن حضرت قطبؒ کی خانقاہ کے باہر جمع ہونے والے بہت سے لوگوں نے ایک عورت اور مرد کو دیکھا۔ عورت برقعے میں روپوش تھی اور مرد اپنی ظاہری حالت سے انتہائی شکستہ حال نظر آ رہا تھا۔ اس کی داڑھی وحشیوں کی مانند بڑھی ہوئی تھی اور سر کے منتشر بال اس کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کر رہے تھے۔ عام لوگ اسے کوئی دیوانہ سمجھ رہے تھے مگر واقف حال لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا وہی معزز سردار تھا جس نے حضرت قطبؒ کے خلاف سازش کا ایک ناپاک

منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس وقت سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ خانقاہ کے اندر موجود تھے۔ دروازے پر خادموں کا پہرہ تھا جو اجازت کے بغیر کسی کو اندر جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ اجنبی شخص عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے دروازے تک آیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا کہ حضرت سلطان الہندؒ کے دربار عالیہ میں جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔

”لوگو! میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔“ سردار کا لہجہ بڑا دردناک تھا۔ مگر خانقاہ کے خادم آداب کے پابند تھے۔ اس لئے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ناگوار لہجے میں کہا۔ ”یہ کوئی بازار ہے کہ جب جس کا جی چاہے، منہ اٹھائے ہوئے چلا آئے؟ ابھی کچھ معززین شہر اندر موجود ہیں۔ وہ رخصت ہو جائیں تو حضرت قطبؒ کے ایماء پر تجھے بھی اجازت مل جائے گی۔“

”جب تک تو میری روح بھی خاکستر ہو جائے گی۔ شاہ کو خبر کرو کہ ایک سوختہ جاں غلام آیا ہے۔“ سردار ہندیانی انداز میں بول رہا تھا۔ خادم اسے خاموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے..... مگر وہ ہر شے سے بے نیاز تھا۔ یہاں تک کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس کی آواز سن لی اور پھر سردار کو فوراً ہی اندر طلب کر لیا گیا۔

وہ برقع پوش خاتون کے ساتھ خانقاہ کے اندر داخل ہوا۔ جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، سلطان الہندؒ اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اندر پہنچتے ہی عورت بے نقاب ہو گئی۔ یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے بچے کے حوالے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کی تھی۔ عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے حضرت قطبؒ اور حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں کو چھونا چاہا مگر حضرت قطبؒ نے عورت کو یہ کہہ کر روک دیا۔

”خاتون! اسلام میں ایک نامحرم عورت کو کسی محرم مرد کے جسم کو چھونا قطعاً حرام ہے۔ چاہے وہ مرد کوئی مذہبی بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے تم دونوں کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ پھر تم لوگوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں کی؟“

”شاہا! یہ آپ کے جلال سے ڈرتی تھی مگر میں اسے خدمت عالیہ میں لے کر آیا ہوں۔“ سردار نے انتہائی وارفتگی کے عالم میں کہا۔ ”یہ آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہونا چاہتی ہے۔“

در اصل واقعہ یہ تھا کہ وہ دہلی کے بدنام طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک خوبصورت ہندو دوشیزہ تھی جسے رقص و موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے سردار نے کیف و سرور کے عالم میں اسے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ پھر اقتدار کی طاقت کے ذریعے اس نے ہندو دوشیزہ کو दाشته بنا لیا۔ آج وہ گمراہ اور فتنہ گر عورت حضرت قطبؒ کے آستانے پر کسی بھکاری کی مانند پڑی تھی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ درخواست قبول کر لی اور پھر وہ عورت کفر و گناہ کے دائرے سے نکل کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد سردار نے خواہش ظاہر کی۔

”شاہا! اس غلام کو ہمیشہ کے لئے اس در پر پڑا رہنے دیا جائے تاکہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا

کر سکے۔“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جواباً فرمایا۔

”خانقاہ کی بجائے شاہی دربار کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہاں رہ کر پرہیزگاری کی زندگی بسر کرو۔ لوگوں کو نیکی کی دعوت دو، کمزوروں کا سہارا بنو اور بزرگانِ خدا کے ساتھ انصاف کرو۔ یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے، یہی تمہاری عبادت ہے اور یہی تمہاری ریاضت ہے۔“

یہ کہہ کر آپؒ نے اپنے ایک خادم کو فرمانروائے ہندوستان سلطان التمش کے نام ایک مکتوب تحریر کرنے کا حکم دیا۔

حضرت قطبؒ نے التمش کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”یہ شخص اپنے گناہوں سے تائب ہو چکا ہے اور میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ آپ بھی اپنے دل میں اس سے کسی قسم کی رنجش نہ رکھیں۔ ہو سکے تو حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں۔ خدا معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

یہ ایک اور اعزاز تھا جو حضرت قطبؒ کی طرف سے مجرم سردار کو بخشا گیا تھا۔

آخر کچھ دیر بعد وہ بادل ناخواستہ حضرت قطبؒ کی بارگاہ سے اُٹھا۔ عورت اس کے ہمراہ تھی۔ خانقاہ کے خادموں اور دوسرے لوگوں نے سنا۔ عورت بڑے والہانہ انداز میں کہتی جا رہی تھی۔ ”میں کیسی خوش نصیب ہوں کہ مجھے حضرت قطبؒ کے ذریعے دولت ایمان عطا ہوئی ہے۔“

پھر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اس واقعے نے اتنی شہرت پائی کہ حلقہٴ کفار میں لرزہ پڑ گیا۔ جو لوگ صدیوں سے پتھر کے دیوتاؤں سے بدظن تھے، اب انہیں حقیقی زندگی کی روشنی نظر آ گئی تھی۔ شکوک و شبہات کی بلند ترین عمارتیں مسلسل گر رہی تھیں اور ان کی جگہ یقین کے سادہ مکانوں کی بنیادیں اُٹھائی جا رہی تھیں۔ بڑے بڑے کٹر برہمن، بد دماغ راجپوت اور چھوٹی چھوٹی ذاتوں کے ہندو قطار در قطار حضرت کی خانقاہ کی طرف آرہے تھے۔ ہندو مذہب کے پرستاروں کے لئے یہ بڑی عجیب خبر تھی کہ دو ماہ کا بچہ نہ صرف گفتگو کر سکتا ہے بلکہ وہ کئے ہوئے سوالات کا جواب بھی دے سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک ایسی ناقابل فراموش کرامت تھی جس نے جادو اور منتروں کے پجاریوں کو اسلام کی حقانیت کے اعتراف پر مجبور کر دیا تھا۔ نتیجتاً ہزاروں ہندو کلمہ طیبہ پڑھ کر حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے۔ علمائے ظاہری کی ایک بڑی جماعت جو عرصہٴ دراز سے حضرت قطبؒ کی مخالفت میں سرگرم عمل تھی، یہ منظر دیکھ کر شرم و ندامت کے سپینے میں ڈوب گئی۔ سازش کے بچھائے ہوئے جال خود ان ہی کو جکڑنے لگے اور حضرت قطبؒ کا مرتبہ کم ہونے کی بجائے ان کے تصور سے بھی زیادہ بلند ہو گیا۔



اہل دربار کا خیال تھا کہ اب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلاف کسی دل میں بغض و کینہ کا غبار باقی نہیں ہوگا..... مگر یہ ایک خوش فہمی تھی۔ کوئی بھی زمانہ حسد کرنے والوں سے خالی نہیں رہا

ہے۔ جب اس سازش کا غبار چھٹ گیا تو ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا جس سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل کو شدید تکلیف پہنچی۔ حضرت خواجہؒ کی دہلی آمد سے پہلے شیخ الاسلام جمال الدین بسطامیؒ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت میں یہ سب سے بڑا عہدہ تھا۔ حضرت جمال بسطامیؒ کی وفات کے بعد سلطان شمس الدین التمش حضرت قطبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے درخواست کی کہ آپ شیخ الاسلام کے منصب کو قبول فرمائیں مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

”درویش، دنیا کے ہنگاموں سے یکسر دور رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی فقیر صلاحیت نہیں رکھتا۔ بہتر ہے کہ اس اہم ترین منصب پر کسی لائق شخص کا تقرر کیا جائے۔“

سلطان شمس الدین التمش اچھی طرح جانتا تھا کہ حضرت قطبؒ جان بوجھ کر اپنا دامن بچار ہے ہیں ورنہ شیخ الاسلام کے عہدے کے لئے آپؒ سے بہتر کوئی شخص کم سے کم دہلی میں موجود نہیں تھا۔ صریحاً انکار کے بعد بھی شمس الدین التمش مسلسل کئی دن تک درخواست کرتا رہا مگر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ آخر شیخ نجم الدین صغریٰ کو اس عہدے پر مامور کر دیا گیا۔

شیخ نجم الدین صغریٰ، حضرت عثمان ہروئیؒ کے خلیفہ تھے۔ اس اعتبار سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ نجم الدین صغریٰ میں ایک خاص روحانی رشتہ تھا۔ شیخ کا شمار اپنے وقت کے مشہور بزرگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد وہ اذیت ناک واقعہ پیش آیا جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر سنگین الزام عائد کیا جا رہا تھا اس وقت کچھ لوگوں نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے پاس جا کر کہا تھا۔

”آپ کا حضرت قطبؒ سے ایک خاص تعلق ہے۔ پھر آپ اس مردِ حق کے مقدمے میں گواہی کیوں نہیں دیتے؟“

لوگوں کے اس سوال پر شیخ نجم الدین صغریٰ نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”قطب سے میرا یہی تعلق تو مجھے گواہی دینے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ اگر میں عدالت میں کچھ کہوں گا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپس کے رشتوں کو نبھایا جا رہا ہے۔ اس طرح مجھ پر جانبداری کا الزام آ جائے گا۔“ شیخ نجم الدین صغریٰ کا جواب سن کر لوگ حیران رہ گئے تھے۔ انہیں صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ شیخ مصلحت و سیاست سے کام لے رہے ہیں۔ آخر وہ ساعت گراں گزر گئی اور حضرت قطبؒ کے عظمت و تقدس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

جب حالات پرسکون ہو گئے تو تمام معززین شہر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ آنے والوں کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کرتے اور انہیں مختصر عبادتِ الہی کے رموز و نجات بھی سمجھاتے۔ اس دوران حضرت قطبؒ کے خدمت گاروں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطان الہندؒ کی نگاہیں انسانی ہجوم میں کسی کو مسلسل

تلاش کرتی رہتی ہیں۔ جب یہ عمل کئی دن تک جاری رہا تو ایک روز خادموں نے حضرت خواجہ کی اس کیفیت کو حضرت قطب کے روبرو بیان کر دیا۔ حضرت قطب نے بھی خاموشی کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کی اس کیفیت کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ واقعاً سلطان الہند کو کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو اس محفل میں موجود نہیں ہے۔

جب رات کو تنہائی میں سر آئی تو حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے سلطان الہند کی بارگاہ میں دست بستہ عرض کیا۔ ”غلام کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیر و مرشد کسی خاص شخص کے منتظر ہیں۔“

”ہاں قطب! تمہارا اندازہ درست ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے کسی قدر افسردہ لہجے میں فرمایا۔ ”جب اپنے کسی محبوب عزیز سے ملاقات نہ ہو تو انسان اُداس ہو ہی جاتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ ساری دنیا آگئی مگر شیخ نجم الدین صغریٰ اب تک ملاقات کے لئے نہیں آئے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جب بھی درویش دہلی آیا، شیخ بھی ملنے ضرور آئے۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟“

حضرت قطب الدین بختیار کاکی پیر و مرشد کی بات سن کر بظاہر خاموش ہو گئے لیکن آپ نے فوراً ہی ایک خادم کے ذریعے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ سلطان الہند ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔

جواب میں شیخ الاسلام نے کہا کہ وہ امور سلطنت اور اپنی ذمہ داریوں کے باعث عدیم القرصت ہیں۔ اگر وقت ملا تو حاضر ہو جائیں گے۔

شیخ نجم الدین صغریٰ کا جواب سن کر حضرت قطب کو سخت اذیت محسوس ہوئی۔ آپ شیخ الاسلام کے جواب کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نجم الدین صغریٰ اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے سلطان الہند کی بارگاہ میں آنے سے گریز کر رہے تھے۔ یہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور دوسرے بزرگوں کے لئے ایک تکلیف دہ سلوک تھا۔ حضرت قطب تو پیر و مرشد کے ادب کے باعث خاموش رہے لیکن دیگر حضرات نے شیخ نجم الدین کبریٰ کے اس طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

”شیخ الاسلام ہونے کے بعد وہ بہت مغرور ہو گئے ہیں۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے رویے پر تنقید کرنے والے حضرات کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”وہ میرے پیر و مرشد کی نشانی ہیں۔ ان کا میرے ساتھ کچھ بھی سلوک ہو مگر میں انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔“ حضرت سلطان الہند نے شیخ الاسلام کا دفاع اس طرح کیا کہ اہل مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔ ”اگر شیخ نجم الدین یہاں تشریف نہیں لائے تو میں خود ان کے پاس جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے حضرت قطب کو اپنے ساتھ لیا اور شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

شیخ الاسلام اس اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد آسودہ حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی شیخ الاسلام کے یہاں پہنچے تو وہ

اپنا نیا مکان تعمیر کر رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر دونوں بزرگوں پر پڑی وہ مزدوروں کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئے۔ حضرت قطب کو امید تھی کہ شیخ الاسلام والہانہ انداز میں سلطان الہند کے استقبال کے لئے آگے بڑھیں گے اور اپنے سارے کام ترک کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ حضرت خواجہ کو دیکھ کر وہ کچھ اور مصروف نظر آنے لگے تھے۔ سلطان الہند نے نجم الدین صغریٰ کے طرز عمل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظر انداز کر دیا اور قریب پہنچ کر اپنے برادر روحانی کو سلام کیا۔

شیخ الاسلام نے رسم زمانہ نبھانے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سلام کا جواب تو دے دیا مگر فوراً ہی مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہیں مختلف کاموں کے بارے میں ہدایت دینے لگے۔

حضرت سلطان الہند کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن نجم الدین صغریٰ مسلسل مزدوروں سے بات چیت کرتے رہے تو حضرت خواجہ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ”نجم الدین! آخر تم پر کیا افتاد نازل ہوئی ہے کہ تم درویشی کی بنیادی رسم بھی بھول گئے ہو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔

”میں بالکل نہیں بدلا ہوں۔“ شیخ نجم الدین صغریٰ نے اس طرح جواب دیا کہ ان کی آواز ہر جذبے سے عاری تھی۔ ”میں درویشی کے آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ یہ کہتے کہتے شیخ الاسلام کے چہرے پر ایک خاص رنگ ابھر آیا تھا جیسے انہیں اپنی علیست پر بہت ناز ہو۔

”میرے بھائی! درویشی تو بڑی چیز ہے، ایک عام آدمی بھی اپنے گھر آنے والے مہمانوں کو اس طرح نظر انداز نہیں کرتا۔“ اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی انتہائی برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن پھر بھی آپ کے لہجے سے ہلکی سی تلخی نمایاں ہو چلی تھی۔ ”کیا تمہیں سرکاری عہدے نے اتنا مغرور بنا دیا ہے کہ اب تمہاری نظروں میں اخلاقی قدروں کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی؟ کیا شیخ الاسلام کے لقب کو بھائے دوام حاصل ہے؟ کیا خاندان چشتیہ کی روایتوں کے امین اس قدر دنیا پرست ہوتے ہیں؟ کیا پیر و مرشد کی فصاحت یہی تھی کہ درویش اپنی عزت و جاہ کی مسند آراستہ کر کے مخلوق خدا کو فراموش کر دے؟“ خواجہ معین الدین چشتی کی گرم گفتاری کا یہ عالم تھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ کے غرور کا حیران جل کر خاک ہو گیا۔

اب شیخ الاسلام کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں تھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سامنے ان کی زبان لڑکھارہی تھی۔ ”میں کل بھی آپ سے مخلص تھا اور آج بھی میرے دل میں وہی جذبات موجود ہیں مگر اس شخص نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“ شیخ نجم الدین صغریٰ نے حضرت قطب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے اس مرید خاص کی وجہ سے میری طرف کوئی متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ ساری دنیا اس کی خانقاہ کی طرف گھنچتی چلی جاتی ہے جیسے اس شہر میں میرا کوئی مقام ہی نہیں۔“ آخر شیخ الاسلام کے دل کی بات ان کی زبان پر آگئی تھی۔

چند لمحوں کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی یہ سوچ کر حیران رہ گئے کہ اتنا بڑا بزرگ بھی

حضرت قطبؒ سے حسد رکھتا ہے مگر کچھ دیر بعد ہی آپؒ کے ہونٹوں پر تبسم اُبھر آیا۔
 ”نجم الدین! اب تمہاری بے اعتنائی اور ناراضگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے
 شانِ بے نیازی سے فرمایا۔ ”یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں کہی؟ اگر تم مجھے آگاہ کر دیتے تو تمہیں اتنے
 دن یہ اذیت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ بہر حال مطمئن رہو، جس شہر کے اہل علم اتنے تنگ نظر ہوں، وہاں
 قطبؒ کو قیام نہیں کرنا چاہئے۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ واپس جانے لگے۔ شیخ نجم الدین
 صغریٰ نے کچھ دیر بیٹھنے اور کھانا کھانے کی درخواست کی مگر سلطان الہندؒ نے صاف انکار کر دیا۔



چند روز بعد اہل شہر ایک انتہائی کرب ناک صورتِ حال سے دوچار ہو گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ
 حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر واپس جا رہے تھے لیکن اس بار خلافِ توقع حضرت قطب الدین
 بختیار کاکیؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ جیسے جیسے یہ خبر عام ہوتی گئی، لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دیوانہ وار
 شاہراہ پر نکل آئے۔ سلطان شمس الدین التمش کو اطلاع ملی تو وہ بھی گھبرا کر چلا آیا۔ اس نے سلطان الہندؒ
 سے عاجزانہ درخواست کی کہ حضرت قطبؒ کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ یہی
 فرماتے رہے کہ جہاں علم و تقویٰ بغض و حسد کا شکار ہو جائے وہاں قطبؒ نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمانروائے
 ہندوستان احتراماً خاموش ہو گیا مگر حضرت خواجہؒ کے ہمراہ پیادہ پا چلتا رہا۔

جب سلطان الہندؒ حضرت قطبؒ کو لے کر شہر کی حدود سے باہر نکلے تو انسانی ہجوم نے گریہ و زاری
 شروع کر دی۔ سیر العارفین کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی نے اس جانگداز منظر کی تفصیلات بیان
 کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت قطبؒ کے قدم جہاں پڑتے تھے، لوگ وہاں کی خاک اٹھا کر اپنی
 آنکھوں سے لگا لیتے تھے یا چہرے پر مل لیتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک لوگوں کی
 اس جذباتی کیفیت کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر انسانی جوشِ عقیدت پر آپؒ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ یکایک
 سلطان الہندؒ ٹھہر گئے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمانے لگے۔

”فرزند! تم دہلی میں قیام کرو، مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جدائی میں کہیں اہل شہر برباد نہ ہو جائیں۔“
 جیسے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، انسانی ہجوم میں بے
 پایاں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مگر اہل شہر کی یہ خوشی بہت عارضی تھی۔ دوسرے ہی لمحے انہیں ایک ایسے
 صدمہ عظیم سے دوچار ہونا پڑا کہ جس کا ازالہ رہتی دنیا تک ممکن نہیں تھا۔ حضرت سلطان الہندؒ مختصر قیام
 کے بعد دہلی سے اجمیر تشریف لے جا رہے تھے۔ فضا سو گوار تھی اور فرطِ غم سے لوگوں کے دل ڈوبے جا
 رہے تھے۔ انسانی ہجوم بہت دور تک حضرت غریب نوازؒ کو رخصت کرنے آیا لیکن منزلِ فراق آخر منزلِ
 فراق ہے۔

سلطان الہندؒ نے حضرت قطبؒ کو گلے لگایا اور پھر گلوگیر آواز میں فرمایا۔ ”فرزند! الوداع! اب اگر
 خدا کو منظور ہوگا تو میدانِ حشر میں ملاقات ہوگی۔“ یہ ایک واضح اشارہ تھا جس کے مفہوم پر اہل دل نے
 غور کیا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

راہوں سے غبار اٹھنے لگا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مشتاقانِ دید کے درمیان فاصلے حائل ہو گئے۔ اہل درد بے قرار تھے۔ شام فراق نے دل کی دنیا کا اس طرح حصار کر لیا تھا کہ ہجوم عاشق کو وسیع و عریض کائنات میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جذبے سرنگوں، تمنائیں بے جان اور سانسیں منتشر تھیں۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور چہروں پر ناکام حسرتوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہونٹ پیہم مصروفِ نغاں تھے اور سر زمینِ دہلی کا ایک ایک ذرہ فریاد کر رہا تھا۔ اگرچہ جانے والے نے دمِ رخصت سختی سے تنبیہ کی تھی کہ اس کی یاد میں اشک ریزی نہ کی جائے لیکن ہوش کسے تھا؟ جن کی متاعِ حیات لٹ گئی ہو، ان کے جذبات دائرۂ اختیار میں کس طرح رہتے؟ صبر و ضبط برقرار رکھنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ لوگ جانے والے کو دیوانہ وار پکار رہے تھے۔

”اے روشنی! ہم سیاہ بختوں کے شہر میں کچھ دیر اور قیام کر۔ ہمیں اپنی تاریک بستیوں کو سجانے دے اور دل و دماغ کے بے نور گوشوں کو اپنی معرفت کی ضیاء بارپوں سے منور کرنے دے۔“ مگر جانے والا بہت دور جا چکا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے اہل ایمان کو واضح طور پر سمجھا دیا تھا۔

”خبردار! دنیا کی کسی روشنی کے فریب میں نہ آ جانا۔ تمہارے لئے وہی ایک روشنی کافی ہے جو گنبدِ خضریٰ سے نکل کر زمین و آسمان کے بعید ترین گوشوں کو روشن کر رہی ہے۔ ہمیشہ اسی روشنی پر نظر رکھنا۔ پھر نہ تمہارے دل تاریک ہوں گے نہ مکان۔“

لوگوں کی سماعتوں میں ابھی تک وہ صدائے دلنواز گونج رہی تھی لیکن ان کی آنکھیں اس قابل کہاں تھیں کہ وہ گنبدِ خضریٰ سے طلوع ہونے والی روشنی کو دیکھ سکتے۔ ان کی نظریں تواجیر کی روشنی پر مرکوز تھیں اور اسی روشنی کو وہ کسی حد تک برداشت کر سکتے تھے۔ آخر جب آفتابِ چشتیہ کی یہی روشنی وارفتگانِ شوق کی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو وہ جوشِ جذبات میں چیخنے لگے۔ ہر مضطرب اور پیاسی نگاہ دور تک دامن کش ہوئی مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جانا تھا، اس لئے آپؒ تشریف لے گئے۔



حضرت سلطان الہندؒ کے جانے کے بعد بہت دن تک دہلی کے در و بام آپؒ کی اس کرامت کے ذکر سے گونجتے رہے جس نے حضرت قطبؒ کو عجیب و غریب انداز سے بے گناہ ثابت کیا تھا اور جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے صدیوں پرانے قشقے کھرچ دیئے تھے اور زُنا کو توڑ کر اس طرح پھینک دیا تھا کہ اب اس کا فرانہ رسم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ ہزاروں اہل ہنود حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ بت پرستوں کے بڑے بڑے پجاری اور پروہت وحشت زدہ تھے۔ انہیں اپنے صنم خانوں کی بلند دیواریں زمین بوس ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ سینکڑوں سال سے فرضی خداؤں کا سہارا لے کر ان گنت بندگانِ خدا پر اس طرح حکومت کی جا رہی تھی کہ ان کے دل، دماغ اور روہیں اور جسم برہمنوں کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے۔ آج اسی حکومت کی بنیادیں لرز رہی تھیں اور نیم برہنہ پجاری اپنے بدن پر باطل عقائد کی راکھ ملے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

”لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کہاں جا رہے ہو؟ دیوی کے پرستارو! دیوتاؤں کے پجاریو! تمہیں ایک مسلمان جادوگر نے گمراہ کر دیا ہے۔ ٹھہرو! تمہاری منزل تمہیں قریب پکار رہی ہے۔ آکاش کی طرف دیکھو! تم پر قہر نازل ہونے والا ہے۔ برہما تم سے رُوٹھ گئے ہیں۔ دشمنو اور شکر خفا ہیں۔ کرشن اور رام نے تم سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب تمہارا زمین پر کوئی سہارا باقی نہیں۔ لوٹ آؤ کہ ابھی وقت ہے۔ ہم تمہاری معافی کے لئے دیوتاؤں سے سفارش کریں گے۔“ پروہت مسلسل چیخ رہے تھے۔ پجاری اور جوگی، مسلمان ہو جانے والے ہندوؤں کو پیہم عذاب کی خبریں دے رہے تھے مگر جو ایک بار دیوتاؤں کے حلقے سے نکل گیا، پلٹ کر نہیں آیا۔ دوسرے ہندو بھی اپنے سابقہ ہم مذہبوں کی تقلید میں حضرت قطب کی خانقاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اہل ہنود کی صفوں میں عجیب و غریب افراتفری کا عالم تھا۔ عیار برہمنوں نے اسلامی نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جادوگر کہہ کر پکارا تھا۔ بت پرستوں کا خیال تھا کہ اس الزام تراشی سے جاہل مخلوق اپنے مرکز کی طرف پلٹ آئے گی لیکن جانے والوں نے اپنے روحانی پیشواؤں کی ایک بھی نہیں سنی۔ ہندو معبدوں میں ناقوس زیادہ زور و شور سے بجتے رہے مگر اب لوگ مؤذن کی صداؤں کے منتظر تھے۔ پھر بھی کچھ جذباتی پجاریوں نے جانے والوں کا راستہ روک کر کہا۔

”مسلمان جادوگروں نے تمہارے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔“

جواب میں کہنے والوں نے کہا۔ ”تم بھی جادوگری کی کوئی ایسی مثال پیش کر کے ہمارے ہوش و حواس چھین لو۔“

بڑا جارحانہ جواب تھا۔ برہمن پجاری اپنے ہم قوموں کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس عظیم الشان کرامت کو جادوگری کا نام دینے والے عاجز و قاصر تھے۔ ہندوؤں کے یہاں جادو، ٹوٹنے اور منتر کی رسم عام تھی مگر وہ حضرت سلطان الہندؒ کے اس مفروضہ جادو کا جواب نہ دے سکے اور شدید بے چارگی کے عالم میں ہندو مذہب کا شیرازہ منتشر ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔

دہلی کے رہنے والے عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ اس روشن دلیل کے بعد حضرت قطبؒ کے مخالفین اپنے دلوں کی کثافت دُور کر کے ایک مردِ حق کی عظمتوں کو تسلیم کر لیں گے مگر یہ محض خوش گمانی تھی۔ کچھ لوگ یقیناً شرارتوں سے باز آ گئے تھے لیکن اب بھی چند افراد اپنے فطری حسد کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دراصل یہ علماء کی وہ مخصوص جماعت تھی جو خوشامد کے راستے سے اقتدار کی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے برہمن پجاریوں اور عیسائی پادریوں کی طرح اپنی اپنی مسندیں آراستہ کر لی تھیں اور اب چاہتے تھے کہ خلق خدا مذہبی معاملات میں ان کی محتاج رہے۔

جس روز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر روانہ ہوئے، اسی دن مخالفین کے حلقوں میں نئے انداز کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بعض تنگ دل علماء تو جوشِ اختلاف میں حد سے گزر گئے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی روحانی قوتوں کے مظاہرے پر کہنے والوں نے یہاں تک کہا۔

”(معاذ اللہ) یہ شعبہ بازی ہے۔ پہلے لوگوں کے ہوش و حواس سلب کر لئے اور پھر حاضرین دربار سمجھنے لگے کہ دو ماہ کا بچہ گفتگو کر رہا ہے۔ یہ خلاف عقل بات کس طرح ممکن ہے؟ اسلام میں ایسے روحانی کمالات کی کوئی حیثیت نہیں، یہ مظاہرے تو ہندو جوگی بھی کر سکتے ہیں پھر مسلمانوں کے دین اور کافروں کے مذہب میں کیا فرق باقی رہ گیا؟“

یہ عجیب اذیت ناک صورت حال تھی کہ حضرت قطب کے مخالف علماء کرامت کی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے مگر جب یہی کرامت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ظاہر ہوئی تو تنگ نظر عالموں نے اسے شعبہ بازی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دنوں تک مخالف علماء کی ان فتنہ پرداز یوں کو برداشت کرتے رہے۔ پھر ایک دن آپؒ نے اپنے حلقہ درس میں موجود ہزاروں انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! تم نے مجھ پر الزام تراشیاں کیں۔ میں خاموش رہا۔ پھر تمہاری زبانیں بے لگام ہو گئیں۔ تم خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر مجھے ذلیل و رسوا کرنے کے لئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے تمہیں شدید عالم کرب میں پکارا۔ اپنے روز و شب کے حوالے دیئے۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی گواہی پیش کی مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ آخر جب اللہ نے مجھے بے گناہ ثابت کر دیا تو تم دوسرے انداز سے میری دل آزاری پر کمر بستہ ہو گئے۔ پہلے مجھے مجرم قرار دیا جا رہا تھا اور اب کہا جا رہا ہے کہ شیر خوار بچے کی گفتگو حضرت سلطان الہندؒ کی شعبہ بازی کا نتیجہ ہے۔ تم نے میرے پیرومرشد کی عظیم الشان کرامت کو ہندو جوگیوں کی غیر اسلامی حرکتوں کے مماثل قرار دے دیا۔ اے بے خبر انسانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری محدود عقل اللہ کی بے پناہ قوتوں کو ایک دائرے میں محصور کرنا چاہتی ہے، اللہ تو وہ ہے کہ جس کا ایک اشارہ پتھروں کو بھی گویائی کی صلاحیتیں دے سکتا ہے۔ پھر وہ تو گوشت پوست کا حرکت کرنے والا ایک آدم زاد تھا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے گفتگو کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ سلطان الہندؒ کا کمال نہیں، قادر مطلق کی خلاقیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے سرخرو کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہمیشہ کے لئے ذلت کے تاریک غاروں میں دھکیل دیتا ہے۔ اللہ کو سلطان الہندؒ کی عزت و تکریم منظور تھی، اس لئے انہیں ظاہری سبب بنا دیا گیا۔ بے شک! وہ سرزمین ہند پر اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں۔ اللہ ان کی دعاؤں کو ہم سب سے زیادہ سنتا ہے۔ وہ اس بت خانے میں پرچم حق لے کر داخل ہوئے ہیں۔ انہیں اللہ نے ایسے روحانی کمالات سے سرفراز فرمایا ہے کہ جن کا ادراک ہمارے ہوش و خرد سے باہر ہے۔ تم ایک بچے کو موضوع بنا کر سلطان الہندؒ کی عظمتوں سے انکار کر رہے ہو اور ان کی عارفانہ بلندیوں کو پتھر کے پجاریوں کی شعبہ بازیوں کے ہم منصب قرار دے رہے ہو؟ یہ کیسا ظلم ہے اور کیسی تہمت ہے؟ تم نے اجیر کے کھنڈرات نہیں دیکھے؟ وہ سونے اور چاندی کے دیوتا، وہ آگ کے پرستار جادوگر، وہ سانپوں کا زہر پینے والے پجاری، وہ بدن پر راکھ مل کر جنگلوں کی خاک چھاننے والے سادھو کہاں گئے؟ انہیں تلاش کیوں نہیں

کرتے؟ ان کی بوسیدہ ہڈیوں سے پوچھو کہ تمہارا یہ حشر کیوں کر ہوا؟ اللہ نے ان سب طاغوتی قوتوں کو حضرت سلطان الہند کی دعاؤں سے ہلاک و برباد کیا ہے۔ قادر مطلق کی قسم! وہ روحانیت کے بڑے مظاہرے ہیں، بڑی کرامات ہیں۔ تم ایک ایسے شخص کے اسانات سے منکر ہو جو تمہارے تاریک مکانوں کو جگمگانے کے لئے دیارِ مدینہ سے روشنی مانگ کر لایا۔ اُسوں! تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے، بڑا آزار پہنچایا ہے۔ کاشن! سلطان الہند مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے اور میں ایسی اذیت ناک باتیں سننے کے لئے یہاں موجود نہ رہتا۔“ یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ آبدیدہ ہو گئے۔

مجلس پر ایک المناک سناٹا طاری تھا۔ حضرت قطبؒ کے عقیدت مندوں میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ پھر دہلی کا ایک دارفہ شوق لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور حضرت قطبؒ سے مخاطب ہو کر عرض کرنے لگا۔ ”شیخ محترم! یہ چند ہوس پرست ہیں جو بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے کے لئے جیج رہے ہیں۔ مگر ان کا شور آسمانی فیصلوں کو نہیں بدل سکتا۔ آسمان نے تو آپ کو اور سلطان الہندؒ کو محترم قرار دیا ہے۔ اب اہل دنیا کو کتنا بھی ناگوار گزرے، کیا آپ ان نفس کے غلاموں کے لئے اپنے بے شمار جاں نثاروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ بے شک! ہم سلطان الہندؒ اور آپ کے مقامِ معرفت سے واقف نہیں لیکن خدمتِ گار تو ہیں۔ عشق کی بنیادی رسم سے تو آشنا ہیں۔ حکم دیں تو اپنی جانیں نذر کر دیں۔ الزام تراشی والی زبانیں کاٹ کر خدمتِ عالیہ میں حاضر کر دیں۔ اگر عاجز رہیں تو اپنی جانیں گنوا دیں۔ بس یہی ہے آپ کے غلاموں کی متاع۔ جب بھی حضرت کا اشارہ ہوگا، سرمایہٴ حیات لٹا دیں گے لیکن یہ گوارہ نہیں کریں گے کہ آپ چند زمانہ سازوں کی باتوں سے بد دل ہو کر اپنی محبتوں اور نوازشوں کا مرکز بدل دیں۔ ہم صرف آپ کے ہیں، ہمیں ہمارے گمروں میں قیام کرنے کی اجازت دیں یا اپنے ہمراہ کسی صحرا کی جانب لے چلیں ہمارے لئے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔“ اس جاں سوختہ عشق کی تقریر عجیب تھی۔ ایک ایک لفظ سوزِ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہل مجلس رونے لگے۔ خود حضرت قطبؒ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ حضرت قطبؒ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے فرمایا۔ ”میں اگر جانا بھی چاہوں تو نہیں جاسکتا۔ پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ تمہارے درمیان رہوں۔ پھر جب وقتِ رخصت آئے تو تم مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی زمین میں دفن کرو۔ اللہ نے ہر شے کا وقت طے کر دیا ہے۔ کوئی اس کے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔“ حضرت قطبؒ نے اہل دہلی کی تسکین کے لئے چند کلمات ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں اپنی ذات کے لئے کسی سے یہ نہیں کہتا کہ وہ میرے احترام میں گردن جھکائے بیٹھا رہے۔ میں اللہ کا ایک عاجز و گناہ گار بندہ ہوں اور اسی حالت میں اپنے رب کے حضور چلا جانا چاہتا ہوں۔ اس کا شکوہ نہیں کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں، اس کا غم ہے کہ لوگ حضرت سلطان الہندؒ کے مقام سے واقف نہیں۔ اگر بے خبری کا یہ مظاہرہ اہل ہنود کرتے تو مجھے بھی کوئی شکوہ نہیں ہوتا لیکن یہ سب کچھ ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے جو مسندِ علم پر جلوہ افروز ہیں۔ وہ سلطان الہندؒ کے روحانی درجات سے تو آگاہ

نہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس مردِ جلیل نے اسلام کی کیا خدمات انجام دی ہیں؟“
یہ کہہ کر حضرت قطب بختیار کاکیؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر آپؒ نے انتہائی جذب کے عالم میں فرمایا۔ ”خدا نے سلطان الہندؒ کو تمہاری شہادتوں کا محتاج نہیں کیا ہے۔ خواجہ خواجگاں تو وہ ہیں کہ جن کے کارِ عظیم پر آنے والی صدیاں گواہی دیں گی اور اپنی پشت پر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے علم کے یہ تاجر اس طرح بے نشان ہو جائیں گے کہ ان کا کوئی حوالہ باقی نہیں رہے گا۔ لوگ حضرت خواجہؒ کی ایک کرامت پر سرگرمیاں ہیں یا دیوانوں کی طرح چیخ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ حضرت سلطان الہندؒ کی پوری زندگی ہی کرامت ہے۔“



پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زندگی میں پیش آنے والے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر عجیب ہے کہ عہدِ جدید کا کوئی مادہ پرست اس پر مشکل ہی سے یقین کرے گا۔ ”سیر الاقطاب“ کے مصنف نے حضرت خواجہؒ کی اس کرامت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا زمانہ تھا اور یہ واقعہ کس مقام پر پیش آیا تھا؟ اس واقعہ سے جو کردار وابستہ ہیں ان کے ناموں کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود تذکرہ خواجگانِ چشت کے سلسلے میں ”سیر الاقطاب“ ایک معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اسی کتاب کے مصنف حضرت شیخ الہندؒ خود بھی بہت بڑے بزرگ اور نامور صوفی تھے اس لئے کوئی بھی ہوش مند انسان شیخ الہندؒ کی بیان کردہ روایات پر شک نہیں کر سکتا۔ سیر الاقطاب آج سے تقریباً چار سو سال پہلے تصنیف کی گئی تھی۔ سیر الاولیاء کے بعد صوفیائے چشت کی سیرت پر یہ دوسری مستند کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سن اور مقام کے حوالے تو پیش نہیں کئے ہیں تاہم قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا ہو گا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سبزواری میں قیام فرماتے تھے۔ اس قیاس کی بنیاد حاکم سبزواریؒ کا وہ ظلم و تشدد ہے جو اپنی انتہا کو پہنچ کر تاریخی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یادگار محمدؒ کی یہ عام عادت تھی کہ وہ معمولی سی بات پر بے گناہ لوگوں کو قتل کر دیا کرتا تھا۔ غالباً یہ اسی سنگِ دل حاکم کے دورِ حکومت کا واقعہ ہے۔

ایک دن ایک پریشان حال بوڑھی عورت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ظاہری حالت سے وہ بہت زیادہ شکستہ نظر آ رہی تھی۔ اس وقت حضرت خواجہؒ ظہر کی نماز کے لئے وضو فرما رہے تھے۔ جیسے ہی عورت نے خانقاہ کے دروازے میں قدم رکھا، ایک خادم نے آگے بڑھ کر اسے روکتے ہوئے پوچھا۔ ”خاتون! تم کون ہو اور کس سے ملنا چاہتی ہو؟“

”میں صرف ایک غم زدہ ماں ہوں۔ اور مجھے کچھ یاد نہیں۔“ شدتِ غم سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”وہ کہاں ہے؟“ عورت نے حضرت خواجہؒ کے خادم سے ایک الجھا ہوا سوال کر ڈالا تھا۔ ”کون؟“ حضرت خواجہؒ کا خادم ایک اجنبی عورت کے مبہم طرزِ گفتگو سے الجھ کر رہ گیا۔

”وہ فقیر جو لوگوں کی مرادیں پوری کرتا ہے، مجھے اس کے پاس لے چلو۔“
 ”خاتون! یہ ایک مردِ خدا کی خانقاہ ہے۔ یہاں ادب و احتیاط کا مظاہرہ کرو۔“ حضرت خواجہ کے خادم کو اس عورت کا گستاخانہ طرزِ کلام بہت گراں گزرا تھا۔
 ”مجھے کیا معلوم ادب کسے کہتے ہیں؟“ عورت کے چہرے پر پھیلے ہوئے رنج و الم کے سائے مزید گہرے ہو گئے تھے اور وحشت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ خادم کو اس کی ذہنی حالت پر پاگل پن کا گمان ہونے لگا تھا۔ ”میں اپنے بیٹے کے سوا کسی کو نہیں جانتی۔“
 ”پھر یہاں کیوں آئی ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم کو بھی عورت کی بدحواسی پر غصہ آ گیا تھا۔

”میں اپنے بیٹے کو لینے آئی ہوں۔“ یہ کہتے کہتے عورت کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

”واپس جاؤ! یہاں تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔“ خادم نے بوڑھی عورت کو جھڑک دیا۔ اب اسے اجنبی خاتون کی دیوانگی کا یقین ہو چلا تھا۔

”اے شخص! تُو کہاں ہے؟“ اچانک عورت چیخنے لگی۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نام نہیں جانتی تھی، اس لئے آپؒ کو عجیب انداز میں پکار رہی تھی۔ ”تیرے آدمی کتنے سنگ دل ہیں کہ ایک ستم رسیدہ ماں کو آگے جانے کا راستہ نہیں دیتے۔“ عورت دل کے زور سے چیخ رہی تھی۔ اس کی آواز اس قدر پر شور تھی کہ خانقاہ کا گوشہ گوشہ گونجنے لگا تھا۔ حضرت خواجہؒ کے مریدوں اور خدمت گاروں کے علاوہ جتنے بھی حاضرین موجود تھے وہ سب کے سب عورت کی دلخراش چیخیں سن کر چونک پڑے تھے۔ ان میں سے بعض خدام صورت حال کو سمجھنے کے لئے خانقاہ کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ خود حضرت خواجہؒ بھی حیرت زدہ تھے۔

”جا کر دیکھو یہ کیسا شور ہے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس خادم کو مخاطب کر کے فرمایا جو آپؒ کو وضو کر رہا تھا۔ ”یہ عورت کون ہے اور اس پر کیا افتاد پڑی ہے؟“

”حضور! پہلے وضو فرمالیں۔“ خادم نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ اس کے نزدیک عورت کی چیخوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ اپنے اس فعل میں حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ ایک خادم کی زندگی کا مقصد ہی مخدوم کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو کر حضرت خواجہؒ کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن سلطان الہندؒ جس انداز کے مخدوم تھے ان سے یہ بعید تھا کہ عورت چیختی رہتی اور وہ اپنے کام میں مشغول رہتے۔ اپنی اس عادتِ کریمانہ کے سبب حضرت خواجہؒ نے خادم سے دوبارہ فرمایا۔

”پہلے تم اس عورت کی خبر لو۔“ سلطان الہندؒ بے قرار سے نظر آنے لگے۔ ”میں خود وضو کر لوں گا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہؒ نے خادم کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لیا۔ خادم تیز تیز قدموں سے خانقاہ کے دروازے کی طرف چلا گیا اور سلطان الہندؒ وضو کرنے لگے۔ عورت کی پُر درد آوازیں مسلسل سنائی دے

رہی تھیں۔

”انہیں منع کیوں نہیں کرتا؟ یہ مجھے تیرے پاس آنے سے روک رہے ہیں۔“
کچھ دیر بعد خادم نے واپس آ کر حضرت خواجہ کو بتایا کہ ایک پاگل عورت اپنے بیٹے کو تلاش کرتی ہوئی خانقاہ میں گھس آئی ہے۔

”کیا اس کا بیٹا یہاں موجود نہیں ہے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خادم سے پوچھا۔
”خانقاہ میں تو بے شمار انسان آتے ہیں ممکن ہے کہ ان میں اس کا بیٹا بھی شامل ہو۔“
”اس کے بیٹے کا خانقاہ سے کوئی تعلق نہیں۔“ خادم نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

”پھر بھی اسے اپنے بیٹے کو تلاش کر لینے دو۔“ حضرت خواجہؒ نے خادم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ”اس کی جستجو سے کسی کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟“

”حضرت! وہ عورت دیوانی ہے۔“ خادم نے دست بستہ ہو کر اس طرح کہا جیسے سلطان الہندؒ اس کی بات نہ سمجھ سکے ہوں۔

”اگر وہ دیوانی یہاں نہیں آئے تو پھر کہاں جائے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس بار قدرے ناگوار لہجے میں فرمایا۔ ”یہاں بے شمار دیوانے آتے ہیں، ایک اس کے آنے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟“ حضرت خواجہؒ نے اشارات و کنایات میں بہت کچھ کہہ دیا تھا مگر خادم علم و معرفت کے ان رموز کو کیا سمجھتا۔ وہ تو حضرت خواجہؒ کے متغیر چہرے کو دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ پھر اسی بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا خانقاہ کے دروازے تک پہنچا اور دوسرے ساتھی کو حضرت خواجہؒ کا حکم سنا دیا۔

خانقاہ کا خدمت گار بوڑھی عورت کے راستے سے ہٹ گیا۔ ایک مخبوط الحواس خاتون کو حضرت خواجہؒ کی خانقاہ میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ اب اس کی چیخیں بند ہو چکی تھیں اور وہ اپنے قریب کھڑے لوگوں کے چہروں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک خادم اس عورت کو حضرت سلطان الہندؒ کے پاس لے گیا۔ حضرت خواجہؒ کو دیکھتے ہی وہ مضطرب حال عورت آپ کے قدموں سے لپٹ گئی اور گریہ و زاری کرنے لگی۔

”میں تیرے پاس اپنا بیٹا لینے آئی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تیری دعاؤں سے میرا کھویا ہوا بیٹا مل جائے گا۔“

”کہاں ہے تمہارا بیٹا؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بوڑھی عورت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

”میرے بیٹے کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے۔“ عورت ہچکیوں سے رونے لگی۔ ”حاکم شہر کے حکم سے اس بے گناہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔“

”تو پھر یوم جزا کا انتظار کرو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اُداس لہجے میں فرمایا۔ ”وہ دن جب ساری ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی، ظالموں اور سرکشوں کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اس کے روبرو لایا جائے گا، پھر کسی کی سفارش، کسی کا اقتدار باقی نہیں رہے گا، نا انصافی کا شکار ہونے والے اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کرسی کیا ہے، عدالت کیا ہے اور انصاف کیا ہے؟ جو اس جہان فانی میں محرم رہے، وہ اس دنیا میں بامراد ہوں گے، وقت معلوم کا انتظار کرو۔ وہ عادل حقیقی تمہارے بیٹے کے ساتھ بھی انصاف کرے گا۔“

”وہ دن بہت دور ہے۔“ اس سنگین حادثے نے عورت کا صبر و قرار چھین لیا تھا۔ ”میں تیرے پاس فریاد لے کر آئی ہوں۔ مجھے اس زمین پر انصاف چاہئے۔“

”خاتون! میں مسافر ہوں جو خود برسوں سے خدا کی تلاش میں در در بھٹک رہا ہے۔ میں اس شہر کا حاکم نہیں کہ کسی کی فریاد سنوں۔“ حضرت خواجہؒ نے آہستہ سے فرمایا۔ ”اور پھر جانے والا تو جا چکا، اس کی رخصت سے پہلے خبر ہو جاتی تو یہ عاجز اپنے اللہ سے دعا کرتا۔ کتابِ زیست مکمل ہو چکی، بابِ ہستی بند ہو چکا، اب کیا ہو سکتا ہے؟ اول بھی صبر، آخر بھی صبر۔ یہی درد کا درماں، یہی غم کا علاج اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں۔“ یکا یک عورت کی ہدیبانی کیفیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ”میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اگر مردے زندہ نہیں ہوتے تو پھر میں بھی یہیں تیرے قدموں میں مر جاؤں گی۔ اپنے بچے کے بغیر یہ زندگی ایک بوجھ ہے۔ اگر وہ واپس نہیں آ سکتا تو پھر میری موت کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دے۔ خدا تیری یہ دعا تو سن لے گا۔“ بوڑھی عورت اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور اس نے حضرت خواجہؒ کا دامن پکڑ لیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہے، پھر آپؒ نے بلنواز لہجے میں مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”اچھا میرا دامن چھوڑو۔ نماز کا وقت تنگ ہوا جا رہا ہے۔ میں نماز ادا کر لوں، اس کے بعد تمہاری رودادِ غم سنوں گا۔“

عورت نے حضرت غریب نوازؒ کا دامن چھوڑ دیا۔

پھر آپؒ نے نماز کی امامت کی اور اس کے بعد بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔

بوڑھی خاتون ہچکیوں کے درمیان اپنی داستانِ الم سنانے لگی۔ ”میں ایک غریب بیوہ عورت ہوں۔ شوہر نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت دو سالہ شیر خوار بچہ چھوڑا تھا۔ میں نے محنت مزدوری کر کے اس کی پرورش کی۔ پھر جب وہ جوان ہوا تو اُسے حاکم شہر کا اندھا قانون کھا گیا۔ ایک رئیس زادے نے ایک غریب نو جوان کا قتل کر دیا۔ مقتول میرے بچے کا دوست تھا، چشم دید گواہوں نے قتل کا الزام میرے بیٹے کے سر ڈال دیا۔ میں نے عدالت میں جا کر انصاف چاہا مگر قانون بھی بہرا تھا اور منصف بھی۔ آخر اس رئیس زادے کو بچانے کے لئے میرے بیٹے کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ میں اس کی لاش قتل میں چھوڑ کر تیرے پاس چلی آئی ہوں۔ لوگوں نے مجھے تیرا بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تیری دعائیں سب سے زیادہ سنتا ہے۔“ یہ کہہ کر عورت نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف ملتی نظروں سے دیکھا۔ ایک تو عورت کا غم انگیز بیان، دوسرے اس کی سادگی اور حضرت خواجہؒ سے حُسنِ ظن۔ سلطان الہندؒ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور پھر آپؒ کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی۔

”خدا یا! اپنے بندے معین الدین پر رحم فرما۔ تو اس کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔“ عورت نے حضرت خواجہ کو شدید کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ آپؑ سے ایک ایسی دعا کی طالب تھی جس کا کسی درویش کی زبان پر آنا بظاہر ناممکن تھا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مخالفین نے اس عورت کو یقین دلادیا تھا کہ آپؑ کی دعاؤں سے مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک شرارت تھی جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ غم زدہ ماں آپؑ کے پاس فریاد لے کر جائے گی اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات ایک تماشا بن کر رہ جائے گی۔ یہ دل آزاری کا بڑا عجیب انداز تھا۔

حضرت سلطان الہندؒ بہت دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ آپؑ کے چہرہ مبارک پر اذیت و کرب کے آثار صاف نمایاں تھے۔ پھر آپؑ نے آنکھیں کھول کر بوڑھی عورت کی طرف دیکھا اور اُداس لہجے میں فرمایا۔

”خاتون! تم نے مجھے بہت آزار پہنچایا ہے۔ کاش! تمہیں یا کسی دوسرے شخص کو میری ذات سے یہ حُسن ظن نہ ہوتا لوگ یہ کہہ دیتے کہ معین الدین اس شہر میں سب سے زیادہ گناہ گار ہے اور خدا اس کی کوئی دعا نہیں سنتا۔“

مریدوں اور خادموں نے آج تک اپنے پیرومرشد کی ایسی گفتگو نہ سنی تھی۔ سب کے سب شدید حیرت کے عالم میں اس بات کے منتظر تھے کہ اب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔

یہ ایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اٹھے اور بوڑھی عورت سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ ”مجھے اپنے بیٹے کے پاس لے چلو۔ میں اس کے لئے اللہ سے انصاف طلب کروں گا۔“

عورت بھی کھڑی ہو گئی۔ ”اب میرا بیٹا مجھے مل جائے گا۔“ فرط مسرت سے غمزہ ماں کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ ”خدا ان لوگوں کا بھلا کرے، جنہوں نے مجھے تیرا پتہ بتایا۔“

بوڑھی عورت کی باتیں سن کر ایک بار پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے چہرہ مبارک پر شدید اذیت کے آثار نظر آنے لگے۔ قریبی خدمت گار اور مریدان خاص جو کسی حد تک سلطان الہندؒ کے مزاج شناس تھے، آج آپؑ کی بار بار بدلتی ہوئی اس کیفیت سے سخت پریشان تھے۔ حضرت خواجہؒ نے اپنا عصا ہاتھ میں لیا اور خانقاہ کے دروازے تک آئے۔ تمام مرید، خدام اور حاضرین آپؑ کی تقلید میں پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ حضرت خواجہؒ ایک لمحے کے لئے ٹھہرے، چند مریدین کو اپنے ہمراہ لیا اور باقی لوگوں کو خانقاہ کے اندر رہنے کا حکم دے کر اس طرف روانہ ہو گئے، جدھر بوڑھی عورت نشاندہی کر رہی تھی۔

حضرت سلطان الہندؒ طویل فاصلہ طے کر کے بوڑھی عورت اور چند مریدوں کے ہمراہ مقتل پہنچے۔ حکومت کے کارندے بہت دیر پہلے لڑکے کو پھانسی دے چکے تھے۔ بس ایک مقتل کا محافظ تھا جو دروازے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ تماشاخیوں کی ایک بھیڑ تھی جو دروازے سے اندر جھانک جھانک کر مقتول کی لاوارث لاش کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھی عورت ان لوگوں کے درمیان راستہ بناتی ہوئی آگے

بڑھ رہی تھی۔ آخر وہ مقتل کے دروازے تک پہنچ گئی اور دیوانہ وار چیختی ہوئی بولی۔

”وہ ہے میرے جواں مرگ بیٹے کی لاش جسے اس شہر کا اندھا قانون کھا گیا۔“ عورت دراصل حضرت خواجہ سے مخاطب تھی جو آہستہ روی کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگر انسانی ہجوم نے یہی سمجھا کہ غم زدہ ماں لوگوں کے سامنے فریاد کر رہی ہے۔

اچانک ایک کرخت آواز گونجی۔ ”کیا ٹوٹنے اپنے ہوش و حواس کھو دیئے ہیں؟“ مقتل کا محافظ بڑے سنگدلانہ انداز میں عورت کو ڈانٹ رہا تھا۔ ”تو حاکم شہر کے انصاف پر اعتراض کرتی ہے، تیری یہ گستاخی تجھے بھی پھانسی کے پھندے تک لے جاسکتی ہے۔ اپنے بدکردار بیٹے کو مظلوم کہتی ہے؟ یہ بھی تجھ پر حاکم وقت کا احسان ہے کہ تیرے بیٹے کو گورد کفن میسر آ جائے گا۔ ورنہ اس کی لاش کو کتے کھا جاتے۔“

اسی دوران حضرت خواجہ معین الدین چشتی انسانی ہجوم سے نکل کر مقتل کے دروازے پر نمودار ہوئے اور پہرے دار کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

”اگر تم اس عورت سے عملی ہمدردی نہیں کر سکتے تو اپنی زبان سے چند شیریں کلمات ادا کر کے شریک غم ہو جاؤ۔ آج اس خاتون پر جو آفت ٹوٹی ہے، وہی مصیبت کل کسی دوسرے انسان پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ تماشا کرنے والے خود تماشا بن جائیں۔ انہیں اپنا محاسبہ کر لینا چاہئے۔“ حضرت خواجہ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں عجیب تاثیر تھی کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ گئے تھے۔ مقتل کا جابر و سفاک محافظ بھی پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔

”ہم اس لڑکے کو لے جانے ہی کے لئے آئے ہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے مقتل کے محافظ کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اب تمہیں مزید زحمت برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ حاکم شہر کی نا انصافیوں کا بیان کرنے والی یہ غمزدہ عورت بھی کچھ دیر بعد یہاں سے چلی جائے گی۔ پھر تم بھی آزاد ہو گے، تمہارا حاکم بھی اور تمہارا قانون بھی۔“ یہ کہہ کر حضرت سلطان الہند مقتل میں داخل ہو گئے۔

عورت اور چند خدام بھی آپ کی تقلید میں پیچھے پیچھے تھے۔ تماشائی تو پہلے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو دیکھ کر پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت ہو چکے تھے۔ رہا محافظ تو اس کی حالت بھی انسانی ہجوم سے مختلف نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ایک ایسے اجنبی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جس کے آگے اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اجنبی نے چار لفظوں میں اس کے حاکم اور قانون کی درندگی کو بے نقاب کر دیا تھا مگر وہ انتہائی کوششوں کے باوجود کسی بات کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ مقتل کے محافظ نے اپنے جابر حاکم کا رعب و جلال بھی دیکھا تھا مگر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے جبروت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ محافظ مسلسل سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص کون ہے جس کی ہیبت سے اس کی روح تک لرز رہی ہے۔

ہر طرف ایک سکوت مرگ سا طاری تھا اور تمام بے چین نگاہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا

تعاقب کر رہی تھیں۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ سلطان الہند، مقتول کی لاش کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ خدام آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ غم زدہ عورت اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار بیٹے کے مردہ جسم سے لپٹ گئی۔ پورا مقتل اس کے شورِ ماتم سے گونج رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک بہت غور سے مرنے والے نوجوان کے چہرے کو دیکھتے رہے، پھر چپختی ہوئی عورت سے فرمایا۔ ”خدا سے انصاف مانگنے والے بین نہیں کرتے۔“

حضرت خواجہؒ کی آواز سنتے ہی عورت نے اپنی چیخوں کو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی ہلکی ہلکی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ سلطان الہند نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے خدام سے فرمایا۔ ”عصر کا وقت ہو گیا ہے، نماز ادا کر لی جائے۔“

پیر و مرشد کا حکم پاتے ہی مریدوں نے زمین پر اپنے اپنے رومال بچھا دیئے۔ سلطان الہند امامت کے لئے آگے بڑھے، ایک خادم نے تکبیر کہی اور چند مسلمانوں پر مشتمل ایک مختصر سی جماعت نے نیت باندھ لی۔ مقتل میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ یہ وہی نماز تھی جو میدانِ کارزار میں پڑھی گئی، گھوڑوں کی پشت پر پڑھی گئی، خندقوں کے اندر اور دریاؤں کے کنارے پڑھی گئی، جسم بے کار ہو گیا تو اشاروں سے پڑھی گئی، یہاں تک کہ زیرِ شمشیر پڑھی گئی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلام پھیرا اور دعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ دراز کر دیئے۔ ”اے علیم و خبیر! تُو بہتر جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تُو سب سے زیادہ میری دعائیں سنتا ہے۔ تیرے عزت و جلال کی قسم! میں نے ان سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ یہ خود جوشِ عقیدت میں حد سے گزر گئے ہیں۔ میں تو تیرا وہی معین الدین ہوں جسے دنیا میں تیرے ہی کرم کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں مگر یہ غم زدہ ماں مجھے تیرا واسطہ دے کر یہاں لے آئی ہے۔ اس کے حُسنِ ظن کو برقرار رکھ۔ مقتل بھی تیرے حکم سے آباد ہوتے ہیں اور بزمِ حیات بھی تیرے اشارے سے سجائی جاتی ہے۔ تُو جو چاہے تو اٹھے سینہٴ صحرا سے حباب۔“

خدام نے سلطان الہندؒ کی یہ مختصر سی دعا سنی تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ انہوں نے آج تک کسی مانگنے والے کی آواز میں ایسا سوز و گداز محسوس نہیں کیا تھا۔

دعا مانگ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اٹھے اور مقتول کی لاش کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک اس بے حس و حرکت نوجوان کو دیکھتے رہے، پھر اپنے عصا سے مقتول کی گردن کو چھوتے ہوئے فرمانے لگے۔

”اگر تُو مظلوم ہے تو خدا کے حکم سے زندہ ہو جا۔“

ابھی فضاؤں میں سلطان الہندؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ مقتول کے جسم میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ماں بیٹا حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے۔

”جاؤ! بس انصاف ہو گیا۔ مجھ گناہ گار کی ذات کو تماشا نہ بناؤ اور ساری زندگی اس خدا کا شکر ادا

کرتے رہو جو ہر شے پر قادر ہے۔“ یہ کہہ کر آپ تیز رفتاری کے ساتھ مقتل سے باہر تشریف لائے اور اپنی خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

انسانی ہجوم یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور مقتل کے محافظ کی تو یہ حالت ہو گئی کہ کسی نامعلوم دہشت کے سبب اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ وہ اس محیر العقول واقعہ کو دیکھ کر چیخنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان سے چند ہی الفاظ ادا ہو سکے۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔“ پھر اس کی زبان بند ہو گئی جیسے کسی غیر مرئی قوت نے گویائی کی ساری صلاحیتیں سلب کر لی ہوں۔ اس کے پراگندہ ذہن میں مختلف خیالات ابھرا ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ اب اسے حاکم شہر کے ظلم و تشدد کا احساس ہو رہا تھا اور اپنی سنگ دلی کے بے شمار مظاہرے بھی یاد آ رہے تھے۔

”جس شخص کی دعا سے ایک مقتول نئی زندگی پاسکتا ہے تو کیا اس کی بددعا سے حاکم شہر پر بھی عذاب آسانی نازل ہو سکتا ہے؟ پھر کیا وہ لوگ بھی اس عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے جو حاکم کی نا انصافیوں میں شریک رہے؟“ مقتل کے محافظ نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے قہر کے فرشتے اس کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ شدت خوف سے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مقتل کے دروازے پر جو دوسرے لوگ موجود تھے، ان کی دماغی کیفیت بھی دگرگوں تھی۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے تھے مگر آپؒ کے جلال معرفت نے انہیں پتھروں کی طرح ساکت کر دیا تھا۔ خدام بھی بظاہر خاموش تھے مگر ان کے چہروں پر سارے عالم کی خوشیاں سایہ فگن تھیں۔ خدا نے ان کے پیرومرشد کو اس طرح سرفراز کیا تھا کہ اس واقعے کو یاد کر کے عقل انسانی حشر تک سر بگریاں رہے گی۔

راتے میں شام ہو چکی تھی اس لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ایک مقام پر ٹھہر کر نماز مغرب ادا کی اور جب خانقاہ واپس پہنچے تو ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تمام لوگ سلطان الہندؒ کے منتظر تھے مگر آپؒ اس طرح خانقاہ میں داخل ہوئے کہ کسی سے بات تک نہ کی اور سیدھے اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ جو خدام آپؒ کے ہمراہ مقتل گئے تھے، انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کو اس عجیب و غریب واقعے کی تفصیلات سنا دیں۔ حاضرین، سلطان الہندؒ کی زبان مبارک سے قدرت کی اس کرشمہ سازی کی تشریح سنا چاہتے تھے مگر حجرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد حضرت خواجہؒ عشاء کی نماز میں شریک ہونے کے لئے باہر آئے اور پھر فرض ادا کرتے ہی دوبارہ حجرے میں تشریف لے گئے۔ دروازہ حسب سابق بند ہو گیا۔

خانقاہ میں موجود ہر شخص پر اضطراب طاری تھا۔ اس سے پہلے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے حجرے میں بند رہ کر رات رات بھر ریاضت کرتے رہتے تھے مگر اس وقت خدمت گاروں اور مریدوں کو پیرومرشد کی مصروفیات کا علم ہوتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے دوران یہ پہلی رات تھی جب حضرت خواجہؒ نے واپسی کے بعد کسی سے بات نہیں کی تھی اور وقت مقررہ پر کھانا تک طلب نہیں کیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی مگر کوئی خادم بھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پارہا تھا کہ دروازے پر دستک دے

کر حضرت سلطان الہند سے اس مکمل سکوت کا سبب دریافت کر سکے۔

آخر رات آہستہ آہستہ گزرنے لگی۔ خدام میں سے کوئی شخص ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوسکا۔ شب کی تاریکی میں لوگ حضرت خواجہ کی اس روشن کرامت کا ذکر کرتے رہے جو مقتل میں ظاہر ہوئی تھی۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے عقیدت مندوں کے لئے ایک مقام شکر تھا کہ جو مخالفین اس موقع پر سلطان الہند کی عاجزی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے، خدا نے انہیں مایوس کر دیا تھا..... مگر اس کے ساتھ ہی حضرت خواجہ سے محبت کرنے والوں کی روحوں پر ایک بار گراں تھا۔ وہ اپنے مخدوم کی خاموشی کا سبب جاننے کے لئے بے چین تھے اور ایسی اذیت ناک تشمکش میں ان لوگوں نے پوری رات جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ پھر خادموں اور عقیدت مندوں کی یہ جماعت اس وقت چونک اٹھی جب شہروں کی مسجدوں سے خوش الحان موزونوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پوری فضا ”اللہ اکبر“ کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ نماز فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ ایک خادم نے حسب دستور خانقاہ میں اذان دینی شروع کی..... اور جیسے ہی اس نے پکارا..... ”آؤ نماز کی طرف.....“ حجرے کا دروازہ کھلا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی نمودار ہوئے۔ عقیدت مندوں اور خادموں کی صفوں میں ایک مسرت انگیز لہر دوڑ گئی۔

کچھ دیر بعد آپ نے نماز فجر کی امامت کی اور پھر ذکر الہی میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ چاروں طرف دن کی روشنی پھیل گئی۔ پھر آپ نے معمول کے مطابق ان لوگوں کو طویل درس دیا جو شہر کے مختلف گوشوں سے آکر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی خانقاہ میں جمع ہوتے تھے۔ اس دوران تمام لوگوں کی نظریں سلطان الہند کے چہرہ مبارک پر مرکوز تھیں۔ ہر شخص آپ کی ظاہری حالت میں بڑا فرق محسوس کر رہا تھا۔ حضرت خواجہ کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے سے شدید تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ درس میں سینکڑوں انسان موجود تھے مگر یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ سلطان الہند رات بھر اپنے اللہ کے حضور روتے رہے ہیں۔

درس کے بعد آپ دوبارہ حجرے میں تشریف لے گئے۔ شہر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مقتول نوجوان کے زندہ ہو جانے کی خبر اس تیزی سے پھیلی کہ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہزاروں انسان قطار در قطار اس باغ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے جہاں ایک درویش نے اپنی خانقاہ تعمیر کی تھی اور وہ نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کی سیاہی دھونے کا کام کر رہا تھا۔ آج بے شمار آنکھیں اسی مرد خدا کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں۔ نماز ظہر سے پہلے حضرت خواجہ بیدار ہوئے اور جب آپ حجرے سے باہر تشریف لائے تو بندگان خدا کی بھیڑ کو اپنا منتظر پایا۔ خدمت گاروں نے مشتاقان دید کے جمع ہونے کا سبب بیان کیا۔ حضرت سلطان الہند ہجوم کی طرف آئے اور بلند آواز میں فرمایا۔

”خبردار! کسی فریب میں مبتلا نہ ہو جانا۔ یہ اسی قدرت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا۔ وہ ہر شے پر قادر ہے اور جب چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے، اہل زمین پر اپنی نشانیاں ظاہر کر دیتا ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت سلطان الہند کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر انتہائی رقت آمیز لہجے

میں فرمایا۔

”ایک بندے کا اپنے مالک سے اتنا تعلق تو ضرور ہونا چاہئے کہ بندہ جو درخواست کرے، اللہ اسے

قبول فرمائے۔“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اہل مجلس کی طرف دیکھا۔ حاضرین زار و قطار رو رہے تھے۔ خود حضرت قطبؒ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی۔ کچھ دیر بعد اشکوں کا سیلاب تھم گیا اور حاضرین کے بے قرار دل ٹھہر گئے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دوبارہ اہل مجلس سے مخاطب ہوئے۔

”حضرت سلطان الہندؒ کے مقام معرفت کو کون سمجھ سکتا ہے؟ خدا نے میرے پیر و مرشد کو اس زمین پر شرف خاص بخشا ہے۔ حاسدین کچھ بھی کر لیں مگر آسمانی فیصلہ خاک ہند پر نازل ہو کر رہے گا۔ لوگ ایک زندہ بچے کی گفتگو پر حیران ہیں اور حضرت خواجہؒ کی عظیم الشان کرامت کو شعبہ بازی قرار دے رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ سلطان الہندؒ کی دعاؤں کے طفیل اللہ نے اس نوجوان کی سانسیں بھی لوٹا دی تھیں جس کا تین مردہ صبح سے شام تک مقتل میں پڑا رہا تھا۔ معاذ اللہ! کیا لوگ اسے بھی شعبہ بازی قرار دیں گے؟ اور پھر جو بات بھی ان کی عقل سے بالاتر ہوگی، اسے شعبہ بازیوں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے گا؟ جو حقیقتاً شعبہ باز تھے، وہ حضرت خواجہؒ کے سامنے اپنے تمام تر شیطانی کمالات کے باوجود خم ہو گئے..... اور جو کلمہ گو ہیں وہ حضرت سلطان الہندؒ کے روحانی مظاہروں کو بت پرستوں کی جادوگری کے مماثل قرار دے رہے ہیں۔ یہ کیسا نفاق ہے اور کیسا حسد ہے؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اس مرد حق پرست کی آمد کے بعد رسم جادوگری ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے کاہن، جوگی، پروہت اور سنیا سی منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ آج ان کے لئے خدا کی زمین پر کوئی پناہ گاہ نہیں۔ حضرت خواجہؒ کی ضرب لا الہ سے پورا بت خابہ ہند کانپ رہا ہے اور تنگ نظر مسلمان شعبہ بازی کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آفتابِ چشتیہ طلوع ہوا تو اندھیرے فنا ہونے لگے اور عقائد باطلہ مقامِ عافیت کی تلاش میں اپنے ٹھکانے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔“ یہ کہہ کر حضرت قطبؒ نے اپنی خانقاہ میں موجود انسانی ہجوم پر نظر ڈالی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ ساکت تھا۔

”لوگ اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ ہندوستان کا ایک ایک گوشہ سلطان الہندؒ کی باجبروت شخصیت کی زد میں ہے۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دوبارہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہاں صرف معین الدین چشتیؒ کی آواز ہے جو صدیوں سے گمراہی کی نیند سونے والے پجاریوں کو ان کے گھروں سے کھینچ کر باہر لا رہی ہے۔ خدا کی قسم! یہ آواز انسانی سماعتوں پر محیط ہو جائے گی۔ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے مگر اس کا سر پر غرور حضرت خواجہؒ کی بارگاہِ جلال میں جھکا رہے گا۔ سلطان الہندؒ کی ذاتِ گرامی تو ایک مطلع انوار ہے۔ جب تک اس سے کوئی کرن پھوٹی ہے تو خود بخود ایک کرامت بن جاتی ہے جسے دیکھ کر لوگوں کی زنگ آلود عقل ٹھوکریں کھانے لگتی ہے۔ انسان کسی کرامت کے اظہار میں عاجز رہ جاتا ہے تو دوسروں کی روحانی سر بلندیوں کو ”ساحری اور شعبہ بازی“ کہہ کر پکارنے لگتا ہے۔

شمس و قمر کا کام مختلف اوقات میں روشنی تقسیم کرنا..... نسیم سحری اور بادِ صبا کا کارِ فطری انسانی دل و دماغ پر خوشگوار اثرات چھوڑنا..... اور تریاق کا عمل زہر کی ہلاکت آفرینی کو ختم کرنا ہے۔ اسی طرح کرامت بھی زہد اور تقویٰ کا ردِ عمل ہے۔ جب بندے کو خداوند ذوالجلال کی بارگاہ سے ولایت کی سند عطا ہو جاتی ہے تو پھر کشف و کرامت کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ تو مردِ مومن کی دُھندلی سی نشانیاں ہیں..... اور مردِ مومن ان نشانیوں کے بغیر بھی خدا کا دوست ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور کرامت بیان فرمائی۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے بلکہ بغداد میں قیام فرما تھے۔ اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ حضرت خواجہؒ کا وہ دور تھا جب آپؒ سخت ریاضت و مجاہدات کر رہے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہاں سات آتش پرست بھی موجود تھے۔ شہر کی آبادی سے دور ایک سنان مقام پر دریا کے کنارے یہ آگ کا پجاری اس طرح زمین میں دھنس جاتا تھا کہ صرف اس کی گردن نظر آتی رہتی تھی اور وہ کئی کئی ماہ تک اسی حالت میں اپنے مذہبی کلمات کی گردان کرتا رہتا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی تین چار دن بعد حلق میں پانی کی چند بوندیں ٹپکا دیا کرتے تھے اور دو تین ماہ بعد روٹی کے کچھ نوالے اس کی غذا بن جاتے تھے۔

کوئی پجاری اس طرح اپنے روحانی کمالات کا مظاہرہ کرتا کہ سر کے بل زمین میں اتر جاتا تھا یہاں تک کہ صرف اس کے ٹخنے نظر آتے رہتے تھے۔ عام تماشا شائی اسے روحانیت کا ایک اعلیٰ و ارفع مظاہرہ سمجھتے تھے۔ اس ذیل میں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اگر وہ آتش پرست روحانیت کے کسی بلند درجے پر فائز نہ ہوتا تو آٹھ آٹھ دن تک زیر زمین کس طرح زندہ رہتا؟ سادہ لوح انسانوں کو اس حقیقت کی خبر نہیں تھی کہ وہ آتش پرست جس دم کے ماہر تھے۔ ایک ایک ہفتے زمین کے اندر رہ کر اپنی سانس روک لیا کرتے تھے اور کم عقل لوگ اس کرشمہ سازی کو روحانیت کا ایک عظیم الشان مظاہرہ سمجھ کر دل ہی دل میں متاثر ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان آتش پرستوں میں بعض اتنے سخت جان تھے کہ سال میں دو بار روٹی کا ایک لقمہ کھا کر مقامی آبادی کو حیران کر دیتے تھے۔

ریاضت مذہبی ہو یا دنیاوی، اس کا ایک خاص اصول یہ ہے کہ اگر کوئی انسان ظاہری لذتیں ترک کر دے اور مسلسل فاقہ شی کرتا رہے تو اس کی خفیہ حیات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ کبھی کبھی انسان کے دل کی بات بھی سمجھ لیتا ہے۔ جب کچھ احمق و نادان لوگ اس آتش پرست جماعت کو دیکھنے کے لئے دریا کے کنارے جمع ہوتے تھے تو ان میں سے کوئی پجاری کسی ایک شخص کے دل کی بات بتا دیا کرتا تھا جس سے تماشاخیوں کے مجمع میں ہلچل سی مچ جاتی تھی اور لوگ قطار در قطار دریا کی طرف جانا شروع کر دیتے تھے۔ جہاں آتش پرستوں نے ایک طویل و عریض دائرے میں آگ روشن کر رکھی تھی اور جس کے شعلے مسلسل بھڑکتے رہتے تھے۔

جب آتش پرستوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا تو اہل بغداد کو تشویش ہوئی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خدام نے بھی ایک دن اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا۔ ”شیخ محترم! دریا کے

کنارے سات آتش پرستوں کی ایک جماعت نے برسوں سے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ آگ کے پجاری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے روحانی کرشمے دکھا کر بندگانِ خدا کو متاثر کر رہے ہیں۔ اگر آتش پرستوں کی یہی حرکات کچھ دن اور جاری رہیں تو پھر کسی بڑے ہنگامے کا خطرہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ضعیف الاعتقاد لوگوں کے ایمانوں میں خلل نہ پڑ جائے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت دیر تک اپنے خدمت گاروں کی زبانی آتش پرستوں کی روداد سنتے رہے، پھر آپؒ نے حاضرین سے فرمایا۔

”انسان اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔ آتش پرست بھی آزاد ہیں۔ انہیں آگ کو پوجنے دو۔ آتش پرستوں کا روحانیت سے کیا تعلق؟ وہ تو ایک حقیر درجے کی جادوگری ہے۔ اگر کوئی قیامت تک بھی آگ کی پرستش کرے تو یہ بھڑکتے ہوئے شعلے اسے معاف نہیں کریں گے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا جواب سن کر تمام خدام مطمئن ہو گئے اور وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔ آتش پرستوں کی سرگرمیاں کم ہونے کی بجائے مزید بڑھنے لگیں۔ وہ ساتوں پجاری تماشاویوں کے سامنے ایسے ایسے کمالات کا مظاہرہ کرتے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔ بغداد میں ایک شور مچ گیا۔ آتش پرستوں کے حلقہ عقیدت میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر یہی عقیدت گمراہی میں تبدیل ہو جانے والی تھی کہ خدام نے دوبارہ حضرت خواجہؒ سے عرض کیا۔

”شیخ محترم! وہ آتش پرست اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ معصوم بندگانِ خدا کے ذہن بھٹکنے لگے ہیں۔ اگر آتش پرستوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کی گئی تو وہ اسی طرح مسلمانوں کے عقائد میں انتشار پھیلاتے رہیں گے۔“

”کیا اہل ایمان کے دلوں کو ابھی قرار نہیں آیا کہ وہ سکونِ قلب کی خاطر آتش پرستوں کی طرف دیکھ رہے ہیں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے خدام سے دریافت کیا۔

”اہل ایمان کو تو آگ کے پجاریوں سے کوئی خطرہ نہیں۔“ ایک خادم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

”تو پھر تم لوگ اتنے فکر مند کیوں نظر آتے ہو؟“ حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔

”پیر و مرشد! اس خرابے میں تمام لوگوں کو یقین کی دولت حاصل نہیں۔ یہاں بہت سے لوگ مسلمان ہیں مگر ان کے ذہنوں میں انتشار برپا ہے۔ آتش پرستوں کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر ان کی عقل ٹھوکریں کھانے لگتی ہے اور قلب ضعیف لرزنے لگتا ہے۔ اگر آپؒ نے فوری طور پر اس طرف توجہ نہیں فرمائی تو اس آگ میں کچھ نادانوں کے عقائد جل کر خاک ہو جائیں گے۔ خدا کے لئے اہل بغداد پر نظر کرم کیجئے اور اس آگ کو بجھا دیجئے جس کے سرخ شعلے مسلمانوں کے گھروں کی طرف لپک رہے ہیں۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ آپؒ خاموشی کے ساتھ مصلے سے اٹھے اور خدام سے فرمانے لگے۔ ”مجھے ان آتش پرستوں کے پاس لے چلو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے اس آگ کو دیکھنا چاہتا ہوں جسے کچھ انسانوں نے خدا کا درجہ دے دیا ہے۔“

خدام نے پیر و مرشد کا حکم سن کر سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دریا کی طرف جا رہے تھے جہاں آتش پرستوں کا ڈیرا تھا۔ جیسے ہی آتش پرستوں نے مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو سب کے سب آتشیں دائرے کے قریب سمٹ آئے اور بلند آواز میں کچھ پڑھنے لگے شاید ان کا کوئی منتر تھا جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔

”تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھڑکتی ہوئی آگ کے قریب پہنچ کر اس کے پجاریوں سے دریافت کیا۔

”ہم اپنے خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔“ ایک آتش پرست نے اپنا منتر ترک کرتے ہوئے مسلمان درویش کو جواب دیا۔

”کیا تم آگ کو خدا سمجھتے ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”بے شک! ہم آگ کو خدا کا درجہ دیتے ہیں۔“ اس آتش پرست نے پُر غرور لہجے میں جواب دیا۔
”آگ دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ ہر شے کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک آگ ہی معبود ہے، آگ ہی خدا ہے۔“

”اگر دریا کی کوئی موج ان بھڑکتے ہوئے شعلوں پر آپڑے تو کیا تمہارا خدا بچنے سے محفوظ رہے گا؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آتش پرستوں کے دعوے کے جواب میں عجیب و غریب منطقی دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

کچھ دیر کے لئے ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ تمام آتش پرست لا جواب ہو کر رہ گئے تھے۔
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دوبارہ آگ کے پجاریوں سے مخاطب ہوئے۔ ”موج دریا کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی بھی شخص ذرا سا پانی لے کر ان بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ڈال دے تو یہ آن کی آن میں بجھ جائیں گے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ پانی آگ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر تمہارے خیال میں یہی ظاہری طاقت خدا ہے تو پھر تم پر بھی لازم ہے کہ آگ کو چھوڑ کر دریا کی عبادت کرو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے چند الفاظ نے آتش پرستوں کے فلسفہ قوت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔

جب کسی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو ان ساتوں میں سے جو شخص سب سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت خواجہؒ کے قریب آ کر بولا۔ ”دراصل یہ روشن آگ ہمارا خدا نہیں ہے۔“
بوڑھے آتش پرست کی زبان سے الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ”پانی کے مقابلے میں آگ کا عذاب زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے اس لئے ہم آگ کی پرستش کرتے ہیں تاکہ ہمارے جسم بھڑکتے ہوئے شعلوں سے محفوظ رہ سکیں۔“

”تم لوگ کب سے اس شعلہ سوزاں کی پوجا کر رہے ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے

بوڑھے آتش پرست سے نیا سوال کیا۔

”پوری زندگی بیت گئی۔“ بوڑھے آتش پرست نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ اس آگ کی نذر کر دیا۔“

”تو پھر تم لوگ یقین کی منزل تک بھی پہنچ گئے ہو گے؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔
 ”کیسا یقین؟“ بوڑھے آتش پرست کے چہرے پر سوالیہ نشان ابھر آیا۔ ”ہمیں یقین حاصل نہیں ہوتا تو آگ کی عبادت ہی کیوں کرتے؟“ آتش پرست کے لہجے میں وہی غرور شامل تھا جو عام طور پر سطحی انسانوں کی علامت ہوتی ہے۔

”اس بات کا یقین کہ اس قدر طویل عبادت کے بعد یہ آگ تمہارے جسموں کو نہیں جلائے گی۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا تھا۔

”آگ اپنے پجاریوں کو کبھی نہیں جلا سکتی۔“ آتش پرست کے دعوے سے یقین کم اور لاف زنی زیادہ نمایاں تھی۔ اس کا چہرہ جوش جذبات سے سرخ ہوا گیا تھا۔

”پھر تم لوگوں میں ایسا کون ہے جو اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لئے آگے بڑھے؟“ حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت اطمینان سے فرمایا اور آتش پرستوں کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

مسلمان درویش کے اس غیر متوقع سوال نے آگ کے پجاریوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ آج ان شعبہ بازیوں کا امتحان تھا جن کے ذریعے وہ بے عقل انسانوں کو حیران کر دیا کرتے تھے۔ اب تک آتش پرستوں کی زندگی میں ایسا کوئی شخص نہیں آیا تھا جو اتنی جرأت، بے باکی کے ساتھ ان کے طریقہ عبادت پر گفتگو کر سکتا۔ نتیجتاً وہ دم بخود تھے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

”دعویٰ ثبوت کا پابند ہے۔ تمہاری ریاضتیں، تمہارے مجاہدے برحق ہیں تو آگ سے گزر جاؤ، پھر ساری دنیا دیکھ لے گی کہ تم جل کر خاک ہو گئے ہو یا آگ نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“

”ابھی ہم اس منزل تک نہیں پہنچے۔“ آخر بوڑھے آتش پرست نے زبان کھولی۔ وہ اپنے لہجے پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر اس کی آواز سے لرزش صاف نمایاں تھی۔ ”ہم اسی دن کی جستجو میں اپنی جانوں پر یہ آزار جھیل رہے ہیں، جب آگ ہماری عبادتوں سے خوش ہو کر ہمیں بخش دے گی۔“

”یہ قیامت تک بھی ممکن نہیں۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے جواباً فرمایا۔ ”تم جب بھی اس آگ سے گزر رو گے، یہ تمہیں پھونک ڈالے گی۔ یہ خدا نہیں، خدا کی قدرت کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے۔ منکروں اور

نافرمانوں کے لئے قہر و غضب کا آلہ کار ہے، آگ کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ خدائے واحد کے حکم کی تابع ہے۔ اس کی سوزش اور ضرر سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زبان و دل سے گواہی دیں گے کہ اللہ

کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے آخری رسول ہیں۔ بس یہی لوگ آگ سے نجات پانے والے ہوں گے، باقی تمام گمراہی ہے۔“

”تم تو اس خدا کے ماننے والے ہو جو تمہارے خیال میں تنہا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔“
 بوڑھے آتش پرست نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے استہزاء کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں! یہ میرے خدا کا کرم ہے کہ میں اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔“ حضرت خواجہؒ نے نہایت عاجزی سے فرمایا۔

”تو پھر تم ہی اس آگ سے گزر جاؤ۔“ یکا یک آتش پرست گستاخانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ”ہم بھی دیکھیں کہ ایک خدا کو ماننے والے شعلہ سوزاں سے کس طرح محفوظ رہتے ہیں؟“
 ”اس آگ کا کام اشیائے ظاہری کو جلانا ہے۔“ حضرت خواجہؒ نے نہایت تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ”خدا نے مادی دنیا میں آگ کو یہی ذمہ داری سونپی ہے کہ جو چیز بھی اس کے درمیان سے گزرے، اسے جلا کر خاکستر کر دے۔ یہی آگ کی فطرت ہے اور فطرت کے خلاف عمل کرنا ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔“
 ”جب تم بھی اس آگ سے ڈرتے ہو تو پھر ہماری آزمائش کیوں؟“ بوڑھا آتش پرست حضرت خواجہؒ کی عارفانہ گفتگو سمجھنے سے قاصر تھا اس لئے مزید گمراہی کی باتیں کر رہا تھا۔

”مسلمان خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے اسی شگفتگی کے ساتھ فرمایا جس کے لئے آپؐ مشہور تھے۔ ”میں تو تمہیں اس آگ کی خبر دے رہا ہوں جو دوسری دنیا کی آگ ہے۔ جب تمام انسانوں کی شکستہ ہڈیاں جوڑی جائیں گی، خاکی پیکر اپنے رب کے حضور گردنیں جھکائے کھڑے ہوں گے، پھر جو راندہ درگاہ ٹھہریں گے انہیں اس آگ کے حوالے کر دیا جائے گا جس کا تصور انسانی عقل سے ماورا ہے۔ میں تو اس آگ کی نشانیاں بتا رہا ہوں جس کا ایندھن درخت اور پتھر نہیں، سرکش انسان ہیں۔ وہ آگ بولنے والی آگ جو پکار پکار کر اپنے خالق سے کہے گی۔ ”ہے اور کوئی تیرے جھٹلانے والوں میں سے؟ اسے بھی بھیج دے کہ میرا شکم خالی ہے۔“ میں تو اس آگ کا حوالہ دے رہا ہوں جس کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ آگ جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے بھڑکایا ہے، اس آگ کا دھندلا سا عکس بھی نہیں۔“

”ہم بھی اُسی آگ سے بچنے کے لئے ان شعلوں کی عبادت کر رہے ہیں۔“ آتش پرست کی سرکشی اپنی جگہ برقرار تھی۔ ”جب تم اس آگ سے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتے ہو تو پھر ہماری پرستش میں خلل کیوں ڈالتے ہو؟“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے پجاری کے چہرے پر ناگواری کا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔
 حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان ساتوں شعبہ بازوں کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے۔ آپؒ نے اپنے خادم کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”پیغام حق سنایا جا چکا ہے۔ اب اگر کوئی اپنے کان بند کر لیتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ خدا بے نیاز ہے۔ نہ وہ کسی کی بندگی کا محتاج ہے اور نہ اسے کسی کی عبادت کی ضرورت ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ جس آگ کی پرستش کر رہے ہیں، ایک دن اسی کی خوراک بن جائیں گے۔“
 یہ کہہ کر آپؒ واپس جانا چاہتے تھے مگر ایک خادم درخواست گزار ہوا۔

”سیدی! ان گمراہوں کی تعداد کل سات ہے مگر ان کی شعبہ بازیوں سے متاثر ہونے والے بے

نثار ہیں۔ اگر خدا نخواستہ آپ بھی ان کے طلسم کو نہ توڑ سکے تو یہ بات سارے شہر میں پھیل جائے گی اور پھر ان کی بے باکیوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ آگ ان پر ہی اُلٹ جائے۔“ خدام کی آواز میں دل کی تڑپ شامل تھی۔

حضرت سلطان الہندؒ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”اے مشرق و مغرب کے خدا! اے جزو کل کے خدا! اے آگ اور پانی کے خدا! تُو بہتر جانتا ہے کہ تیرا گناہ گار بندہ معین الدین کتنا مجبور ہے۔ تجھ پر یہ بھی روشن ہے کہ میں تیری بخشی ہوئی نعمتوں کو تماشا بنانا نہیں چاہتا۔ میں نے تیرے عطا کردہ علم سے ان کے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو منزل کی طرف موڑنا چاہا مگر یہ اپنی گمراہی پر خوش ہیں، اپنے جہل پر اصرار کر رہے ہیں۔ بے شک! تُو جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے وادی گناہ میں بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دے۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے دونوں جوتے اتار دیئے۔

حضرت سلطان الہندؒ کے اس عمل سے آپؒ کے خدام بھی حیران تھے اور آتش پرست بھی، کوئی نہیں جانتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کیا کرنے والے ہیں؟ آپؒ ننگے پاؤں آگے بڑھے اور آگ کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ پھر آپؒ نے اپنے ایک خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرے جوتے اٹھا کر لاؤ اور اس بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔“

خدام نے حضرت خواجہؒ کے حکم پر عمل کیا اور اپنے پیر و مرشد کے نعلین بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر دیئے۔

حضرت سلطان الہندؒ، آتش پرستوں سے مخاطب ہوئے۔ ”میں نے آج تک جس خدا کی عبادت کی ہے اس نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے جب بھی پکارا، اس نے میری دستگیری کی۔ اس آگ کی حیثیت ہی کیا؟ وہ تو آتشِ نمرود کو بھی گلزار بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ تو اس کی بے نیازی ہے کہ وہ تم جیسے حقیر و ناتواں انسان کو چند ساعتوں کی مہلت بخش دیتا ہے ورنہ کس میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی ایک سانس بھی لے سکے۔ خدا نے مجھے اپنے کرم خاص سے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ اگر میں آگ کے درمیان سے گزر جاؤں تو اس کے شعلے میرے پیرہن کو بھی نہ چھو سکیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فطرتاً نہایت شیریں سخن تھے مگر اس وقت آپؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ جلالِ روحانی کی حرارت سے دہک رہا تھا۔ ”وہ سچا۔ اس کا کلام سچا۔ اس نے اپنے نام لیواؤں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو پھر ہر معاملے میں تم ہی غالب رہو گے۔ اپنے رب کی اسی تائید کا سہارا لے کر میں خود بھی آگ کے شعلوں سے گزر سکتا تھا اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ تمہارے معبود نے میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر میں نے اپنے معبود سے التجا کی ہے کہ وہ سرکشوں کو اس طرح عاجز کرے کہ ان کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہ رہے۔ تمہیں ابھی اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارا معبود کتنا کمزور ہے۔“

آتش پرستوں پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شعلے مسلسل بھڑک رہے تھے مگر سلطان الہندؒ کے جوتے اسی طرح محفوظ تھے جیسے وہ آگ کے بجائے زمین کے کسی خشک حصے پر رکھے ہوں۔

خدا کے چہرے ناقابل بیان مسرت سے روشن تھے اور آتش پرستوں کے چہروں پر مایوسیوں کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔

”تم نے دیکھ لیا کہ تمہارا معبود کتنا ضعیف ہے؟“ حضرت سلطان الہند آتش پرستوں سے مخاطب ہوئے۔ ”تم نے جس کے لئے سال ہا سال تک شدید جسمانی اذیتیں برداشت کیں، آج اس نے تمہیں اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا کہ تمہاری گردنیں شرم سے جھکی ہوئی ہیں اور تمہارے چہرے مسخ ہوئے جا رہے ہیں۔ کیا تم اب بھی حق و باطل کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتے؟ میری طرف غور سے دیکھو۔ میں نے جس ذاتِ واحد کی عبادت کی تھی، اس نے مجھے یہ شرف بخشا کہ میرے جوتوں کو بھی معتبر کر دیا۔“

آگ پیہم بھڑک رہی تھی اور اس کے پجاری پتھر کے مجسموں کی مانند حضرت خواجہ کے جوتوں کو دیکھتے رہے جو ابھی تک نہ صرف سالم و ثابت تھے بلکہ ان پر آگ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ”اب تم کس بات کے منتظر ہو؟“ حضرت خواجہ نے آتش پرستوں سے سوال کیا مگر جواب میں کسی کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ ”کیا تمہیں اب بھی اُمید ہے کہ تمہارا معبود غضب میں آ کر ایک مسلمان کے جوتوں کو راکھ کر دے گا؟ کب تک اپنے آپ کو فریب دیتے رہو گے؟ اگر تمہاری آنے والی نسلیں قیامت تک اس آگ کو روشن رکھیں تب بھی ایک مومن کی یہ نشانی خاستر نہیں ہوگی۔“ اتنا کہہ کر حضرت سلطان الہند نے اسی خادم کو دوبارہ حکم دیا۔ ”جوتے آگ سے نکال لو۔“

ایک بار پھر آتش پرستوں پر وحشت طاری ہو گئی۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے حضرت خواجہ کے خادم کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جس آگ کے خوف سے پجاری لرزہ بر اندام رہتے تھے، اسی آگ کی سوزش کو سلطان الہند کے خادم نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اس طرح بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان چلا گیا جیسے کسی فرش گل پر محو خرام ہو۔ پھر اس طرح اپنے پیر و مرشد کی نشانی واپس لے کر آ گیا کہ اس کے لباس تک کو آگ نہیں چھو سکی تھی۔

”کیا ہمیں بھی تمہارا خدا معاف کر دے گا؟“ یہ منظر دیکھ کر آگ کے پجاری رونے لگے۔ ”یہ اسی کی شان ہے کہ وہ سرکشوں کے لئے بھی آخری سانس تک اپنا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے آتش پرستوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

”پھر ہمیں بھی اس پناہ گاہ تک لے چلو۔“ آتش پرست، حضرت سلطان الہند کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ”ہمیں اس آگ کے شعلوں سے بچالو۔“

”اس آگ کی کیا حقیقت ہے، تمہیں کلمہ توحید آتش دوزخ سے بھی بچالے گا۔“ یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے ان ساتوں آتش پرستوں کو دولت ایمان سے شرف یاب کیا۔ پھر اہل بغداد نے اپنی آنکھوں سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آگ کے پجاری با آواز بلند کہہ رہے تھے۔

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اس کے رسول ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ دریا سے پانی بھر بھر کر آگ پر ڈالتے جا رہے تھے۔ کیسا عجیب انقلاب تھا؟ انسان کو جب روشنی ملی تو وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے معبودوں کو مٹانے لگا۔ شعلے بجھتے جا رہے

تھے۔ یہاں تک کہ آخری شعلہ بھی بجھ گیا۔ پھر آدم زادوں کے خیالی معبود کی خاک بھی ہوا میں منتشر ہو گئی۔

آتش پرستوں کے قبول اسلام کا واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اہل مجلس کی طرف دیکھا۔ حاضرین مجلس کا عجیب حال تھا۔ بیشتر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور چہروں پر جذبات و احساسات کا عجیب امتزاج نظر آ رہا تھا۔ ہر چند کہ اس مجلس کے آداب بہت سخت تھے لیکن حضرت قطبؒ کے کچھ عقیدت مند ان قوانین کی پابندی نہ کر سکے اور برسر محفل پکار اٹھے۔

”بے شک! ہمارے سلطان الہند ایسے ہی ہیں۔ ہندوستان کے عارفوں میں کون ان کا ہمسر ہو سکتا ہے؟ وہ تمام اولیاء کے سردار ہیں۔“ عقیدت مندوں نے وہی لہجہ اختیار کیا تھا جو عام انسانی فطرت ہے۔

”حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہماری تعریف و توصیف کے محتاج نہیں۔“ حضرت قطبؒ نے اپنے عقیدت مندوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہم اپنی زبان سے نہیں کہتے کہ ہمارے شیخ محترم دوسرے سلسلے کے بزرگوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ درجہ بندی ان لوگوں کا کام ہے جو فروعات میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں بھی بندگانِ خدا، پیغامِ توحید و رسالت سنا رہے ہیں، ہمارے نزدیک وہ سب کے سب محترم ہیں۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس اختلافی بحث کا دروازہ بند کر دیا جس سے اکثر خانقاہیں آباد تھیں۔ (اور آج بھی ہیں)

”میں گناہ گار، حضرت سلطان الہندؒ کے مقامِ معرفت کا کیا پتہ دے سکتا ہوں؟ میں تو خود ان کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور ایک خادم اپنے آقا کے مقامِ ذات کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ میں تو صرف اپنے شیخ کے چند روحانی کمالات کا ذکر کر رہا ہوں تاکہ اس شہر میں بسنے والے تنگ نظر حضرات اس مردِ حق کی دل آزاری سے باز آجائیں جس نے ہندوستان کی بنجر اور سنگلاخ زمین میں ایمان کے درخت اُگائے اور پھر ان درختوں کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ صرف کر دیا۔“

حضرت قطبؒ کا لہجہ نہایت پُر سوز تھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ آپؒ کے الفاظ میں دل کا درد شامل ہے۔ ”میں تو دہلی کے بے خبروں کو یہ خبر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت خواجہؒ کے روحانی کرشموں کے سامنے دنیا بھر کے شعبدہ باز عاجز رہتے تھے۔ بغداد کا وہ آتش کدہ جسے اس کے پیجاریوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر روشن کیا تھا، حضرت سلطان الہندؒ کی نعلین کا بھی متحمل نہ ہو سکا۔ تمام عمر آگ کی پوجا کرنے والے اب کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے ہیں۔ معاذ اللہ! کیا یہ شعبدہ بازی ہے؟ خدا نے حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ علیہ السلام کو اپنی قدرتِ خاص سے عصا بخشا تھا اور پھر اسی عصائے کلیمی نے سامری کے تمام اژدھوں اور ساحرانہ کمالات کو اس طرح نکل لیا تھا کہ ان کا اس دنیا میں وجود تک باقی نہیں رہا۔ بے شک! حضرت خواجہؒ کلیمؒ نہیں ہیں مگر کلیمؒ کے غلام تو ہیں، کلیمؒ پر ایمان تو رکھتے ہیں۔ اس لئے خدا نے انہیں ضربِ کلیمی سے شرفِ یاب کر کے بتِ خانہ ہند کی جانب بھیجا ہے۔ اب اگر جادو گروں، کاہنوں اور شعبدہ بازوں کی بساطیں الٹ گئی ہیں تو لوگوں کو حیرت کیوں ہے؟“

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے پیرومرشد کی صفات عالیہ اس طرح بیان فرما رہے تھے کہ اہل مجلس دم بخود تھے۔ اب انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مردِ جلیل جو نہایت سادگی کے ساتھ ان کے درمیان رہ کر چلا گیا تھا، معرفت کے کس مقام پر فائز تھا؟



اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی زندگی کا ایک اور اہم ترین واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے طویل سفر کے اختتام پر ہندوستان تشریف لائے تھے اور پھر دہلی، ملتان اور لاہور سے گزر کر اجمیر میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ یہ حضرت سلطان الہندؒ کی تبلیغ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اجمیر کے بت پرست ایک مسلمان کو خاموشی سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ پھر مقامی لوگوں کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ ایک خاص تبدیلی رونما ہونے لگی۔ پتھر کے پجاری، حضرت خواجہؒ کے قریب ٹھہر کر آپؒ کا طریقہ عبادت دیکھنے لگے۔ پھر کافروں کی یہ دلچسپیاں اس حد تک بڑھیں کہ بعض منکرین اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اجمیر کے حکمران پرتھوی راج نے شروع میں اسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر جب مذہب تبدیل کرنے والے راجپوتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو پرتھوی راج کو فکر لاحق ہوئی۔ اس نے اپنے قریبی درباریوں سے مشورہ کیا۔ آخر طویل غور و فکر کے بعد ایک منصوبہ بنایا گیا۔ منصوبے کی تفصیل اس طرح تھی کہ پرتھوی راج نے اپنے ایک درباری امیر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلمان درویش کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہوگا اور پھر ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے حالات کا جائزہ لیتا رہے گا۔ دراصل اس راجپوت سردار کی حیثیت ایک جاسوس کی تھی۔ اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارگاہ میں اس لئے بھیجا جا رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی سرگرمیوں سے پرتھوی راج چوہان کو مطلع کرتا رہے کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بروقت مقابلہ کیا جاسکے۔

پھر ایک دن وہی درباری امیر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟“ حضرت سلطان الہندؒ نے نہایت نرم لہجے میں راجپوت

سردار سے پوچھا۔

”میں سمرات پرتھوی راج چوہان کا درباری امیر ہوں۔“ آنے والے نے سر جھکا کر کہا۔ ”آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اب نیا مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔“ راجپوت سردار نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”باپ دادا کے مذہب سے کیوں بیزار ہو؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار سے نیا سوال کیا۔ ”تمہارے آباؤ اجداد تو صدیوں تک اس مذہب پر عمل پیرا رہے۔ اب تم میں اچانک یہ تبدیلی کیوں آئی ہے؟“

”مجھے لاکھوں دیوتاؤں اور ہزاروں دیویوں کا مذہب پسند نہیں۔“ راجپوت سردار نے پُر جوش لہجے

میں کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ مسلمانوں کا خدا ایک ہے اس لئے میں بھی بے شمار خداؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پوجا کرنا چاہتا ہوں۔“

”بے شک! ہمارا خدا ایک ہے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ”مگر ایک خدا کی عبادت کرنا آسان نہیں۔ اس راستے میں دنیا کا تو ذکر ہی کیا، خود اپنی ذات کی بھی نفی کرنی پڑتی ہے۔“

”میں اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ پرتھوی راج کے درباری امیر کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ ”میں ایک خدا کے سوا تمام طاقتوں سے انکار کروں گا۔“

”تم یہ انکار نہیں کر سکو گے۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے راجپوت سردار کے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا۔

”آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“ راجپوت سردار کی باتوں سے حیرت کا رنگ نمایاں تھا۔

”تم یہ راز نہیں سمجھ سکتے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مختصر فرمایا۔

”میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔“ راجپوت سردار کا لہجہ بدستور عاجزانہ تھا۔ ”میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے اپنے مذہب میں شامل کر لیں۔“

”میری کیا طاقت ہے کہ میں کسی کو مسلمان کر سکوں۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا۔ ”کسی انسان کو ہدایت دینا محض اللہ کے فضل و کرم پر منحصر ہے۔ اگر وہ ایک شخص کو ہدایت دینا نہیں چاہتا تو پھر سارے جن و انس مل کر بھی کسی گمراہ کو ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتے۔“

اس کے بعد راجپوت سردار بہت دیر تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور درخواست کرتا رہا مگر آپؒ نے اسے دولتِ ایمان سے سرفراز نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس وقت حضرت سلطان الہندؒ کے چند خدام بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا جب کسی غیر مسلم نے قبولِ اسلام کی درخواست کی ہو اور حضرت خواجہؒ نے جواب میں انکار فرمادیا ہو۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس پر خدام آپس میں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کوئی حضرت سلطان الہندؒ سے اس انکار کا سبب دریافت کر سکے۔

پھر حالات نے نئی کروٹ لی۔ دوسرے دن چند خدام نے چند ایسے افراد کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو ظاہری شکل و صورت سے راجپوت نظر آ رہے تھے مگر جب وہ لوگ قریب آ گئے تو خدمت گاروں کو اندازہ ہوا کہ ان کا تعلق پرتھوی راج کے دربار سے ہے۔ آتے ہی ان لوگوں نے حضرت خواجہؒ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خدام نے سلطان الہندؒ کو اطلاع دی۔ آپؒ نے فوراً ہی آنے والوں کو خانقاہ کے اندر طلب کر لیا۔ (اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ ایک جھونپڑی پر مشتمل تھی) راجپوتوں کی اس مختصر سی جماعت میں وہ سردار بھی شامل تھا جسے حضرت خواجہؒ نے مسلمان بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

”ہم آپ سے ایک خاص مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔“ آنے والوں میں سے ایک سردار نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

”آپ حضرات کو جو کچھ کہنا ہے، بلا جھجک کہیں۔“ حضرت سلطان الہند نے نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا۔ ”درویش تو یہاں آیا ہی اس لئے ہے کہ اپنی بات کہے اور دوسروں کی سنے۔“

”یہ شخص کل آپ کے پاس قبول اسلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔“ آنے والوں میں سے ایک شخص نے راجپوت سردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ نے اسے اپنے مذہب میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر ایسا کیوں؟ کیا آپ کے یہاں بھی انسانوں کی درجہ بندی ہے؟“

”اسلام میں کوئی تفریق نہیں۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا اور اب آپ کے الفاظ سے جلالِ روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ”اللہ کے دین کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے۔ مگر وہاں کسی منافق.....“

”آپ اس شخص کو منافق کس طرح کہہ سکتے ہیں جو اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا؟“ دوسرے راجپوت سردار نے جرح کے انداز میں کہا۔

”اگر یہ اپنی مرضی سے یہاں آتا تو ذاتِ واحد کی قسم! اس فقیر کو اپنے تصور سے زیادہ کشادہ دل پاتا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سردار کے دعوے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ منافق ہی نہیں، جاسوس بھی ہے۔“

”جاسوس؟“ حضرت خواجہؒ کے انکشاف نے راجپوتوں کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا منصوبہ اس طرح بے نقاب ہو جائے گا۔ حضرت سلطان الہندؒ کی قوتِ کشف نے راجپوتوں کو حیران کر دیا تھا پھر بھی ان لوگوں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اس طرح کہا جیسے وہ اس راز سے بے خبر ہوں۔ ”یہ کس کا جاسوس ہے؟“

”یہ اسی سے دریافت کرو۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ”میں نے اسے کلمہ طیبہ کی تلقین اس لئے نہیں کی کہ یہ اپنی عملی زندگی میں بہت زیادہ گناہ گار ہے۔ اس نے بے گناہ انسانوں پر مظالم ڈھائے ہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ اسے اپنے حکمران کو سجدہ کرنے کی عادت ہے..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ میں نے اللہ کے فضل سے لوحِ محفوظ پر دیکھا ہے کہ یہ دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت نہیں ہوگا۔ سارا اجمیر دیکھے گا کہ اس کی موت بڑی بے کسی کی موت ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”اسلام میں منافقوں اور جاسوسوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ عنقریب یہ لوگ اپنا حشر دیکھ لیں گے۔“

منصوبہ سازوں کا یہ گروہ حضرت سلطان الہندؒ کے جلال کی تاب نہ لاسکا اور لرزتے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا۔ راجپوت سرداروں نے تمام حالات پر تھوی راج چوہان کے گوش گزار کر دیئے۔ اجمیر کا حکمران ایک درویش کی بے باکانہ گفتگو کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے چند سپاہیوں کے ذریعے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو یہ گستاخانہ حکم دیا۔

”اگر عافیت چاہتے ہو تو فوراً اجمیر کی حدود سے بہت دور چلے جاؤ۔ ورنہ ایسی دردناک سزا دوں گا

کہ آنے والی نسلیں تمہارے حال سے عبرت حاصل کریں گی۔“
اس حکم کے جواب میں حضرت سلطان الہندؒ نے فرمایا تھا۔ ”یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اجمیر کی حدود سے کون نکلے گا اور زمانہ کس کے حال سے عبرت پکڑے گا۔“
ابھی واقعے کو تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ شہاب الدین غوری نے اجمیر پر حملہ کر دیا۔ ایک خونی معرکہ آرائی کے بعد پرتھوی راج چوہان نے ذلت آمیز شکست کھائی اور افغان سپہ سالار کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔

اس تاریخی واقعے میں اہل نظر کے لئے جہاں بے شمار سبق ہیں وہاں یہ پہلو بھی عجیب ہے کہ جس راجپوت سردار کے بارے میں حضرت سلطان الہندؒ نے پیش گوئی کی تھی، وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جب آگ اور خون کا کھیل ختم ہو گیا تو مسلمانوں کو دریا میں ایک سڑی ہوئی لاش نظر آئی۔ یہ لاش اسی سردار کی تھی جس کے بارے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا تھا۔
”میں نے اللہ کے فضل سے لوح محفوظ پر دیکھا ہے کہ یہ دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت نہیں ہو گا۔ اور اس کی موت بڑی بے کسی کی موت ہوگی۔“



یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد آپؒ دوبارہ حاضرین سے مخاطب ہوئے مگر اشارہ ان درباری علماء کی طرف تھا جو خانقاہوں میں بیٹھنے والے درویشوں کو بے عمل کہتے تھے۔
”میں جانتا ہوں کہ یہ مسجدوں کے امام، زندگی کے دشت الم میں نماز ادا نہیں کر سکتے۔ یہ تقریر کے ماہرین زیر شمشیر اپنے ایمان کی شہادت نہیں دے سکتے۔ یہ فقہ کی باتیں کرتے والے، یہ راز نہیں جانتے کہ خدا ہر شے سے بے نیاز ہے۔ یہ حقوق العباد کا ذکر کرنے والے اس بات سے بے خبر ہیں کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ قدم قدم پر سود و زیاں کا حساب کرنے والے اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ خدا چاہے تو زیاں بھی سود ہے..... اور اگر خدا نہ چاہے تو پھر ہر سود، زیاں ہے۔ نقصان ہے، خسارہ ہے۔ یہ شرع کی آگ لے کر اپنے شکم بھرنے والے نہیں جانتے کہ رسالت مآب ﷺ کے گھر سے چالیس چالیس دن دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ یہ سنت رسول ﷺ اہل علم کو یاد نہیں۔ پانچ وقت کی نمازیں ادا کر کے دوسروں کو بے عمل کہنے والے اگر یہ نیم شب کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ وہ کیوں اس واقعہ عظیم کو فراموش کر دیتے ہیں، سرور کونین ﷺ رات رات بھر اپنے رب کے حضور کسی عمارت کے ستون کی مانند کھڑے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پائے اقدس پر ورم آ جاتا تھا۔ یہ لمحاتی سجدہ کرنے والے اس سجدہ طویل کو کیوں یاد نہیں کرتے جب حضور اکرم ﷺ کو سجدے کی حالت میں صبح ہو جاتی تھی اور پھر دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ پتھروں پر سجدہ کرنے کے سبب کبھی کبھی پیشانی رسالت مآب ﷺ سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے لگتے تھے۔ یہ بھی تو مزاج شریعت ہے۔ آخر یہ علمائے ظاہر اس سنت کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ یہ زندگی کا مشکل ترین عمل ہے۔ محفلیں آراستہ کرنے والے، اپنے

لباسوں اور عماموں کو خوشبوؤں میں بسانے والے اس راستے سے نہیں گزر سکتے۔ اگرچہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ وادی طائف میں لہولہان بھی ہوئے ہیں۔ کارزارِ حیات میں ایک عظیم سپاہی کی حیثیت سے شمشیر بکف بھی اترے ہیں۔ شعب ابی طالب میں بھوک اور پیاس کی ناقابل بیان تکلیف بھی برداشت کی ہے۔ یہ سنت کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ صحیح مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے اس راہ سے کیوں نہیں گزرتے؟ وہ تو شبنم اور سبزہ زاروں پر محو خرام ہونے والے ہوتے ہیں۔ آقا ﷺ کی سنت سے تو ہم غلاموں کو عشق ہے۔ ہماری صفوں سے کوئی قلندر اٹھتا ہے اور بادشاہوں کے درباروں میں پہنچ کر ان کے اقتدار و حکومت کی نفی کر دیتا ہے..... اور پھر تہہ تیغ ہو جاتا ہے۔ یہ خوش بیان واعظ مقرر، مزاج شاہ کا اندازہ کر کے تقریر شروع کرتے ہیں اور اس برسر اقتدار انسان کی لغزشوں پر مسلسل پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ ہماری جماعت کا ایک درویش شاہوں کے دربار کو حقارت سے دیکھتا ہوا گزر جاتا ہے اور ان مقامات کا رخ کرتا ہے جہاں برہمنوں اور ٹھاکروں کا ہجوم ہے۔ وہ ان کے خداؤں کو جھٹلاتا ہے اور حق کا پیغام سناتا ہے۔ اہل ہند اس درویش پر زندگی کے دروازے بند کر دیتے ہیں مگر وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ بت پرستوں کی صدیوں پرانی تاریخ تباہ ہو جاتی ہے۔ کل جہاں مندروں میں ناقوس کی آوازیں گونجتی تھیں، آج وہاں ”اللہ اکبر“ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہ جبہ و دستار کے طالب اپنی قباؤں کی نفاست ہی پر غور کرتے رہتے ہیں اور ایک فقیر بے مایہ، دریدہ لباس، خالی شکم، کسی درخت کے نیچے سے اٹھ کر کفار کے عقائد کی بساط الٹ دیتا ہے۔ یہ علم کے وارث اپنے مذہبی فرائض ادا کر کے نرم و گداز بستروں پر گہری نیند سو جاتے ہیں..... اور ایک جان سوختہ عشق الہی رات بھر اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز رہ کر گریہ و زاری کرتا ہے۔ درویش قدرت کے ایک مبہم سے اشارے پر اپنی جان سے گزر جاتا ہے اور یہ دانش مند لوگ اپنی زندگی بچانے کے لئے جواز تلا کرتے رہتے ہیں۔ یہ علمائے ظاہری ہر وقت سر بگریاں رہتے ہیں اور درویش سر بکف۔ پھر دونوں میں کیا تقابل ہے، کیا نسبت ہے؟..... جن کے دل گداز سے خالی ہیں، سوز سے محروم ہیں، جاں فروشی کے جذبے سے عاری ہیں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقام روحانیت کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟ انہیں کیونکر اندازہ ہوگا کہ سلطان الہند کے روبرو ایک شیر خوار بچہ کس طرح گفتگو کرتا ہے؟ ایک مقتول کس طرح حیات نو پاتا ہے؟ آگ کے پجاری کس طرح وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے آتش کدوں کو اپنے ہاتھوں سے بجھا دیتے ہیں؟..... کس طرح لوح محفوظ کا فیصلہ زمین پر نازل ہوتا ہے اور کس طرح لاکھوں راجپوت سپاہیوں کے حصار میں پر تھوی راج چوہان کا جسم ٹکڑوں میں تبدیل ہو جاتا ہے؟..... یہ سب کچھ کیا ہے، اس کا ادراک درباری علماء کو نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام چیزیں ان کی عقل سے ماورا ہیں جو اللہ کے پسندیدہ بندوں پر الزام تراشی کرتے ہیں اور انہیں سیاہ کار ثابت کرنے کے لئے جھوٹی گواہیاں لاتے ہیں..... مگر وہ کچھ بھی کر لیں، اللہ کے کسی محبوب کے چہرے پر سیاہی نہیں ملی جاسکتی۔ اس کے نام لیواؤں کے چہرے بھی روشن رہیں گے اور قبریں بھی۔ سلطان الہند آخر سلطان الہند ہیں۔ اس وقت جتنے بھی لوگ سرزمین ہند پر بستے ہیں، وہ میرے سلطان

ہی کی رعایا ہیں۔ میرا سلطان تاج و تخت نہیں رکھتا۔ اس کے دروازے پر مسلح افواج کا پہرہ نہیں۔ بے شک! وہ ایک بوریائشیں ہے مگر انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے..... اور یہی حکومت حقیقی ہے۔ پائیدار ہے۔ میرے سلطان کا اقتدار چند سانسوں پر محیط نہیں کہ انسان کی آنکھ بند ہوئی اور سب کچھ خاک میں مل گیا۔ میرا سلطان تو وہ ہے جو دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی اہل دل پر حکومت کرے گا۔ قیامت تک جو لوگ ہندوستان میں پیدا ہوں گے، وہ سب کے سب سلطان الہند کی رعایا میں شمار ہوں گے۔“

یہ کہتے کہتے حضرت قطب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جوش جذبات سے آپ کی آواز لرز رہی تھی اور خود سامعین کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ان کے دامن بھیگ گئے تھے۔ پہلی بار اہل شہر کو اندازہ ہوا تھا کہ ساعت فراق کے کہتے ہیں اور حضرت سلطان الہند کے اجمیر تشریف لے جانے سے بے قرار روحوں پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔



ایک اور مجلس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی روحانی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”یہ اسی زمانے کی بات ہے جب پرتھوی راج کو شکست ہوئی تھی۔ راجپوت حکمران کو گرفتار کرنے کے بعد شہاب الدین غوری، حضرت خواجہ کی قدم بوسی کو حاضر ہوا۔ سلطان الہند نے اسے مزید فتح و نصرت کی دعائیں دیں۔ جب افغان سپہ سالار رخصت ہونے لگا تو اس نے نذر کے طور پر حضرت سلطان الہند کی خدمت میں زر نقد اور قیمتی تحائف پیش کئے مگر آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ البتہ اتنا فرمایا کہ ان تمام اشیاء کو اجمیر کے ضرورت مند مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ شہاب الدین غوری نے سلطان الہند کے حکم کے مطابق ساری چیزیں مقامی مسلمانوں میں بانٹ دیں اور پھر درخواست گزار لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”میں تو مخدوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

”خدا تمہیں اجر عظیم دے کہ تم نے فقیر کا اس قدر لحاظ رکھا۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا۔ ”دولت اس دنیا کا عظیم فتنہ ہے۔ اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تب بھی میں اس کی طلب نہیں رکھتا۔ زمین پر صرف اللہ میرا کفیل ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح میری ضرورتوں کی تکمیل کر دیتا ہے۔“

شہاب الدین غوری کے قتل کے بعد قطب الدین ایبک نے ہندوستان کی عنان حکومت سنبھالی۔ غلام خاندان کے اس پہلے حکمران نے حضرت سلطان الہند کی خدمت عالیہ میں گراں بہا نذریں پیش کیں مگر آپ نے حسب عادت سختی سے انکار فرما دیا۔ ایک کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے تخت ہندوستان پر قدم رکھا۔ یہ درویش صفت شہنشاہ حضرت خواجہ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا لیکن تحائف قبول کرنے کے سلسلے میں وہ بھی حضرت سلطان الہند کو مجبور نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ اجمیر کے حاکم بھی حضرت خواجہ کے آستانے پر حاضری دیتے رہتے تھے مگر سلطان الہند کو ان کے قیمتی عطیات سے کوئی

سروکار نہ تھا۔ آپ ہر بار شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے۔ یہاں تک کہ اہل ثروت اپنے مقصد میں ناکام ہو کر لوٹ جاتے۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، حلقہ اسلام وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اجمیر جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسا خطہ زمین ہے کہ جہاں ماضی میں آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ اس لئے شہر اجمیر کے تمام غریب سمٹ کر حضرت سلطان الہند کی خانقاہ میں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے مفلس اور ضرورت مند افراد کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ آپ ان لوگوں کی روحانی تربیت بھی کرتے اور لباس و غذا کا بھی انتظام فرماتے۔ نتیجتاً حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی خانقاہ سے ایک بڑا لنگر خانہ قائم ہو گیا تھا جہاں بے شمار بھوکے دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔

ہندوستان میں کچھ اور بھی بزرگان دین ایسے گزرے ہیں جن کے یہاں بھوکے اور پریشان حال انسانوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور روز و شب لنگر جاری رہتا تھا..... لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور دیگر بزرگوں کے انتظامات میں بڑا فرق تھا۔ دوسرے بزرگوں کی خانقاہوں میں بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور دیگر اہل ثروت کی جانب سے بے شمار نذریں آتی تھیں جنہیں وہ خدارسیدہ لوگ، غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ایک لنگر خانہ قائم کر دیا جاتا تھا جس سے بھوکوں کو رزق حاصل ہوتا رہتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا دستور یہ تھا کہ آپ کسی شہنشاہ یا کسی امیر و وزیر کی کوئی نذر قبول نہیں فرماتے تھے مگر پھر بھی آپ کے لنگر خانے سے صبح و شام ہزاروں انسان اپنے شکم کی آگ بجھاتے تھے۔ اہل شہر کو حضرت سلطان الہند کے اس عمل پر شدید حیرت ہوتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے بڑے لنگر خانے کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں؟ بعض تجسس پسند افراد بہت دن تک اس جستجو میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت سلطان الہند کے ذریعہ آمدنی کا پتہ چل جائے مگر وہ سب کے سب اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ انہیں اس بات کی ہوا بھی نہ لگ سکی کہ غریبوں کے طعام کے لئے پیسہ کہاں سے آتا ہے؟

اس صورت حال نے تنگ نظر لوگوں کو حسد میں مبتلا کر دیا تھا اور جو عقیدت مند تھے انہیں ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ حضرت خواجہؒ، اخراجات کا یہ بار گراں کس طرح برداشت کرتے ہوں گے؟ اپنے اسی جذبے سے مجبور ہو کر حاکم اجمیر یا کوئی صاحب ثروت، حضرت سلطان الہند کے روبرو حاضر ہو کر درخواست کرتا۔

”ہم اپنے آپ میں یہ جرات اظہار نہیں پاتے کہ لنگر خانے کے اخراجات کی ذمہ داریاں ہمیں منتقل کر دی جائیں۔ یہ ہم گناہ گاروں کے لئے بڑا شرف ہو گا کہ آپ کی کوئی خدمت انجام دے سکیں۔“

”تم جانتے ہو کہ یہ لوگ کون ہیں؟“ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا اشارہ ان ضرورت مند انسانوں کی طرف تھا جو ہر وقت آپ کی خانقاہ میں موجود رہتے تھے۔ ”انہیں اللہ نے میرے پاس بھیجا ہے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔ اب تم چاہتے ہو کہ میں اپنے مہمانوں کو تمہارے حوالے کر دوں؟ یہ کیسی عجیب بات ہے؟ کون غیرت مند انسان برداشت کرے گا کہ اس کے مہمان دوسرے کے در پر جا

پڑیں۔ اگر یہ عام مہمان ہوتے تو شاید میں گوارہ کر لیتا کہ تم ان لوگوں کی میزبانی کرو..... لیکن یہ وہ مہمان خصوصی ہیں جنہیں خالق کائنات نے میرے سپرد کیا ہے۔ یہ بہت معزز لوگ ہیں۔ خود ان کی عزت بھی گوارہ نہیں کرے گی کہ یہ ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر منتقل ہو جائیں۔ انہیں میرے پاس ہی رہنے دو۔ یہ بہت نازک مزاج ہیں۔ ان کے دلوں کا شیشہ تحقیر کی ہلکی سی ضرب بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہ میری اولاد کے مانند ہیں۔ میرے سوا کوئی شخص ان کی ناز برداری نہیں کر سکتا۔ پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ میں انہیں اپنی جاگیر کی آمدنی سے کھلاتا ہوں؟ میری اس زمین پر کوئی جاگیر نہیں۔ یہ زمین خدائے واحد کی ملکیت ہے۔ اس لئے سارے خزانوں کا بھی وہی مالک ہے۔ معین الدین کا سرمایہ حیات تو بس اتنا ہے کہ اسے ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ وہ شاہ و امیر ہوں یا محتاج و گداگر، ان سب کو وہ خلاق عالم ہی رزق پہنچاتا ہے مگر اکثر لوگ اس کا شعور نہیں رکھتے۔“

حضرت سلطان الہند نے اپنے مہمانوں کی شخصیت کو اس طرح بیان کیا کہ اجیر کے آسودہ حال لوگ رو پڑے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں انسانی اعلیٰ ظرفی اور انکسار کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ نہیں دیکھا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ان محتاجوں کو جس طرح اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے اس کی مثال ایک نہایت درد مند باپ ہی فراہم کر سکتا ہے..... مگر صرف اپنی اولاد کی حد تک۔ سلطان الہند کی یہ نوازشات تو ان لوگوں پر عام تھیں جن سے آپ کا کوئی خونی یا نسبی رشتہ نہیں تھا۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اس فقیر کی ضروریات کا اتنا لحاظ رکھا۔ مگر آئندہ ان باتوں سے مجھے اذیت پہنچے گی۔“ حضرت سلطان الہند نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد دوبارہ فرمایا۔ ”ان کی میزبانی میرا فرض ہے۔ سر محشر مجھ سے اس سلسلے میں سخت باز پرس ہوگی کہ معین الدین! ہم نے تمہارے پاس کچھ مہمان بھیجے تھے، تم نے انہیں دوسروں کے کاندھوں کا بوجھ بنا دیا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں مالک روز جزا کے سامنے سر جھکائے ہوئے آؤں اور ایک ایسے مجرم کی طرح کھڑا ہوں جس نے اپنے آپ کو رازق سمجھ لیا تھا۔“

حضرت سلطان الہند نے در پردہ نہایت مہذب الفاظ میں اہل سرمایہ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ دولت کے انبار بھی محض خدا کے فضل و کرم سے ہیں اور اگر خدا نہ چاہے تو ایک انسان تنہا اپنی کفالت بھی نہیں کر سکتا۔

حضرت سلطان الہند کی گفتگو سن کر وہ مالکان سیم و زر، وہ صاحبان اقتدار ندامت کے پسینے میں نہائے ہوئے واپس چلے گئے۔ ایک درویش نے، زمین جس کا بستر تھی اور آسمان جس کا سائبان تھا، دنیا کے تمام وسائل و اسباب کی نفی کر دی تھی۔ اس کے بعد پھر کسی اہل کرم نے حضرت خواجہ کے مہمانوں کا ذکر نہیں چھیڑا اور سلطان الہند کا لنگر خانہ روز بروز کشادگی اختیار کرتا چلا گیا۔

بھوکے آتے تھے اور حضرت سلطان الہند کے قلندرانہ دربار میں اس طرح کھانا کھاتے تھے جیسے وہ اپنے ذاتی دسترخوان پر موجود ہوں۔ شکستہ حال اپنے لباسوں کی دھجیاں لے کر آتے تھے اور ان کے جسموں پر نئی قبائیں سجادی جاتی تھیں۔ یہاں کوئی کسی سے شرمندہ نہیں تھا۔ سب برابر تھے اور یہ برابری

انہیں اس شخص نے عطا کی تھی جو ہندوستان میں سب سے زیادہ محترم تھا۔ حاجت مندوں کی ضرورت کی تکمیل کے لئے حضرت سلطان الہند نے کئی خدمت گاروں کو متعین فرما دیا تھا۔ کوئی بازار سے اشیائے خوردنی لاتا اور کوئی کھانا پکانے کا انتظام کرتا۔ ان تمام خدمت گاروں میں ایک خصوصی خادم تھا جو حضرت خواجہ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ چیزوں کی خریداری کے سلسلے میں یہی خادم دوسرے لوگوں کو رقم فراہم کرتا تھا۔

ایک دن اجمیر کے ایک مالدار شخص نے حضرت خواجہ کے خاص خادم سے کہا۔ ”سنا ہے کہ شہنشاہ ہندوستان اور دیگر امراء خفیہ طور پر حضرت خواجہ کو قیمتی تحائف بھیجتے ہیں جس سے اتنے بڑے لنگر خانے کا خرچ چلتا ہے۔“ کہنے والے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ خبر درست بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بغیر یہ سارے اخراجات کس طرح ممکن ہیں؟“

یہ ایک شدید جذباتی ضرب تھی جسے سلطان الہند کا خادم برداشت نہ کر سکا۔

”ہندوستان کا شہنشاہ میرے سلطان کو کیا دے سکتا ہے؟ خود اس کی حکومت حضرت خواجہ کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔“ سلطان الہند کے خادم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا اور وہ بڑی وارفتگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ”میرے پیر و مرشد کو تو وہ غیب کے خزانوں سے دیتا ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔ اس کائنات کا حقیقی شہنشاہ ہے۔ میرے شیخ کے مصلے کے نیچے دولت کا سمندر اُبلتا ہے۔ ہندوستان کے تمام امیروں کا سرمایہ اس کے چند قطعوں کے برابر بھی نہیں۔ یہ وہ دولت ہے جو اللہ نے حضرت خواجہ کو بطور انعام بخشی ہے۔ یہ ایسی پاک اور صاف ہے کہ تم اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جہاں جہاں سیم و زر کے ذخائر موجود ہیں ان میں سے بیشتر میں کسی نہ کسی طرح بندگانِ خدا کا خون شامل ہے۔ مگر میرے مرشد کے خزانے کو اللہ نے نہ صرف اس عیب سے محفوظ رکھا ہے بلکہ وہ ایک عطائے خاص ہے جس کا ادراک اہل دنیا کو نہیں ہو سکتا۔“

سلطان الہند کے خادم نے جوشِ جذبات میں ایک ایسا راز فاش کر دیا تھا جس سے اہل اجمیر آج تک بے خبر تھے۔

”تم ایک بار ہمیں وہ خزانہ دکھا دو۔“ مال دار شخص نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”میں حضرت خواجہ کی اس کرامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”معاذ اللہ! کیا سلطان الہند کی کرامت کوئی تماشا ہے؟“ حضرت خواجہ کے خادم خاص کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ”پیر و مرشد میرے اس گناہ کو معاف کریں کہ میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔“ یکایک خادم کی آواز لرز نے لگی اور وہ کانپتے قدموں سے واپس چلا گیا۔

پھر وہ اسی حالت میں سلطان الہند کے حضور پہنچا اور حضرت خواجہ کے قدموں سے لپٹ کر گریہ و زاری کرنے لگا۔ ”سیدی! میں اپنے دل سے مجبور تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکا کہ کوئی میرے آقا پر طعنہ زنی کرے۔ میرے جذبات نے مجھے ہلاک کر ڈالا۔ میں رازداری کے قابل نہیں رہا۔ میرے اس گناہِ عظیم کو معاف کر دیجئے۔ اگر میں سلطان الہند کی بارگاہ سے اٹھ گیا تو پھر دنیا اور آخرت میں

میرے لئے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی۔“ خادم کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔
 ”درویش وہ ہے جو سمندر پی جائے۔ مگر تم تو چند قطروں ہی میں چھلک گئے۔“ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خادم سے فرما رہے تھے۔ ”وہ لوگ کچھ بھی کہتے رہتے، مگر تمہیں لب کشائی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اللہ نے تمہارے مرشد پر یہ احسان عظیم کیا ہے کہ تم اپنی ضروریات زندگی میں کسی امیر و وزیر کے محتاج نہیں۔ تم تو وہ ہو جنہیں اللہ بے سبب دیتا ہے۔“

خادم نے معافی مانگنے کے لئے دوبارہ زبان کھولنی چاہی مگر حضرت سلطان الہندؒ نے اس کے سر پر اپنا دستِ محبت رکھ دیا۔ ”تم یقیناً رازداری کے قابل ہو مگر تمہیں اپنے پیر و مرشد کی محبت نے بے قرار کر دیا تھا۔ نگاہِ عشق میں یہ سرمستی جائز ہے مگر وہ تو ایک امانت تھی جو تمہیں منتقل کی گئی تھی۔ امانت کا بوجھ اٹھانا ہر حال میں لازم ہے، چاہے اس سلسلے میں امین کو اپنی جان سے بھی گزر جانا پڑے۔ آئندہ احتیاط رکھو۔ کوئی دشنام ہی کیوں نہ دے، فقیر کو اس سے بے نیاز ہونا چاہئے۔“

اس واقعے کو مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مگر اس اختلاف کے باوجود یہ روایت معتبر ہے اور اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کرامات کے ہجوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ نامور بزرگ حضرت شیخ الہدیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف ”سیر الاقطاب“ میں اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت معین الدین چشتیؒ کے مطبخ (لنگر خانے) میں اس قدر کھانا پکتا تھا کہ شہر کے تمام مساکین اور غرباء شکم سیر ہو کر کھاتے تھے۔ جس خادم کے ذمے یہ خدمت تھی وہ روزانہ خرچ کے لئے نقد رقم لینے حاضر ہوتا تو سلطان الہندؒ اپنے مصلے کا ایک کونا اٹھا دیتے اور بے شمار خزانہ ظاہر ہو جاتا۔ حضرت خواجہؒ اس خادم سے فرماتے کہ آج کی ضرورت کے مطابق رقم لے لو اور اسے بندگانِ خدا پر خرچ کر ڈالو۔ پھر خادم کا یہ معمول تھا کہ حاجت مندوں کی خوراک اور لباس پر جو رقم خرچ ہوتی، خادم حضرت سلطان الہندؒ کے مصلے کے نیچے سے لے لیتا۔ روزانہ یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ خادم کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک درویش کے قدموں کے نیچے دولت کا دریا بہہ رہا ہو۔ ایسا دریا کہ کثرتِ استعمال کے باوجود اس کے پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے دریا گرم موسم میں خشک ہو جاتے تھے لیکن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی فتوحات میں ہمیشہ طغیانی رہتی تھی۔

یہ تاریخ ساز واقعہ سنانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اہل مجلس کی طرف دیکھا۔ حاضرین اپنی نشستوں پر ساکت و جامد بیٹھے تھے۔

”ہمیں بھی سلطان اور دیگر امراء نذر بھیجتے ہیں اور ہم ان سارے تحائف کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔“ حضرت قطبؒ نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہمارے دوسرے صوفی دوستوں کا بھی یہی طریقہ ہے۔ تحائف آتے ہیں اور محتاجوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سلطان الہندؒ کی خانقاہ کا دستور سب سے جداگانہ ہے۔ حضرت خواجہؒ کسی شہنشاہ یا امیر کی نذر قبول نہیں کرتے مگر پھر بھی میرے مرشد کے روزانہ اخراجات سب سے زیادہ ہیں۔ ہم غرباء اور مساکین کی

ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اہل ثروت نذر بھیجیں اور ہم بندگانِ خدا کی حاجت روائی کریں۔ اس سلسلے میں بھی اللہ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ہندوستان کے تمام اولیاء میں فضیلت بخشی ہے۔ سلطان الہندؒ کسی اہل سرمایہ کی نذر کا انتظار نہیں کرتے۔ اللہ آپ کو اپنے دستِ غیب سے دیتا ہے اور بے حساب دیتا ہے۔ میں اپنے مرشد کی کن کن صفات کا ذکر کروں؟ اگر میں سلطان الہندؒ کی مکمل شخصیت کے بارے میں بیان کرنے لگوں تو اس کا عظیم میں تمام زندگی ختم ہو جائے گی، پھر بھی مجھ سے آفتابِ چشتیہ کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکے گا..... اور تم لوگ جن کے ذہن و دل پر قدرت نے اپنا کوئی راز منکشف نہیں کیا ہے، میری باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکو گے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ سلطان الہندؒ کے قدموں سے جو غبار اٹھتا ہے، اگر اس کا ایک ذرہ بھی کسی کے لباس پر پڑ جائے تو اس کی ساری کٹافتیں دُور ہو جائیں گی۔“

ان واقعات کو مسلسل بیان کرنے سے مخالف گروہوں پر عجیب ردِ عمل ظاہر ہوا۔ علماء ظاہری نے اپنی تقریروں میں سلطان الہندؒ کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ درباری علماء تو اپنے خول سے باہر نہیں نکلے۔ وہ اسی طرح حضرت خواجہؒ کی ذاتِ مبارک کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ مگر ان کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد اپنے گناہوں سے تائب ہو گئی۔ وہ لوگ جو کل تک حضرت سلطان الہندؒ کے صوفیانہ عمل میں عیب تلاش کرتے پھرتے تھے، آج ان کی یہ حالت تھی کہ وہ سر جھکائے ہوئے حضرت قطبؒ کی خانقاہ کی طرف جا رہے تھے..... اور پھر اہل شہر نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ بیشتر نکتہ چیں، حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹے ہوئے معافی طلب کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی درخواست کر رہے تھے کہ انہیں بھی سلسلہٴ چشتیہ میں بیعت کر لیا جائے۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے کوئی شخص کسی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے اس کے گھر جائے مگر جب واپس آئے تو قتل کرنے کی بجائے اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔ یہ حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور بڑی کرامت تھی۔ اگرچہ کئی روز پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر روانہ ہو چکے تھے لیکن اس طویل فاصلے کے باوجود لوگوں کے دلوں پر آپؒ کی ہیبت و جلال طاری تھا۔ اور اسی جلالِ معرفت نے دلوں کا رنگ دھو کر انہیں صاف و شفاف کر دیا تھا۔ جن کی زبانیں سلطان الہندؒ کی برائی کرتے نہیں تھکتی تھیں، اب وہی لوگ بلند آواز میں یہ منقبت پڑھ رہے تھے۔

خواجہ خواجگانِ معین الدین



ایک دوسری مجلس میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی ایک اور کرامت بیان فرمائی۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب پرتھوی راج چوہان کو شکست ہو گئی تھی اور اجمیر و دہلی پر مسلمانوں کو مکمل غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ حالات پُر سکون تھے اور بے شمار کافر حلقہٴ اسلام میں داخل ہو رہے تھے لیکن پھر بھی ہندو راجپوتوں کی ایک کثیر تعداد تھی جو اب بھی اپنے آبائی مذہب پر سختی سے قائم تھی۔ حضرت خواجہ

معین الدین چشتیؒ مسلسل اہل ہند کو اسلام کا پیغام سنا رہے تھے۔ دین حق میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس لئے سلطان الہندؒ نے تلوار کے بجائے اپنے حسنِ عمل کا سہارا لیا اور غیر مسلموں کے سفینہٴ حیات کو اسلام کے ساحل کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے رہے۔

ایک دن حضرت خواجہؒ اپنے مریدوں اور مقامی عقیدت مندوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپؒ کے سامنے سے ایک دولت مند ہندو گزرا۔ یہ شخص نسلِ راجپوت تھا۔ چلتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اگرچہ حضرت خواجہؒ اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن وہ جاتے جاتے اچانک رک گیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ عام لوگ تو اُس کی اس حرکت کو نشے کے اثرات سے تعبیر کر رہے تھے مگر کچھ اہل نظر سمجھ گئے تھے کہ وہ حضرت سلطان الہندؒ کے سامنے ادب و احترام کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ پھر یکایک وہ سیدھا ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”خواجہؒ! اس گناہ گار کا سلام قبول کرو۔ تمہارے قریب آنا چاہتا ہوں مگر اپنی بد اعمالی سے شرم آتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسے جانا دیکھ کر حضرت سلطان الہندؒ نے اپنے حلقے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا۔ ”اس شخص کو غور سے دیکھ لو۔ اللہ کا دوست جا رہا ہے۔“

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے الفاظ سن کر تمام لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

حاضرین میں سے اکثر افراد جانتے تھے کہ سلطان الہندؒ نے جس کافر راجپوت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذاتی طور پر ایک نہایت بد کردار انسان ہے۔ دولت مند ہونے کے باعث کئی خرابیاں اس کی فطرت میں شامل ہو گئی تھیں۔ وہ دن رات شراب کے نشے میں غرق رہتا تھا۔ راتوں کو رقص و سرور کی محفلیں سجاتا تھا اور پھر شب کی تاریکی میں دوسرے ہنگامے پر پارہتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت تھک کر سو جاتا تھا۔ اس کی زندگی کے معمولات دیکھ کر کوئی ایک شخص بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے..... مگر جب حضرت سلطان الہندؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ ”اللہ کا دوست جا رہا ہے۔“ تو سننے والے حیران رہ گئے۔ کچھ لوگ حضرت خواجہؒ کو اس آدمی کی حقیقت بتانا چاہتے تھے لیکن ادب کے پیش نظر لب کشائی کی جرأت نہ کر سکے۔

کچھ دن بعد پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ وہ ہندو راجپوت اسی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے آیا۔ کچھ دیر تک کسی غلام کی مانند سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اسی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”خواجہؒ! میرا سلام قبول کرو۔ میں ادھر سے گزرنا نہیں چاہتا مگر نہ جانے کون میرے ناپاک قدموں کو تمہارے مقدس دربار کی طرف موڑ دیتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ حسب سابق جھومتا ہوا چلا گیا۔

حضرت سلطان الہندؒ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ فرمایا۔ ”اس شخص کو غور سے دیکھ لو۔ اللہ کا دوست جا رہا ہے۔ وہ بڑا صاحبِ نعمت ہے۔“

حاضرین پھر حیرت میں ڈوب گئے۔ اب کی بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس شرابی اور بدکار انسان کو ”ولی“ کے ساتھ ”صاحبِ نعمت“ بھی کہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ

سلطان الہند کو اس شخص کے کردار کے متعلق بتائیں مگر حضرت خواجہ کے جلال معرفت کے آگے ان کی زبانیں گنگ تھیں۔

پھر تیسری بار یہی واقعہ پیش آیا۔ ہندو راجپوت نے اسی انداز میں سلام کیا اور بڑے دردناک لہجے میں کہنے لگا۔ ”خواجہ! پھر مجھے یہاں کوئی کھینچ لایا ہے۔ میں اپنی رُوسیا ہی کو کدھر لے جاؤں؟“ یہ کہہ کر وہ حسب دستور چلا گیا۔

عجیب شخص تھا۔ حاضرین منتظر تھے کہ سلطان الہند پھر اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ فرمائیں گے۔ آخر وہی ہوا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اسی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”لوگوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے، مگر میں یہی کہتا رہوں گا کہ وہ اللہ کا دوست ہے۔ اگر وہ دن میں ہزار بار بھی ادھر آئے گا تو میں ہر مرتبہ اسے صاحبِ نعمت کہہ کر پکاروں گا۔“ یہ درپردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ تھا جو سلطان الہند کے فرمودات کو اس شخص کے کردار کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آخر ایک شخص برسرِ مجلس کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کرنے لگا۔ ”سیدی! آپ بہتر جانتے ہیں کہ ہمارے پراگندہ ذہن مستقل شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ جس شخص کو آپ نے اللہ کا دوست کہہ کر پکارا ہے، وہ بلا نوش شرابی ہے۔ دن رات اُم الخبائث کے نشے میں ڈوبا رہتا ہے۔“

”ہاں! وہ شرابی ہے۔“ حضرت سلطان الہند نے نہایت تحمل سے فرمایا۔ ”میں اُس کی بلا نوشی سے باخبر ہوں۔ مگر تم اللہ کی شانِ کرم سے واقف نہیں۔“

”وہ رقص و سرود کا رسیا ہے، بت پرست ہے، ہوس کار ہے۔“ وہ شخص عقل کی روشنی میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے گفتگو کر رہا تھا۔

”مجھے یہ بھی پتہ ہے۔“ حضرت سلطان الہند کے ہونٹوں پر وہی دلنواز تبسم ابھر آیا جو آپ کی مخصوص عادت بن چکا تھا۔ ”بے شک! وہ بندہ ہوس ہے مگر اللہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔ جب وہ کسی کو دیتا ہے تو بے سبب دیتا ہے۔ عنقریب اللہ اس پر اپنے کرم کی بارش اس طرح کرے گا کہ لوگوں کا ہجوم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔“

لوگ بظاہر خاموش تھے لیکن کچھ بدگمانوں کے دلوں میں اب بھی شکوک و شبہات پرورش پا رہے تھے۔ ان کے پریشان ذہنوں میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ایک معصیت آلود انسان کس طرح اللہ کی دوستی کے درجے تک پہنچ سکتا ہے؟ پھر کچھ لوگوں نے رازداری کے ساتھ اس ہندو راجپوت کے مشاغل جاننے کی کوشش کی تو عجیب و غریب انکشاف ہوئے۔ اس مالدار شخص کے ماں باپ مر چکے تھے، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ سرمائے کی کثرت اور تنہائی کی شدت نے اسے شرابی بنا دیا۔..... اور پھر شراب اسے رقص و سرود کی محفلوں تک لے گئی۔ ایک بوڑھے ملازم نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ نصف شب تک خوبصورت عورتوں کے رقص سے دل بہلاتا ہے، پھر ان سب کو نفرت و حقارت کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد رات بھر شراب پیتا ہے اور

عالم بے خودی میں اس وقت تک چیختا رہتا ہے جب تک کہ بے جان ہو کر بستر پر نہیں گر جاتا۔

”میں کدھر جاؤں؟..... میری منزل کہاں ہے؟“

سننے والے حیران رہ گئے۔ ملازم نے بتایا کہ جب تک وہ ہوش میں رہتا ہے، کسی سے کوئی بات نہیں کرتا..... مگر جیسے ہی اس کے اعصاب پر شدید خمار کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو بڑے دردناک انداز میں چیخنے لگتا ہے۔ ”میری منزل کہاں ہے؟..... میں کدھر جاؤں؟“

پھر ایک دن اسے منزل بھی مل گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ آج خلاف معمول اس کے قدموں میں ہلکی سی لرزش بھی نہیں تھی۔ تمام لوگ حیرت میں مبتلا تھے۔ ہندو راجپوت نے اپنا دستور بدل ڈالا تھا۔ ہر شخص کی نظریں اس سیاہ کار شرابی پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک اہل مجلس نے سلطان الہندؒ کی آواز سنی۔

”دیکھو! اللہ کا دوست آ رہا ہے۔“

پھر وہ راجپوت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ”شاہا! تیرے سوا اس غلام کی کوئی منزل نہیں ہے۔ میں نے تیری مملکت کی حدود سے نکل جانا چاہا مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہر مقام تیری رہ گزر میں ہے۔ میرے شب و روز پر، میرے ہوش و حواس پر یہاں تک کہ میرے خوابوں پر بھی تیرا قبضہ ہے۔ میں تیرے در کے سوا کہیں نہیں جاسکتا۔ مجھے اپنے گھر کی درباری بخش دے کہ یہی میرا شرف ہے۔ میرے سر کو اپنے قدموں سے پامال کر دے کہ یہی میری کلاہ خسروی ہے، یہی میرا تاج شاہی ہے۔“ اس کی آواز اتنی رقت آمیز تھی کہ اہل مجلس بھی رو پڑے۔

”اے جان بے قرار! تجھے خوشخبری ہو کہ تُو اللہ کے دوستوں میں شامل ہے۔“ حضرت سلطان الہندؒ نے ہندو راجپوت کو اپنے قدموں سے اٹھا کر گلے سے لگایا اور فضاؤں میں وہی کلمہ گو بننے لگا جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“ پھر شراب کے برتن توڑ دیئے گئے، رقص و سرود کی محفلیں اُجاڑ دی گئیں اور اس شخص نے یہ کہہ کر اپنا سارا سرمایہ بندگانِ خدا کے درمیان لٹا دیا کہ سلطان الہندؒ کے در کی گدائی میرے لئے کافی ہے۔

ہندو راجپوت کے قبولِ اسلام نے پورے اجمیر میں ہلچل مچا دی تھی۔ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تمام مرید اور عقیدت مند حیران تھے۔ حضرت سلطان الہندؒ کی پیش گوئی کا ایک حصہ درست ثابت ہو چکا تھا اور اب لوگوں کو اس بات کا انتظار تھا کہ حضرت خواجہؒ کے باقی فرمودات عالم اسباب میں کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ یعنی وہ نو مسلم کس طرح ولایت کے درجے تک پہنچتا ہے اور کس انداز میں صاحبِ نعمت کے منصب پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ہندو راجپوت ایمان لایا تو کلمہ طیبہ کا ایک ایک حرف اس کی زبان اور دل سے گزر کر روح میں اتر گیا۔ حضرت سلطان الہندؒ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو درس دیتے تو وہ اس طرح با ادب ہو کر بیٹھتا جیسے پتھر کا کوئی ستون ہے۔ اپنے پیرومرشد کے ارشادات کو اس طرح سنتا جیسے دنیا میں کوئی دوسری

بات سماعت کے قابل ہی نہیں ہے۔

سبھی کو تھے ملحوظ آداب محفل
مگر ہم نے تیرے اشاروں کو دیکھا

اُس کی کیفیت اس عاشق جاں سوختہ کی تھی جو اپنی زندگی بارگاہِ جاناں کے لئے وقف کر چکا ہو۔ وہ ہمیشہ حضرت سلطان الہندؒ کی جنبش چشم کو دیکھتا۔ اس شدتِ احساس نے نو مسلم راجپوت کو عقیدت و محبت کی ایک ایسی منزل تک پہنچا دیا تھا جو اکثر انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ وہ سلطان الہندؒ کے خدمت گاروں کا بھی اس قدر احترام کرتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ ان کی باتوں کو بھی حکم کا درجہ دیتا۔ اگر وہ لوگ اس سے کسی کام کا کہہ دیتے تو ہنسی خوشی انجام دیتا۔ خانقاہ کا کوئی دوسرا خدمت گار اسے ٹوکتا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا۔

”میرے پیر و مرشد کا ایک ایک خادم میری نظر میں مخدوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے لئے اس خانقاہ میں آنے والا ایک ایک فرد محترم ہے۔ اس کو بچے کا ایک ایک ذرہ آفتاب ہے جس نے میری سیاہ راتوں کو روشن کیا۔“

جب سلطان الہندؒ کے روبرو کوئی شخص نو مسلم راجپوت کی باتیں بیان کرتا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بڑی محبت سے فرماتے۔ ”تم نے دیکھ لیا کہ عشق کیا ہوتا ہے؟ بے شک! وہ عاشق جانناز ہے اور یہی عشق اسے ایک دن اللہ کا دوست بنا دے گا۔“

جب ساری دنیا سو جاتی تھی تو وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔ ”آخر تمہاری جان پر بھی تمہارا حق ہے۔“ حضرت سلطان الہندؒ فرماتے۔

”شاہا! میرے گناہ گار پیروں کا حق یہ ہے کہ وہ سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں کھڑے رہیں۔ آنکھوں کا حق یہ ہے کہ وہ سلطان معرفت کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے پتھر جائیں..... اور جان بے قرار کا حق یہ ہے کہ غلام اپنے شاہ کے قدموں پر جان دے دے۔“ یہ کہتے کہتے شدتِ گریہ سے نو مسلم راجپوت کی آواز ڈوبنے لگی۔

حضرت خواجہؒ کا دستِ کرم بلند ہوا، نو مسلم راجپوت آگے بڑھ کر سلطان الہندؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

نصف شب کا عالم تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دونوں ہاتھ دراز کر دیئے۔ وہ اپنے خادم کے لئے خداوند ذوالجلال سے سلامتی مانگ رہے تھے۔ ”اے خلاقِ عالم! تیرا یہ گناہ گار بندہ اپنے آباء و اجداد کی مشرکانہ روایتوں کو چھوڑ کر کوچہ وحدانیت کی طرف آیا ہے۔ اس کے مضطرب قدموں کو اپنی راہ میں جمادے، اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے دستِ قدرت سے تھام لے، اس کے دل و دماغ کو کشادہ کر دے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔“

پھر یوں ہوا کہ نو مسلم راجپوت جو کل تک پتھروں کا پجاری تھا اور خود بھی پتھر تھا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعاؤں سے اکسیر بن گیا۔ جس پتھر کو چھو لیتا اسے سونا بنا دیتا۔ اہلِ اجمیر نے اپنی آنکھوں

سے ایک بت پرست سیاہ کار کو ”ولی“ اور ”صاحبِ نعمت“ ہوتے ہوئے دیکھا۔
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے حضرت سلطان الہندؒ کی یہ کرامت بیان فرمائی تو مخالفین کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

پھر مخالفین میں سے ایک شخص نے اپنی نشست سے اٹھ کر کہا۔ ”شیخ محترم! ہمیں معلوم ہے کہ سلطان الہندؒ اس دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے حق میں دعا فرمائیے کہ ہم نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذاتِ گرامی کے متعلق اپنے ذہنوں میں جن بدگمانیوں کو پرورش کیا ہے، خدا انہیں معاف فرمادے۔ ہم اپنے طور پر تو تائب ہو چکے مگر یہ گناہ براہِ راست خدا کی نافرمانی نہیں۔ ہم نے خدا کے ایک دوست کی دل آزاری کی ہے۔ جب تک وہی مردِ بزرگ ہمارے اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا، اس وقت تک اللہ کی بارگاہ میں ہماری دعاؤں کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ خدا کے لئے ہمارے سکونِ قلب کی خاطر آپ دعا فرمائیے۔“ کہنے والے کی آواز لرز رہی تھی اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”لوگو! یہ تمہارا احسن ظن ہے۔“ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس شخص کی بات سن کر فرمایا۔ ”میرے لئے یہی شرف کافی ہے کہ میں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سلطان الہندؒ کا خادم ہی کہلاؤں۔ یہ تو حضرت خواجہؒ کی چشمِ کرم ہے جو خادموں کے ساتھ بھی دوستوں جیسا سلوک کرتی ہے۔ اگر تمہارے دل اسی طرح قرار پاتے ہیں تو میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ تم بھی اپنے دامن پھیلا دو کہ اللہ تمہارے اندازوں سے زیادہ دینے والا ہے۔“

عجیب جاں گداز منظر تھا۔ حضرت قطبؒ کی رقت انگیز آواز سے فضائیں تک نم آلود ہو گئی تھیں۔ ”اے مالکِ ارض و سما! اس کائنات میں وہ کون ہے جو تیرے جلال کے روبرو ہو سکے۔ مخلوق پر تیرا یہ احسانِ عظیم ہے کہ تیرے بے پناہ فضل و کرم نے ہر شے کو محیط کر لیا۔ ہم گناہ گار بھی تیرے کرم ہی سے پچانے جاتے ہیں۔ اگر گناہوں کے صحرا میں ہمارے سروں پر تیری رحمت کا ابر سایہ فلک نہ ہو تو یہ ناتواں جسم جل کر خاکستر ہو جائیں۔ ہم اس زمین پر بے اماں تھے، تُو نے ہمیں اپنے کرم کا سائبان بخشا۔ ہم گم کردہ راہ تھے، تُو نے ہمیں منزل کا نشان دیا۔ ہمارے دل وسوسوں اور اندیشوں کی آماجگاہ تھے، تُو نے ہمیں سرمایہٴ ایمان دیا۔ ہم اس وطن میں بے وطن تھے مگر تُو نے ہجرتِ رسول ﷺ کے صدقے میں دنیا کے ہر خطہٴ زمین کو ہمارا وطن بنا دیا۔ تُو نے اجمیر و دہلی کی سنگلاخ بستیوں سے چشمہٴ ہدایت جاری کیا۔ تُو نے اپنی لامحدود نوازشات سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سلطان الہندؒ بنا دیا۔ پھر تُو نے ہمیں سلطان الہندؒ کی رعایا ہونے کا شرف بخشا۔ آج اسی رعایا کے کچھ لوگ جو راستہ بھول گئے تھے، اپنی منزل کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے مضطرب قدموں کو استقامت بخش دے۔ یہ سلطان الہندؒ کے گناہ گار ہیں، سلطان الہندؒ ہی کے صدقے میں تُو انہیں معاف فرمادے۔“

پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر اس قدر رقت طاری ہو گئی کہ آپؒ کی زبان مبارک سے مزید الفاظ ادا نہ ہو سکے..... اور اہلِ مجلس کا تو یہ حال تھا کہ شورِ گریہ سے ایک حشر سا برپا تھا۔ حضرت قطبؒ

کی خانقاہ پر کسی ماتم کدے کا گمان ہوتا تھا۔ درود یوار تک آہ وزاری کرتے محسوس ہو رہے تھے۔
پھر حاضرین مجلس نے ایک عجیب و غریب بات محسوس کی۔ حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی خوشبو سلگتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی عود و عنبر سے پوری مجلس مہکی ہوئی تھی۔ لوگ اس خوشبو سے آشنا تھے۔ مگر اچانک حاضرین نے محسوس کیا کہ ایک نئی خوشبو نے پوری خانقاہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو اس خوشبو میں نہایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ سمجھنے والوں نے سمجھ لیا کہ یہ نئی خوشبو قدرت کی ایک نشانی ہے جو حضرت قطبؒ کی دعا کی قبولیت کا مظہر ہے۔ پھر مضطرب جذبوں کو طمانیت حاصل ہو گئی اور بے قرار دل سکون پا گئے۔



اہل دل بظاہر مطمئن ہو گئے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک اور قیامت ان کی منتظر ہے۔ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جانے والا اس طرح چلا جائے گا۔ شہر دہلی جو صرف اس کے دم سے آباد تھا، اچانک مقبرہ بن جائے گا۔ کسی شخص کو گمان بھی نہیں تھا کہ دہلی کے باشندوں سے یہ حضرت قطبؒ کی آخری ملاقات ہے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آخری بار دہلی سے اجمیر روانہ ہوئے تھے اس وقت حضرت قطبؒ کی عمر پچاس سال تھی۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے عام انسانی زندگی کا اوسط نوے اور سو سال کے درمیان تھا۔ اس اعتبار سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو جوان کہا جاسکتا تھا..... مگر زندگی اور موت کے سلسلے میں قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ آگے جانے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعد میں آنے والے بہت پہلے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت قطبؒ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ آپؒ ظاہری اعتبار سے مکمل طور پر صحت مند نظر آتے تھے مگر کسے معلوم تھا کہ زندگی کی آگ کے گرد گہرا دھواں پوشیدہ ہے اور اس توانائی کے پس پردہ ایسی ناتوانی موجود ہے کہ انسان اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔

12 ربیع الاول 633ھ کی رات کا واقعہ ہے کہ شیخ علی بجاتانیؒ کی خانقاہ میں محفل سماع منعقد تھی۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی اس محفل عرفاں میں موجود تھے۔ ایک بزرگ قوال جو خود بھی نہایت پرہیزگار انسان تھا، حضرت شیخ احمد جامؒ کا قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ اس محفل سماع میں حضرت قطبؒ کے علاوہ دہلی کے دیگر مشائخ بھی موجود تھے۔ ایک تو حضرت شیخ احمد جامؒ جیسے عظیم صوفی شاعر کا عارفانہ کلام، دوسرے پڑھنے والے کی پُر سوز آواز۔ غرض اہل مجلس کا عجیب حال تھا۔ دل پکھلتے جا رہے تھے اور جانیں حرف و آہنگ کی جراحت سے ناقابل بیان اضطراب میں مبتلا تھیں۔ بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جیسی حضرت امیر خسروؒ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے۔

نمی دائم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسل بود شب جائے کہ من بودم

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بہت دیر سے شیخ احمد جامؒ کا طویل قصیدہ سن رہے تھے اور ایک ایک شعر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مگر جب قوال نے یہ شعر پڑھا تو بے اختیار ہو گئے۔ عشق کی تمام

احتیاطیں ختم ہو گئیں اور تکلفات کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را !

ہر زمان از غیب جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل ہوئے ہیں انہیں ہر زمانے میں غیب سے نئی زندگی دی جاتی

ہے)

محفل سماع میں موجود دوسرے بزرگوں نے بھی یہ شعر سنا لیکن حضرت قطبؒ کی طرح کوئی اس کی گہرائی اور اثر آفرینی کو نہیں پہنچ سکا۔ بقول علامہ اقبال۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں

ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ احمد جامؒ کے اس شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپؒ پر وجد طاری ہو گیا اور پھر سر محفل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اس سے پہلے بھی سماع کے دوران حضرت قطبؒ کی حالت غیر ہو جاتی تھی مگر اس بار تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص مقتل کی زمین پر لیٹا ہوا ہے اور اسے کسی تیز خنجر سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ جب دوسرے مشائخ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا یہ حال دیکھا تو قوال کو اشارہ کر دیا کہ وہ اسی شعر کو بار بار پڑھتا رہے۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ جب کسی شعر سے انسانی قلب پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کو بار بار دہرانے سے ایک مقام وہ آ جاتا ہے کہ نا آسودہ جذبے سکون پانے لگتے ہیں اور مضطرب دل کو آہستہ آہستہ قرار مل جاتا ہے۔

مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ جیسے جیسے قوال کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، حضرت قطبؒ کے اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ایک ناقابل فہم اذیت سے دوچار تھے۔ ایک ایسی اذیت جو کم ہونے کی بجائے لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور مولانا بدر الدین غزنویؒ، حضرت قطبؒ کو شیخ علی بھستانیؒ کی خانقاہ سے اٹھا کر گھر لے گئے۔

رات بھر حضرت قطبؒ کی یہی کیفیت رہی۔ مگر جب مؤذن نے فجر کی اذان دی تو حیرت انگیز طور پر حضرت قطبؒ کو ہوش آ گیا۔ آپؒ نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ نماز ادا کی۔ تمام مشائخ، مرید اور عقیدت مند سمجھے کہ جذب کی وہ حالت ختم ہو گئی ہے اور اب حضرت قطبؒ مکمل طور پر پرسکون ہیں..... لیکن اس وقت سب لوگ حیران رہ گئے جب نماز فجر ادا کرتے ہی دوبارہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر بے خودی کی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس حالت جذب سے پہلے حضرت قطبؒ نے شیخ احمد جامؒ کا وہی شعر پڑھا تھا اور پھر آپؒ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ جو آپؒ کے دوست تھے اور مولانا بدر الدین غزنویؒ جو آپؒ کے مشہور خلفاء میں سے تھے، حضرت قطبؒ کی اس کیفیت سے سخت مضطرب تھے۔ پھر ظہر کی نماز کا وقت آیا تو حیرت انگیز طور پر حضرت قطب الدین

بختیار کاکی ہوش میں آ گئے۔ آپؑ نے باقاعدہ وضو کیا اور نہایت خضوع و خشوع سے نماز ادا کی۔ اس بار بھی خانقاہ میں موجود لوگوں نے یہی سوچا تھا کہ حضرت قطبؒ کی کیفیت جذب ختم ہو چکی ہے..... مگر نماز ادا کرتے ہی قلب مضطرب کا وہی عالم ہو گیا۔ ذہن بیدار نے ایک بار پھر ہوش کی دنیا سے تمام رشتے توڑ لئے۔

حضرت قطبؒ کا یہ عرصہ ہوش و بے خودی تین دن اور تین راتوں پر محیط تھا۔ اس دوران آپؑ نے ساری نمازیں ادا کیں۔ یہ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی باہوش بزرگ کسی بھی عالم میں نماز ترک نہیں کر سکتا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بلاشبہ ان صوفیائے کرام میں سے تھے، جو آخری سانس تک فرض و سنت کی تکمیل کے لئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر 14 ربیع الاول کو آپؑ ہوش میں آئے اور اپنے ایمان کی گواہی دی۔

”اے اللہ! تو علیم و خبیر بھی ہے اور بصیر بھی کہ میں نے تیرے سوا کسی کی پرستش نہیں کی۔ تو شاہد ہے کہ میں تیرا بندہ حقیر ہوں اور تیرے حبیب رسالت مآب ﷺ کا ادنیٰ غلام۔ یہی نسبت میرا سرمایہ آخرت ہے۔ اسی نسبت کے صدقے میں قطب الدین کے گناہوں کو بخش دے کہ تیری رحمت عالم پناہ ہے۔“ یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دہلی ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جو کئی بار اُجڑا ہے اور کئی بار آباد ہوا ہے۔ اس زمین نے بڑے بڑے مہاراجوں، سلطانوں اور شہنشاہوں کا دور دیکھا ہے..... اپنے سینے پر نادر روزگار عمارتوں کا بوجھ برداشت کیا ہے..... مگر آج اس کا حقیقی معمار اپنے کام کی تکمیل کر کے بہت دور جا چکا تھا۔ دیوار و در اُداس تھے۔ گلی کوچوں میں وحشت برس رہی تھی اور مکانوں سے شور و فغاں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا پُرساں حال، حاجت مندوں کا کفیل اور بیماروں کا مسیحا اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

کسی نے پکار کر کہا۔

”اے خاکِ دلی! قطب کا ماتم کر! اب کے تو ایسی اُجڑی ہے کہ پھر اس شان کا بسانے والا کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔“

بے شک! یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دہلی کی خاک میں بڑے بڑے صوفی، قلندر اور درویش محو خاک ہیں مگر ان میں کوئی بھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے درجے کو نہیں پہنچتا۔

633ھ کا سال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑا گراں ثابت ہوا تھا۔ (اسی سال درویش صفت حکمران سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا) حضرت قطبؒ کی موت سے صرف اہل ایمان ہی دل گرفتہ نہ تھے، اہل ہنود بھی اسی طرح اُداس نظر آتے تھے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو۔ جس طرف بھی نظر جاتی تھی، نظامِ روز و شب درہم برہم نظر آتا تھا۔ بس وہ درباری علماء خوش تھے جنہوں نے دنیاوی جاہ و حشم کے بدلے اپنی آخرت فروخت کر دی تھی۔



حضرت قطبؒ کے انتقال کے بعد سلطان الہندؒ بہت زیادہ اُداس رہنے لگے مگر آپؒ نے اپنے اس غم کو دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے تمام معمولات پر سکون انداز میں جاری رہتے تھے مگر جب آپؒ خلوت میں جاتے تھے تو حضرت قطبؒ کو یاد کر کے بے قرار ہو جاتے تھے۔ بعض خدمت گاروں نے آپؒ کو تنہائی میں روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ یہ ایک ولی کا دوسرے ولی سے خاص تعلق تھا جو اکثر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اس طرح رُلا یا کرتا تھا کہ عام لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔

پانچ ماہ تک حضرت سلطان الہندؒ کی یہی کیفیت رہی۔ آپؒ نے اپنے تمام فرائض بحسن و خوبی انجام دیا۔ آخر 6 رجب 633ھ کا سورج طلوع ہوا۔ اہل اجیر سمجھ رہے تھے کہ آج آسمان بہت زیادہ صاف اور نیلا ہے، دھوپ بھی تیز اور روشن ہے..... مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد اسی نیلے آسمان پر گہری دُھند چھا جائے گی اور سورج کی تیز کرنیں سیاہی کی قبا پہن لیں گی۔ پورا دن حسب معمول گزرا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے تمام نمازیں باجماعت ادا کیں۔ مجلس درس آراستہ ہوئی اور تمام مریدوں کو اسلام کے ارکان پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت کی۔ حضرت سلطان الہندؒ کا یہ عمل بھی حسب دستور تھا مگر درس کے دوران ایک بات خاص طور پر نمایاں تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بار بار ایک ہی بات پر زور دیتے تھے۔

”خواب ہستی بہت مختصر ہے۔ انسان کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ زندگی کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا اور بندے کو اس حقیقت ازلی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا اس سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔“

حاضرین مجلس سلطان الہندؒ کی اس نصیحت کو بھی عام درس کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ آج حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کسی اور ہی سانچے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

آخر سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں، پھر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ حضرت خواجہؒ کا یہ عمل بھی حسب سابق تھا۔ خدمت گاروں کو یہ احساس تک نہیں ہوا کہ آج رات کیسا اندوہناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ تمام مرید و عقیدت مند اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور کچھ لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اچانک حاضرین کو حضرت خواجہؒ کی خلوت خاص سے ایک بار عب صد بلند ہوتی محسوس ہوئی۔ تمام لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ جو لوگ سلطان الہندؒ کے حجرے سے دور تھے وہ بھی اس آواز کو سن کر قریب آ گئے۔

اگرچہ حضرت خواجہؒ گزشتہ پچاس سال سے رات بھر ذکر الہی میں مشغول رہتے تھے لیکن اس طرح کہ آپؒ کا قلب جاری رہتا تھا اور زبان مکمل طور پر ساکت رہتی تھی۔ یا کبھی بہت زیادہ پُر جوش ہوئے تو ہلکی ہلکی آواز ابھرنے لگتی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں کہ جو خدمت گار حجرے کے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا، وہی اس آواز کو سن سکتا تھا۔ باقی لوگ جو کچھ فاصلے پر موجود ہوتے تھے، انہیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ سلطان الہندؒ کس طرح ذکر کرتے ہیں؟ لیکن آج نصف صدی کے معمول میں اتنا نمایاں فرق آ گیا تھا کہ خانقاہ میں موجود تمام لوگ اپنی اپنی جگہ چونک اٹھے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بلند آواز

میں ذکر الہی کر رہے تھے۔ آپ کی آواز کیا تھی، ہیبت و جلال کا ایک ایسا آہنگ تھا کہ جس کے اثر سے خانقاہ کے درو دیوار کانپ رہے تھے۔ خدام کی یہ حالت تھی کہ ان کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ عام انسانی دل کی کیا حیثیت ہے، حضرت سلطان الہند کی ضرب ”لا الہ الا اللہ“ سے اجمیر کے پہاڑوں میں بھی شگاف پڑ گئے تھے۔ تمام خدمت گاروں اور مریدوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو پہلی بار اس رنگ میں دیکھا تھا ورنہ آپ ہمیشہ اہل دنیا سے صورتِ جمال ہی میں ملتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خدام و مریدین نے سلطان الہند کی پر جلال آواز سنی تھی۔ اگر وہ اپنے پیر و مرشد کو لباسِ جلال میں دیکھ لیتے تو اللہ ہی جانتا ہے کہ دیکھنے والوں کا کیا حال ہوتا؟ عشق کی آتش سوزاں کو یہ خس و خاشاک کس طرح برداشت کرتے؟ جل کر خاک ہی ہو جاتے۔

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ حضرت خواجہ کے ذکر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک مرد حق کی یہ آواز اسی طرح ابھر رہی تھی۔ وہ آواز جس میں خدائے واحد اور اس کے احکام کے سوا ہر چیز کی نفی پوشیدہ تھی۔ اچانک سننے والوں کو احساس ہوا کہ اب حضرت سلطان الہند حالتِ وجد میں چلے گئے ہیں۔ ذکر کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دینے لگتی تھی مگر اس کے ساتھ فضا پر مزید ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ ہر شخص خوف سے اس طرح لرزہ بر اندام تھا کہ اسے اپنی سانس تک رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تمام خدمت گار سہمے ہوئے تھے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکے اور حضرت خواجہ کی اس کیفیت جذب کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کوئی سوال کر سکے۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔ رات کے ستارے بزمِ فلک سے رخصت ہوئے اور ستارہ سحری اپنی پوری تابناکی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس وقت خدمت گاروں نے محسوس کیا کہ اب فضا پر مکمل سکوت طاری ہے اور حضرت خواجہ کے حجرے سے آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں۔ حاضرین خانقاہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ حضرت سلطان الہند کی کیفیت جلال ختم ہو چکی ہے اور آپ حالتِ جمال میں دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔

کچھ دیر بعد فجر کی اذان ہوئی۔ خدمت گاروں کو یقین تھا کہ اذان کی آواز سنتے ہی سلطان الہند حجرے سے باہر تشریف لائیں گے اور پھر نمازِ فجر ادا کریں گے۔ وہ خادم جو آپ کو صبح کے وقت وضو کرایا کرتا تھا، بڑی مستعدی کے ساتھ دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ خانقاہ میں موجود دیگر افراد وضو کر کے سنت مؤکدہ ادا کرنے لگے۔ وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا مگر حجرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ اب دوسرے خدمت گار بھی ایک ایک کر کے دروازے پر جمع ہونے لگتے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر فکر و تشویش کی علامت ظاہر ہونے لگتی تھی۔ طویل عرصے تک خدمت گزاری کے باوجود کسی مرید یا عقیدت مند کے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا تھا کہ حضرت خواجہ کی کوئی نماز فجر قضا ہوئی ہو۔ تاریخوں میں تو بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ شادی سے قبل سلطان الہند نے مسلسل پچاس سال تک عشاء کے وضو سے نمازِ فجر ادا کی ہے۔ پھر ایسا نماز گزار انسان افضل ترین عبادت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا تھا۔ لوگوں کے

اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا، وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تمام خدمت گار اور مرید اس نتیجے پر پہنچے کہ شب بیداری کے باعث آپؐ کی آنکھ لگ گئی ہوگی ورنہ آپؐ اب تک باہر تشریف لا چکے ہوتے۔ پھر آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ سلطان الہندؒ کو آرام کرنے دیا جائے اور دروازے پر دستک دے کر آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالا جائے۔ اس کے بعد تمام لوگوں نے نماز فجر ادا کی مگر محسوس ایسا ہوتا تھا ہر شخص اپنی جگہ بے سکون ہے اور حضرت خواجہؒ کی نماز میں عدم شرکت کے باعث ہر ذہن میں مختلف قسم کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔

آخر سورج طلوع ہوا اور تیز دھوپ اجیر کی پہاڑیوں سے اتر کر میدانوں میں پھیل گئی۔ کچھ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ پھر کچھ خاص مریدوں نے دروازے پر کان لگا دیئے کہ شاید حضرت خواجہؒ ذکر میں مصروف ہوں اور آپؐ کی ہلکی ہلکی آواز ابھر رہی ہو۔ مگر لوگ کوئی آہٹ، کوئی صدا سننے میں ناکام ہو گئے۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عمر ستانوے سال ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو خیال گزرا کہ کہیں ضعف پیری کے سبب آپؐ کو کوئی عارضہ نہ لاحق ہو گیا ہو۔ جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا، لوگوں کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے اور جب عقیدت مندوں کی یہ بے چینی برداشت سے باہر ہو گئی تو دروازے پر مسلسل دستک دی گئی۔ جواب میں وہی خاموشی طاری رہی۔ انجام کار ایک بار پھر مشورہ کیا گیا۔ جو لوگ روحانی اعتبار سے حضرت خواجہؒ کے زیادہ قریب تھے، ان کی رائے کو ترجیح دی گئی اور پھر دروازے کو توڑ دیا گیا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک عجیب و غریب خوشبو کی لہر آئی جو قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو نہلاتی ہوئی گزر گئی۔ اندر جانے والے خدام گھبرا کر رک گئے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان الہندؒ اپنے زمینی بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کا منہ کعبے کی طرف ہے۔ پہلی نظر میں دیکھنے والوں کو ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا کہ حضرت خواجہؒ محو خواب ہیں اور شب بیداری کے سبب گہری نیند سو رہے ہیں..... مگر جب لوگوں نے جسم مبارک کو غور سے دیکھا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ حضرت سلطان الہندؒ کی سانسوں کا رشتہ بحال نہیں تھا چند خدام جو حجرے میں داخل ہو چکے تھے، انہوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں کانپ رہی تھیں اور چہروں پر اذیت ناک وحشت برس رہی تھی۔ حجرے کے اندر موجود لوگوں کو بظاہر یقین ہو چکا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عالم فانی سے رخصت ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں..... مگر ان کے دل اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ سلطان الہندؒ اس قدر جلد آخری سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں عشاء کی نماز تک حضرت خواجہؒ بالکل صحت مند تھے۔ آپؐ کے چہرہ مبارک پر کسی بیماری کی ہلکی سی علامت بھی نہیں تھی۔ ساری رات با آواز بلند ذکر الہی کرتے رہے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا کہ آپؐ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ یہ جذبات کی ایک ہیجانی کیفیت تھی جو کسی عزیز ہستی کی موت کے وقت اکثر انسانوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید، عقیدت مند اور خدام اسی شدت جذبات کے زیر اثر تھے۔ پھر کچھ دیر بعد جذبات کا یہ سیلاب گزر گیا تو حاضرین خانقاہ اور حضرت خواجہؒ کے اہل

خانہ کو یقین آ گیا کہ ہندوستان کی اقلیم معرفت کا تاجدار اپنی عظیم الشان روحانی سلطنت کو چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے۔

جب خدمت گاروں نے حضرت سلطان الہندؒ کا چہرہ مبارک دیکھا تو ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب تبسم موجود تھا۔ ایسا تبسم جو کسی حسین اور محبوب چیز کو دیکھنے کے بعد لبوں پر نمودار ہوتا ہے۔ بے شک! اس وقت حضرت سلطان الہندؒ موت کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو اہل حق کو بہت دلکش نظر آتی ہے..... اور دنیا پرستوں کو نہایت ہولناک اور لرزہ خیز۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر گناہ گار لوگوں کے چہرے مرتے وقت مسخ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی زندگی مرضی حق کے مطابق گزارتے ہیں، ان کے نزدیک موت کا تصور خوشگوار ہوتا ہے اور وہ اس ازلی حقیقت سے فرار ہونے کے بجائے خوش دلی کے ساتھ موت کا استقبال کرتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو خدا کے دوست تھے اور ایک دوست اپنے دوست کے حکم پر کس طرح عمل کرتا ہے، اس کا اندازہ تمام انسان نہیں کر سکتے بس دیکھنے والوں نے سلطان الہندؒ کے ہونٹوں پر ایک مخصوص تبسم دیکھا جو مرد مومن کی ایک مخصوص نشانی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک فارسی شعر میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم

چو مرگ آمد تبسم ہر لب اوست

(میں تجھے مرد مومن کی پہچان بتاتا ہوں کہ جب موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم نمایاں

ہوتا ہے)

پھر خدمت گاروں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ستانوے سال تک خدا کے نور سے دیکھتی رہی تھیں۔ اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جو تقریباً ایک صدی تک اللہ کے نور سے دیکھنے کے بعد 6 رجب 633ھ کو بے جان ہو گئی تھیں مگر اس طرح کہ دیکھنے والوں کو اب بھی ان کی روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ حضرت سلطان الہندؒ کی نیم وا آنکھوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپؐ کسی آنے والے کا انتظار کرتے کرتے تھک کر لیٹ گئے ہیں مگر انتظار ابھی باقی ہے۔

اب واقعاً خدام کو یقین آ گیا تھا کہ حضرت خواجہؒ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اس احساس کے ساتھ ہی لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا۔ شدتِ غم بڑھی تو بے اختیار عقیدت مندوں کی چیخیں نکل گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ درویشوں کی یہ جماعت جو زندگی بھر دوسرے لوگوں کو صبر و ضبط کی تلقین کرتی رہی تھی، آج اپنے ہی پیغام کی نفی کر رہی تھی۔ بہت سے خدمت گار اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے اور جو ہوش میں تھے، ان کی آنکھوں سے بھی سیل اشک جاری تھا۔ جوشِ گریہ سے دامن بھگ چکے تھے۔ پھر کسی پکارنے والے نے بلند آواز میں حاضرین خانقاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اے سلطان الہند کے گداگرو! کیا تمہیں اپنے سلطان کی نصیحت یاد نہیں رہی؟ غور کرو کہ حضرت خواجہ نے کل تم سے کیا کہا تھا؟ کیا تم نے سلطان الہند کی خانقاہ کو ماتم کدہ بنا دیا ہے؟ کیا تم پیر و مرشد کے حکم سے سرتابی نہیں کر رہے ہو؟..... لوگو! اپنے ہوش و حواس برقرار رکھو اور مخدوم کی روح کو آزار نہ پہنچاؤ۔“ اگرچہ وہ شخص اپنے ساتھیوں کی وحشت کو اعتدال میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن خود اس کا یہ حال تھا کہ زبان سے ایک ایک لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہا تھا۔ فرط جذبات سے آواز ڈوبتی جا رہی تھی اور پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

لوگوں نے اس شخص کی باتوں کو محل سے سنا۔ کچھ دیر کے لئے خانقاہ کے در و دیوار پر سناٹا چھا گیا۔ پھر عقیدت مندوں کی صف سے نکل کر ایک سوختہ عشق آگے آیا اور اس شخص کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ”تم اسے صبر کی تلقین کرتے ہو جس کی کائنات ہی ٹٹ گئی۔ اسے پیغام تعزیت دیتے ہو جس کا سرمایہ حیات چھن گیا۔ میرے سینے کی طرف دیکھو! اس میں جو کچھ تھا، جل کر خاکستر ہو گیا۔ تم جانتے ہو کہ آج تمہارے درمیان سے کون اٹھ کر چلا گیا؟ نہیں! تم نہیں جانتے۔ اگر تم اس حقیقت کو جان لو تو تمہارے دماغوں سے دھواں اٹھنے لگے اور تمہارے دل شق ہو جائیں۔ ایک رشتہ خاک میں مل جاتا تو لوگ دوسرا رشتہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک صورت زیر زمین چلی جاتی ہے تو لوگ دوسری شکل ڈھونڈ لیتے ہیں..... مگر ہم اسے کہاں تلاش کریں، کہاں ڈھونڈیں؟ اس جیسا یہاں کون ہے؟..... خدا کی قسم! کوئی نہیں۔ اس کے قدموں سے اٹھنے والے غبار کے برابر بھی کوئی نہیں۔ وہ گداگروں کا سلطان تھا، مانگنے والوں کی جھولیاں بھر دیتا تھا۔ وہ راستے میں کھو جانے والوں کا رہنما تھا۔ ایسا رہنما کہ اس نے اپنے پیچھے چلنے والوں کو راہ میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ وہ زندگی کے صحرا میں لبر کرم تھا، دل کے تاریک گوشوں میں معرفت کا آفتاب تھا اور سینکڑوں کے لئے حق کی روشن دلیل تھا۔ وہ میرا ساتھی بھی تھا، میرا آقا بھی..... وہ میرا ہم نشین بھی تھا، میرا سلطان بھی..... وہ میری عقل بھی تھا، میرا دل بھی..... وہ میری روح بھی تھا، میرا محبوب بھی..... لوگو! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا تھا؟ صد حیف! کہ اس کا رُوئے تابناک بجھ گیا اور میری آنکھوں کی بینائی باقی ہے۔ واحسرتا! کہ شاہ نے اپنے غلام کو خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ اب یہ غلام کدھر جائے؟ دیار ہند میں ایسا دوسرا شاہ کون ہے؟ اے خالق کون و مکاں! اب مجھے بھی اس زمین پر زندہ نہ چھوڑ کہ سلطان کے بغیر غلام کا سر دوش ہستی پر ایک بار گراں ہے۔ اے خدا! میرے اس بوجھ کو ہلکا کر دے۔ اے عزیز و جلیل! اس آتش فراق کو بجھا دے کہ اب یہ جاں سوختہ مزید جلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔“ یہ کہہ کر اس مرد قلندر نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور ہجوم سے گزرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ لوگ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ وہ بار بار آسمان کی طرف رخ کر کے چیختا تھا۔ ”اے خدا! تیری پناہ۔ اے خدا! تیری پناہ۔“ یہ قلندر و مجذوب حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا مرید بھی تھا اور جاں نثار بھی۔ وہ سلطان الہند کی محبت میں اس قدر غرق ہو چکا تھا کہ اسے گرد و پیش تو کیا، اپنی جان کی بھی خبر نہیں تھی۔ آج جب اُسے یہ جاں گداز اطلاع ملی تو وہ گریہ و زاری کرتا ہوا خانقاہ تک آیا اور اپنی محبتوں کا مرثیہ پڑھ کر چلا گیا۔

قلندر کا حضرت سلطان الہندؒ کی ذات سے اظہارِ عقیدت اتنا پُر سوز تھا کہ وہ لوگ بھی ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے جواب تک نہایت صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پھر اس سیل جذبات کا شور کچھ کم ہوا تو مریدانِ خاص آگے بڑھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جسم مبارک پر وہ چادر ڈالنا چاہی جسے آپؒ اکثر استعمال فرماتے تھے۔ اچانک ایک خدمت گار کی نظر سلطان الہندؒ کی پیشانی پر گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اس نے ڈرتے ڈرتے دوسرے خادم کو اس طرف متوجہ کیا۔ دوسرے خدمت گار نے بھی حضرت خواجہؒ کے ماتھے کی طرف دیکھا اور وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر جس قدر بھی خدام حجرے میں موجود تھے، سب نے حضرت سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک کو دیکھا اور ہر شخص ایک ہی کیفیت سے دوچار ہوا۔ تمام خدمت گار اپنی جگہ ساکت تھے اور حضرت خواجہؒ کے جاہ و جلال سے ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ زندگی میں بھی کبھی کسی انسان کی یہ جرأت نہیں تھی کہ سلطان الہندؒ کو آنکھ بھر کے دیکھ سکے..... اور اب وصال کے بعد بھی لوگوں کی نگاہیں اس مردِ حق کے رعب و جلال سے جھکی جاتی تھیں..... مگر جس چیز نے خدمت گاروں کو اپنی اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا، وہ سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک پر لکھی ہوئی تحریر تھی۔

جب خدمت گار دروازہ توڑ کر حجرے میں داخل ہوئے تھے، اس وقت شدتِ غم کے سبب کسی کو ہوش نہیں رہا تھا اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ماتھے پر لکھی ہوئی روشن عبارت کو نہیں پڑھ سکے تھے۔ اب جو ہیجانی کیفیت کچھ کم ہوئی تو دیکھنے والوں نے قدرت کی یہ عجیب و غریب نشانی دیکھی۔ حضرت سلطان الہندؒ کی پیشانی مبارک پر واضح حروف میں تحریر تھا۔

”حبیب اللہ مات فی حب اللہ“

(اللہ کے دوست نے اللہ کی محبت میں وفات پائی)

بعض مؤرخین کی روایت ہے کہ یہ عبارت سنہری حروف میں تحریر تھی۔ کچھ تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ عبارت کا رنگ گہرا سبز تھا۔ صدیوں کے فرق سے روایتوں میں بھی تبدیلی آسکتی ہے اور پھر اس طرح رنگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو سکتا ہے..... مگر تمام معتبر راوی اس بات پر متفق ہیں کہ وصال کے بعد جب لوگوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ مبارک دیکھا تھا تو آپؒ کی پیشانی پر یہ تحریر موجود تھی۔

نامور صوفی امیر خورڈ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔ موصوف نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وفات کے ایک سو پچیس سال بعد اپنی مشہور کتاب ”سید الاولیاء“ تصنیف کی۔ یہ ہندوستان میں تصوف کے موضوع پر پہلی مستند اور جامع کتاب ہے۔ ”سید الاولیاء“ میں خاندانِ چشت کے حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ امیر خورڈ جیسے معتبر بزرگ نے بھی اپنے اس تذکرہ صوفیاء میں یہی روایت بیان کی ہے کہ انتقال کے بعد حضرت سلطان الہندؒ کی کشادہ اور بلند پیشانی پر یہ عبارت تحریر تھی۔

”اللہ کے دوست نے اللہ کی محبت میں وفات پائی۔“

مغل شہزادے دارا شکوہ نے بھی اپنی مشہور تصنیف ”سفینۃ الاولیاء“ میں حرف بہ حرف یہی عبارت درج کی ہے۔ اس کے بعد سے آج تک جتنے بھی مستند تذکرہ نگار گزرے ہیں، ان سب نے اسی روایت کو معتبر قرار دیا ہے۔ کچھ بزرگوں کا کہنا ہے کہ حضرت سلطان الہندؒ کے وصال کے بعد آپؐ کی پیشانی پر اس عبارت کا روشن ہونا قدرتِ خداوندی کی ایک دلیل ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے بھی ایک سبق تھا جو سلطان الہندؒ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ قدرت نہیں چاہتی تھی کہ اس کا دوست عام انداز میں دنیا سے رخصت ہو۔ انجام کار جب یہ نشانی ظاہر ہوئی تو وہ علماء جو اپنے رسمی علم کے نشے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ولایت کو جھٹلا رہے تھے، حیران رہ گئے۔ مجبوراً انہیں بھی اعتراف کرنا پڑا کہ ”حضرت خواجہ اجمیریؒ اللہ کے دوست تھے۔“

بعض حضرات جوشِ عقیدت میں اس واقعے کو سلطان الہندؒ کی سب سے بڑی کرامت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اندازِ فکر درست نہیں۔ کرامت اسے کہتے ہیں کہ جو کسی مردِ خدا کے عمل سے ظاہر ہو۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپؐ کا ظاہری عمل بھی ختم ہو گیا۔ اب یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ اس نے حضرت خواجہؒ کی پیشانی پر ایک خاص علامت کو ابھار دیا..... اور اہل دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ابھی ہمارا جو بندہ تمہارے درمیان سے اٹھ گیا ہے، وہ عام انسان نہیں ہے، ہمارا دوست ہے۔ اس نے ساری زندگی ہم سے محبت کی۔ یہاں تک کہ ہماری محبت میں اسے موت آگئی۔ دراصل یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کرامت نہیں بلکہ آپؐ کی بزرگانہ عظمت پر اللہ کی گواہی تھی۔ یہاں ہم دوسرے ممالک کے صوفیائے کرام کے بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ ان کی موت کے بعد کیا کیا خاص واقعات پیش آئے لیکن جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے، ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زندگی منفرد تھی اسی طرح آپؐ کی موت بھی دوسرے بزرگوں سے جداگانہ تھی۔

”اللہ کے دوست کو اللہ کی محبت میں موت آگئی۔“ یہ بہت بڑی بات ہے اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

”سید الاولیاء“ میں امیر خورڈہی کی روایت ہے کہ جس رات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ وفات پانے والے تھے، اسی شب چند بزرگوں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے۔

”اللہ کا دوست معین الدین آ رہا ہے۔ ہم اسی کے استقبال کے لئے آئے ہیں۔“

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کوئی ذمہ دار مسلمان اپنے خواب کو غلط طور پر سرور کو نہیں ﷺ سے منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ قول مقدس مشہور ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا، فی الحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ شیطان ہرگز میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔“ اس حدیث کی روشنی میں جن بزرگوں نے سرور کو نہیں ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا، وہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ کوئی وسوسہ، کوئی اندیشہ یا کوئی خیال پریشان نہیں تھا۔ پھر ساری دنیا نے اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جو کچھ رسول عربی ﷺ نے فرمایا تھا، وہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیشانی پر روشن تھا۔

جب اہل اجمیر کو سلطان الہندؒ کے انتقال کی خبر ہوئی تو پورے شہر میں صف ماتم بچھ گئی۔ کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ ہر شخص اس طرح اُداس تھا جیسے اس کا قریب ترین عزیز بچھڑ گیا ہو۔ مسلمانوں کے غم کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت خواجہؒ کے وصال کی خبر نے اہل ہنود تک کو سوگوار بنا دیا تھا۔ بت پرست ہونے کے باوجود وہ سلطان الہندؒ کے اخلاق عالیہ سے اس قدر متاثر تھے کہ جب انہیں حضرت خواجہؒ کے دنیا سے گزر جانے کی اطلاع ملی تو بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر سلطان الہندؒ کی باتیں یاد آئیں تو پتھر کے پجاریوں کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ اب وہ قطار در قطار حضرت خواجہؒ کی خانقاہ کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ اس مردِ جلیل کا آخری دیدار کر سکیں۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیشانی مبارک پر جو تحریر روشن تھی، اس سے ہندو راجپوتوں نے عجیب تاثر قبول کیا۔ نتیجتاً جو لوگ سلطان الہندؒ کی زندگی میں مسلمان نہیں ہو سکے تھے، ان میں سے بے شمار افراد نے آپؒ کی وفات کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔

آخر اہل دل کے لئے وہ سنگین ساعت آ پہنچی، جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو کفن پہنایا گیا۔ تمام مریدوں، خدمت گاروں، عقیدت مندوں اور اہل اجمیر کا برا حال تھا۔ جس ذاتِ گرامی نے پچاس سال تک گمراہوں کی رہنمائی کی، تاریک دلوں کو ایمان و عقائد کی روشنی بخشی، بیمار روحوں کی مسیحائی کی، مفلسوں کو تو نگری کا درس دیا، محتاجوں کو فقر و قناعت اور غیرت و خودی کی تعلیم دی، آج وہی عظیم و جلیل شخصیت دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔

جب سلطان الہندؒ کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو لوگوں کے جذبات ایک بار پھر بے قابو ہو گئے۔ جو آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی تھیں، ان میں ایک بار پھر سیلاب سا آ گیا۔ حضرت خواجہؒ کے بعض مرید اور عقیدت مند جو اس کرب ناک فضا میں صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے، گریہ و زاری کرنے والوں کو سمجھاتے رہے لیکن آج کوئی ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک انسانی ہجوم سے گزرتا ہوا وہی جاں سوز عشق پھر نمودار ہوا۔

”لوگو! ٹھہر جاؤ۔ یہ غلام تو اپنے شاہ کا چہرہ دیکھ لے۔“ اس مردِ قلندر کی آواز بڑی پرسوز تھی۔ پورا مجمع ساکت ہو کر رہ گیا۔ ”میرے سلطان کو کہاں لے جا رہے ہو؟ کیا اس کے بعد یہ سلطنت تباہ نہیں ہو جائے گی؟ اگر تم آفتابِ معرفت کو زیرِ خاک اُتار دو گے تو کیا تمہارے مکان تاریک نہیں ہو جائیں گے؟“ قلندر ہوش و خرد کے تمام آداب سے بظاہر بے گانہ نظر آتا تھا مگر اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ بڑا معنی خیز تھا۔ اس کی باتیں سن کر ہجوم کی کیفیت اور بھی دگرگوں ہوتی جا رہی تھی..... مگر رسمِ فنا تو اسی کا نام ہے۔ بڑے بڑے انبیائے کرام بھی اسی راستے سے گزر گئے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو بھی خاک کے بستر پر لٹا دیا گیا تھا تو پھر اسی مردِ قلندر کی خواہش پر سلطان الہندؒ کے چہرے سے کفن ہٹایا گیا۔ جو لوگ قبر مبارک کے گرد جمع تھے انہوں نے حضرت خواجہؒ کے چہرے سے کفن ہٹتے

ہی ایک ایسی تیز روشنی دیکھی جس سے پوری قبر میں اُجالا پھیل گیا تھا۔ قلندر نے بھی اپنے سلطان کا آخری دیدار کیا۔ چند لمحوں تک بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنے شاہ کا چہرہ دیکھتا رہا پھر ایک جگر خراش چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر قبر کے قریب ہی زمین پر گر گیا۔ کچھ لوگوں نے قلندر کو اٹھا کر ایک طرف لٹا دیا اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ مہر منیر لحد کے اندھیروں میں روپوش ہو گیا اور پورا قبرستان اس آیت قرآنی سے گونجنے لگا۔

”خاک سے پیدا کئے گئے، خاک میں ملا دیئے گئے اور پھر خاک ہی سے اٹھائے جائیں گے۔“ (ترجمہ)

کئی ماہ تک پورے اجمیر پر گورستان کا سناٹا طاری رہا۔ کیا مسلمان، کیا کافر، ہر شخص کے اُداس چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی عزیز ترین شے گم ہو گئی ہو اور وہ اسے دیوانہ وار ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔ بہت دن تک قبر مبارک پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہا۔ اجمیر کے گرد و نواح اور دوسرے شہروں سے طویل مسافت طے کر کے لوگ آتے رہے۔ دعاؤں اور آنسوؤں کی صورت میں اپنے سلطان کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے رہے۔ پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ لوگوں کے چہرے تو اب بھی اُداس تھے مگر جذبات غم میں پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔

مگر وہ مرد قلندر آج بھی اسی طرح سو گوار تھا۔ جب بھی کوئی خدمت گار یا عقیدت مند، فاتحہ خوانی کے لئے حضرت خواجہؒ کی قبر مبارک پر جاتا، وہ قلندر وہاں موجود ہوتا۔ نہ اسے طوفانی بارش متاثر کرتی، نہ تپتی ہوئی دھوپ اور نہ خون کو منجمد کرنے والی طوفانی ہوائیں۔ وہ موسم کی ہر سختی سے بے نیاز، حضرت سلطان الہندؒ کے مرقد پر بیٹھا رہتا۔ لوگ حیرت سے اسے دیکھتے اور چلے جاتے۔ جو واقف حال تھے، انہیں قلندر کے مزاج کی تبدیلی پر شدید حیرت تھی۔ وہ اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ یہ سلطان الہندؒ سے عشق کی انتہا تھی کہ قلندر ایک بار اپنے آقا کی قبر پر آ کر بیٹھا تو پھر مر کر ہی اٹھا۔



جن لوگوں نے فلسفہ، منطق اور سائنس کے نامعتبر حوالوں سے اپنے دماغوں کو سجا رکھا ہے انہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اجمیر میں آمد اور ”فتح مبین“ تک تمام واقعات پر فراخ دلی سے غور کرنا چاہئے۔ پھر انہیں خدا کے وجود پر بھی یقین آ جائے گا اور حضرت خواجہؒ کے سلطان الہند ہونے میں بھی کوئی شک باقی نہیں رہے گا۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر یہی تو دعویٰ کیا ہے کہ:

”اگر تم مومن ہو تو کفار کی کثرت کے باوجود تم ہی غالب رہو گے۔“ (ترجمہ)

جو لوگ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر اس آیت مقدسہ کی عملی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں، انہیں غیر جانبداری کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اگر خداوند ذوالجلال اپنی لازوال قوت و جبروت کے ساتھ حضرت خواجہؒ کی پشت پناہی نہ کرتا تو سیستان کا یہ بے سرو سامان درویش اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا؟ یہی خدا کے وجود کی دلیل ہے کہ لاکھوں مسلح

راجپوت مل کر بھی حضرت خواجہ کو پیغام حق سنانے سے باز نہ رکھ سکے۔ قتل کرنا چاہا تو خود ہلاک ہو گئے۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا؟ کیا اب بھی اہل زمین کو کسی دوسری نشانی کی ضرورت ہے؟ بے شک! حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ عظیم و جلیل مومن تھے۔ اس لئے لاکھوں کفار پر تنہا غالب رہے۔ آپؒ نے منکرین کے سب سے مضبوط قلعے کو ایک ضرب ”لا الہ“ سے مسمار کیا۔ پھر اقلیم کفر کے فاتح قرار پائے۔ آپؒ کی فتح عجیب تھی۔ آپؒ سکندر، چنگیز یا تیمور کی قبیل کے فاتح نہیں تھے۔ آپؒ کا طریقہ جنگ بھی مختلف تھا اور فتح کا انداز بھی جداگانہ۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

اجمیر اسی فاتح کی آخری آرام گاہ بھی ہے اور زندہ یادگار بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان پر آٹھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اس لئے حضرت سلطان الہندؒ کا روضہ مبارک بھی دل و نظر کا مرکز بنا رہا۔ ہم کچھ دیر کے لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ مسلم دور اقتدار کے سبب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ کی ظاہری زینت و آرائش کا کام جاری رہا اور بے شمار لوگ ہندوستان کے گوشے گوشے سے سمٹ کر اپنے روحانی پیشوا کی زیارت کو حاضر ہوتے رہے..... مگر 1947ء کے بعد تو مسلمان ہر شعبہ حیات میں بے اثر ہو گئے اور کلمہ گویوں کی جو چند ریاستیں تھیں وہ بھی جمہوریہ ہند میں ضم ہو گئیں۔ لاکھوں مسلمان تارک راہوں میں مارے گئے اور کوئی ایک کروڑ کے قریب پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس اعتبار سے سلطان الہندؒ کے دربار میں سلام عقیدت پیش کرنے والوں کی تعداد بھی کم ہونی چاہئے تھی..... مگر ہم دیکھتے ہیں کہ زائرین کے ہجوم میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

محفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اگر سلطان الہندؒ کے حضور آنے والوں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو یقیناً ان میں ایسے لاکھوں ہندو شامل ہو گئے جو اپنے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر در خواجہؒ پر آتے ہیں اور ایک مسلمان درویش کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان پر کوئی جبر نہیں، کوئی ظلم نہیں۔ بس ایک عقیدت کی لہر ہے جو انہیں ان کے گھروں سے نکال کر سلطان الہندؒ کے دربار تک لے آتی ہے۔

ہندو زائرین میں محض تو ہم پرست اور جاہل ہی نہیں ہوتے، ان میں بے شمار لوگ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں بلکہ انہیں اپنی تاریخ سے بھی بھرپور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ انہیں گردش روز و شب کا یہ راز معلوم ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کا اشارہ پا کر شہاب الدین غوری نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور آپؒ ہی کی دعاؤں سے افغان سپہ سالار کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔ ہر چند کہ ہندو زائرین کے سینوں میں تعصب کی دبی دبی چنگاریاں بھی موجود ہوتی ہیں لیکن وہ سلطان الہندؒ کے دربار میں آ کر فرقہ پرستی کی صدیوں پرانی رسموں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اگرچہ پرتھوی راج چوہان ہندو قوم پرستوں کا عظیم ہیرو ہے لیکن سلطان الہندؒ کی مملکت کے حصار میں داخل ہونے کے بعد کسی بت پرست کو اس کا احساس پک نہیں رہا کہ پرتھوی راج کون تھا؟ اس کے محلات کی بنیادیں کہاں

تھیں؟ رام راج کے نام لیواؤں کا دربار کہاں آراستہ ہوتا تھا..... اور وہ بہادر و شجاع راجپوت جن کے تذکروں سے ہندو تہذیب کی داستانیں روشن تھیں، یکا یک کہاں غائب ہو گئے؟ نہ ان کی کوئی یادگار ہے نہ سادھی، لاکھوں جسیم اور مسلح افراد کو زمین نے کس طرح نگل لیا؟ ایسے بے شمار سوالات ہیں جو ہندو زائرین کے ذہنوں میں ابھر سکتے ہیں..... مگر یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا جاہ و جلال ہے کہ بت پرست اپنے ماضی سے بے نیاز ہو کر اس مردِ جلیل کی بارگاہ میں سر جھکا دیتے ہیں جہاں تارک الدنیا سادھو اور جوگی بھی دست بستہ کھڑے رہنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا شرف سمجھتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غیر مسلموں کے قافلے اجمیر آتے ہیں لیکن وہ ایک بار بھی پرتھوی راج چوہان یا دوسرے ہندو حکمرانوں کو یاد نہیں کرتے۔ یہی بت پرست فرطِ عقیدت میں مزارِ خواجہؒ پر شمعیں روشن کرتے ہیں، تازہ شاداب گلابوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔ آستانہ سلطان الہندؒ کی خاک اٹھا کر اپنی پیشانیوں پر ملتے ہیں اور جب انہیں حاضری کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے تو اس طرح اُلٹے قدموں لرزاں و ترساں واپس جاتے ہیں جیسے کوئی زندہ شہنشاہ ان کی حرکات و سکنات کا نگران ہو۔

مزارِ خواجہؒ سے کچھ فاصلے پر تارا گڑھ پہاڑ ہے۔ اسی پہاڑ کی چوٹی پر راجپوت فرمانروا پرتھوی راج چوہان کا مضبوط ترین قلعہ تھا..... اور آج اسی قلعے کے عین قلب میں حضرت سید حسین مشہدیؒ (خنک سوار) کا مزار مبارک ہے۔ حضرت سید حسینؒ راجپوتوں سے ایک معرکہ آرائی کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ بے شک! اس مردِ خدا کو ظاہری موت آگئی مگر وہ آج بھی اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ ہندو زائرین حضرت سید حسین مشہدیؒ کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے تارا گڑھ بھی جاتے ہیں۔ وہ منظر کیسا عجیب ہوتا ہے کہ پتھر کے پجاری اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ایک مسلمان بزرگ کی بارگاہ میں مسلسل دعائیں مانگتے رہتے ہیں اور انہیں ایک لمحے کے لئے بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں کبھی پرتھوی راج اپنی تمام تر ہیبت و قوت کے ساتھ تخت نشین تھا۔ یہ کیسی زندگی ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت سید حسین مشہدیؒ کو حاصل ہوئی اور یہ کیسی موت ہے جس سے پرتھوی راج چوہان اور اس کے پیش رو حکمران دوچار ہوئے۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس میں قدرت کی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔

اجمیر میں ایک حضرت سلطان الہندؒ کا دربار ہے جو عقیدت مندوں اور غلاموں سے کسی موسم میں خالی نہیں رہتا..... دوسری طرف اسی شہر میں پرتھوی راج اور دیگر ہندو فرمانرواؤں کے زیر زمین مقبرے ہیں جہاں کبھی کوئی ہندو نہیں آتا۔ کوئی فرقہ پرست اپنے نامور ہیرو کی سادھی تعمیر نہیں کراتا..... اور کوئی ان سورماؤں کا نام لے کر نہیں پکارتا جن کے پاس مادی طور پر بڑے وسائل و اسباب تھے۔ ایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا آستانہ عالیہ ہے جہاں ہمہ وقت نورِ الہی کی بارش ہوتی رہتی ہے، شب و روز عود و عنبر کی خوشبوئیں سلکتی رہتی ہیں اور فضائیں آیاتِ قرآنی کے ابدی آہنگ سے گونجتی رہتی ہیں۔ اسی مقام پر راجپوت حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے بے نام و نشان عبرت کدے ہیں جہاں غلاظت و کثافت ہمیشہ

کے لئے مسلط کر دی گئی ہے۔ جہاں ہجوم شغالاں (گیدڑ) اور گروہ سگاں اپنی کریمہ آوازوں میں دن رات چیخا رہتا ہے اور جہاں ویرانی رقص کنناں اور بے کسی مرثیہ خواں ہے۔ کیا لوگوں کو اب بھی عقل نہیں آتی؟

یوم نوبت می زند جو گنبد افراسیاب
(اٹو شہنشاہ افراسیاب کے گنبد پر بیٹھا ہوا شور مچا رہتا ہے)

یہی اہل دنیا ہیں اور ان سے اسی قسم کا وعدہ کیا گیا تھا۔

جن لوگوں کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ سلطان الہندؒ کا روحانی دربار کیا ہے؟ وہاں کیسے کیسے اکابر سر جھکائے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور کتنی دیر تک گریہ و زاری کے ساتھ حال دل بیان کرتے رہتے ہیں۔ کسی مجبوری کے سبب جن لوگوں کو یہ سعادت حاصل نہیں ہو سکی ہے، انہیں ہم تصوراتی طور پر دیارِ خواجہ غریب نوازؒ میں لئے چلتے ہیں۔ اگرچہ اہل طلب کے لئے یہ خیالی منظر کشی نا کافی ہوگی لیکن پھر بھی کسی حد تک دل و نظر کے یہ فاصلے کم ہو جائیں گے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فوراً بعد کس شخص نے روضہ مبارک کی عمارت تعمیر کرائی۔ غیاث الدین خلجیؒ کے دور میں ایک بزرگ حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ گزرے ہیں۔ آپؒ نے 938ھ کے آخر میں سلطان الہندؒ کے دربار مبارک کی تعمیر کا آغاز کیا اور پھر 939ھ میں یہ منصوبہ تکمیل تک پہنچا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تین سو سال تک خواجہؒ کی قبر مبارک یا تو غیر پختہ رہی یا پھر کچھ حصہ پختہ کر دیا گیا ہوگا۔ ویسے باقاعدہ تعمیر کا کام حضرت حسین ناگوریؒ کی نگرانی میں شروع ہوا۔ خواجہ حسین ناگوریؒ، سلطان الہندؒ کے مشہور خلیفہ صوفی حمید الدین ناگوریؒ (سوالی) کی اولاد میں سے تھے اور آپؒ کا شمار سلسلہ چشتیہ کے نامور بزرگوں میں ہوتا ہے۔ خواجہ حسین ناگوریؒ کو حضرت سلطان الہندؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ آپؒ اکثر بڑے حسرت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے۔

”میرے روحانی پیشوا کو ظاہری زینت و آرائش کی ضرورت نہیں مگر پھر بھی آنے والوں کو اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں سلطان الہندؒ آرام فرما ہیں۔“

ان الفاظ سے حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ کی دلی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر ایک طویل عرصے تک آپؒ کی یہ خواہش تکمیل نہ پاسکی۔ اس وقت اجمیر کی صورت حال یہ تھی کہ حضرت سلطان الہندؒ کی قبر مبارک کے آس پاس ایک گھنا جنگل موجود تھا۔ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد اجمیر کی کوئی سیاسی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ تین سو سال تک بے التفاتی کے سبب اس علاقے میں بے شمار خود رو درخت اُگ آئے تھے۔ پھر جھاڑیوں اور پودوں کا یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ایک جنگل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ گرد و نواح کے درندوں نے ان گھنے پیڑوں کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ دن کے وقت بھی وہاں گہری تاریکی چھائی رہتی تھی۔

حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ نے اس خوفناک فضا میں بھی سلطان الہندؒ کی قبر مبارک سے علیحدہ ہونا گوارا نہیں کیا۔ آپؒ ہمہ وقت مرقد خواجہؒ پر حاضر رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ کبھی آپؒ کا کوئی عزیز یا دوست اس پُر ہول ویرانے کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔
 ”حسین! تمہیں ان جنگلی درندوں کے درمیان ڈر نہیں لگتا؟“

حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ دوستوں کے اس اندیشہ خوف پر مسکرا نے لگتے۔ ”جس ذات پاک نے حسین ناگوریؒ کو پیدا کیا ہے وہی ان درندوں کا بھی خالق ہے۔ پھر اس مخلوق سے کیا ڈرنا جس کی حرکات و سکنات اللہ کے حکم کے تابع ہوں۔ ویسے یہ درندے بھی سلطان الہندؒ کے خدمت گار ہیں۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جوش عقیدت انہیں بھی سلطان الہندؒ کے دربار میں کھینچ لاتا ہے۔“

یہ حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ کا بیان کردہ کوئی افسانہ نہیں تھا۔ فی الواقع اکثر شیر جیسے درندے بھی سلطان الہندؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے یہ عجیب و غریب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کی روایت کے مطابق شیر اپنے ٹھکانوں سے نکل کر، سر جھکائے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر مبارک کی طرف آتے تھے اور پھر مرقد کے نزدیک پہنچ کر اس طرح اپنی گردنیں جھکا دیا کرتے تھے جیسے عقیدت مندوں کی کوئی جماعت سلطان الہندؒ کے روبرو بصد ادب و احترام حاضر ہو۔ یہ خونی درندے ایک مخصوص صف بندی کے ساتھ کچھ دیر تک سلطان الہندؒ کے پاس کھڑے رہتے تھے اور پھر حضرت خواجہؒ کو نذر عقیدت پیش کر کے خاموشی سے واپس چلے جاتے تھے۔

پھر تین سو سال بعد 938ھ کے آخر میں غیاث الدین خلجی نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے سلطان الہندؒ کے دربار میں حاضر ہوا تو اس کی ملاقات حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ سے ہوئی جو اس خوفناک جنگل میں قیام پذیر تھے۔ غیاث الدین خلجی، حضرت خواجہ حسینؒ کی اس بے مثال محبت سے بہت متاثر ہوا۔ گفتگو کے دوران ایک موقع پر خلجی نے حضرت خواجہ حسینؒ سے کہا۔

”بزرگ! میری دلی خواہش ہے کہ آپ مجھے کسی خدمت کا موقع دیں۔“

حضرت خواجہ حسینؒ اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی غیاث الدین خلجی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، آپؒ نے فرمایا۔ ”اللہ سلطان کو حسن نیت کا صلہ دے۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ نے میری خبر گیری کی۔“

جب خلجی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت خواجہ حسین ناگوریؒ نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ”درویش اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہے مگر پھر بھی اپنے دل میں یہ خواہش رکھتا ہے کہ کوئی بندہ خدا اس طرف آئے اور عقیدت کے ساتھ سلطان الہندؒ کا روضہ مبارک تعمیر کرے۔“

غیاث الدین خلجی بھی اس بات کا منتظر تھا۔ اس نے حضرت حسین ناگوریؒ کے ایماء پر سلطان الہندؒ کے مزار مبارک کی تعمیر کا حکم جاری کر دیا۔ یہ کار نیک تقریباً ایک سال تک جاری رہا اور پھر 939ھ میں

حضرت سلطان الہند کے روضے کی تکمیل ہوئی۔

1025ھ میں مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر انتہائی عقیدت کے ساتھ آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا تھا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی قبر مبارک کے گرد ایک احاطہ تعمیر کرایا تھا جو تمام تر خالص سونے سے آراستہ تھا۔

اس احاطے سے دو تین فٹ کے فاصلے پر دوسرا احاطہ ہے جسے ریاست جے پور کے حکمران راجہ اے سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔

سلطان الہند کے مزار مبارک کا فرش قیمتی سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ گنبد مبارک کے دو دروازے ہیں اور دائیں بائیں دو حجرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایک دروازے میں وہ کواڑ نصب کئے گئے ہیں جو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر چتوڑ سے لایا تھا۔ ان کواڑوں پر یہ شعر کندہ ہے۔

رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ

بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ کے تین بڑے احاطے ہیں۔ پہلے احاطے میں نقار خانہ عثمانی، نقار خانہ شاہ جہانی اور اکبری مسجد واقع ہیں۔ نقار خانہ عثمانی کو حیدر آباد کن کے نواب میر عثمان علی خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے دروازے پر ایک خوبصورت بارہ دری موجود ہے۔ اندر نوبت خانہ ہے جہاں دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجتی ہے۔ نقار خانہ شاہ جہانی 1045ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ دلکش عمارت مغل شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں کے جوش عقیدت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دروازہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔

اکبر مسجد مغل حکمران جلال الدین اکبر نے 978ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ دونوں مینار سنگ مرمر سے تیار کئے گئے ہیں جو صنائی اور نقاشی کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مسجد کے محن میں ایک حوض بھی ہے۔ دوسرے احاطے میں بلند دروازے کے علاوہ محفل خانہ، حوض شاہی اور کچھ دوسرے حجرے نظر آتے ہیں۔ بلند دروازے کی اونچائی 75 فٹ ہے۔ یہ دروازہ خلیجیوں کے عہد کی یادگار ہے جسے سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے۔

تیسرے احاطے میں مسجد صندل خانہ، بہشتی دروازہ، حجرہ بی بی حافظہ جمال اور بابا فرید گنج شکرؒ کی چلہ گاہ، حجرہ حور النساء بیگم، مزار خواجہ حسین ناگوریؒ، اولیاء مسجد اور جامع مسجد شاہ جہانی جیسی عمارتیں موجود ہیں۔

مسجد صندل خانہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے 859ھ میں سلطان محمود خلجی نے تعمیر کرایا تھا۔ کچھ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخی عبادت گاہ شہنشاہ جہانگیر نے 1610ھ میں بنوائی تھی۔ یہ مسجد حضرت سلطان الہند کے روضے کی شمالی دیوار سے ملحق ہے۔ اس مسجد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کے لئے صندل گھسا جاتا ہے اس لئے اسے مسجد صندل خانہ کہتے ہیں۔ اس مسجد کے شمال میں ایک احاطہ ہے جس میں چنبیلی کے درخت ہیں۔ روایت ہے کہ یہاں حضرت سلطان

الہند کی دونوں بیویاں محو خواب ہیں۔

مسجد صندل خانہ کے نیچے حجرہ بابا فرید الدین گنج شکر واقع ہے۔ حجرے میں دور تک تہہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ حضرت سلطان الہند کے مزار خامہ کا یہی راستہ ہے۔ حجرے کا دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ صرف پانچ محرم کو کھولا جاتا ہے۔ احاطہ نور کے مغربی دروازے کا نام بہشتی دروازہ ہے جو جامع مسجد کے عین سامنے ہے۔ یہ دروازہ بھی عام طور پر مقفل رہتا ہے۔ صرف حضرت سلطان الہند کے عرس کے زمانے میں یکم سے 6 رجب تک کھلا رہتا ہے، یا پھر اس دروازے کو عاشورہ محرم میں کھولا جاتا ہے۔ بہشتی دروازے کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ جو شخص بھی اس دروازے سے سات بار گزرے گا، وہ جنت میں جائے گا۔

اسی احاطے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی صاحبزادی بی بی حافظہ جمال کا حجرہ مبارک بھی ہے۔ اس عظیم خاتون کی قبر حضرت سلطان الہند کے روضہ مبارک کی جنوبی دیوار سے ملتی ہے۔ بی بی حافظہ جمال کے مزار کے سامنے دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ یہ حضرت خواجہ کے دو صاحبزادوں کے مرقد ہیں جو بہت کم سنی کے عالم میں وفات پا گئے تھے۔

دوسرے حجرے میں مغل فرمانروا شہاب الدین شاہ جہاں کی بڑی بیٹی حور النساء مدفون ہے۔ اس مغل خاتون کا انتقال 1025ھ میں ہوا تھا۔ حور النساء بیگم نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اسے سلطان الہند کے دربار کے کسی گوشے میں دفن کر دیا جائے۔

اسی احاطے میں سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد بھی ہے جسے ”اولیاء مسجد“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ اس مقام پر حضرت سلطان الہند نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور تاریخی روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی آمد سے پہلے یہاں ایک بت خانہ تھا۔ سلطان الہند اسی صنم خانے کے قریب اپنی مذہبی رسوم ادا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جیسے جیسے اسلام کو فروغ حاصل ہوتا گیا، حضرت خواجہ کے خدمت گاروں نے بت خانے کی چار دیواری کو منہدم کر دیا اور پتھروں کے خداؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ حضرت سلطان الہند کے زمانے میں یہ عبادت گاہ ناپختہ تھی۔ آپ کے وصال کے بعد عقیدت مندوں نے اس مسجد کو سنگ مرمر کی دلکش عمارت میں تبدیل کر دیا۔

اجمیر میں سب سے بڑی مسجد ”جامع مسجد شاہ جہانی“ ہے جو حضرت سلطان الہند کے مزار مبارک کے احاطے کے اندر واقع ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے بارے میں شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آراء لکھتی ہے۔ ”والد محترم نے اپنے جلوس شاہی کے دسویں سال 1638ء میں اس مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی یہ عبادت گاہ چودہ سال میں مکمل ہوئی۔ جمعہ اور عید کی نمازیں اسی مسجد میں ادا کی جاتی ہیں۔“

مسجد شاہ جہانی کے قریب ہی ایک حوض ہے جسے ”حوض شاہی“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ حوض ہر وقت پانی سے لبریز رہتا ہے۔ اس میں ایک فوارہ بھی موجود ہے جس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ جدید دور کی تعمیر ہے۔ حوض پر ایک سنگی بارہ دری بھی بنائی گئی ہے۔ اس کے درمیان میں مندرجہ ذیل

الفاظ کندہ کئے گئے ہیں:

”یہ عمارت حضورِ ملکہ معظمہ (کوئین ایمپریس) میری صاحبہ کے درگاہ ملاحظہ کرنے کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے۔“

اس عبارت کے ساتھ ہی 22 دسمبر 1911ء کی تاریخ درج ہے۔ روایت ہے کہ انگریز ملکہ میری نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے حضرت سلطان الہند کے دربارِ عالیہ میں حاضر ہوئی تھی۔ واپسی کے وقت اس نے درگاہ کے مجاورین سے درخواست کی تھی کہ حوضِ شاہی پر ایک بارہ دری تعمیر کی جائے۔ اس کام میں خرچ ہونے والی رقم ملکہ میری نے اپنی جیب سے ادا کی تھی۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ اس وقت کے کچھ زمانہ ساز لوگوں نے پتھر پر ایک ایسی عبارت تحریر کر دی جس سے حکومتِ برطانیہ کی خوشامد کا رنگ جھلکتا ہے۔

حضرت سلطان الہند کے مزار مبارک کے بڑے گنبد کا کلس سونے کا ہے۔ اسے ریاست رام پور کے حکمران نواب کلب علی خان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں تین من سونا استعمال کیا گیا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت سلطان الہند کے مزار مبارک کے احاطے میں کئی تاریخی عمارتیں موجود ہیں۔ اگر ان سب کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو مزید کئی صفحات درکار ہوں گے۔ ہندوستان کے بے شمار سلاطین و نوابین اور دیگر ارباب اقتدار میں سے ہر ایک کی یہ دلی خواہش تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے قربت کا کوئی نہ کوئی رشتہ قائم ہو جائے۔

اکثر صاحبانِ ثروت جو عقیدتاً مسلمان تھے، ان کی یہ آرزو تھی کہ مرنے کے بعد انہیں دیارِ خواجہؒ میں پیوندِ زمین کر دیا جائے تاکہ سلطان الہند کے طفیل ان کی قبروں پر بھی بارشِ کرم ہوتی رہے۔ تمناؤں کی پرورش انسانی فطرت ہے مگر ہر تمنا تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچتی۔ قدرت کے اس نظام کے تحت جس کے مقدر میں یہ سعادت لکھی جا چکی تھی، اسے سلطان الہند کے دربار میں دو گز زمین مل گئی۔ ورنہ..... مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی کسی نہ کسی عنوان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نتیجتاً وہ لوگ کچھ اور نہ کر سکے تو انہوں نے ایک پتھر ہی پر اپنا نام کندہ کر دیا۔

مزار مبارک کے احاطے میں دو ایسی تاریخی چیزیں ہیں جو ہمیشہ زائرین کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں، ان میں ایک بڑی دیگ ہے اور دوسری چھوٹی۔ جہانگیر نے یہ دیگ 1022ھ میں نصب کرائی تھی۔ اس میں تقریباً ساٹھ من کھانا تیار ہوتا ہے۔ بڑی دیگ کو ”دیگ کلاں“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بلند دروازے کے قریب مغربی سمت میں نصب کرائی گئی ہے۔ اس کا محیط ساڑھے تیرہ گز کے قریب ہے اور اس میں سو من چاول آسانی سے پکایا جاسکتا ہے۔ یہ دیگ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ مغل شہنشاہ چتوڑ کے راجپوتوں کی سرکشی اور بغاوت سے ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ اس وقت چتوڑ کا حکمران رانا اودے سنگھ تھا۔ چتوڑ پر حملہ کرنے سے پہلے جلال الدین اکبر فوج سمیت سلطان الہند کے مزار مبارک پر حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کے لئے دعا مانگی۔ 1567ء میں اکبر نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ چار ماہ

کے طویل محاصرے کے بعد فروری 1568ء میں اکبر کو ایک ناقابل یقین فتح حاصل ہوئی اور راجستھان کے راجپوتوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اس فتح کی خوشی میں اکبر دوبارہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوا۔ اجمیر اور گرد و نواح کے تمام لوگوں کو کھانا کھلایا اور یادگار کے طور پر ”دیگ کلاں“ تیار کروائی۔

جلال الدین اکبر جو خود اپنے زمانہ گمراہی میں خدا بن بیٹھا تھا، ایک خادم کی حیثیت سے اس کا بار بار سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک روشن کرامت ہے۔ ایک اکبر ہی پر کیا منحصر ہے، جدید ہندوستان کا سیاسی دیوتا پنڈت جواہر لال نہرو اپنے نظریات کے اعتبار سے سوشلسٹ تھا اور عقائد کے لحاظ سے منکر..... مگر وہ جب تک زندہ رہا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضر ہوتا رہا۔ سلطان الہندؒ کے عرس مبارک کی اکثر تقریبات میں پنڈت نہرو شریک ہوا کرتا تھا اور بڑی عقیدت سے پھولوں کی چادریں چڑھاتا تھا۔ ہندوستانی وزیراعظم کے رازدار حلقوں کا کہنا ہے کہ نہرو ایک ہی دعا مانگا کرتا تھا۔

”خواجہ! تمہارے حوالے سے بے شمار لوگوں کو نہ جانے کیا کیا ملا ہے مگر میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھوں۔ دنیا سے اس طرح جاؤں کہ میرے چہرے اور لباس پر شکست اور زوال کا کوئی داغ نظر نہ آئے۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب نہرو کی موت واقع ہوئی تو وہ نہ صرف بھارت کا وزیراعظم تھا بلکہ پچاس کروڑ ہندوستانیوں کا محبوب رہنما بھی۔

یہی حال مسز اندرا گاندھی کا تھا۔ ایک بار 1977ء میں مرار جی ڈیسیائی سے شکست کھائی تو سلطان الہندؒ کے دربار میں قیمتی نذریں لے کر حاضر ہوئی۔ آج بھی سرکاری کاغذات میں اس دورے کا ریکارڈ موجود ہے۔ درمیانی مدت کے انتخابات میں اندرا گاندھی نے تاریخی فتح حاصل کی جبکہ سیاسی پنڈت پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اندرا گاندھی کا دور ختم ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قدموں میں جھکا۔ اس کے آثار آج بھی موجود ہیں اور تا قیامت رہیں گے۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی، حضرت سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں خم ہوئے..... حجت پوری ہو چکی۔ کوئی کسی بھی مقصد کے لئے جھکا، اللہ نے اسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے جھکا دیا۔ ترقی پسندوں کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں۔ اگر کوئی سمجھنے کی کوشش کرے۔

جب شیخ مجیب الرحمن مغربی پاکستان میں نظر بند تھا اور اس کی رہائی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے بلکہ یحییٰ خان نے کئی بار اس کی موت کے احکام بھی جاری کر دیئے تھے۔ ایسے سنگین لمحات میں شیخ مجیب الرحمن کی بیوی نے مسز اندرا گاندھی سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت سلطان الہندؒ کے مزار پر حاضر ہونا چاہتی ہے۔ ہندوستانی وزیراعظم نے سرکاری سطح پر اس حاضری کے انتظامات کئے اور شیخ مجیب الرحمن کی بیوی بہت دیر تک حضرت خواجہؒ کے آستانے پر روتی رہی۔ پھر شیخ مجیب الرحمن کو آزاد کر دیا گیا اور وہ

بابائے بنگلہ دیش کے منصب پر فائز ہوا۔
ہندوستانی عوام کی اسی بے پناہ عقیدت کو دیکھتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے حکومت
برطانیہ کو اپنی رپورٹ میں لکھا۔

”ہندوستان پر آٹھ سو سال سے ایک قبر حکومت کر رہی ہے۔“
اور اس حکومت کے خاتمے کے کوئی آثار نہیں۔ یہ وہ حکومت ہے کہ جس کا سلسلہ قیامت کے دن
سے جڑا ہوا ہے۔ جس روز زمین پر حشر برپا ہوگا، اسی روز یہ حکومت ختم ہوگی۔
حافظ شیرازی کے بقول ۛ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما !
(جس کا دل عشق کی حرارت سے زندہ ہو جاتا ہے اسے کبھی موت نہیں آتی۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ جن
کی زندگی کی مہر تاریخ عالم پر ثبت ہے)



حضرت لال شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ

537ھ مروند (افغانستان)

ولادت

673ھ سہون (سندھ)

وفات

اسم گرامی سید عثمان..... والد محترم کا نام سید کبیر..... آپؒ کا سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے ملتا ہے۔ پیر و مرشد نے ”لال شہباز“ کا لقب عطا کیا۔ کچھ روایتوں کے مطابق آخری عمر میں آپؒ پر ”جذب و سکر“ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس لئے قلندر کہلائے۔ حضرت لال شہبازؒ نے تلاشِ علم میں مختلف علاقوں کے طویل سفر کئے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت بابا فریدؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جیسے عظیم صوفیاء سے آپؒ کی صحبتیں رہتی تھیں۔ مگر تاریخی اعتبار سے یہ روایتیں درست نہیں۔ ”برٹن ہسٹری آف سندھ“ کے مطابق آپؒ علمِ لسانیات اور صرف و نحو (قواعد) کے بہت بڑے ماہر تھے۔

یہ ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے کا واقعہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان پر اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی لیکن کچھ علاقوں میں ابھی تک ہندو حکمران برسرِ اقتدار تھے۔ زیادہ تر ہندو حاکم مسلمان بادشاہوں کے خراج گزار تھے اور انہیں سیاسی مصلحت کے طور پر برقرار رکھا گیا تھا۔ ان ہی ہندو حاکموں میں راجہ سیوستان بھی تھا۔ اس شہر کا موجودہ نام سہون ہے جو حیدر آباد (سندھ) سے اٹھاسی میل کے فاصلے پر کیرتھر کی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ اس شہر کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس وقت سہون کا حاکم راجہ جیرجی تھا جو عرف عام میں چوپٹ راجہ کے نام سے مشہور تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس راجہ کا علامتی نام ہو..... ہندی زبان میں ”اندھیرنگری چوپٹ راج“ ایک مشہور محاورہ ہے۔ چوپٹ راجہ سے مراد انتہائی نا اہل حکمران ہے جس کے عہد حکومت میں بد انتظامی، بے ایمانی اور نا انصافی حد سے گزر گئی ہو۔

اسی چوپٹ راجہ کے دورِ اقتدار میں ایک درویش نے سہون کا رخ کیا۔ پھر اس درویش نے اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ سہون کے اس محلے میں سکونت اختیار کی جہاں کی بیشتر آبادی زنانِ بازاری (طوائفوں) پر مشتمل تھی۔ درویشوں کا یہ مختصر ترین قافلہ شام کے وقت اس محلے میں داخل ہوا تھا اور ایک کھلے میدان میں ان فاقہ مست لوگوں نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔

رات بھر مختلف مکانوں سے ناچنے گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ شراب کے نشے میں بدست لوگ فجر کی اذان تک شور مچاتے رہے۔ درویش اپنے اوراد و وظائف میں مشغول رہا مگر اس کے خدمت گاروں کی نیندیں اڑ گئیں۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

”یہ کیا محلہ ہے؟ اور کیسے اس کے مکین ہیں؟“

آخر رات گزر گئی۔ پھر صبح ہوئی تو خدمت گار صورتِ حال جاننے کے لئے محلے میں پہنچے۔ گوشے گوشے میں ہندو آباد تھے۔ بس دو چار گھر مسلمانوں کے تھے۔ درویش کے خدمت گاران مسلمانوں کے پاس گئے تو صورتِ حال منکشف ہوئی۔

”بابا! آپ یہاں کہاں آ گئے؟“ سہون کے مسلمانوں نے نو وارد درویشوں سے کہا۔ ”یہ ہندوؤں کی بستی ہے اور وہ بھی گناہوں سے بھری ہوئی۔ یہاں ناچنے گانے والی عورتیں رہتی ہیں جن کی سیاہ

کاریوں نے ہماری زندگی وبال کر دی ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر میں ہمارے لئے جائے اماں ہوتی تو ہم اس جگہ کو چھوڑ کر بہت پہلے جا چکے ہوتے۔ یہ اوباشوں کی نگری ہے جہاں دن رات آسمان سے لعنت برتی رہتی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کب ہمیں اس عذابِ مسلسل سے نجات ملے گی؟“

درویش حیران و پریشان واپس لوٹ آئے۔ اپنے مرشد سے کہنے لگے۔ ”شیخ! یہاں سے جلد از جلد کوچ کر جائیں کہ یہ بستی ہمارے رہنے کے لائق نہیں ہے۔“

”آخر کیوں؟“ شیخ نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔

خدام نے تمام صورتِ حال بیان کر دی۔ ”ہم لوگ غلطی سے طوائفوں کے ایک محلے میں آ بے ہیں۔“

”غلطی سے نہیں آئے، بلکہ قصداً بھیجے گئے ہیں۔“ شیخ نے ایک خاص ادائے بے نیازی کے

ساتھ کہا۔

”شیخ! اس معصیت کدے میں تو سانس لینا بھی دشوار ہے۔“ درویش، زنانہ بازاری کی بستی میں بہت زیادہ گھٹن محسوس کر رہے تھے۔

”مسلمان کو اس لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ وہ سازگار ماحول میں اپنے روز و شب بسر کرے اور چند روزہ زندگی گزار کر واپس چلا جائے۔“ شیخ نے فرمایا۔ ”مسلمان ایک چراغ کے مثل ہے کہ جہاں تاریکی دیکھے، وہاں چلا جائے اور اپنے وجود سے ظلمتوں کو دور کر دے۔ بے شک! اس وقت ہم فاسقوں اور فاجروں کی بستی میں خیمہ زن ہیں مگر ہمارا قیام عارضی نہیں۔ یہاں درویشوں کا ڈیرا مستقل ہو گا..... اور اللہ اپنی قدرت سے اس بستی کی تمام غلاظتیں دور فرما دے گا۔ وہ پاک ہے اور وہی اپنی پاکی کے صدقے میں اس زمین کی ساری کثافتیں دھو ڈالے گا۔“

خدمت گار اپنے شیخ کے فرمودات سن کر بظاہر مطمئن ہو گئے تھے مگر وہ دلی طور پر اس کیفیت و غلیظ فضا میں عجیب سی خلش اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

دن کے اُجالے میں اہل محلہ نے اجنبی درویشوں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ لوگ ہنستے، گاتے، جھومتے، لڑکھڑاتے اور خدا پرستوں سے استہزا کرتے گزر رہے تھے۔ سورج اپنے مستقر پر گردش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اندھیرے کی آمد سے پہلے ہی یہاں گھر گھر میں چراغ جل جاتے تھے۔ عطر اور پھول بیچنے والے گلی کے موڑ پر کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ خریدارانِ بدست اپنے ظاہری و باطنی تعفن کو چھپانے کے لئے خوشبوؤں کا سہارا لے سکیں۔ برسوں سے یہی کاروبار جاری تھا..... مگر آج کی شام اچانک بازار کا رنگ بدل گیا۔

روز کا معمول تھا کہ سورج ڈوبتے ہی خاموش گلیاں جاگ اُٹھتی تھیں لیکن آج حیرت انگیز طور پر دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ عطر اور پھول بیچنے والوں نے دیکھا کہ رقص و موسیقی کے شائقین گلیوں میں داخل ہوتے تھے اور یکا یک گھبرا کر پیچھے کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ آتے وقت ان لوگوں کے چہروں پر سرمستی و سرخوشی کے آثار ہوتے تھے مگر جاتے ہوئے وحشت و سراسیمگی نمایاں ہوتی تھی۔ گل فروش انہیں

آوازیں دھتے رہ جاتے مگر وہ پلٹ کر نہ دیکھتے اور اس طرح واپس چلے جاتے کہ اب ان کے لئے بازارِ حُسن میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔

رات آئی تو اس محلے پر سکوتِ مرگ کا سا گمان گزرنے لگا۔ کہاں طلبوں، گھنگھروؤں اور آوازوں کا وہ شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی..... اور کہاں یہ خاموشی کہ اس بستی کے مکین اپنے دلوں کی دھڑکنیں بھی سن سکتے تھے۔ آخر طوائفوں کے محافظ صورتِ حال جاننے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے اور گل فروشوں سے ”سردی بازار“ کا سبب پوچھنے لگے۔

گل فروش ایک ہی جواب دیتے۔ ”آنے والے گلی تک تو آتے ہیں مگر آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ پوچھو تو جواب نہیں دیتے۔ بس خاموشی سے لوٹ جاتے ہیں۔“

گل فروشوں کا ناقابلِ فہم جواب سن کر بازارِ حُسن کے نگہبان گلیوں کے موڑ پر کھڑے ہو گئے۔ آنے والے آئے لیکن کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ نگہبانوں نے واپسی کا سبب پوچھا تو بعض لوگوں نے بس اتنا کہا۔ ”ہمیں اندر جاتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا ہے۔“

نگہبانوں نے خریداروں کو سمجھانا چاہا، حفاظت کا یقین دلایا مگر کوئی دلیل کام نہیں آئی۔ باہر کا کوئی شخص بھی گناہوں کی اس بستی میں داخل نہ ہو سکا۔

وہ رات بازار کے اصولوں کے مطابق بہت سرد گزری۔ کوئی خریدار کوچہ حُسن تک نہیں پہنچا۔ زنانِ بازاری حیران و پریشان تھیں اور اپنے محافظوں سے بار بار پوچھتی تھیں۔

”آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس بستی کے شائقین پر کیا گزری ہے کہ ان کے آشنا قدم راستہ بھول گئے ہیں۔“

محافظ کیا جواب دیتے؟ وہ خود صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

آخر اندیشوں اور پریشانیوں کے درمیان بازارِ حُسن کی وہ رات گزر گئی۔

درویشوں نے سکون کی سانس لی اور دلجمعی کے ساتھ ذکرِ حق میں مشغول ہو گئے۔ مگر انہیں حیرت ضرور تھی کہ یہ شور و شغب اچانک تھم کیسے گیا۔

دوسرے دن بھی بازارِ حُسن کا یہی حال رہا۔ لوگ گلی کے موڑ تک آتے رہے اور حالتِ خوف میں واپس جاتے رہے۔

بازار کے محافظ و نگہبان رقص و موسیقی کے شائقین سے اس کا سبب پوچھتے تو وہ ایک ہی بات کہتے۔

”کوئی غیر مرئی قوت ہے جو ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ اگر ہم اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو ہم پر شدید خوف طاری ہو جاتا ہے۔“

پھر اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ چراغوں کے ساتھ چولہے بھی بجھ گئے اور سنگین اقتصادی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

”اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو فاقہ کشی کی نوبت آ جائے گی۔“ بازارِ حُسن کے ایک رکن نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”آخر ہم لوگ اس صورتِ حال سے کیوں دوچار ہوئے؟“ دوسرے شخص نے سوال کیا۔ ”آنے والوں پر کوئی جبر نہیں، کوئی پابندی نہیں، پھر وہ یہاں کیوں نہیں آتے؟ ان کے پیروں میں کس نے زنجیریں ڈالی ہیں اور انہیں یہاں آنے سے کون روکتا ہے؟“ اس شخص نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے تھے۔

بہت غور و فکر کے بعد اس کوچے کے لوگ اس نتیجے پر پہنچ گئے۔ ”جب سے یہ گدڑی پوش مسلمان یہاں آئے ہیں، اسی روز سے بازار کے درو دیوار پر سناٹا پھیل گیا ہے۔“ اس بستی کے مکینوں کی سمجھ میں بات آگئی۔ پھر طویل مشورے کے بعد طے پایا کہ ان گدڑی پوشوں سے بات کی جائے۔ نتیجتاً بازار کے چند جہاندیدہ افراد گدڑی پوشوں کے خیمے میں پہنچے اور سخت لہجے میں پوچھنے لگے۔

”تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

”ہم اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی زمین پر مقیم ہیں۔“ گدڑی پوش درویش نے بے نیازانہ کہا۔ ”یہ ہمارے دیوتاؤں کی زمین ہے۔“ بازارِ حُسن کے محافظ نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ اپنے ڈیرے اٹھاؤ اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔“

”ہم اپنے شیخ کے حکم کے پابند ہیں۔“ گدڑی پوش فقیر نے جواب دیا۔ ”اگر شیخ فرمائیں گے تو ہم لوگ کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”تمہارا شیخ کون ہے؟“ بازار کے محافظ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

گدڑی پوش خادم نے ایک خیمے کی طرف اشارہ کر دیا۔

بازارِ حُسن کے نگہبان، شیخ کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر غصے کے آثار تھے اور چلنے کا انداز جارحانہ تھا..... مگر جب وہ بدکار لوگ شیخ کے روبرو پہنچے تو ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ اپنی قوتِ گویائی کھو بیٹھے۔

”تم لوگ کیوں آئے ہو؟“ شیخ نے پوچھا۔

بستی کے مکین مسلمان گدڑی پوشوں کو اپنے محلے سے نکالنے آئے تھے مگر جب شیخ نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا تو وہ اپنی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکال سکے۔ یہاں تک کہ گنگ زبانوں اور کانپتے قدموں سے واپس چلے گئے۔

پھر طے پایا کہ طوائفین خود گدڑی پوش شیخ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے عاجزانہ لہجے میں درخواست کریں۔ آخر تمام زنانِ بازاری، شیخ کے خیمے میں پہنچیں اور گریہ و زاری کے انداز میں کہنے لگیں۔

”ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں اور کس مقصد سے یہاں آئے ہیں..... مگر اتنا ضرور ہے کہ آپ کی وجہ سے ہمارا کاروبار ختم ہو گیا ہے۔“

”روکنا تو درکنار، ہم نے کسی سے کچھ کہا تک نہیں۔“ شیخ نے طوائفوں کو مخاطب کرتے ہوئے

فرمایا۔ ”اگر تم گناہوں کی تجارت قائم رکھنا چاہتی ہو تو شوق سے جاری رکھو۔ ہمیں تمہارے معمولات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

سہون کی بازاری عورتیں شیخ کے مفہوم کو سمجھ نہ سکیں اور خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ گم کردہ راہ خریدار اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ آئیں گے..... مگر کئی دن گزر جانے کے بعد بھی حسن و شباب کی منزلوں کا کوئی مسافر لوٹ کر نہیں آیا۔

طوائفیں دوبارہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ”شہر آرزو“ کی بربادی پر ماتم کرنے لگیں۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ جب تک آپ یہاں موجود ہیں، ان کے قدم اس کوچے کی طرف نہیں اٹھ سکتے۔“

”پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ گدڑی پوش شیخ نے رنان بازاری سے پوچھا۔

”براہ کرم آپ یہاں سے چلے جائیں تاکہ ہمارے ویران گھروں کا اندھیرا دور ہو جائے۔“

طوائفوں نے عرض کیا۔ ”جب تک آپ یہاں موجود ہیں، کسی مکان میں کوئی چراغ نہیں جلے گا۔“

”مجبوری ہے، ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جاسکتے۔“ شیخ نے فرمایا۔ ”اس مقام پر ہماری آخری آرام گاہ تعمیر ہوگی۔ اگر ہمارا وجود تمہارے کاروبار میں حارج ہے تو پھر تم لوگ کہیں اور چلے جاؤ۔“

”ہم تو مجبور عورتیں ہیں مگر ہمارا حاکم راجہ جیر جی بہت طاقتور ہے۔ وہ تمہیں چین سے رہنے نہیں دے گا۔“ طوائفیں مسلمان درویش کو دھمکی دے کر چلی گئیں۔

گدڑی پوش درویش فاحشہ عورت کی اس دھمکی پر مسکرا کر رہ گیا۔



پھر وہ طوائفیں حاکم سہون راجہ جیر جی کے دربار میں پہنچ کر فریاد کرنے لگیں۔ ”ہمیں ایک مسلمان کے ظلم و ستم سے نجات دلانی جائے۔“

راجہ جیر جی نے پورا واقعہ سنا تو حیران رہ گیا۔ پھر حاکم سہون نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ لوگ بہ رضا و رغبت یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے ورنہ انہیں یہاں سے جبراً نکال دو۔“

راجہ جیر جی کے شمشیر بدست سپاہی گدڑی پوشوں کے خیمے میں داخل ہوئے اور انہیں حاکم سیوستان (سہون) کا حکم سنایا۔

گدڑی پوشوں نے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ ”ہم صرف اپنے شیخ کے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو ہمارے شیخ سے کہو۔“

گدڑی پوشوں کے انکار سے جیر جی کے سپاہیوں کا غصہ بھڑک اٹھا تھا۔ وہ اسی حالت غضب میں شیخ کے خیمے کی طرف بڑھے مگر اندر داخل نہیں ہو سکے۔ سپاہیوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے پیروں کی طاقت سلب ہو چکی ہے اور وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر ہیں۔ پھر جب سپاہیوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو ان کی ساری طاقت بحال ہو گئی۔

راجہ جیر جی اپنے سپاہیوں کی مجبوریوں کا قصہ سن کر پہلے تو حیران ہوا، پھر وہ ایک انجانے سے خوف کی لپیٹ میں آ گیا۔ ”کیا وہ اتنا شکتی شالی (طاقتور) ہے کہ تم لوگ اس کے آگے دم بھی نہیں مار سکتے؟ تم

نے اُسے دیکھا تک نہیں اور ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے۔“

”ہم کچھ نہیں جانتے مہاراج!“ سپاہیوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اپنی حالت کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ دیوتا ہی جانیں کہ وہ کون ہے اور یہاں کس لئے آیا ہے؟ ہمارے کان تو کسی بڑے خطرے کی آہٹ سن رہے ہیں۔“

راجہ جیرجی نے فوری طور پر اپنے وزیروں، مشیروں اور درباری نجومیوں کو طلب کر لیا۔ تمام واقعات سن کر حاکم سہون کی طرح اراکین سلطنت اور ستاروں کا علم جاننے والے بھی حیران و پریشان تھے۔

پھر درباری نجومیوں نے کاغذ پر بارہ خانے بنائے اور ان خانوں میں ستاروں کی موجودہ رفتار درج کی۔ کچھ دیر تک آپس میں مشورے کرتے رہے۔ پھر یکایک ان کے چہروں پر خوف کے گہرے سائے لرزنے لگے۔ نجومیوں نے راجہ جیرجی کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔

”ہم نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایک مسلمان حدود سلطنت میں داخل ہوگا اور پھر وہی شخص اقتدار کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کے لئے بھی ایک سنگین خطرہ بن جائے گا۔“

حاکم سہون راجہ جیرجی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے؟“

”ہمارا علم یہی کہتا ہے۔“ تمام نجومیوں نے بیک زبان کہا۔ ”شاید یہ وہی فقیر ہے جس کے ایک شاگرد کو آپ نے قید میں ڈال دیا ہے۔“

ماہرین نجوم نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ دن پہلے ایک مسلمان سہون میں داخل ہوا تھا اور قلعے کے جنوبی حصے میں گھنی جھاڑیوں کے اندر مقیم ہو گیا تھا۔ وہ دن میں تین مرتبہ اپنے رومال سے زمین کو صاف کرتا اور با آواز بلند کہتا۔

”لوگو! میرا مرشد آ رہا ہے۔ میں اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہا ہوں، تم بھی میرے مرشد کو گرجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنا کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“

فقیر روزانہ یہی ایک نعرہ لگایا کرتا تھا۔ اتفاق سے راجہ جیرجی کے محل کی ایک کھڑکی جھاڑیوں کی طرف کھلتی تھی۔ حاکم سہون کی خوبصورت لڑکی بناؤ سنگھار کرنے کے بعد درتپے میں آ کر بیٹھ جاتی اور جنگل کا نظارہ کرتی رہتی۔ راج کمار کی یہ غیر معمولی انہماک دیکھ کر محل کی کنیروں نے حاکم سہون کو اطلاع دی کہ وہ اپنی بیٹی کی خبر لیں ورنہ صورت حال بے قابو ہو سکتی ہے۔ راج کمار کی ایک مسلمان پر فریفتہ ہو گئی ہے۔

راجہ جیرجی نے خلوت میں راج کمار کو طلب کر کے پوچھا۔ ”بیٹی! یہ کنیریں تمہارے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں؟“

راج کمار نے کسی جھجک کے بغیر اس بات سے انکار کر دیا۔ ”مہاراج! میں اُس شخص کو جانتی تک نہیں۔ آپ خود درتپے میں بیٹھ کر دیکھ لیں۔ فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ وہاں سے انسانی ہیولے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

بٹی کے کہنے پر راجہ جیر جی نے خود محل کے درتچے میں بیٹھ کر دیکھا۔ واقعتاً گھنی جھاڑیوں اور محل کے درتچے میں بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ وہاں سے کسی انسان کے نقش و نگار کا نظر آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر راجہ کماری ایک ہیولے سے کس طرح عشق کر سکتی تھی۔

راجہ جیر جی شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسی دوران کچھ تنگ نظر اور متعصب وزیروں نے حاکم سہون کو مشورہ دتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں راجہ کماری بے قصور ہیں۔ سارا قصور اس مسلمان فقیر کا ہے جو مہاراج کی عزت و آبرو سے ایک بھیا تک کھیل کھیل رہا ہے۔“

راجہ جیر جی نے استفہامیہ نظروں سے اپنے وزیروں کی طرف دیکھا۔

”درصل وہ مسلمان فقیر راجہ کماری کے عشق میں مبتلا ہے۔“ وزیروں نے شک کا بیج بو دیا۔

راجہ جیر جی نے اقتدار و حکمرانی کے نشے میں تحقیق کئے بغیر مسلمان فقیر کو زنجیریں پہنا کر قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر روزانہ اس کے کمزور جسم کو مشق ستم بنایا جاتا۔ مگر وہ ہر بار ایک ہی بات کہتا۔

”میں اپنے مرشد کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ اسی کے عشق میں تڑپ رہا ہوں اور خلش دل سے بے قرار ہو کر اسی کو پکارتا ہوں۔“

راجہ جیر جی اور اس کے وزیر ایک مسلمان درویش کی زبان سمجھنے سے قاصر رہے اور اس کے جسم پر وحشیانہ انداز میں تازیانوں کی بارش کرتے رہے۔ اسی اثناء میں طوائفوں والا واقعہ پیش آ گیا۔ ماہرین نجوم نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

”پھر کیا، کیا جائے؟“ راجہ جیر جی نجومیوں کی بات سن کر وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

”مہاراج کو چاہئے کہ وہ مسلمان فقیر کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کریں اور یہاں سے چلے جانے کی درخواست کریں۔“ ایک نجومی نے حاکم سہون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

راجہ جیر جی دل سے تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک غیر مسلم فقیر کا اس طرح احترام کرے مگر ماہرین نجوم نے اسے جھک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر ایک معتبر وزیر، ہیرے جواہرات اور اشرافیوں سے بھرا ہوا خوان لے کر درویشوں کے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت مسلمان فقیروں نے کھانا پکانے کے لئے آگ جلائی تھی۔

راجہ جیر جی کے وزیر نے جواہرات اور سونے سے بھرا ہوا خوان شیخ کے سامنے رکھتے ہوئے عرض کیا۔ ”یہ حاکم سہون کی طرف سے آپ کے لئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ اسے قبول فرما لیجئے اور براہ کرم کسی دوسری جگہ تشریف لے جائیے۔“

”جسے تم گرانقدر تحفہ کہتے ہو، اس کی حیثیت ٹھی بھرا رکھ سے زیادہ نہیں۔“ یہ کہہ کر شیخ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ ”اس خوان کو اٹھا کر آگ میں ڈال دو۔“

راجہ جیر جی کے وزیر نے بڑی حیرت سے مسلمان درویش کی بات سنی۔ وہ دل ہی دل میں خندہ زن تھا کہ ایک معمولی سی آگ قیمتی ہیروں اور سونے کے ٹکڑوں کو کس طرح جلائے گی؟

خدمت گار نے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق خوان اٹھا کر آگ میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

ایک شعلہ سا بھڑکا، تمام لعل و جواہر اور سونے کے ٹکڑے جل کر خاک ہو گئے۔
 ”ہمیں نذر کرنے کے لئے ایک مٹھی بھر راکھ لایا تھا؟“ شیخ نے بت پرست وزیر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

حاکم سہون کا نمائندہ کچھ دیر تک پھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ ناقابل یقین منظر دیکھتا رہا۔ وہ سونا جو تپتی ہوئی بھٹی میں بہت دیر کے بعد پگھلتا ہے، اسے معمولی آگ کے شعلوں نے چند لمحوں میں جلا کر خاک کر ڈالا تھا۔ مسلمان درویش کی یہ کرامت دیکھ کر وزیر نے قدموں پر سر رکھ دیا اور گداگرانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو راجہ کے حکم سے مجبور ہوں۔ میری جان بخش دی جائے۔“
 وزیر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔
 ”تجھے معاف کیا جاتا ہے۔“ شیخ نے بے نیازانہ فرمایا۔

پھر جب وزیر کانپتے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگا تو شیخ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔
 ”اپنے راجہ سے کہہ دینا کہ ہم یہاں سے واپس جانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہم بفضل خدا اس بستی میں تادیر رہیں گے اور اسی کے حکم سے اسی جگہ ہماری قبر تعمیر ہوگی۔ اگر حاکم سہون اپنی سلامتی چاہتا ہے تو خود یہاں سے چلا جائے۔“

پھر مختصر سے سکوت کے بعد شیخ نے فرمایا۔ ”راجہ کو چاہئے کہ ہمارے مرید کو ایذا پہنچانے سے باز رہے۔ اُسے عزت و احترام کے ساتھ رہا کر دے۔ ورنہ ہم خود اُسے آزاد کرا لیں گے۔“
 وزیر دوبارہ حاکم سہون کی خدمت میں پہنچا اور اس نے لعل و جواہر کے راکھ ہو جانے کا پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! وہ ایک انتہائی طاقتور سنیا سی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔“
 وزیر کی گفتگو سن کر راجہ جیر جی غضب ناک ہو گیا۔ ”ٹو بزدل ہے کہ ایک معمولی سی بات سے ڈر گیا۔ میں نے اس سے بھی بڑی شعبدہ بازیاں دیکھی ہیں۔ میری سلطنت میں ایسے ایسے کامل جادوگر موجود ہیں جو مسلمان سنیا سی کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیں گے۔“

پھر جب وزیر نے شیخ کے مرید کو رہا کرنے کی بات کی تو حاکم سہون اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ ”ہم تو اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ جادوگر اپنے چیلے کو آزاد کرا سکتا ہے تو کرا لے۔“

ماہرین نجوم نے راجہ جیر جی کو سمجھایا کہ وہ ضد سے کام نہ لے مگر حاکم سہون کے دماغ پر اقتدار کا نشہ طاری تھا۔ اس لئے اس نے اپنے کان بند کر لئے اور ایک ہی بات کو بار بار دہراتا رہا۔

”وہ اپنے دل کی حسرتیں نکال لے۔ میں ہر نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔“
 حاکم سہون کی ضد دیکھ کر وزیر و مشیر خاموش ہو گئے۔



پھر ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ درویش نے عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر خدمت گاروں کی موجودگی

میں اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جو راجہ جیرجی کی قید میں تھا اور کئی مہینے سے دردناک سزائیں برداشت کر رہا تھا۔

”بودلہ! اب تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہماری آنکھیں تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔“

خدمت گار حیران تھے کہ پیر و مرشد کسے پکار رہے ہیں؟ بودلہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟
خادموں کو حیرت زدہ پا کر شیخ نے فرمایا۔ ”بودلہ ہمارا مرید ہے اور تمہارا بھائی ہے۔ وہ ہمارے ہی حکم پر سہون آیا تھا مگر یہاں کے جابر حاکم نے جھوٹا الزام لگا کر اسے قید خانے میں ڈال دیا ہے۔..... مگر آج رات زنداں کی دیواروں میں گہرے شکاف پڑ جائیں گے اور تمام زنجیریں کھل کر زمین پر گر پڑیں گی۔ بودلہ بس آنے ہی والا ہے۔“

ادھر شیخ کی زبان مبارک سے یہ کلمات ادا ہوئے..... اور ادھر بودلہ کا زخمی جسم اچانک زنجیروں سے آزاد ہو گیا۔ بودلہ نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ ابھی اس کی حیرانی برقرار تھی کہ یکایک زنداں کا دروازہ کھل گیا۔ بودلہ سمجھ گیا کہ یہ تائید غیبی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے بے اختیار نعرہ مارا۔
”میرا مرشد آگیا..... میرا مرشد آگیا۔“

شدید زخمی ہونے کے سبب بودلہ کی ناتوانی انتہا کو پہنچ چکی تھی مگر زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد اسے اپنے جسم میں نئی توانائی محسوس ہونے لگی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ قید خانے کے میدان سے گزر کر صدر دروازے کی طرف آیا تو زنداں کی بلند دیواریں اس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ بودلہ نے حسرت سے دیواروں کی طرف دیکھا۔ یکایک ایک دیوار شق ہوئی اور اس میں گہرا شکاف پڑ گیا۔ بودلہ نے زوردار نعرہ مارا اور شکاف سے گزر کر باہر آ گیا۔

پھر اُسے مرشد کی آواز سنائی دی۔ ”بودلہ! اسی راستے پر چلے آؤ۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“
بودلہ نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا مگر دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ وہ اپنے مرشد کی آواز کو پہچانتا تھا۔ آخر اسی آواز کے سہارے چل پڑا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بودلہ کو چند خیمے نظر آئے۔ پھر وہ غیر ارادی طور پر ایک خیمے میں داخل ہو گیا۔ یہ اس کے مرشد کا خیمہ تھا۔ بودلہ نے حیران ہو کر شیخ کی طرف دیکھا، پھر والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور مرشد کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ شیخ کے دوسرے خدمت گار بھی ایک اجنبی شخص کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے گرد سمٹ آئے تھے۔ بودلہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور مرشد اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت مشفقانہ لہجے میں فرما رہے تھے۔ ”بس! تمہاری آزمائش ختم ہوئی۔ تم سرخرو ٹھہرے اور تمہارے دشمن ہلاکت کو پہنچے۔“

خدمت گاروں نے دیکھا کہ اجنبی شخص کے پورے جسم پر زخموں کے نشانات تھے اور جگہ جگہ سے گوشت نچا ہوا تھا۔

شیخ نے اپنے خدام کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”یہی تمہارا بھائی بودلہ ہے۔ اسے حاکم سہون نے ناحق ستایا ہے۔ انشاء اللہ! وہ بہت جلد اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے گا۔“

پھر دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چند روز میں بودلہ کے تمام زخم، کسی دوا کے بغیر بھر گئے اور جسم پر چوٹ کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ شیخ کی ایک اور کرامت تھی۔



جب دوسرے دن زنداں کے محافظوں نے بودلہ کو موجود نہیں پایا تو راجہ جیر جی کے دربار میں ہلچل مچ گئی۔

”مہاراج! آپ نے دیکھا کہ مسلمان سنیا سی اپنے قیدی کو اس طرح چھڑا کر لے گیا کہ ہمارے آہنی دروازے اور طاقت و محافظ کسی کام نہ آئے۔“ وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ وہی وزیر تھا جو شیخ کی خدمت میں قیمتی تحائف لے کر حاضر ہوا تھا۔ ”ابھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں اور اس فقیر کو ستانے سے باز رہیں۔“

راجہ جیر جی اپنے وزیر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کا عیار ذہن نیا منصوبہ تراشنے لگا۔ پھر جب مسلمان درویش کی اس کرامت کا شور بلند ہوا تو اُس محلے کی طوائفیں ترک سکونت کر کے کسی اور محلے میں چلی گئیں۔

زنانِ بازاری کے رخصت ہوتے ہی شیخ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ”ان مکانوں کو ڈھا دو اور زمین کو ہموار کر دو۔“

خدام، پیر و مرشد کے حکم پر فوراً ہی عمل پیرا ہوئے اور ان لوگوں نے طوائفوں کے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ خبر پورے شہر میں عام ہو گئی۔ ابھی ایک مکان بھی پوری طرح منہدم نہیں ہوا تھا کہ چند مسلح افراد گھوڑوں پر نمودار ہوئے۔ پھر ایک توانا شخص، غصے سے بھرا ہوا نیچے اُترا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں درویشوں کو مخاطب کر کے بولا۔

”تم لوگ کس کے حکم سے مکانوں کو ڈھا رہے ہو؟“

درویشوں نے مسلح افراد کی طاقت سے مرعوب ہوئے بغیر کہہ دیا کہ وہ اپنے شیخ کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔

”تمہارا شیخ کون ہے؟“ اس شخص نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

خدمت گار اس سوال کا جواب دینے ہی والے تھے کہ شیخ اپنے خیمے کے دروازے پر جلوہ افروز ہوئے۔

”وہ ہیں ہمارے شیخ۔“ درویشوں نے اپنے شیخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مسلح شخص آگے بڑھا اور چیختے ہوئے بولا۔ ”میں اس زمین کا مالک ہوں۔ تم لوگ کس حیثیت سے میرے تعمیر کردہ مکانوں کو مسمار کر رہے ہو؟“ اس کے ساتھ ہی راجپوت زمیندار کے منہ سے مغلظات کا فوارہ اُبل پڑا۔

شیخ نے کچھ کہے بغیر اپنے عصا سے زمیندار کے جسم پر ایک ضرب لگائی اور پھر پورا علاقہ اس کی

چیخوں سے گونجنے لگا۔ وہ زمین پر گر کر کسی ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔ راجپوت زمیندار کے ساتھی حیرت و خوف کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمیندار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے ملازمین پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ درویشوں کو روکنے کے بجائے وہاں سے فرار ہو کر راجہ جیرجی کے پاس پہنچے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

”مہاراج! اگر مسلمان سنیا سی کو نہ روکا گیا تو پورے سہون میں بھونچال آ جائے گا۔“

راجہ جیرجی نے اسی وقت سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کرتے ہوئے حکم جاری کر دیا۔ ”ایک معزز شہری کے قتل کے جرم میں مسلمان سنیا سی کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔“

بعض روایتوں میں درج ہے کہ خود حاکم سہون سپاہی لے کر درویش کے پاس پہنچا اور نہایت تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ”راجپوت زمیندار کے قتل کا حساب کون دے گا؟“ راجہ جیرجی کا خیال تھا مسلمان سنیا سی اس کا جاہ و جلال دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے گا مگر حاکم سہون کی یہ خوش گمانی اس وقت دور ہو گئی جب درویش نے مادی اقتدار کی نفی کر دی۔

”تم کون ہو اور کس کے قتل کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“ درویش نے راجہ جیرجی سے پوچھا۔ ایک مردِ مومن کی اس شانِ بے نیازی پر حاکم سہون بھڑک اٹھا۔ ”میری ہی زمین پر رہتے ہو اور مجھ ہی سے سوال کرتے ہو کہ میں کون ہوں؟“

”زمین کی ملکیت کا معاملہ کچھ اور ہے جسے تم عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ فی الحال اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔“ درویش نے جان بوجھ کر اپنی لاعلمی اور بے خبری کا مظاہرہ کیا۔

یہ سن کر راجہ جیرجی کچھ اور غضب ناک ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے ایک وزیر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مسلمان سنیا سی کو فردِ جرم پڑھ کر سنائے۔ وزیر مملکت درویش سے مخاطب ہوا۔

”تمہارا پہلا جرم یہ ہے کہ تم اجازت کے بغیر اس محلے میں خیمہ زن ہوئے ہو..... ان ناچنے گانے والی عورتوں کو بے دخل کیا جو ایک طویل عرصے سے یہاں مقیم تھیں..... پھر ان مکانوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا جو راجپوت زمیندار کی ملکیت تھے..... اور آخر میں جب زمین کا مالک ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنے آیا تو اسی کو قتل کر ڈالا۔“

مسلمان درویش نے اپنے خلاف فردِ جرم سنی اور پھر نہایت مطمئن لہجے میں الزامات کا جواب دینا شروع کیا۔

”ہم مسلمان کسی پر جبر نہیں کرتے۔ زنانِ بازاری یہاں سے خود گئیں۔ انہیں کسی نے زبردستی نہیں اٹھایا..... مکانوں کو مسمار اس لئے کیا کہ وہ ناپاک تھے..... ساری زمین اللہ کی ہے۔ اسی لئے اس کے حکم سے یہ جگہ ہماری ملکیت ہے..... اور ہم نے کسی راجپوت زمیندار کو قتل نہیں کیا۔ ہاں! ایک پاگل کتا ادھر ضرور آیا تھا۔ ہم نے بہت چاہا کہ وہ ادھر سے بھونکتا ہوا گزر جائے اور ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے..... مگر جب وہ کاٹ کھانے کے لئے جھپٹا تو ہم نے اسے بجکم خدا ہلاک کر ڈالا۔ سامنے اس کی قبر

ہے۔“ درویش نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اس کتے کو وہیں دفن کیا ہے۔“
”وہ کتا نہیں، سردار تھا۔“ پاس کھڑے لوگوں نے تردید کی۔

راجہ جیرجی دوبارہ مسلمان درویش سے مخاطب ہوا۔ ”یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“
”ان کی نظر میں مرنے والا سردار ہو گا مگر ہم نے تو ایک کتے ہی کو زمین کے سپرد کیا ہے۔“ درویش نے اسی بے نیازی اور استقامت کے ساتھ اپنے الفاظ دہرا دیئے۔
راجہ جیرجی نے اپنے سپاہیوں کو قبر کھولنے کا حکم دیا اور انتہائی قہر آلود لہجے میں مسلمان درویش کو تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔

”اگر اس گڑھے سے راجپوت سردار کی لاش برآمد ہو گئی تو پھر تم لوگوں کی خیر نہیں۔ اس قتل کی پاداش میں ایک ایک کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔“

”یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کا کیا حشر ہو گا؟ ویسے تم اپنے اطمینان کے لئے قبر کھول کر دیکھ لو کہ وہاں تمہارا راجپوت زمیندار دفن ہے یا کوئی کتا؟“ مسلمان درویش کے چہرے اور لہجے سے اسی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جب قبر کھولی گئی تو راجہ جیرجی کے سپاہی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ قبر میں راجپوت زمیندار کے بجائے ایک سیاہ کتا دفن تھا۔ حاکم سہون نے بھی یہ ناقابل یقین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زمیندار کے ملازمین دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیرجی کے سپاہی بھی وہاں سے فرار ہو جانا چاہتے تھے مگر راجہ کی ناراضگی کے سبب مجبوراً ٹھہرے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد حاکم سہون ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے اپنے محل میں واپس لوٹ آیا.....
اور درویش کے خدمت گار مکانوں کو مسمار کرنے میں مشغول ہو گئے۔



راجہ جیرجی کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ سہون میں ایک مسلمان درویش کی موجودگی اس کے لئے مستقل عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ وہ درباریوں کے سامنے اپنے آپ کو بے خوف و بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اندرونی طور پر بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ اکثر اسے تنہائی میں نجومیوں کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

”مہاراج! یہ وہی شخص ہے جس کے ہاتھوں آپ کی زندگی اور اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہو گا۔“
راجہ جیرجی کئی بار اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کر چکا تھا مگر ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ آخر حاکم سہون نے اپنے علاقے کے کچھ جادوگروں کو طلب کر کے ان سے مسلمان درویش کے بارے میں مشورہ کیا۔

بہت غور و فکر کے بعد تمام جادوگر ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور ان سیاہ کاروں نے حاکم سہون کے روبرو، مسلمان درویش کی روحانی طاقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اس شخص کی اڑان بہت اونچی ہے۔ بد قسمتی سے ہمیں اس مقام تک رسائی حاصل نہیں۔ ہمارا علم و ہنر مسلمان درویش کا کچھ نہیں

بگاڑ سکتا۔“

جادوگروں کے اس اعتراف پر راجہ جیرجی بہت برہم ہوا۔ ”جب تم لوگ میرے دشمن کو دفع نہیں کر سکتے تو پھر تمہارا عدم وجود دونوں برابر ہیں۔“

سہون کے ساحروں نے مقابلے سے پہلے ہی اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ ”ہمارا عجز اپنی جگہ مگر پھر بھی ہم مہاراج کو ایک مفید مشورہ دے سکتے ہیں۔ اگر اس ترکیب پر عمل کیا گیا تو بہت جلد آپ کو اپنے دشمن سے چھٹکارا مل جائے گا۔“

جب حاکم سہون نے وہ ترکیب پوچھی تو جادوگروں نے اپنا تجویز کردہ نسخہ بتا دیا۔ ”اگر کسی طرح مسلمان درویش کے شکم میں حرام غذا داخل کر دی جائے تو اس کی ساری روحانی قوت زائل ہو جائے گی اور پھر ہمارے جادو کی شکتی اس پر غالب آ جائے گی۔“

راجہ جیرجی نے ساحروں کا مشورہ قبول کر لیا اور پھر کچھ دیر تک مسلمان درویش کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا۔ یہ حاکم کی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ اپنے اس منافقانہ عمل سے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس نے مسلمان درویش کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔

آخر راجہ نے ایک روز کسی حرام جانور کا گوشت پکوا یا اور کئی خوان سجا کر مسلمان درویش کی خدمت میں بھیج دیئے۔

خدمت گاروں نے حاکم سہون کی نذر قبول کر لی اور تمام خوان اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

”یہ کیا ہے؟“ شیخ نے خدام سے پوچھا۔

”راجہ جیرجی نے آج فقیروں کی دعوت کی ہے۔“ خدام نے دست بستہ عرض کیا۔

شیخ نے ایک خوان سے کپڑا اٹھایا۔ کھانا دیکھتے ہی شیخ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پھر چہرے پر غیظ و جلال کے آثار نمایاں ہوئے۔ خدام حیرت و سکوت کے عالم میں مرشد کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہے تھے۔

”ہمارا خیال تھا کہ وہ کافرا تنی نشانیاں دیکھنے کے بعد ایمان لے آئے گا۔ مگر جس کی تقدیر میں ہلاکت و بربادی لکھی جا چکی ہو، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا۔“ یہ کہہ کر شیخ نے کھانے سے بھرا ہوا خوان الٹ دیا۔“

مرشد کے اس عمل سے خدام پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زمین بھی لرزنے لگی۔ سہون شدید زلزلے کی لپیٹ میں تھا۔ زمین نے دو تین کروٹیں لیں اور طاقت و اقتدار کا سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ادھر شیخ کے سامنے خوان الٹا پڑا تھا..... اور ادھر راجہ جیرجی کے قلعے کی بنیادیں الٹی ہو گئی تھیں۔ سینکڑوں منکرین حق بلے میں دب کر ہلاک ہو گئے اور پھر کچھ دن بعد ان کی ہڈیاں گل سڑ کر رزق خاک ہو گئیں۔

یہ درویش، مشہور بزرگ حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ تھے جن کے ہیبت و جلال سے باطل پرستوں کی صفوں میں شگاف پڑ گئے۔ ہزاروں پتھر کے پجاریوں نے اپنے ماتھوں سے قشقے کے

نشانات کھرچ ڈالے اور گلے میں پڑے ہوئے زنار توڑ کر پھینک دیئے۔ درختوں، جانوروں، ستاروں، چاند اور سورج کو سجدہ کرنے والوں نے ”حی و قیوم“ کی وحدانیت پر گواہی دی اور سرورِ کونین ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا۔

روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے خوف سے جو طوائفیں ترک سکونت کر کے کسی اور محلے میں چلی گئی تھیں، انہیں سکونِ قلب میسر نہ آ سکا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت قلندرؒ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئیں اور آپؒ کے دستِ مبارک پر تائب ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئیں۔



حضرت لال شہباز قلندرؒ کا خاندانی نام عثمان تھا۔ آپؒ کی تاریخ ولادت میں بڑا اختلاف ہے۔ کچھ مورخین نے 538ھ کو آپؒ کا سالِ پیدائش قرار دیا ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت قلندرؒ 573ھ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد محترم کا اسم گرامی سید کبیرؒ تھا اور سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے جا ملتا ہے۔

بعض کتابوں میں آپؒ کے نام کی جے ”لعل“ تحریر کی گئی ہے۔ ”لعل“ ایک قیمتی پتھر کو کہتے ہیں۔ اکثر تاریخوں میں ”لال“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں سرخ۔ حضرت قلندرؒ کا آبائی وطن مروند تھا جسے مہمند بھی کہتے ہیں۔ اسی شہر میں آپؒ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد حضرت شیخ عثمانؒ، حضرت بابا ابراہیمؒ سے بیعت ہوئے۔ پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق آپؒ نے ایک سال تک سخت ریاضتیں کیں۔ پھر پیر و مرشد سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔

حضرت بابا ابراہیمؒ نے اپنے مرید خاص کو ”شہباز“ کا خطاب عطا کیا۔ اس خطاب کی توجیہ پیش کرتے ہوئے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپؒ کی آنکھیں شہباز کی طرح چمکتی تھیں، اس لئے پیر و مرشد اسی نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ ”لال“ کا لفظ آپؒ کی ذات سے اس لئے وابستہ ہوا کہ حضرت قلندرؒ اکثر سرخ لباس پہنا کرتے تھے اور یہ رنگ آپؒ کو بہت زیادہ مرغوب تھا۔

کچھ مورخین ”قلندر“ کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حضرت لال شہبازؒ نے حضرت سید جمال مجردؒ کا خرقہ حاصل کیا اور سید جمالؒ ایک قلندر تھے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ آپؒ کے پیر و مرشد حضرت بابا ابراہیمؒ نے حضرت شہبازؒ کو قلندری سلسلے میں داخل کیا تھا۔

کچھ تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو ”قلندر“ کہہ کر پکارا تھا۔ اسی روز سے آپؒ ”قلندر“ مشہور ہو گئے۔

کچھ تاریخ نویسوں نے ”شہباز“ کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ایک بار آپؒ اپنے ہم عصر بزرگوں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ اور حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے ہمراہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ اچانک آپؒ چلتے چلتے رک گئے اور چہرہ مبارک سے پریشانی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

”مخدوم! کیا ہوا؟“ ساتھی بزرگوں نے آپؒ کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

”میرا ایک مرید اس وقت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے۔“ حضرت سید عثمان مروندی نے غم زدہ لہجے میں فرمایا۔ ”آپ حضرات اپنا سفر جاری رکھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت شیخ نے اس طرح جست لگائی جیسے ہوا میں پرواز کر رہے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد حضرت بابا فریدؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے حضرت سید عثمانؒ کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ہمراہ ایک اجنبی شخص تھا۔ پھر جب چاروں بزرگ منزل پر پہنچ گئے تو ایک بزرگ نے سوال کیا۔ ”مخدوم! کیا یہی وہ مرید ہے جس کی وجہ سے آپ بہت پریشان تھے؟“

حضرت سید عثمانؒ نے فرمایا۔ ”حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میرے مرید کو گردابِ بلا سے نکال کر عافیت کے ساحل تک پہنچایا۔“

روایت ہے کہ آپؒ کی یہ کرامت دیکھ کر تینوں عارفانِ وقت نے بے ساختہ فرمایا۔ ”مخدوم! آپ ”شاہ باز“ ہیں۔“

اسی دن سے حضرت سید عثمانؒ ”شاہ باز“ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ پھر یہ لفظ کثرت استعمال کے سبب شہباز ہو گیا۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے آپؒ کی جس کرامت سے متاثر ہو کر ”شہباز“ کا لقب دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپؒ کا ایک مرید کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ دشمنوں نے اس کے خلاف سازش کی اور اسے ایک سنگین جرم میں پھنسا دیا۔

مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرید نے پُر زور لہجے میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس جرم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“ قاضی کو ایک مسلمان کے بیان پر یقین آ چلا تھا کہ دشمنوں نے عدالت میں جھوٹے گواہ لا کر کھڑے کر دیئے۔ وہ لوگ بھی اللہ کو حاضر و ناظر جان کر قسمیں کھاتے رہے کہ یہ شخص مجرم ہے اور موت کے خوف سے جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے۔

قاضی نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرید سے کہا۔ ”تمہارے خلاف بہت سی شہادتیں موجود ہیں لیکن اگر تم بھی ایک گواہ پیش کر دو تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔“

دشمن بہت زیادہ با اثر تھے، اس لئے حضرت قلندرؒ کے مرید کے حق میں کوئی ایک شخص بھی شہادت نہ دے سکا۔ نتیجتاً قاضی نے ایک بے قصور انسان کو پھانسی کی سزا سنائی۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنے بزرگ دوستوں کے ساتھ سفر میں تھے کہ اچانک آپؒ کو اپنا مرید پاؤ آ گیا۔ حضرت شیخؒ نے اس کے حال پر نظر کی تو یہ تکلیف دہ منظر دیکھا کہ سپاہی اسے کھینچتے ہوئے پھانسی گھر کی طرف لے جا رہے تھے۔

یہ ایک مغرب سے سیاہ آندھی اُٹھی اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ پھر گرد و غبار صاف ہوا تو

سپاہی حیرت و خوف سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور وہ قیدی غائب تھا جسے کچھ دیر بعد پھانسی دی جانے والی تھی۔ حضرت لال شہباز قلندر اپنا مرید چھڑا کر لے گئے تھے۔

قلندر کے اس تصرف روحانی کو دیکھ کر ان کے ہم عصر بزرگوں نے انہیں ”شہباز“ کا لقب دیا تھا۔ مورخ خداداد خان نے اپنی تصنیف ”لب تاریخ“ میں حضرت لال شہباز قلندر کی پیدائش کے بارے میں ایک عجیب واقعہ تحریر کیا ہے۔

اس وقت حضرت قلندر کے والد محترم سید کبیر کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات سید کبیر نے خواب میں دیکھا۔ ایک نہایت پُر فضا مقام تھا۔ ہر طرف دلکش باغات اور سبزہ زار تھے۔ میوہ دار درخت تھے اور ان کے قریب صاف و شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ طائران خوش الحان نغمے گا رہے تھے کہ اچانک ایک گوشے سے سرخ رنگ والا ایک خوب صورت بچہ نمودار ہوا اور سید کبیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”مجھے اس مقام سے باہر لائیے۔“

سید کبیر کچھ دیر تک اس خوب صورت بچے کو دیکھتے رہے، پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”جنت میں باہر آنا افضل ہے۔“ (جنت میں باہر آنے سے مراد جنت کی سیر کرنا ہے)

جیسے ہی سید کبیر کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، وہ خوب صورت بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا..... اس کے ساتھ ہی سید کبیر کی آنکھ کھل گئی۔ بڑا عجیب خواب تھا۔ سید کبیر کچھ دیر تک اپنے خواب پر غور کرتے رہے مگر جب ذہن اس کی کوئی عقلی توجیہ پیش نہ کر سکا تو پھر اسے محض خواب سمجھ کر فراموش کر دیا۔

کچھ دن بعد سید کبیر نے دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ سرخ رنگ والا وہی خوب صورت بچہ آپ کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”بزرگوار! مجھے اس مقام سے باہر لائیے۔“

سید کبیر نے بچے کی بات سن کر اپنا وہی جواب دہرا دیا۔ ”جنت میں باہر آنا افضل ہے۔“ اب کی بار بچہ خاموش نہیں رہا۔ اس نے سید کبیر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”دنیا میں ظاہر ہونا بھی اچھا ہے۔“ یہ کہہ کر بچہ پہلے کی طرح غائب ہو گیا۔

بچے کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی سید کبیر بیدار ہو گئے۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان شروع ہو گئی اور ارض و سما کی وسعتوں میں اللہ کی کبریائی بیان ہونے لگی۔

دوسری مرتبہ اسی بچے کو خواب میں دیکھنے کے بعد سید کبیر کچھ مضطرب سے ہو گئے۔ پھر آپ ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو خواب کی تعبیر کا علم رکھتے تھے۔ بزرگ نے سید کبیر کا خواب سننے کے بعد فرمایا۔ ”سید! آپ شادی شدہ ہیں؟“

سید کبیر نے نفی میں جواب دیا۔

”قدرت چاہتی ہے کہ اب آپ شادی کر لیں۔“ بزرگ نے فرمایا۔ ”وہ آپ ہی کا بچہ ہے جسے حق تعالیٰ عدم سے وجود میں لانا چاہتا ہے۔“

سید کبیرؒ نے بزرگ کی بات سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

”تمہیں حق تعالیٰ سے اُمید رکھنا چاہئے کہ وہ ایک غیر معمولی بچہ ہوگا۔“ بزرگ نے خواب کے بعض خفیہ گوشوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

سید کبیرؒ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے مگر بزرگ کی ہدایت کے بعد ان کا ارادہ بدل گیا اور انہوں نے بعض بے تکلف دوستوں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ پھر یہ خبر اڑتے اڑتے اس وقت کے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچی..... اور اُس نے اپنی عقیقہ بیٹی کا نکاح سید کبیرؒ سے کر دیا۔

”لب تاریخ“ کی روایت کے مطابق ہرات کے بادشاہ نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور اُسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا عقد سید کبیرؒ سے کر دے۔ الغرض یہ شادی ہو گئی اور پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ عالم اسباب میں ظاہر ہوئے۔ ”لب تاریخ“ کے مؤلف نے بادشاہ اور اس کی بلند کردار بیٹی کے نام تحریر نہیں کئے ہیں۔ جب حضرت قلندرؒ کی عمر مبارک چھ سال کی ہوئی تو ایک دن آپؒ کے والد محترم نے بہت غور سے اپنے بیٹے کے نقش و نگار دیکھے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی صورت اسی بچے سے ملتی تھی جسے سید کبیرؒ نے دوبار خواب میں دیکھا تھا۔



حضرت بابا ابراہیمؒ اور پھر حضرت سید جمال شاہ مجرّدؒ سے خرقہ حاصل کرنے کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ ”حرین شریفین“ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ اس سفر کے دوران آپؒ کی ملاقات مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ سے ہوئی۔ حضرت سرخ بخاریؒ، نامور صوفی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے دادا محترم تھے۔ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اور حضرت لال شہبازؒ میں قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں سیدزادے تھے، دونوں طالبانِ حق تھے اور دونوں سرخ لباس پہنتے تھے۔ حضرت سرخ بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کئی سال تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ ان مقامات مقدسہ پر دونوں بزرگوں نے مل کر سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔

پھر حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ بخارا تشریف لے گئے۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بعض روایتوں کے مطابق جب یہ دونوں بزرگ بخارا میں داخل ہوئے تو سرحد کے محافظ سپاہیوں نے پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

جواب میں حضرت جلال الدین بخاریؒ نے فرمایا۔ ”ہم سید ہیں اور بخارا کے علماء کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے آئے ہیں۔“

سپاہی دونوں بزرگوں کو حاکم بخارا کے دربار میں لے گئے۔

”تمہارے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہے کہ تم لوگ سیدزادے ہو؟“ حاکم بخارا نے حضرت سرخ بخاریؒ اور حضرت قلندرؒ سے سوال کیا۔

”ہمارا اقرار ہی ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔“ حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ نے فرمایا۔

”تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سے لوگ آلِ رسول ﷺ ہونے کے دعوے دار ہیں مگر حقیقت یہ

ہے کہ اس زمین پر سید زادے بہت کم ہیں۔“ حضرت جلال الدین بخاریؒ کا جواب سن کر حاکم بخارا نے کہا۔ ”کسی شخص کا زبانی دعویٰ اس کے سید ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔“

”پھر آپ کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں؟“ حضرت سرخ بخاریؒ نے فرمایا۔ اس دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ خاموش رہے۔

”روایت ہے کہ سید کو آگ نہیں جلاتی۔“ حاکم بخارا نے کہا۔ ”اگر تم لوگ آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ تو میں اس بات کو تسلیم کر لوں گا کہ تم دونوں سید زادے ہو۔“

حضرت جلال الدین بخاریؒ نے نہایت پر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”حاکم بخارا! آگ بھڑکائیں۔ یہ سید زادہ اس امتحان سے گزرنے کے لئے تیار ہے۔“

الغرض حاکم بخارا کے حکم پر آگ روشن کی گئی۔ پھر جب آگ کے شعلے پوری شدت کے ساتھ بھڑکنے لگے تو حضرت سید جلال الدین بخاریؒ بسم اللہ پڑھ کر آگ میں داخل ہو گئے۔ انسانی ہجوم نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ حاکم بخارا کے ساتھ دیگر حاضرین کو بھی یقین تھا کہ آگ کے سرخ شعلے آن کی آن میں حضرت سرخ بخاریؒ کو جلا کر خاک کر دیں گے..... مگر اس وقت بخارا کے باشندوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے حضرت جلال الدین بخاریؒ کو آگ کے درمیان بالکل محفوظ پایا۔ کچھ دیر بعد حضرت سرخ بخاریؒ زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

حاکم بخارا نے برسرِ عام حضرت شیخؒ سے معافی مانگی اور اپنی بیٹی کا نکاح آپؒ سے کر دیا۔

یہ واقعہ اپنی جگہ کتنا بھی درست ہو مگر سید کی قومیت یا حسب و نسب کو پرکھنے کا وہ معیار مناسب نہیں جو حاکم بخارا نے قائم کیا تھا۔ مذہبی تاریخ میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ مستند واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جنہیں بادشاہ وقت نمرود نے منجیق کے ذریعے بھڑکی ہوئی آگ میں پھینکا تھا..... اور جب خلیل اللہ کا جسم اقدس آگ کے شعلوں سے مس ہونے والا تھا، تو اسی لمحے آسمانی حکم نازل ہوا تھا۔

”اے آگ! ٹھنڈی ہو جا سلامتی کے ساتھ ابراہیمؑ پر۔“ (ترجمہ)

پھر اسی حکم الہی کے ساتھ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے مہکتے ہوئے پھولوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد جتنے بھی اہل ایمان آگ کی آزمائش سے گزرے ہیں، ان سب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو زندہ کیا تھا..... اور وہ اسی آسمانی حکم کے زیر سایہ تھے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول۔

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستان پیدا

مگر یہ عقیدہ کہ سید وہی ہے جو آگ کے شعلوں میں محفوظ رہے، خلاف شریعت بھی ہے اور خلاف فطرت بھی۔ خلاف شریعت اس لئے کہ قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ میں ایسی کوئی سند موجود نہیں۔ آگ کا کام صرف جلا نا ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی زد میں آئے گی، جل کر راکھ ہو جائے گی۔ اب اگر کوئی اہل ایمان آتش سوزاں کے اثراتِ بد سے محفوظ رہتا ہے تو یہ محض اللہ کا کرم ہے اور اس حقیقت

ازلی کا اظہار کہ دنیا کی ہر شے اللہ ہی کے حکم سے اپنے اندر مخصوص تاثیر رکھتی ہے اور جب اللہ چاہتا ہے تو ایک لمحے کے لاکھویں حصے میں اس کی تاثیر کو بدل ڈالتا ہے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک مرید سیدی مولہؒ پر سلطان جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ پھر جب سیدی مولہؒ زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے سامنے لائے گئے تو آپؒ نے با آواز بلند فرمایا۔

”میں حکومتِ وقت کو تسلیم کرتا ہوں اور میرا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔“

سلطان جلال الدین خلجی کے چند مشیروں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ آگ بھڑکائی جائے اور پھر سیدی مولہؒ کو شعلوں کے درمیان سے گزارا جائے۔ اگر وہ بے گناہ ہوئے تو آگ سے محفوظ رہیں گے۔ سلطان جلال الدین خلجی اس آزمائش ترکیب کے لئے آمادہ ہو گیا تھا مگر علمائے دربار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”آگ کی فطرت جلانا ہے۔ یہ کسی شخص کے گناہ گار اور معصوم ہونے کا پیمانہ نہیں۔“



حاکم بخارا کی بیٹی سے شادی کے بعد حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کچھ دنوں تک اسی تاریخی شہر میں سکونت پذیر رہے اور مختلف صاحبانِ معرفت سے کسب فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک دن حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ آپؒ نے اسی حالت میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سید! میں نے آسمانِ معرفت پر ایک شہباز کو اڑتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ شہباز تم ہو۔“

الغرض چند ماہ بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ سے اجازت چاہی اور بخارا سے رخصت ہو کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زیارت کے لئے نجف اشرف حاضر ہوئے۔ ایک رات آپؒ نے یہاں خواب میں دیکھا۔ کوئی بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے۔

”سید عثمان! تم بلاناخیر کر بلائے معلیٰ چلے جاؤ۔ وہاں تمہارے والد محترم مقیم ہیں اور تمہیں دیکھنے

کے لئے بے قرار و مضطرب ہیں۔“

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ حرمین شریفین کی زیارت اور حصولِ علم کی غرض سے طویل سفر پر روانہ ہوئے تو آپؒ کے والد گرامی حضرت سید کبیرؒ کر بلائے معلیٰ تشریف لے گئے تھے۔ اب ان کا آخری وقت قریب آ پہنچا تھا اور وہ بیٹے کو یاد کر کے بہت روتے تھے۔ اسی دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ نے عالم خواب میں بزرگ کی ہدایت سنی اور پھر دوسرے دن آپؒ کر بلائے معلیٰ روانہ ہو گئے۔

حضرت سید کبیرؒ نے اپنے قلندر بیٹے کو سینے سے لگایا اور وصیت کرتے ہوئے فرمایا ”فرزند! یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے عمر بھر بس ایک ہی دعا کی ہے کہ وہ ذات پاک تمہیں ہر آزمائش

میں ثابت قدم رکھے۔“

اس واقعے کے چند روز بعد حضرت سید کبیرؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔



حضرت سید کبیرؒ کی وفات کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ کربلائے معلیٰ سے سبزدار تشریف لے گئے۔ یہاں آپؒ کے پیر و مرشد حضرت بابا ابراہیمؒ سکونت پذیر تھے۔ اپنے مرید کو دیکھ کر حضرت بابا ابراہیمؒ بے قرار ہو گئے۔

”سید! تم سے ملاقات کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا تھا۔“

”شیخ محترم! ابھی ساہا سال آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے گا۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

”نہیں سید!“ حضرت بابا ابراہیمؒ نے فرمایا۔ ”فرشتہ اجل میرے دروازے پر آ پہنچا ہے۔ بس اندر آنے کی دیر ہے۔“ یہ کہہ کر حضرت بابا ابراہیمؒ نے پیر و مرشد کا خرقہ اور دیگر تبرکات حضرت لال شہباز قلندرؒ کے حوالے کئے۔ ”یہ میرے پاس تمہارا جتنا خرقہ تھا، تمہیں مل گیا۔ جب میں دنیا سے گزر جاؤں تو تم جمال شاہ مجرّد کی خدمت میں حاضر ہو جانا۔ وہی تمہاری تکمیل کریں گے۔“

حضرت لال شہباز قلندرؒ مرشد کی جدائی کے تصور سے بہت رنجیدہ و ملول تھے مگر وقت معلوم کسی کے ٹالے نہیں ٹٹتا۔ چند روز بعد ہی حضرت بابا ابراہیمؒ بھی ”دارافتا“ سے ”داربقا“ کی طرف کوچ کر گئے۔ والد گرامی سید کبیرؒ کے انتقال کے بعد یہ دوسرا الم ناک سانحہ تھا جسے حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ مختصر سے عرصے میں دو محبوب ترین ہستیوں سے ٹکھڑنا اور پھر ان صدمات کو برداشت کرنا آسان کام نہیں تھا..... مگر حضرت لال شہباز قلندرؒ منزل تسلیم و رضا کے مسافر تھے، اس لئے آپؒ نے اسلام کے روایتی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ والد ماجد اور پیر و مرشد کے فراق میں آپؒ کی آنکھیں اشکبار تھیں مگر ہونٹوں پر شور و فغاں نہیں تھا۔

بعض تاریخوں میں درج ہے کہ پیر و مرشد حضرت بابا ابراہیمؒ کی وفات کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت سید جمال شاہ مجرّد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت قلندرؒ کے حوالے سے ہماری محرومی یہ ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے آپؒ کے مرشد اول حضرت سید بابا ابراہیمؒ کے تفصیلی حالات تحریر نہیں کئے۔ کچھ یہی معاملہ حضرت جمال مجرّد کا ہے۔ ان بزرگ کے بارے میں بھی کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ شاہ جمالؒ کون تھے اور کہاں مقیم تھے؟

ایک کتاب ”الشہباز“ حضرت قلندرؒ کے عام عقیدت مندوں میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ اس کے مؤلف جلیل سیوہانی ہیں۔ کتاب پر سن اشاعت بھی موجود نہیں۔ مصنف مذکور نے کسی تاریخی حوالے کے بغیر بہت سے واقعات تحریر کئے ہیں۔ جلیل سیوہانی کے بقول جب حضرت بابا ابراہیمؒ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

”تم اپنی منزل آسان تر کرنے کے بعد ہندوستان جاؤ اور وہاں پہنچ کر ہمارے طالب شاہ جمال

مجرد سے اپنی امانتیں حاصل کرو۔“

”الشہباز“ کے مصنف کے مطابق شیخ جمال شاہ مجرد ہندوستان میں سکونت پذیر تھے..... مگر کس شہر میں مقیم تھے، اس کا کوئی حوالہ کتاب میں نہیں ملتا۔ میری ناقص معلومات میں جمال شاہ مجرد نام کے کوئی صوفی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے۔ اور نہ انہوں نے کسی دوسرے ملک سے ہجرت کر کے سرزمین ہند کو رونق بخشی۔ پھر ہم جمال شاہ مجرد کو کہاں تلاش کریں؟..... اور اگر بالفرض ہم حضرت شیخ جمال مجرد کو نظر انداز کر دیں تو پھر حضرت لال شہباز قلندر کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ اس دنیا کا ایک معروف کلیہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ دیگر علوم و فنون میں عموماً اور ”صوفیت“ میں خصوصاً، سلسلہ روحانی کا جاننا ضروری ہوتا ہے کہ فلاں صوفی تصوف کے فلاں خانوادے سے تعلق رکھتا ہے؟ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ چند بزرگ مادر زاد ولی پیدا ہوئے ہیں مگر آگے چل کر انہیں بھی کسی مرشد کامل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ اکثر مصنفین کی تحقیق کے مطابق حضرت لال شہباز قلندر کے مرشد اول حضرت بابا سید ابراہیم ہیں۔ مگر بد قسمتی سے کسی مستند تاریخ میں ان بزرگ کے حالات زندگی نظر نہیں آتے۔

حضرت قلندر کے دوسرے مرشد حضرت شیخ جمال شاہ مجرد ہیں جنہوں نے آپ کی روحانی تربیت کو تکمیل تک پہنچایا۔ ”سوانح لال شہباز قلندر“ کے مصنف مختار احمد کاشف نے مولانا غلام سرور لاہوری کی مشہور تصنیف ”خزینۃ الاصفیاء“ کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

”حضرت لال شہباز قلندر، حضرت شیخ جمال مجرد کے مرید تھے اور شیخ جمال کو حضرت سید ابراہیم سے شرف ارادت حاصل تھا۔ ”خزینۃ الاصفیاء“ کے حوالے سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شیخ جمال مجرد کون بزرگ تھے؟ گزشتہ دنوں میں نے سلسلہ چشتیہ کے نامور بزرگ حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی پر ایک خصوصی مضمون تحریر کیا تھا۔ مطالعے کے دوران میرے ذہن میں ایک بزرگ کا نام محفوظ رہ گیا..... اور وہ بزرگ تھے سید جمال مجرد ساؤجی۔ حضرت چراغ دہلی اپنی مشہور تصنیف ”خیر المجالس“ میں فرماتے ہیں۔

”سید جمال ساؤجی ایک طویل مدت تک مصر میں مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ مصر کے باشندے حضرت ساؤجی کو ”کتب خانہ رواں“ (چلتی پھرتی لائبریری) کہا کرتے تھے۔ سید جمال مجرد ساؤجی کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ کھڑے کھڑے مشکل سے مشکل سوال کا جواب دیتے تھے۔ آپ نے حوالہ پیش کرتے وقت کبھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی۔ علماء نے سید جمال ساؤجی کو بارہا آزمایا مگر ہر مرتبہ آپ کا جواب درست پایا۔ پھر ایک دن حضرت جمال ساؤجی پر ایک عجیب جذبہ اور حال طاری ہوا کہ آپ نے داڑھی مونچھیں منڈوا دیں اور قبرستان میں جا کر بیٹھ گئے۔ حضرت سید جمال ساؤجی ایک متقی اور پابند صومہ، صلوٰۃ انسان تھے..... مگر جب آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی تو دنیا کے رسم و رواج کے ماتھے نمازیں بھی چھوٹ جاتیں۔

حضرت سید جمال ساؤجی کا اس طرح قبرستان میں گوشہ نشین ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کچھ

دن بعد علمائے مصر نے آپؑ کو اپنی مجلسوں سے غیر حاضر پایا تو ان کے شاگردوں اور متعلقین سے پوچھا کہ شیخ ساؤجی کہاں ہیں؟

شاگردوں نے روتے ہوئے اپنے شیخ کی حالت بیان کی۔ ”وہ آج کل گورستان کے سناٹوں میں رہتے ہیں اور اپنے قریبی دوستوں تک کو نہیں پہچانتے۔“

علمائے مصر نے ساؤجیؒ کا یہ حال سنا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر مصر کے سب سے بڑے عالم جو ”ملک العلماء“ کہلاتے تھے، اپنے ہمراہ علمائے ظاہر کی ایک جماعت لے کر قبرستان پہنچے۔ اس وقت حضرت سید جمال مجرد ساؤجیؒ قبلہ رخ بیٹھے تھے۔ آپؑ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی خاص منظر کے مشاہدے میں گم ہیں۔

ملک العلماء نے با آواز بلند سلام کیا۔ مگر حضرت سید جمال ساؤجیؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر دوسرے علماء نے مسنون طریقے کے مطابق سلام کیا لیکن اس بار بھی حضرت جمال ساؤجیؒ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان کے جسم کو حرکت تک نہ ہوئی۔ مصر کے ملک العلماء نے سوچا کہ ساؤجیؒ جان بوجھ کر علماء کی جماعت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لئے بار بار سید جمالؒ کو جھنجھوڑا گیا مگر ان کے حیرت و سکوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ علمائے مصر کی جماعت سید جمال ساؤجیؒ کے پاس اس لئے پہنچی تھی کہ ان کا احتساب کر کے انہیں دوبارہ نماز اور دیگر مذہبی امور کی تلقین کی جائے۔ ملک العلماء کا خیال تھا کہ حضرت جمال ساؤجیؒ احتساب سے بچنے کے لئے خود کو فاجر العقل اور دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

”شیخ جمال! تم نے یہ غیر مسلموں کا ساحلیہ کیوں بنایا ہے اور نماز کیوں ترک کی ہے؟“ ملک العلماء نے اتمام حجت کے لئے آخری بار حضرت سید جمال ساؤجیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ملک العلماء نے تین بار یہی سوال دہرایا مگر سید جمال ساؤجیؒ نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ نہ پلکیں جھپکائیں اور نہ اپنی نشست کا زاویہ تبدیل کیا۔

آخر ملک العلماء نے سزا کے طور پر راگ (دھات) کو پگھلا کر ساؤجیؒ کے حلق میں ڈال دینے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ الغرض راگ کو پگھلایا گیا اور پھر زبردستی حضرت سید جمال ساؤجیؒ کے حلق میں وہ رقیق دھات ڈال دی گئی۔ علماء کی جماعت کو یقین تھا کہ اس تکلیف دہ سزا سے گزرتے ہوئے شیخ جمال ساؤجیؒ چیخ اٹھیں گے..... مگر اس وقت حاضرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب سید جمال ساؤجیؒ اسی طرح ساکت بیٹھے رہے۔ پگھلا ہوا سیسہ حلق سے اتر گیا اور آپؑ نے اُف تک نہ کی۔ یہ ایک ولی کی قوت برداشت اور مشاہدہ حق میں محویت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ اس واقعے کا دوسرا حیرت انگیز اور ناقابل یقین پہلو یہ تھا کہ پگھلی ہوئی دھات نے حضرت سید جمالؒ کو کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ آخر ملک العلماء اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

”شیخ جمال کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب اللہ ہی ان کے معاملات کو درست کر سکتا ہے۔“

پھر کئی صدیاں گزر جانے کے بعد مشہور صوفی سیاح حضرت حامد بن فضل اللہ جمالیؒ مصر

حضرت سید جمال ساؤجی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ حضرت جمالی اپنی کتاب ”سیر العارفین“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”یہ احقر جمالی جب اس مقام مقدس پر پہنچا تو میں نے اس علاقے کے علماء اور دیگر اکابرین کی زبانی جو معتبر لوگ تھے، یہ سنا کہ حضرت سید جمال ایک طویل عرصے تک مصر میں مقیم رہے۔ وہ بہت خوبصورت اور نہایت باکمال انسان تھے۔ صاحب جمال ہونے کی وجہ سے مصر کے لوگ انہیں ”یوسف ثانی“ کہتے تھے۔ پھر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرت سید جمال کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ جس طرح عزیز مصر کی بیوی زلیخا، حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق ہو کر تمام اخلاقی حدود سے گزر گئی تھی، بالکل اسی طرح امراء مصر میں سے ایک مشہور رئیس کی بیوی حضرت سید جمال کے حسن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس بے راہ روعورت نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور بے حجابانہ حضرت سید جمال کی عبادت و ریاضت میں خلل انداز ہوتی تھی۔

حضرت سید جمال کو ”مجرد“ اسی لئے کہتے ہیں کہ آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ ”خزینۃ الاصفیاء“ کے بیان کے مطابق آپ کے پیرو مرشد حضرت سید بابا ابراہیم نے بھی رشتہ ازدواج قائم نہیں کیا تھا اور ساری زندگی تجرد کے عالم میں بسر کی تھی۔ اپنے پیشواؤں کے اسی دستور پر عمل کرتے ہوئے حضرت لال شہباز قلندر نے بھی شادی نہیں کی اور عمر عزیز اپنے سلسلہ روحانی کی تبلیغ میں گزار دی۔

ان تمام روایتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت سید جمال مجرد ہی حضرت قلندر کے مرشد تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ”ساؤجی“ کا لفظ بگڑتے بگڑتے ”شاہ جی“ بن گیا اور پھر تذکرہ نویسوں نے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ ”شاہ“ لکھنا شروع کر دیا۔ تاریخ کی روشنی میں یہ روایت درست نہیں کہ حضرت سید جمال مجرد ہندوستان میں مقیم تھے اور حضرت بابا ابراہیم نے لال شہباز قلندر کو ہدایت کی تھی کہ وہ ہندوستان پہنچ کر حضرت سید جمال سے اپنی امانتیں حاصل کر لیں۔ حضرت شیخ جمال ایک دن کے لئے بھی ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ آپ نے اپنے آخری ایام ”دمیات“ میں گزارے اور اسی مقام پر آسودہ خاک ہوئے۔ حضرت لال شہباز قلندر بھی سید جمال سے فیض روحانی حاصل کرنے کے لئے ”دمیات“ میں حاضر ہوئے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض مورخین نے ”مرند“ کو حضرت لال شہباز قلندر کا آبائی وطن قرار دیا ہے۔ ”مرند“ آذربائیجان کا علاقہ ہے اور آپ اسی مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ کے سلسلہ روحانی میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ”قلندرنامہ“ کے مصنف حکیم فتح سیوہانی ”دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت لال شہباز قلندر کا سلسلہ روحانی حضرت امام زین العابدین کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے نزدیک سید جمال، حضرت شیخ علی کے مرید تھے اور شیخ علی حضرت امام موسیٰ رضا کے صاحبزادے تھے۔ اس روحانی سلسلے میں حضرت بابا سید ابراہیم کا نام موجود نہیں۔

کئی تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت لال شہباز قلندر سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ”تذکرہ

الفقراء“ میں یہ شجرہ روحانی حضرت سید جمال، حضرت بابا ابراہیم اور حضرت مرتضیٰ سجائی کے واسطے سے حضرت احمد بن مبارک تک پہنچتا ہے اور شیخ احمد بن مبارک، غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید تھے۔ اس روحانی سلسلے میں حضرت سید بابا ابراہیم کا اسم گرامی موجود ہے اور حضرت سید جمال کو ان کا مرید ظاہر کیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ سلسلہ قادریہ اور سلسلہ قلندریہ میں بظاہر کوئی نسبت نہیں۔ دونوں سلسلے طریق سلوک کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں۔

اکثر محققین کی رائے کے مطابق سلسلہ قلندریہ کے بانی حضرت سید جمال مجرد ہیں۔ اس طرح اپنے بزرگوں کے واسطے سے شیخ جمال کو تو سلسلہ قادریہ سے نسبت ہو سکتی ہے مگر حضرت لال شہباز قلندرؒ براہ راست حضرت غوث اعظم کے سلسلہ روحانی میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جب طریقہ، مسلک اور تعلیم بدل جائے تو ایک سلسلہ دوسرے سلسلے سے جدا ہو جاتا ہے اور مختلف حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید تھے۔ مولانا نور احمد خان فریدی اپنی کتاب ”تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتانی“ میں تحریر کرتے ہیں:

”حضرت مخدوم سید عثمان مروندی لعل شہباز قلندرؒ پابند شریعت بزرگ تھے۔ اگرچہ آپ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن حضورؐ آپ کو دوستوں میں شمار فرماتے تھے۔ صوفیاء میں جو چار یار مشہور ہیں، ان سے حضرت بہاء الدین زکریا، حضرت شیخ العالم فرید الدین مسعود گنج شکر، سید السادات حضرت جلال الدین بخاری اور مخدوم شیخ عثمان مروندی مراد ہیں۔“

آگے چل کر مولانا نور احمد خان فریدی تحریر کرتے ہیں:

”معراج الولايت“ کی عبارت سے شروع شروع میں نیاز مند کو بھی حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں یہ شبہ ہوا تھا کہ انتہائی جذب و مستی کی وجہ سے آپ احکام شریعت کے پابند نہیں تھے.... لیکن جب احقر نے سہون شریف میں چپے چپے پر ان کی عبادت گاہیں دیکھیں تو عبارت کی صحت پر یقین نہیں آیا..... اور پھر وہ ذات گرامی جو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا جیسی سرکار شریعت کی صحبت میں ایک دو دن نہیں بلکہ کئی سال بسر کر چکی ہو، اس کے متعلق اس قسم کی رائے تہمت نہیں تو کیا ہے؟“

مجھ ناقص کے نزدیک مولانا فریدی صاحب کی یہ دلیل بے وزن ہے۔ اگر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی ارادت کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا جائے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ پر جذب و کیف کی حالت طاری نہیں ہو سکتی تو ہمیں حضرت منصور حلاجؒ کے حالات زندگی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ حضرت حسین بن منصورؒ بھی سالہا سال حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکی، حضرت سہیل تہری، حضرت شیخ ابوالحسن نوری اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی جیسے اکابر مشائخ کی صحبتوں میں رہتے تھے مگر پھر بھی ”نعرۃ الحق“ بلند کرتے رہے۔ حضرت حلاجؒ کی یہ کیفیت خود اختیاری نہیں بلکہ اضطراری تھی۔ اسی وجہ سے غوث اعظم

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت سید علی ہجویریؒ داتا گنج بخشؒ نے حضرت حسین بن منصورؒ کو ”مہجور“ اور ”مجبور“ قرار دیا ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی تھی۔ اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت قلندرؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، تب بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت لال شہبازؒ کی زندگی کا بڑا حصہ جذب و مستی کی حالت میں گزرا ہے۔ ان کے طریق سلوک اور حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کے طریق سلوک میں بڑا فرق تھا۔ صوفیاء کی جماعت میں فارسی زبان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

نماز زاہداں سجدہ سجود است

نماز عاشقاں ترک وجود است

(زاہدوں کی نماز یہ ہے کہ وہ رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عاشقوں کی نماز یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو ترک کر دیتے ہیں)

ترک وجود سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ عشاق مشاہدہ حق میں مکمل طور پر گم ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنی جان تک کا ہوش نہیں رہتا۔ جب بندہ بے خبری کی اس منزل تک پہنچ جائے تو پھر ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کی نماز اور دیگر عبادتیں بھی قضا ہو جاتی ہیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے اسی جذب و کیف کو دیکھ کر ”معراج الولايت“ کے مصنف نے یہ لکھ دیا ہو گا کہ انتہائی مستی کے سبب وہ احکام شریعت کے پابند نہیں تھے۔ اگر کوئی صوفی ہوش کے عالم میں یہ کہے کہ زاہدوں کی نماز سجدہ و سجود ہے اور ترک وجود کر رہا ہوں تو اس کا یہ قول شریعت کی کھلی خلاف ورزی ہو گا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے اپنی مثنوی میں ایک مجذوب کا واقعہ بیان کیا ہے جو حق تعالیٰ سے ناراض ہو کر کوہ طور پر یا کسی جنگل میں جا بیٹھا تھا۔ اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ اس بندے کے پاس جائیں اور اسے ہماری حکمت و قدرت کے اسرار سمجھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص کے گستاخانہ عمل پر غصہ آیا تو حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر جلیلؐ پر ”ہوش و مستی“ کے اس فرق کو اس طرح ظاہر کیا۔

موسیا! آداب داناں دیگر اند

سوختہ جان و روانان دیگر است

(اے موسیٰ! ہوش مندوں کے آداب الگ ہیں اور چلے ہوئے جسموں اور جانوں کے انداز جدا۔ یعنی جو لوگ ہمارے عشق میں جل کر راکھ ہو گئے ہیں ان کے طریقے ہوش میں رہنے والے انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں)

حضرت سید علی ہجویریؒ نے حضرت منصور حلّاجؒ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بہت خوبصورت اور متوازن بات کہی تھی کہ حضرت منصورؒ ”مہجور الاصل“ نہیں تھے بلکہ اپنے اعمالِ موحشہ کی وجہ سے ”مہجور“ قرار دیئے گئے تھے۔ یعنی حضرت منصور حلّاجؒ بنیادی طور پر موحّد تھے۔ مہجور (پچھڑے ہوئے) نہیں تھے بلکہ اپنے بعض اعمال کے سبب شریعت کے قافلے سے پچھڑ گئے تھے۔ اسی سلسلے میں

حضرت داتا گنج بخشؒ کا یہ قول بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔
 ”ایسے لوگ (یعنی مجذوبین) پسندیدہ تو ہوتے ہیں مگر ان کے اعمال و افعال تقلید کے لائق نہیں ہوتے۔“

شریعت کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ واضح بات امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے فرمائی تھی۔
 حاضرین مجلس میں سے کسی شخص نے سوال کیا۔ ”امام! آپ کے قول کی کیا حیثیت ہے؟“
 جواب میں حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا۔ ”میرا ہر قول اور میری ہر رائے قرآن و سنت کے مطابق ہوتی ہے۔“

”اگر آپ کا قول قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ سے متصادم ہو؟“ اسی شخص نے دوسرا سوال کیا۔

حضرت امام اعظمؒ نے بے اختیار فرمایا۔ ”اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آجائے تو میرے قول کو دیوار پر مار دو۔“

حضرت ابوحنیفہؒ کے استاد گرامی حضرت امام شجیؒ قرآن و سنت کے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی تھے۔ سینکڑوں علماء کے ہجوم میں برسرِ مجلس فرمایا کرتے تھے۔ ”اگر میرا کوئی قول قرآن و سنت کے خلاف نظر آئے تو اس پر پیشاب کر دو۔“

صوفیاء کے سلسلے میں عام مسلمان کو آئمہ مجتہدین کے اسی قول مبارک پر عمل کرنا چاہئے ورنہ شدید گمراہی کا خطرہ ہے..... اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے بقول۔ ”اس میں بڑا فتنہ اور بڑی ہلاکت ہے۔“



اب ہم کچھ ایسے تاریخی حقائق پیش کریں گے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ نہیں تھے..... محض صحبت یافتہ، دوست اور جلیس تھے۔

ڈاکٹر عبدالمجید سندھی اپنی کتاب ”پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں“ میں صفحہ 323 پر تحریر کرتے ہیں:
 ”بعض تذکروں میں آیا ہے کہ حضرت سید عثمان قلندر شہبازؒ، حضرت غوث بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کے مرید ہوئے تھے..... لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضرت قلندر شہبازؒ کا طریقہ قلندری تھا جو سلسلہ سہروردیہ سے مختلف تھا..... اور قلندری سلسلے کی نسبت حضرت سید جمال مجردؒ سے ہے۔“

ہم بڑی آسانی سے اس روایت کی عقلی توجیہ پیش کر سکتے ہیں کہ جب دونوں بزرگوں کے طریقہ ہائے سلوک میں نمایاں فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے تو پھر حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید کس طرح ہو سکتے ہیں؟ مرید کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ایک عمل کا قائل بھی ہوتا ہے اور مقلد بھی۔ اگر بالفرض کسی معاملے میں پیر سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو زندگی بھر اپنی زبان و عمل سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔ حضرت بابا فریدؒ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی کتاب ”عوارف المعارف“ کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بابا فریدؒ

کے پاس کتاب کا جو نسخہ موجود تھا اس میں کسی مقام پر کتابت دُھندلی تھی یا کوئی اور مشکل درپیش تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے کچھ دیر کے لئے توقف فرمایا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عرض کیا۔ ”سیدی! میں نے عوارف المعارف کا اس سے بہتر نسخہ کسی شخص کے پاس دیکھا ہے۔“

اپنے محبوب مرید کی بات سن کر حضرت بابا فریدؒ کے چہرہ مبارک پر ناخوشگوار کاری کارنگ اُبھر آیا۔ پھر حضرت محبوب الہیؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”سید نظام! کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ بوڑھا کتابت کی غلطی درست کرنے اور اس کا مفہوم سمجھانے پر قادر نہیں ہے؟“

جیسے ہی پیر و مرشد کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت محبوب الہیؒ کے ہوش اُڑ گئے۔ پھر آپؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں حضرت بابا فریدؒ سے معافی مانگی۔ ”سیدی! میرا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا۔“ اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ جب تک حیات رہے، اس واقعے پر افسوس کرتے رہے۔ ”کاش! پیر و مرشد کے سامنے میری زبان سے یہ الفاظ ادا نہ ہوتے۔“

حضرت محبوب الہیؒ نے ایک معمولی سے اختلاف کو جو دراصل اختلاف بھی نہیں تھا، اتنی شدت سے محسوس کیا۔ پھر زندگی بھر اس واقعے کو بیان کر کے روتے رہے اور اظہارِ ندامت کرتے رہے۔

جبکہ ہم حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے طریقہ ہائے سلوک میں نمایاں اختلاف پاتے ہیں۔ یہ فرق دونوں بزرگوں کی زندگی میں بھی قائم رہا اور وصال کے بعد بھی۔ انتہا یہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ فرق و اختلاف اسی طرح موجود ہے۔ ہم کھلی آنکھوں سے آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ”خانقاہ زکریا“ کی رسمیں الگ ہیں اور ”خانقاہ قلندریہ“ کے آداب جداگانہ۔

ایک بار حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے توحید کے مسئلے پر گفتگو کی۔ پھر جب اس واقعے کی اطلاع حضرت جنید بغدادیؒ کو ہوئی تو آپؒ نے اپنے مرید خاص کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”شبلی! تمہیں محتاط رہنا چاہئے۔ آئندہ تم ایسے نازک مسائل پر عام مجلسوں میں تقریر نہیں کرو گے۔“ پیر و مرشد کی اس تنبیہ کے بعد حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ نے زندگی بھر ایسے نازک موضوعات پر عام لوگوں سے گفتگو نہیں کی۔

جب حضرت منصور حلاجؒ، حضرت جنید بغدادیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے تو آپؒ نے اپنے مرید کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”حسین! تم صبر و سکون سے رہو اور گوشہ نشینی اختیار کرو۔“ حضرت حسین بن منصورؒ نے پیر و مرشد کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ نتیجتاً حضرت حلاجؒ ”مہجور“ قرار پائے اور حضرت جنید بغدادیؒ ان سے خفا ہو گئے۔ اسی طرح حضرت حسین بن منصورؒ کی بے باکانہ گفتگو کی وجہ سے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی بھی ان سے ناراض ہو گئے تھے۔

اس تمام گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے دو انسانوں میں پیری اور مریدی کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ میدانِ تصوف میں ایک مختلف نظریہ رکھتے تھے، اس لئے آپؒ حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے

میں دوسری اہم دلیل یہ ہے کہ کوئی مرید، محبوبیت کے کسی درجے پر بھی فائز ہو مگر مرشد کی بارگاہ میں ”دوست“ کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔



آگے چل کر مولانا نور احمد خان تحریر کرتے ہیں:

”بعض تذکروں میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کو ملامتی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے آپؒ احکام شریعت کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ خاکسار نے اہل علم و فضل سے تحقیق کی تو انہوں نے اسے تہمت قرار دیا۔ خاکسار کی بھی یہی رائے ہے۔ کیونکہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ جیسے شیخ کامل کا دوست اور خلیفہ کامل، ملامتی نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب لال باغ اور پہاڑ کی نشست گاہ میں آپؒ کے مصلے زبان حال سے آپؒ کے منبع شریعت ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔“

صوفیاء میں ایک فرقہ ”لامتیہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق اس فرقے کے بانی مشہور صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ تھے۔ اس فرقے سے تعلق رکھنے والے صوفی اپنے آپ کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے انہیں ملامت کریں۔ مثال کے لئے ہم حضرت بایزید بسطامیؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش کرتے ہیں، اس وقت حضرت شیخؒ کی شہرت عام تھی اور لوگ آپؒ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار رہا کرتے تھے۔

رمضان المبارک کا مہینہ تھا، ایک دن عقیدت مندوں کی ایک جماعت آپؒ کے دیدار کے لئے حاضر ہوئی۔ جب خدمت گار نے حضرت بایزید بسطامیؒ کو اطلاع دی تو آپؒ نے رات کی بچی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے کھاتے ہوئے دروازے پر تشریف لائے۔ جب لوگوں نے حضرت شیخؒ کو روٹی کھاتے ہوئے دیکھا تو پوری شدت کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

”آپؒ کیسے بزرگ ہیں کہ رمضان کے فرض روزے بھی نہیں رکھتے..... اور اگر کوئی شرعی عذر درپیش تھا تو کم سے کم اس مقدس مہینے کا احترام ہی کر لیا ہوتا۔“ عقیدت برہمی میں تبدیل ہو گئی، احترام نفرت میں بدل گیا..... اور لوگوں کا ہجوم ملامت کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

پھر جب لوگ اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے تو حضرت بایزید بسطامیؒ نے روٹی کا نوالہ زمین پر تھوک دیا۔ اس وقت حضرت شیخؒ روزے سے تھے مگر لوگوں کی عقیدت کا طلسم توڑنے کے لئے آپؒ نے خود کو ”بے روزہ“ ثابت کیا اور نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تو نے سن لیا کہ لوگ تجھے کیا کہہ رہے ہیں۔ یاد رکھ کہ میں آئندہ بھی تجھے اسی طرح اذیتیں پہنچاؤں گا اور ہرگز اس لذت سے سرشار نہیں ہونے دوں گا کہ دنیا والے تجھے متقی اور پرہیزگار کہہ کر پکاریں۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنی ساری زندگی ”لامت“ کے اسی حارزار میں گزاری..... مگر جب حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک مرید نے برسر مجلس حضرت بایزید بسطامیؒ کا مقام معرفت جاننا چاہا تو حضرت شیخؒ نے پُر زور لہجے میں فرمایا۔

”ہم صوفیاء میں بایزیدؒ کا وہی مقام ہے جو ملائکہ (فرشتوں) میں حضرت جبریل امینؑ کا۔“
ویسے ہمیں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ”لامتی“ ہونا کوئی تحقیر کی بات نہیں۔ یہ تو ایک انتہائی
دُشوار راستہ ہے، جس پر مردانِ جانباز ہی گامزن ہو سکتے ہیں۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے خلیفہ اور
فارسی کے مشہور صوفی شاعر مولانا فخر الدین عراقی کے بقول۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی

(یہ کسی دشمن کا نصیب کہاں کہ وہ تیری تیغ سے ہلاک ہو جائے۔ بس تیرے دوستوں کا سر سلامت
رہے کہ تُو اس پر خنجر آزمائی کرتا رہے)

اور جہاں تک حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مسلک کا سوال ہے تو آپؒ خود اپنی زبان سے ”لامتی“
ہونے کا اعلان کرتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

منم عثمان مروندی کہ یارِ خواجہ منصور

لامت می کند خلق و من بردار می رقصم

(میں عثمان مروندی ہوں کہ خواجہ منصور میرے دوست ہیں۔ ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور
میں اس ملامت کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے رقص کرتا ہوں)

یہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی اس مشہور غزل کا مقطع ہے جو صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی
ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے خیال میں خواجہ منصورؒ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مرشد تھے..... مگر
ہمارے نزدیک خواجہ منصورؒ سے مراد حضرت منصور حلاجؒ ہیں..... کیونکہ حضرت حسین بن منصورؒ کو بھی
دنیا ملامت کرتی تھی اور آپؒ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ان اذیتوں کو برداشت کرتے تھے۔

”معارج الولايت“ میری نظر سے نہیں گزری مگر مولانا نور احمد خان فریدی نے اس کتاب کا ایک
اقتباس اپنی تالیف ”تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی“ میں پیش کیا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

”وہ صاحبِ کمالاتِ ظاہری و باطنی تھے اور صوری و معنوی تصرفات رکھتے تھے۔ ان سے خوارق و
کرامات بے اختیار ظاہر ہوتی تھیں۔ وہ سندھ میں رہتے تھے اور ساداتِ حسینی سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن
کا نام نامی سید عثمان تھا اور وہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جب
اُن پر جذب و مستی کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ احکامِ شریعت کے پابند نہیں رہتے تھے۔ سید عثمانؒ سرخ لباس پہنتے
تھے اور انہیں ”لال شہباز“ کا خطاب اُن کے پیر روشن ضمیر کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا۔“ اصل عبارت
فارسی زبان میں تھی۔ میں نے حرف بہ حرف اس کا ترجمہ پیش کر دیا ہے۔

”معارج الولايت“ کے مطالعے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے
آتے ہیں۔

ایک یہ کہ جب حضرت قلندرؒ پر جذب و مستی کا زیادہ غلبہ ہوتا تھا تو آپؒ سے احکامِ شریعت ساقط ہو
جاتے تھے۔ اس موضوع پر گزشتہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس سلسلے میں بھی مختلف تذکرہ نگاروں کی تحقیقات کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ دونوں بزرگوں کے درمیان صرف دوستی کا رشتہ قائم تھا۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے مرید حضرت سید عثمانؒ کو ”لال شہباز“ کا خطاب عطا کیا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ روایت بھی درست نہیں۔ حضرت بابا سید ابراہیمؒ بہت پہلے حضرت قلندرؒ کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ پھر بخارا کے سفر کے دوران حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ نے ایک بار آپؒ کو ”شہباز معرفت“ کہہ کر پکارا تھا۔ ان تمام روایتوں کی روشنی میں جب حضرت قلندرؒ سندھ میں داخل ہوئے تو ”لال شہباز“ کا لقب شہرت عام حاصل کر چکا تھا۔

اب ہم مولانا نور احمد فریدی کے حوالے سے ”منبع البرکات“ کی ایک اور روایت کا جائزہ لیں گے۔ اس کتاب میں درج ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ آپؒ احکام شریعت پر عمل نہیں کرتے تو ملتان کے قاضی قطب الدین کاشانیؒ نے آپؒ پر ”فسق“ کا فتویٰ لگا دیا۔ ”فسق“ کے لغوی معنی ہیں، احکام الہی کو قصد ترک کرنا..... دوسرے معنی ہیں بد اعمالی۔

ہم اپنے مضمون حضرت بہاء الدین زکریاؒ میں علامہ قطب الدین کاشانیؒ کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں۔ ملتان کا حاکم ناصر الدین قباچہ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی مقبولیت کو اپنی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔ نتیجتاً قباچہ نے کاشان سے علامہ قطب الدینؒ کو ملتان آنے کی دعوت دی تاکہ مذہبی حلقوں میں حضرت شیخ الاسلام کے اثرات کو کم کیا جاسکے۔ علامہ کاشانیؒ صوفیوں اور درویشوں کے قائل نہیں تھے۔ ناصر الدین قباچہ نے جامع مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور قطب الدین کاشانیؒ اس کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ حکومتی سطح پر علامہ موصوف کی بہت پذیرائی کی گئی۔ ناصر الدین قباچہ نے بطور خاص اپنے سپاہیوں اور امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ علامہ قطب الدین کاشانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ یہی وہ قاضی قطب الدین کاشانیؒ ہیں جنہوں نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے جذب و مستی کے واقعات سن کر ان پر ”فسق“ کا فتویٰ عائد کر دیا تھا۔ ”منبع البرکات“ کی روایت کو مولانا نور احمد فریدی صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے:

”ان دنوں حضرت لال شہباز قلندرؒ ملتان کے کسی قریبی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی بابت قاضی صاحب کی یہ جسارت برداشت نہ ہوئی۔ برہم ہو کر اٹھے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملتان کو چل دیئے۔ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریاؒ مسند ارشاد پر تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت کا مجلس خانہ علماء اور مشائخ سے بھرا ہوا تھا۔ ”قال اللہ“ اور ”قال الرسول“ سے مجلس گرم تھی۔ دفعۃً شور اٹھا کہ سندھ سے شیخ عثمانؒ نامی کوئی بزرگ قاضی قطب الدین کاشانیؒ سے ٹکر لینے کے لئے بگولے کی طرح اڑے چلے آ رہے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے جواں سال بھتیجے شیخ حسنؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”انہیں سمجھا بجھا کر میرے پاس لے آؤ۔“

شیخ حسنؒ نے کچھ فاصلہ طے کر کے مخدوم عثمانؒ کا استقبال کیا۔ ”میرے عم بزرگوار! حضرت شیخ

الاسلام آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

مخدوم عثمان (حضرت لال شہباز قلندر) حضرت بہاء الدین زکریا کا نام سنتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے اور شیخ حسن کے ہمراہ دربارِ غوثیہ میں حاضر ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام نے آپ پر شفقت کی نظر کی اور فرمایا۔ ”اے لال شہباز! آگے بڑھو۔“
شیخ عثمان نے بے دلی سے آنکھ اٹھا کر نظر کی..... اور خدا معلوم کیا دیکھا کہ جو کچھ سوچ کر آئے تھے، سب بھول گئے۔ زیر لب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

”یہ جمال کسی انسان کا نہیں، سورج کا نہیں، چاند کا نہیں۔ ایسا قالب جس کا چہرہ ہزار آفتابوں کی روشنی سے زیادہ منور دکھائی دے رہا ہے، یقیناً کسی عظیم شخصیت کا ہی ہو سکتا ہے۔ مسکراتا ہے تو ساری دنیا مسکراتی نظر آتی ہے۔ جبین نور پر ذرا شکن آتی ہے تو نوری ناری سب کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسے مردانِ خدا بار بار نہیں ملتے۔ اے عثمان! آگے بڑھ اور اپنا سراں کے سامنے جھکا دے۔“

یہ کہہ کر شیخ عثمان آگے بڑھے اور بولے۔

”اے پیکرِ نور! خطا ہوئی۔ معاف فرما دیجئے۔ میں نے آپ کے شہر کے ایک عالم کو گرفت میں لانا چاہا تھا لیکن خود اسی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ خدا را اب مجھے زیادہ نہ ترسائیے اور اپنی بیعت میں لے لیجئے۔“
حضرت شیخ الاسلام نے شیخ عثمان کو بغل میں لے کر خوب بھینچا اور اسی محبت میں آپ کو اپنے حلقہء ارادت میں داخل کر لیا۔ چونکہ حضور نے شیخ عثمان کو لال شہباز کہہ کر پکارا تھا، اس لئے آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور لال شہباز قلندر کہلانے لگے۔

بہت تلاش کے باوجود ”منبع البرکات“ نامی کتاب میرے ہاتھ نہ آ سکی۔ اس لئے میں نے مجبوراً مولانا نور احمد فریدی کی تالیف ”تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی“ کا سہارا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مذکورہ اقتباس ”منبع البرکات“ کی عبارت کا حرف بہ حرف ترجمہ ہے یا مولانا موصوف نے اپنی طرف سے عبارت آرائی کی ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، اس اقتباس کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ راوی کے بیان کردہ واقعات ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں اور متضاد بھی۔

شیخ حسن کے کہنے پر حضرت لال شہباز قلندر کا خاموشی کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کی خانقاہ میں چلے آنا، غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے بھتیجے شیخ حسن اور شیخ قلندر ایک دوسرے سے قطعاً ناواقف تھے۔ پھر یہ صورتِ حال کس طرح پیش آئی کہ حضرت لال شہباز نے شیخ حسن سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی اور چپ چاپ ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ ایک نا آشنا مقام تک چلے آئے؟ خیر! اسے ہم حضرت بہاء الدین زکریا کا تصرفِ روحانی تصور کئے لیتے ہیں کہ قلندر کے قدم بے ارادہ شیخ الاسلام کی بارگاہِ معرفت کی طرف اٹھ گئے ہوں۔

”منبع البرکات“ کے الفاظ ہیں کہ قاضی قطب الدین کاشانی کا فتویٰ سن کر حضرت قلندر غضب ناک ہو گئے اور علامہ سے ٹکر لینے کے لئے بگولے کی طرح اڑے چلے آ رہے تھے۔ غصے اور طیش کی انتہائی حالت کا یکا یک زائل ہو جانا، بذاتِ خود ایک غیر فطری عمل ہے۔ مصنف نے اس تبدیلی کا یہ جواز

پیش کیا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا کا نام سنتے ہی حضرت لال شہباز قلندر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ قلندر، شیخ الاسلام سے نہ صرف واقف تھے بلکہ پرانے ربط و ضبط کے سبب ان کا احترام بھی کرتے تھے۔

”منبع البرکات“ کے مصنف کے بقول جب حضرت لال شہباز قلندر خانقاہ میں داخل ہوئے تو حضرت بہاء الدین زکریا کا چہرہ مبارک دیکھ کر حیران رہ گئے اور بے اختیار بول اُٹھے۔
”یہ جمال کسی انسان کا نہیں، سورج کا نہیں، چاند کا نہیں.....“

حضرت قلندر کا اظہار حیرت ایک ہی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ پہلی بار حضرت بہاء الدین زکریا کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے اور حیران رہ گئے تھے۔

پھر حضرت لال شہباز کے یہ الفاظ کہ خدا رب مجھے زیادہ نہ ترسائیے اور اپنی بیعت میں لے لیجئے، اس بات کی دلیل ہیں کہ جیسے حضرت قلندر برسوں سے شیخ الاسلام کے آستانے پر پڑے رہے ہوں اور دن رات ان سے حلقہ ارادت میں شامل کر لینے کی درخواست کرتے رہے ہوں..... مگر مصنف کا دعویٰ ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا نے پہلی ہی ملاقات میں حضرت لال شہباز کو ”مریدی“ کا اعزاز بخش دیا تھا۔

ان تضادات کے علاوہ اس روایت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ جو واقعہ حضرت لال شہباز قلندر سے منسوب کیا گیا ہے، وہ قلندر کے شایان شان نہیں۔ جس مرد خدا نے زندگی بھر اس بات پر فخر کیا ہو۔

ملامت می کند حلقے و من برداری رقص

(ساری دنیا مجھے ملامت کرتی ہے اور میں اس ناقابل برداشت بوجھ کو اٹھائے ہوئے رقص کرتا ہوں)
اور تمام عمر جس مرد جانباز کے عشق کی یہ کیفیت ہو۔

ز عشق دوست ہر ساعت درون ناری رقص

گہہ برخاری غلطم، گہہ برخاری رقص

(دوست کے عشق میں میرے شب و روز کا ہر لمحہ اس طرح گزرتا ہے کہ میں آگ کے اندر رقص کرتا ہوں۔ میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں کبھی خاک پر لوٹتا ہوں اور کبھی کانٹوں پر رقص کرتا ہوں)

یہ شعر حضرت لال شہباز قلندر کی اسی مشہور غزل کا مطلع ہے جو صوفیانہ شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اور جسے پڑھ کر صاحبان جذب و کیف آج بھی ایک نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔

جس سرفروش صوفی کا یہ حال ہو کہ تپتی ہوئی خاک پر اور نوک خار پر رقص کرتا ہو..... بھڑکتے ہوئے شعلوں میں رقص کرتا ہو..... اور ساری دنیا کی ملائیں برداشت کر کے رقص کرتا ہو، وہ اپنے

اوپر لگائے ہوئے فتوے کو کس طرح خاطر میں لاتا؟ قلندر کے تو جینے کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے۔ وہ نفس کشی کی اس منزل سے گزرتا ہے جہاں سنگ و دشنام بھی اسے مہکتے ہوئے تروتازہ پھول محسوس ہوتے

ہیں۔ حضرت لال شہباز بھی اسی شان کے قلندر تھے۔ انہیں علامہ قطب الدین کاشانی کا ایک فتویٰ اس

قدر متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ غضب ناک ہو کر اپنی خانقاہ سے نکل کھڑے ہوتے۔ قلندر تو برسوں سے ملامت گاہ ہستی میں دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ انہیں اتنا ہوش کہاں تھا کہ اہل ہوش اُن کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

پھر ”منبع البرکات“ کے مصنف نے یہ واقعہ جس طرح بیان کیا ہے، اسے پڑھ کر ایک عامیانه قصے کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ اس قسم کی باتوں سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی بھی اور علامہ قطبؒ کی بھی شان گھٹتی ہے۔ اگر بالفرض ایسا کوئی واقعہ پیش آیا بھی ہو گا تو اس کا انداز یکسر جداگانہ ہو گا۔ اس طرح نہیں کہ حضرت قلندرؒ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک علامہ سے ٹکر لینے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوں گے۔



”موج کوثر“ کے مصنف شیخ اکرام اپنی کتاب میں برٹن کی ”ہسٹری آف سندھ“ کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

”حضرت لال شہباز قلندرؒ بہت بڑے عالم تھے۔ لسانیات اور صرف و نحو (قواعد) میں مہارت رکھتے تھے۔ برٹن کے زمانے (1852ء) میں صرف و نحو کی جو کتابیں مروج تھیں مثلاً ”میزان الصرف“ اور ”صرف صغیر“ وہ حضرت قلندرؒ سے منسوب کی جاتی ہیں۔“

”ماثر الکرام“ کے مصنف میر غلام علی آزاد بلگرامی کے مطابق جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سن بلوغت کو پہنچے تو بابا ابراہیمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔ بابا ابراہیمؒ، سید جمال مجرّد کے مرید تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے حضرت جمال مجرّد کو حضرت بابا ابراہیمؒ کا مرید قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ بہر کیف حضرت لال شہباز قلندرؒ ان دونوں بزرگوں کی صحبت میں رہ کر درجہ کمال کو پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

آگے چل کر میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

”خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے کئی اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی۔ حرمین شریفین جا کر حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔ پھر بغداد سے نکل کر کچھ مکران کے راستے سے سندھ میں تشریف لائے..... اور اس خطہ ارض کے بہت سے علاقوں میں سکونت پذیر رہے۔ ملتان، گجرات اور برصغیر کے مختلف شہروں میں جا کر دین اسلام کی تبلیغ کی۔

ملتان میں حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے ملے اور ان کے ساتھ سندھ کے دورے کئے۔ تذکروں اور تاریخوں میں ”چار یاروں“ کا سندھ اور ملتان کی سیر و سیاحت کرنا مشہور ہے۔ سیر و سفر کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ سندھ میں اقامت گزریں ہو گئے۔

حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے وصال کے بعد دوبارہ ملتان گئے اور ان کے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ سے ملاقات کی۔ اس زمانے میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد (خان شہید) ملتان کا حاکم تھا۔ شہزادہ فطرتاً سادہ مزاج اور نیک سیرت نوجوان تھا۔ اسے بزرگان دین سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ، شہزادہ سلطان محمد کے بارے میں تحریر

کرتا ہے:

”شہزادہ سلطان محمد خان شہید، سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب ترین بیٹا تھا۔ وہ تمام عمدہ صفات اور پسندیدہ عادات جو ایک شہزادے میں ہونی چاہئیں، خان شہید میں موجود تھیں۔ شہزادہ سلطان محمد ہوش و خرد اور ہنر پروری میں بلاشبہ اپنے زمانے کا بہترین انسان تھا۔ اس کی محفل میں ہمیشہ نامی گرامی علماء اور بڑے بڑے شاعر شرکت کرتے تھے، خان شہید اپنے ہمدردوں اور بھی خواہوں کے ساتھ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدانِ خالص حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ اسی شہزادے کے دربار سے وابستہ تھے اور رونقِ محفل کہلاتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے پورے پانچ سال تک خان شہید کی ملازمت کی۔ شہزادہ سلطان محمد، حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ کی سب سے زیادہ عزت اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔“

ضیاء الدین برنی سے لے کر قاسم فرشتہ تک تمام معتبر ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ شہزادہ سلطان محمد اس قدر سلیقہ مند اور مہذب تھا کہ اگر دن رات کسی محفل میں بیٹھتا، تب بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا۔ قسم کھاتے وقت ہمیشہ اس کی زبان پر لفظ ”حقاً“ رہتا تھا۔

شہزادے کی تہذیب و متانت کا یہ عالم تھا کہ جب محفلِ شراب آراستہ ہوتی اور وہ نشے کی حالت میں ہوتا، تب بھی اس کی زبان سے کوئی غیر مہذب اور ناشائستہ کلمہ ادا نہ ہوتا۔ اُس کی مجلس میں مشہور فارسی شعراء نوری، نظامی، خاقانی اور حضرت امیر خسروؒ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ شہزادہ خان شہید ہر شعر کو پوری طرح سمجھتا تھا اور اس کی مناسب داد دیتا تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ سلطان محمد کی سخن فہمی کے قائل تھے۔ ایک مجلسِ شعر و سخن میں حضرت امیر خسروؒ نے خان شہید کی سخن فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں نے ذوقِ صحیح، سخن فہمی، نکتہ رسی اور تمام نئے پرانے شعراء کے اشعار یاد رکھنے میں خان شہید جیسا فاضل شخص کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔“

شہزادہ خان شہید مشہور بزرگ صوفی شاعر حضرت شیخ سعدیؒ سے بھی نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے حضرت شیخ سعدیؒ سے کئی بار درخواست کی۔

”آپ ملتان تشریف لا کر ہمیں سرفراز کریں۔ یہاں آپ کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی جائے گی اور اس کے مصارف کے لئے چند گاؤں وقف کر دیئے جائیں گے۔“

شہزادے کے قاصد دومرتبہ حضرت شیخ سعدیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر حضرت شیخؒ نے اپنی ضعیفی کے سبب ملتان آنے میں معذرت پیش کی لیکن ہر بار اپنے دستِ مبارک سے اپنے اشعار اور غزلیات لکھ کر خان شہید کی خدمت میں بطور تحفہ روانہ کیں۔

ان تمام واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد خان شہید کے ساتھ علم دوست، ادب نواز اور درویشوں سے عقیدت رکھنے والا حاکم تھا۔

مورخ قاسم فرشتہ ایک مجلسِ شعر و سخن کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے:

”جس زمانے میں شہزادہ خان شہید کا قیام ملتان میں تھا، اسی زمانے میں شیخ عثمان ترمذیؒ جو اپنے

دور کے بہت بڑے عالم اور عارفِ کامل تھے، اتفاق سے ملتان تشریف لائے۔ سلطان نے شیخؒ کی آمد کی خبر سنی تو اپنے مصاحب خاص کے ذریعے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ شیخ عثمانؒ نے دعوت قبول کر لی۔ پھر جب شہزادہ سلطان محمد ان بزرگ سے ملا تو فرمانروائے ملتان ہوتے ہوئے بھی اُس نے نہایت انکسار اور عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ بہت دیر تک شیخؒ کے سامنے دست بستہ بیٹھا رہا۔ پھر جب شیخ عثمانؒ واپس جانے لگے تو شہزادہ سلطان محمد نے ان کی خدمت میں درخواست پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

”یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی کہ شیخ ملتان میں قیام فرمائیں۔“

شیخ عثمانؒ نے سکوت اختیار کیا تو شہزادہ خان شہید عاجزانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ”حکومت کے خرچ پر ایک خانقاہ تعمیر کرا دی جائے گی اور یہ شیخ کی خدمت میں ایک حقیر نذر ہوگی۔“

شیخ عثمانؒ نے شہزادہ سلطان محمد کی محبت و عقیدت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہم فقیروں کا ٹھکانا کہیں اور ہے۔ اللہ شہزادے کو اس فقیر نوازی کا اجر عطا کرے۔“

قاسم فرشتہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شہزادہ خان شہید نے حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ کی خدمت میں قیمتی نذریں اور تحائف بھی پیش کئے تھے۔ تاریخ میں اس واقعے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ عثمانؒ نے شہزادہ سلطان محمد کی عقیدت کو دیکھتے ہوئے یہ تحائف قبول کر لئے تھے..... مگر ملتان میں مستقل قیام سے انکار کر دیا تھا۔

ابھی حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ ملتان میں سکونت پذیر تھے کہ ایک دن شہزادہ خان شہید نے محفلِ شعرو سخن آراستہ کی اور حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ کو بھی شریکِ محفل ہونے کی دعوت دی۔ حضرت شیخ عثمانؒ، حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ کے صاحبزادے اور خلیفہ اکبر حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے ہمراہ محفل میں تشریف لائے۔

خوش الحان مطرب نے عربی اشعار پڑھنا شروع کئے۔ ایک شعر پر حضرت شیخ عثمانؒ اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کو وجد آ گیا، اضطرابی حالت میں یہ دونوں بزرگ کھڑے ہو گئے۔ مشائخ کے احترام میں پوری محفل کھڑی ہو گئی اور شہزادہ سلطان محمد نے بھی اہل محفل کا ساتھ دیا۔

حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ پر بہت دیر تک وجد کی کیفیت طاری رہی۔ اس دوران شہزادہ خان شہید دست بستہ کھڑا رہا اور اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔

بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں نے تحریر کیا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد کی مجلس میں شریک ہونے والے شیخ عثمانؒ دراصل حضرت لال شہباز قلندرؒ تھے..... مگر فرشتہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بزرگ ”ترمذ“ کے رہنے والے اور کوئی شیخ عثمانؒ تھے۔ اس سلسلے میں تذکرہ نگار یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ کاتب کی غلطی کے سبب ”مروند“ کی جگہ ”ترمذ“ لکھ دیا گیا۔ حالانکہ ”مروند“ اور ”ترمذ“ کی ظاہری ساخت میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس دلیل کے جواب میں کہنے والے کہتے ہیں کہ مؤرخ قاسم فرشتہ سے سہو ہو گیا اور اُس نے ”مروند“ کی جگہ ”ترمذ“ لکھ دیا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اس واقعے کو ذرا تفصیل سے پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ ضیاء الدین برنی، سلطان غیاث الدین بلبن کی حکومت کے آخری سال یعنی 684ھ میں پیدا ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے 673ھ میں انتقال فرمایا۔ یعنی حضرت قلندرؒ کے وصال کے گیارہ سال بعد ضیاء الدین برنی پیدا ہوا۔ اس لئے ان واقعات کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر اور قریب ترین راوی صرف ضیاء الدین برنی ہے۔ اس کے برعکس محمد قاسم فرشتہ تقریباً تین سو سال بعد 1552ء میں پیدا ہوا۔ اس لئے فرشتہ نے بیشتر واقعات میں ضیاء الدین برنی ہی پر انحصار کیا ہے۔ حضرت شیخ عثمانؒ اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کا یہ واقعہ بھی برنی کی مشہور تاریخ ”فیروز شاہی“ سے ماخوذ ہے۔

مندرجہ بالا واقعے کو ضیاء الدین برنی اس طرح بیان کرتا ہے:

”میں ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی کا مؤلف ہوں۔ میں نے حضرت امیر خسروؒ اور خواجہ امیر سنجرؒ سے بارہا خان شہید کی تعریف میں سنا ہے کہ ہم نے خان شہید جیسا با ادب اور مہذب شہزادہ کم دیکھا ہے۔ اگر وہ ساری رات اور دن مسند امارت پر بیٹھتا تو زانوائے ادب بلند نہ کرتا۔ ہم نے کبھی اُسے ایسی مجلسوں میں پالتی مار کر بیٹھے نہیں دیکھا۔ وہ شراب کی محفل میں ہوتا یا کسی دوسری مجلس میں، ہم نے کبھی اس کی زبان سے کوئی لغو، بے ہودہ اور فحش بات نہیں سنی۔ وہ صرف اتنی شراب پیتا کہ اس سے مستی اور بے خودی نہ ہو۔“

آگے چل کر ضیاء الدین برنی تحریر کرتا ہے:

”شیخ عثمان مریدیؒ ایک بڑے بزرگ تھے۔ وہ ملتان تشریف لائے تو شہزادہ خان شہید نے اپنی عقیدت مندی اور معرفت کی وجہ سے ان کی بہت تواضع کی اور بہت کچھ ان کی نذر کیا۔ شہزادے کی کوشش تھی کہ انہیں ملتان ہی میں رکھے اور ان کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائے۔ مگر عثمانؒ نے وہاں قیام کرنا منظور نہیں کیا۔ ایک دن خان شہید نے شیخ عثمانؒ اور شیخ صدر الدین عارفؒ کو اپنی مجلس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ محفل میں عربی غزلیں سنی گئیں۔ یکایک شیخ عثمانؒ اور دوسرے درویش وجد کی حالت میں رقص کرنے لگے۔ جتنی دیر یہ لوگ جذب کی کیفیت میں رقص کرتے رہے، شہزادہ خان شہید برابر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور زار و قطار روتا رہا۔ شہزادے کی عادت تھی کہ اگر مجلس میں اس کے دوست (مصاحب) کوئی ایسا شعر پڑھتے جس میں وعظ و نصیحت کی باتیں ہوتیں تو وہ سارے کام چھوڑ کر انتہائی عقیدت اور یقین کے ساتھ سنتا اور بہت زیادہ روتا۔ یہاں تک کہ حاضرین اُس کی سخن فہمی پر حیران رہ جاتے۔“

ضیاء الدین برنی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شیخ عثمان مریدیؒ تھے۔ ”تاریخ فیروز شاہی“ کے مترجم ڈاکٹر سید معین الحق نے کتاب کے حاشیے میں تحریر کیا ہے:

”مریدی“ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ صحیح لفظ ”ترمذی“ ہوگا۔“

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر سید معین الحق نے تاریخ فرشتہ کو سامنے رکھ کر یہ رائے قائم کی ہوگی کیونکہ فرشتہ نے شیخ عثمانؒ کے ساتھ ”ترمذی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے ”مریدی“ ہی تحریر

کیا ہے۔ فرشتہ کے لئے یہ لفظ اجنبی تھا۔ نتیجتاً اس نے مریدی کو ترمذی سے تبدیل کر دیا۔ اگر ہمارے تذکرہ نگار اس بات پر اصرار کریں کہ شیخ عثمانؒ، لال شہباز قلندرؒ ہی تھے تو پھر ”مریدی“ کی جگہ ”ترمذی“ ہونا چاہئے۔ کیونکہ حضرت قلندرؒ کا وطن مالوف ”ترمذ“ تھا۔ اگرچہ محمد قاسم فرشتہ، بزرگان دین سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ مشائخ کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتا تھا اور دنیا سے گزر جانے والے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتا تھا..... لیکن وہ شیخ عثمانؒ کے حوالے سے ”مریدی“ کی تحقیق نہ کر سکا..... اور اگر بالفرض قاسم فرشتہ نے تحقیق کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچ سکا کہ شیخ عثمانؒ، ترمذ کے رہنے والے تھے اور اتفاق سے ملتان چلے آئے تھے اور ان کی ملاقات شہزادہ خان شہید سے ہوئی تھی۔

تاریخ فرشتہ اور ”تاریخ فیروز شاہی“ دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت امیر خسروؒ اور خواجہ حسن سبکیؒ آخر تک شہزادہ خان محمد کے دربار سے وابستہ رہے۔ منگولوں کے حملے میں شہزادہ سلطان محمد شہید ہوا تھا، اسی میں مغل، حضرت امیر خسروؒ کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے شیخ عثمانؒ اور شہزادہ خان شہید کی اس ملاقات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شیخ عثمانؒ 670ھ کے قریب ملتان تشریف لائے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ خان شہید کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا..... اور حضرت امیر خسروؒ 680ھ میں شہزادہ سلطان محمد کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔

اب اگر ہم تاریخی حقائق کے حوالے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ اور شہزادہ خان شہید کی ملاقات کا جائزہ لیں تو جس مجلس شعرو سخن کا ذکر ضیاء الدین برنی اور محمد قاسم فرشتہ نے کیا ہے، اس کا انعقاد 670ھ سے پہلے ممکن نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت لال شہباز قلندرؒ آخری بار ملتان تشریف لائے تھے۔ واضح رہے کہ حضرت سید عثمان مروندیؒ کی عمر اس وقت سو سال کے قریب تھی۔ 673ھ میں آپؒ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ یعنی اپنی وفات سے تین سال پہلے آپؒ ملتان تشریف لائے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں حضرت لال شہباز قلندرؒ پر مکمل جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب آپؒ کی ملاقات شہزادہ خان شہید سے ہوئی، اس وقت سید عثمانؒ پورے برصغیر میں ”لال شہباز قلندرؒ“ کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ قاسم فرشتہ، ضیاء الدین برنی کے تین سو سال بعد پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے برنی کی بعض روایات کی تصحیح بھی کی۔ پھر کیا سبب ہے کہ اُس نے شیخ عثمان ترمذیؒ تحریر کیا اور حاشیے میں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ شیخ عثمانؒ ہی دراصل لال شہباز قلندرؒ تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ شیخ عثمان ترمذیؒ کوئی دوسرے بزرگ تھے۔

اب ان قیاسات کا ذکر کہ جن کے سہارے شیخ عثمانؒ کو لال شہباز قلندرؒ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ کہ حضرت قلندرؒ اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ میں گہرے مراسم موجود تھے۔ اکثر تذکروں سے دونوں بزرگوں کی ملاقاتیں ثابت ہیں۔ چونکہ شہزادہ خان شہید کی مجلس شعرو سخن میں حضرت شیخ صدر

الدین عارفؒ بھی موجود تھے، اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت شیخ عارفؒ سے ملنے کے لئے ملتان آئے ہوں گے اور پھر ان ہی کے ساتھ شہزادہ سلطان محمد کی مجلس میں تشریف لے گئے ہوں گے۔

دوسرے یہ کہ حضرت لال شہبازؒ، قلندرانہ مزاج رکھتے تھے، اس لئے مراعاتِ شاہی کو قبول نہیں کیا۔ اسی شانِ بے نیازی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہزادہ خان شہید کی مجلس میں شریک ہونے والے شیخ عثمان، لال شہباز قلندرؒ ہی تھے۔

تیسرے یہ کہ ضیاء الدین برنی اور محمد قاسم فرشتہ نے شیخ عثمانؒ کے علم و فضل کا ذکر کیا ہے۔ برٹن کی تصنیف کردہ ہسٹری آف سندھ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، لسانیات اور صرف و نحو کے بہت بڑے عالم تھے۔

چوتھے یہ کہ ضیاء الدین برنی کی روایات کے مطابق شیخ عثمانؒ نے جذب و کیف کی حالت میں سرِ مجلس والہانہ رقص کیا تھا۔ چونکہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کا رقص کرنا تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اس لئے شیخ عثمانؒ نامی بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ ہی ہو سکتے ہیں۔

اور آخری بات یہ کہ ہمیں کسی معتبر کتاب کے حوالے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شیخ عثمان ترمذیؒ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس سلسلہٴ روحانیت سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بزرگ حضرت لال شہباز قلندرؒ ہی تھے۔

ویسے اس ذیل میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم نے تحقیق کا یہ تمام سفر صرف ناموں کی یکسانیت، اندازوں اور قیاسات کے سہارے طے کیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ذاتِ گرامی پر مزید تحقیق کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ محض خوش عقیدگی اور ضعیف و کمزور روایتوں کی بنیاد پر حضرت لال شہباز قلندرؒ جیسے جانباز صوفی کے مقامِ روحانی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔



”تحفۃ الکرام“ کے مصنف علی شیر قانع کا بیان ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ، ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔

دو قلندروں اور دو صوفیوں کی اس ملاقات کو بعض غیر ذمہ دار تذکرہ نگاروں نے بڑے عجیب انداز میں پیش کیا ہے۔ ”الشہباز“ کے مصنف جلیل سیوہانی کی روایت ملاحظہ کیجئے:

”ہندوستان کی سیر و سیاحت کے دوران حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے بھی حضرت لال شہباز قلندرؒ سے کئی مقابلے کئے لیکن ہر بار مات کھائی۔ ایسے کچھ مقابلوں کی تفصیلات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔“

صرف اسی ایک جملے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف کی ذہنی سطح کیا ہے اور وہ بزرگانِ دین کے سلسلے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ مجھے مجبوراً اس غیر معتبر کتاب سے چند اقتباس پیش کرنے پڑ رہے ہیں کہ ایک اہم موضوع پر گفتگو کی جاسکے۔

جلیل سیوہانی اپنی کتاب ”الشہباز“ میں فرماتے ہیں:

”ایک بار حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ ایک کچی دیوار پر چڑھ کر اسے سواری (گھوڑے) کی طرح دوڑاتے چلے گئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے یہ منظر دیکھا تو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی دیوار کھڑی ہو گئی۔“ (دیوار کھڑی ہونے سے مصنف کی مراد ہے کہ دیوار رک گئی اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اپنے مقصد یا اظہار کرامت میں ناکام ہو گئے)

”الشہباز“ کے مصنف دوسرا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حضرت لال شہباز قلندرؒ فقیرانہ لباس پہننے کے بعد ہمیشہ شیر کی سواری کرتے تھے اور ایک سیاہ سانپ چابک کے طور پر آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت لال شہباز قلندرؒ، حضرت بوعلی قلندرؒ کے مہمان ہوئے۔

”شیخ! آپ کا شیر اور سانپ کیا کھاتے ہیں؟“ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہباز قلندرؒ سے پوچھا۔

”میرے شیر کی غذا گائے ہے اور میرا سانپ مرغ کھاتا ہے۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے جواباً فرمایا۔

یہ سن کر حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اپنے مہمان سے کہا۔ ”تو پھر اُن کی غذا تلاش کر لیجئے۔“ اپنے میزبان کی فرمائش پر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شیر کو گائے کے باڑے کی طرف اور سانپ کو مرغیوں کے ڈربے کی جانب روانہ کیا۔

پھر جیسے ہی حضرت لال شہباز قلندرؒ کا شیر اور سانپ اپنی اپنی غذا کی تلاش میں چلے تو حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اشارہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے گائے نے شیر کو اور مرغ نے سانپ کو کھالیا۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنی سواری اور چابک کو طلب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”زمین کبھی کسی کی امانت ہضم نہیں کرتی۔“ یہ کہہ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شیر اور سانپ کو آواز دی۔

ابھی فضا میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ شیر گائے کے اور سانپ مرغ کے پیٹ سے صحیح و سلامت نکل آئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنی سواری اور چابک کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تمہیں گائے اور مرغ کیسے کھا گئے؟“

شیر اور سانپ نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہم مہمان تھے، اس لئے ہم نے اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔“

شیر اور سانپ کا جواب سن کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ”اب تم دونوں انہیں کھا جاؤ۔“ پھر دوسرے ہی لمحے شیر نے گائے اور سانپ نے مرغ کو کھالیا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تم نے ہماری امانت میں خیانت کی، اسی طرح تمہارے فقراء (مرید) ہمارے فقراء کی امانتیں ہضم کر جائیں گے۔ لہذا ہم تمہارا فقر بند کئے دیتے ہیں، البتہ تمہاری فقیری اور لنگر کو جاری رکھا جاتا ہے۔“

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مصنف اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے کہ اسی لئے حضرت لال شہباز قلندرؒ کا فقر قائم اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا فقر ختم ہے۔ البتہ ان کی درگاہ کا لنگر آج تک جاری ہے۔

”الشہباز“ کے مصنف نے اپنے بیان کردہ واقعے کے سلسلے میں کسی معتبر کتاب کا حوالہ پیش نہیں کیا۔ اگر بالفرض وہ کوئی حوالہ پیش بھی کر دیتے تو اس بے سرو پا قصے پر کون یقین کرتا؟ یہ مسلمان بزرگوں کی کرامت نہیں، کوئی دیو مالائی افسانہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ ”طلسم ہو شربا“ کا کوئی باب قرار دیا جاسکتا ہے ایک ”الشہباز“ پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایسی روایتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں جنہیں پڑھ کر معاذ اللہ! مسلمان بزرگوں پر جادوگر اور شعبدہ باز ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ طلسماتی قصے تحریر کرنا، اسلام کی خدمت نہیں۔ آج کا بے بنیاد قصہ، کل کی روایت میں ڈھل جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اکثر بزرگوں کے ساتھ ان کے کم عقل عقیدت مندوں نے یہی سلوک کیا ہے۔ اپنے روحانی سلسلے کو دوسرے سلاسل سے بہتر ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے افسانے تراشے گئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی صورت حال کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

خداوند ترے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

میں ذاتی طور پر دوائیے مصنفوں کو جانتا ہوں جو اپنے ذہن سے محیر العقول واقعات تراشتے تھے اور بزرگان دین کے ناموں سے منسوب کر دیتے تھے۔ جب آسمانی کتابوں میں تحریف کی جاسکتی ہے اور سرور کونین ﷺ کی احادیث مقدس میں جھوٹی حدیثیں شامل کی جاسکتی ہیں تو اولیاء اللہ کے ناموں کے ساتھ جھوٹے واقعات منسوب کر دینا کوئی مشکل کام ہے؟

جس شخص نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ اور حضرت لال شہبازؒ کے حوالے سے مذکورہ واقعات تحریر کئے ہیں، اسے اندازہ ہی نہیں کہ برصغیر پاک و ہند کچھ یہ دونوں بزرگ کون تھے اور روحانیت کے کس مقام پر فائز تھے۔ ”قلندری“ اس کا نام نہیں کہ کوئی ولی شیر پر سوار ہو جائے۔ درندوں کا مطیع و فرمانبردار ہو جانا تو ولایت کی ایک عام سی نشانی ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے نفس کے شیر پر سواری کی ہوگی کیونکہ انسانی نفس شیر سے بھی زیادہ طاقتور اور خونخوار ہوتا ہے۔ اکثر انسان نفس نام کے اسی درندے کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ استاد ذوق دہلوی کے بقول۔

بڑے موذی کو مارا، نفس امارہ کو گر مارا

نہنگ و اژدھا و شیر نہ مارا تو کیا مارا

اس واقعے کے راوی کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کس شان کے بزرگ تھے؟ آپؒ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؒ کا نام نامی شیخ شرف الدین تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے عظیم صوفی، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی اکثر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت قلندرؒ کا مزاج تھا کہ کہ

نہیں فرماتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کی شدید خواہش تھی کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کسی طرح اُس کی نذر قبول فرمائیں۔ پھر جب اُسے قلندرؒ کی ادائے بے نیازی کے بارے میں معلوم ہوا تو اُس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے سفارش کرائی۔ کسی درباری نے سلطان علاء الدین پر یہ راز ظاہر کر دیا تھا کہ حضرت بوعلی شاہؒ، حضرت محبوب الہی کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کہنے کو نہیں ٹالیں گے۔ آخر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین کے تحائف کے ساتھ اپنے ایک خدمت گار کو حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔

”شیخ! سلطان کی دیرینہ آرزو ہے کہ وہ درویشوں کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔ میں جانتا ہوں کہ امراء کی نذریں قبول کرنا آپ کے شایانِ شان نہیں مگر میری خاطر سلطان کے تحائف قبول فرما لیجئے۔“

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے اپنی عادت کے خلاف حضرت محبوب الہی کے احترام میں سلطان علاء الدین کے قیمتی تحائف قبول کر لئے مگر دوسرے ہی لمحے شاہی کارندوں کے سامنے، ساری رقم کھڑے کھڑے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین کی سفارش اس لئے کی تھی کہ فرمانروائے ہند کو ایک قلندر کی شان بے نیازی کا اندازہ ہو جائے۔ یہ خرقہ پوش اور بوریائشیں حقیقتاً اقلیم معرفت کے تاجدار ہوتے ہیں جن کے نظروں میں شاہانِ ظاہری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے بقول قلندر جز دو حرف ”لا الہ“ کچھ بھی نہیں رکھتا

مگر اُس کے قدموں میں سیم و زر کے دریا بہتے ہیں اور شاہانِ وقت اُس کے آستانے پر اس امید میں سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں کہ قلندر انہیں ایک نظر ہی دیکھ لے۔ یہی شان حضرت بوعلی قلندرؒ کی تھی۔ ”تحفۃ الکرام“ کے مصنف شیر علی قانع تحریر کرتے ہیں: ”حضرت لال شہباز قلندرؒ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں پہنچے۔“

شیر علی قانع نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اس وقت حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ دہلی میں مقیم تھے یا پانی پت میں؟ بہر حال حضرت بوعلی شاہؒ، حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ساتھ نہایت محبت و احترام سے پیش آئے۔ کئی دن تک خاطر مدارات کی۔ کچھ عرصے تک دونوں بزرگ ایک دوسرے کی محبت سے فیض یاب ہوئے۔ رسم میزبانی ادا کرنے کے بعد ایک روز حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت لال شہبازؒ سے فرمایا۔

”اس وقت ہند میں تین سو قلندر موجود ہیں۔ آپ سندھ تشریف لے جائیں۔ اس علاقے کو آپ کی ضرورت ہے۔“

شیر علی قانع نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مشورے سے حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون تشریف لے آئے اور مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔

پروفیسر معین الدین درانی نے اپنی تصنیف ”مجلس صوفیہ“ میں اور اعجاز الحق قدوسی نے اپنی تالیف ”صوفیائے سندھ“ میں ”تحفۃ الکرام“ کی اسی روایت کو نقل کیا ہے۔

کہاں وہ روایت کہ حضرت لال شہبازؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ سے فرمایا۔ ”جس طرح تم نے امانت میں خیانت کی ہے، اسی طرح تمہارے فقراء، ہمارے فقراء کی امانتیں ہضم کر جائیں گے، لہذا تمہارے فقر کو ختم کیا جاتا ہے۔“

اور کہاں یہ روایت کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے مشورے سے سرزمین سہون کو وہ رونق بخشی جس کی ضیاء باریوں کو مسلمان تو مسلمان، اہل ہنود بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔



بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تو آپؒ کے ساتھ درویشوں اور خدمت گاروں کی ایک بڑی جماعت بھی تھی۔ ان خادموں میں ایک ہندو بنیا بھی تھا جس کا نام کانوگنو تھا۔ شروع میں وہ بنیا دکانداری کرتا تھا اور جب بھی اسے فرصت ملتی تھی، حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کانوگنو کی طبیعت کاروبار سے ہٹ گئی اور وہ مستقل طور پر حضرت مخدومؒ کی خدمت میں رہنے لگا۔

”تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟“ ایک دن حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ہندو بنیے سے پوچھا۔
”اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔“ کانوگنو نے عرض کیا۔

”پھر پیٹ کس طرح بھرو گے؟“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے عقیدت مند سے سوال کیا۔

”شیخ کے صدقے میں پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے۔“ کانوگنو نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ہندو بنیے سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اُس کے بیٹوں نے دکانداری شروع کر دی اور انہیں اس قدر منافع حاصل ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ لوگ خوشحال ہو گئے۔ مگر کانوگنو، حضرت قلندرؒ کے قدموں ہی میں پڑا رہا۔

کانوگنو ایمان تو نہیں لایا لیکن اسے حضرت لال شہباز قلندرؒ سے عشق کی حد تک عقیدت تھی..... اور حضرت قلندرؒ بھی اس پر بہت کرم فرماتے تھے۔ کانوگنو نے آپؒ کی اس قدر خدمت کی کہ آج بھی اُسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ عرس کے موقع پر جہاں مسلمان اپنی رسمیں ادا کرتے ہیں، وہاں کانوگنو خاندان کے ہندو بھی بطور خاص اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔



سہون شریف کے ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے جس کے اندر ایک قدیم غار موجود ہے۔ اس غار کے بارے میں ہندوستان کا مشہور مؤرخ دوارکا پرشاد لکھتا ہے۔ ”پچیس ہزار سال پہلے جب انسان غاروں میں رہتے تھے تو یہ غار بنی نوع آدم کا مسکن تھا۔“

اسی غار میں حضرت لال شہباز قلندرؒ نے چلہ کشی کی تھی۔ غار کے اندر درمیان میں ایک بڑی سی

چٹان نما سل رکھی ہے، جسے ”یک بھٹی“ کہتے ہیں۔ غار میں قبلے کے رخ پر ایک محراب بھی ہے۔ اس سل پر بیٹھ کر حضرت لال شہباز قلندر عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ہموار پہاڑی ہے جسے فرش کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس جگہ تقریباً چار سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

1009ء میں میر ابو القاسم نمکین، سہون کے صوبیدار تھے۔ روایت ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں اسی جگہ کچہری لگا کر لوگوں کے مسائل سنا کرتے تھے۔

غار میں شمال کی سمت ایک قبر بھی ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرت لال شہباز قلندر کے ایک دولت مند مرید کا مدفن ہے جس نے اپنی تمام دولت اور جائیداد چھوڑ کر، ساری زندگی اپنے پیرومرشد کی خدمت میں بسر کر دی تھی۔



اسی طرح سہون کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ”لال باغ“ بھی ہے جو آپ ہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس باغ کے نزدیک ایک پہاڑی بھی ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت لال شہباز قلندر اس جگہ بھی ایک طویل عرصے تک چلہ کش رہے تھے۔ لال باغ کا رقبہ تقریباً پانچ سو ایکڑ ہے۔ اس باغ میں مختلف پھلوں کے درخت ہیں۔ اسے ”لال واہی“ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس باغ کے اندر ایک پہاڑ بھی ہے جس سے چشمہ بہتا ہے اور اسی چشمے کا پانی باغ کے حوضوں میں بھر آتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندر کی آمد سے پہلے نہ یہ باغ تھا اور نہ چشمہ۔ اہل نظر اسے حضرت لال شہباز قلندر کی کرامت سمجھتے ہیں کہ ایک مرد خدا کے قدم پڑتے ہی پتھر کا جگر نرم ہو گیا اور اس سے ایک چشمہ پھوٹا۔

کراچی سے آگے ”منگھو“ نامی پہاڑی پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ہم عصر بزرگ دفن ہیں۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ بزرگ حضرت بابا فرید الحسن مسعود گنج شکر کے خلیفہ ہیں اور منگھو پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی پہاڑ پر حضرت لال شہباز قلندر کے نام پر ایک بستی آباد ہے جس کے دونوں جانب خوب صورت باغ ہیں۔ یہ جگہ درویشوں کا مسکن ہے۔ مشہور ہے کہ اس مقام پر بھی حضرت لال شہباز قلندر نے چلہ کشی کی تھی۔

روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندر نے سندھ کے ایک گاؤں ”ریحان“ میں بھی کچھ دن قیام فرمایا تھا۔ اس سفر میں حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ بعد میں یہی گاؤں حضرت رکن الدین کی نسبت سے ”رکن پور“ کہلانے لگا۔ جب حضرت لال شہباز قلندر اس دیہات میں تشریف لے گئے تو یہ ایک ویران علاقہ تھا اور یہاں کی زمین بنجر تھی۔ پھر اللہ نے اپنے دو برگزیدہ بندوں کے قیام کی برکت سے اس زمین کی سرشت بدل ڈالی۔ علاقہ بھی آباد ہو گیا اور زمین بھی سرسبزی و شادابی کا خزانہ اُگلنے لگی۔ آج بھی ”رکن پور“ میں حضرت لال شہباز قلندر کے قیام کے آثار پائے جاتے ہیں۔

آپ کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی جس کی وجہ سے ہر مکتب فکر کے لوگ آپ سے متاثر

ہوتے تھے۔ آپؐ کا مسلک قلندری تھا، اس لئے نہ کسی حکمران سے مرعوب ہوئے، نہ دربار شاہی کی طرف دیکھا اور نہ مال و زر کی خواہش کی۔ عقیدت مند قیمتی نذریں قدموں میں ڈھیر کر دیتے مگر آپؐ فوراً ہی ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیتے۔ شدید ریاضت و عبادت کے علاوہ سخاوت آپؐ کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ اسی لئے آپؐ کو سخی شہباز قلندرؒ بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ روایت ہے کہ جب حضرت لال شہباز قلندرؒ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے، جونا گڑھ تشریف لائے تو مقامی باشندے ایک عجیب صورت حال سے دوچار تھے۔ دن میں ایک مقررہ وقت پر ایک زنبیل اور ڈنڈا نمودار ہوتے تھے اور اس شہر کے رہنے والوں سے خیرات و صدقات وصول کرتے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ مانگنے والے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے۔ بس ایک آواز سنائی دیتی تھی۔

”جسے جو کچھ دینا ہے، اس زنبیل میں ڈال دے۔“

مقامی آبادی کے لوگ خوش عقیدگی کے طور پر یا خوف زدہ ہو کر اس زنبیل میں حسب استطاعت رقم اور دوسری چیزیں ڈال دیا کرتے تھے۔ کہنے کو وہ ایک چھوٹا سا کاسہ تھا مگر اس میں بہت سا سامان سما جاتا تھا، پھر بھی کاسہ خالی رہتا تھا۔ اسی شہر (جونا گڑھ) میں ایک درویش بھی قیام پذیر تھے۔ جب ان بزرگ نے لوگوں کی زبانی یہ محیر العقول واقعہ سنا تو انہیں اعتبار نہیں آیا۔ پھر اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ روایت ہے کہ ان درویش نے بہت کوشش کی مگر وہ زنبیل اور ڈنڈا اپنے کام میں مصروف رہے۔ بزرگ نے کئی بار نادیدہ شخص کو مخاطب کر کے کہا۔

”اگر تم کوئی بزرگ ہو تو سامنے کیوں نہیں آتے؟“

مگر جواب میں کوئی آواز نہیں ابھری۔ زنبیل اور ڈنڈا حسب دستور گردش کرتے رہے اور مقامی باشندوں سے صدقات و خیرات وصول کرتے رہے۔ اس پراسرار عمل کا خاص پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اس زنبیل میں کچھ ڈال دیتا تو اسے مالی یا کسی اور قسم کا فائدہ پہنچ جاتا..... اور اگر کوئی شخص صدقہ دینے سے انکار کر دیتا تو اسے کسی عنوان کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

جونا گڑھ میں رہنے والے درویش خود بھی روحانی قوتوں کے مالک تھے مگر وہ اس زنبیل کی گردش کو روکنے سے قاصر رہے۔ ان بزرگ نے بارہا اپنے اوراد و وظائف سے بھی کام لیا مگر زنبیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان ساری کوششوں کے بعد درویش کو ایک بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی شیطانی خلل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آیات قرآنی کی تلاوت کے سامنے کسی باطل شے کا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔

قصہ مختصر! جونا گڑھ کے وہ بزرگ اس ”زنبیل اور ڈنڈے“ سے سخت پریشان تھے۔ اسی دوران حضرت لال شہباز قلندرؒ (پاکستان کے حوالے سے) اس تاریخی شہر میں تشریف لائے۔ درویش فوری طور پر آپؐ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے درویش کی زبانی پورا واقعہ سننے کے بعد فرمایا۔ ”اس فقیر کو اس جگہ

نے چلو۔“

حضرت قلندر شہر سے باہر مقیم تھے۔ درویش وقت کا انتظار کرتا رہا۔ پھر مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے درویش نے حضرت لال شہباز قلندر سے اُس محلے میں چلنے کی درخواست کی جہاں برسوں سے یہ پراسرار عمل جاری تھا۔ پھر جب حضرت قلندر وہاں تشریف لے گئے تو آپؐ نے دیکھا کہ ایک زنبیل اور ڈنڈا دروازے دروازے گردش کر رہے تھے اور لوگ انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنی نذریں اس کا سے میں ڈال رہے تھے۔

حضرت لال شہباز قلندر ایک دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں چیزیں گردش کرتی ہوئی حضرت قلندر کے پاس آئیں تو آپؐ نے اپنا دست مبارک بڑھایا۔ زنبیل اور ڈنڈا، دونوں خود بخود حضرت قلندر کے ہاتھ میں آ گئے۔ درویش کے ساتھ محلے کے تمام لوگ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

حضرت لال شہباز قلندر نے وہ دونوں چیزیں درویش کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا۔
”یہ ڈنڈا مجھے دے دو۔“

درویش نے حضرت قلندر کے حکم پر عمل کرتے ہوئے وہ ”پراسرار“ ڈنڈا آپؐ کے حوالے کر دیا۔ پھر حضرت لال شہباز قلندر نے درویش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ زنبیل اپنے پاس رکھ لو اور آج سے تم زنبیل شاہ ہو۔ جو بھی تمہاری زنبیل سے کھائے گا، وہ فیض یاب ہوگا۔“
اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندر جو ناگڑھ سے سہون تشریف لے آئے۔ آپؐ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جو ناگڑھ کے ان بزرگ کا اصلی نام کوئی نہیں جانتا۔ مگر ”زنبیل شاہ“ کے نام سے وہ آج بھی مشہور ہیں۔ روایت ہے کہ جب بھی کسی دیوانے شخص کے عزیز واقارب زنبیل شاہ کے مزار پر نجا کر دُعا کرتے ہیں، اللہ اس پاگل کو صحت عطا کر دیتا ہے..... اور یہ حضرت لال شہباز قلندر کا فیض روحانی ہے۔



یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت لال شہباز قلندر بخارا میں مقیم تھے۔ اس وقت آپؐ کا عہد شباب تھا مگر شہرت عام ہو چکی تھی۔ بخارا کا بادشاہ بے اولاد تھا۔ اُس نے نامور طبیبوں کے نسخے آزمائے، علماء کے کہنے پر ضرورت مندوں میں دولت تقسیم کی..... لیکن دوا کام آئی اور نہ دُعا۔ آخر ایک وزیر نے بادشاہ کو حضرت لال شہباز قلندر کی خانقاہ کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔
”اگر آپ اس نوجوان درویش سے رجوع کریں تو عجب نہیں کہ اللہ آپ کی مشکل آسان فرما دے۔“

بادشاہ بخارا کو وزیر کی بات پر یقین نہیں آیا لیکن وہ تاج و تخت کے وارث کی تلاش میں تھک چکا تھا، اس لئے قلندر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ ”شیخ! دینے والے نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے مگر میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میرے لئے دُعا فرمائیے کہ خالق انات مجھے بے نشان ہونے

سے بچالے۔“

”کوئی کتنا بھی کثیر الاولاد ہو، مگر بے نشانی ہر شے کا مقدر ہے۔“ شاہ بخارا کی التجاسن کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

”میں اس بے نشانی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ شاہ بخارا نے عرض کیا۔ ”مجھے اپنے تاج و تخت کا وارث چاہئے۔“

”سب کچھ اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شاہ بخارا کو ٹالنے کی غرض سے فرمایا۔ ”جس نے تمہیں تاج و تخت بخشے ہیں، وہی اولاد بھی عطا کرے گا۔ اُسی کے آگے دامن مراد پھیلانے رکھو۔“

”شیخ! میرے گناہ مجھے مایوسی کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں۔“ شاہ بخارا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”اگر میری التجاؤں میں تاثیر ہوتی تو میرا نخل مراداب تک بار آور ہو چکا ہوتا۔“

شاہ بخارا کی عاجزی و بے چارگی دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آپؐ مراقبہ میں ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد حضرت قلندرؒ نے سر اٹھایا اور فرمانروائے بخارا سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہیں بحکم خدا تخت کا وارث تو مل جائے گا مگر اس کی ایک شرط ہے۔“

”شیخ! مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ شاہ بخارا، حضرت قلندرؒ کی زبان مبارک سے اولاد کی نوید سن کر بے اختیار ہو گیا۔

”تمہارے شہزادے میں آدھا حصہ ہمارا ہوگا۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے شاہ بخارا کے سامنے اپنی شرط پیش کر دی۔

”آدھا حصہ؟“ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی شرط سن کر شاہ بخارا حیرت زدہ ہو گیا۔ ”شیخ! میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔“

”وقت تو آنے دو۔ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بے نیازانہ کہا۔

شاہ بخارا سرشاری اور حیرت کے عالم میں قلندرؒ کی خانقاہ سے اٹھ کر چلا گیا۔

پھر تقریباً ایک سال بعد بخارا کا قصر شاہی نقاروں اور شادیانوں کے شور سے گونج اٹھا۔ وزرائے مملکت، امیران سلطنت اور دیگر خدمت گار، شاہ بخارا کو خوب صورت فرزند کی ولادت پر مبارک باد دے رہے تھے..... اور فرمانروائے بخارا کی سماعتوں میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

”بحکم خدا، شہزادہ تو دنیا میں آجائے گا مگر اس میں ہمارا آدھا حصہ ہوگا۔“

شاہ بخارا نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے اس مبہم اشارے سے یہ مفہوم اخذ کیا تھا کہ آپؐ سیم وزر کے طلب گار ہوں گے۔ نتیجتاً وہ انتہائی قیمتی تحائف لے کر حضرت قلندرؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے لعل و جواہر اور دینار و درہم سے بھرے ہوئے طلائی اور نقرئی خوانوں کو دیکھا اور شاہ بخارا کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آپ کا حصہ۔“ شاہ بخارا نے مسرت آمیز لہجے میں عرض کیا۔
 ”یہ تو میرا حصہ نہیں ہے۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے قیمتی تحائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”آپ ہی نے تو یہ شرط رکھی تھی کہ ولی عہد سلطنت میں آدھا حصہ آپ کا ہو گا۔“ شاہ بخارا نے حیران ہو کر کہا۔

”شہزادہ کہاں ہے؟ اسے میرے پاس لے کر آؤ۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ”میں ولی عہد سلطنت سے اپنا حصہ وصول کر لوں گا۔“

شاہ بخارا اب بھی حضرت قلندرؒ کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خانقاہ سے اٹھا اور شہزادے کو لے کر حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

حضرت قلندرؒ نے بڑی محبت سے بخارا کے ولی عہد سلطنت کو اپنی آغوش میں لیا۔ کچھ دیر تک بہت غور سے شہزادے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی گدڑی (خرقے) میں چھپا لیا۔ شاہ بخارا اور اُس کے وزراء دم بخود تھے۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ، ولی عہد سلطنت کو کچھ دیر تک اپنے سینے سے لگائے رہے۔ پھر خوبصورت شہزادے کو شاہ بخارا کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”اب تم جو چاہو کرو، ہم نے اپنا حصہ وصول کر لیا۔“

شاہ بخارا اور اُس کے مصاحب ایک عارف کے رمز و کنایات کو کیا سمجھتے؟ وقت گزرتا رہا اور شہزادہ جوان ہو گیا۔ پھر شاہ بخارا کے انتقال کے بعد شہزادہ تخت نشین ہوا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ولی عہد کا نام ”ادھم“ رکھا تھا اور اب وہی شہزادہ سلطان ادھم کے نام سے بلخ اور بخارا پر حکومت کر رہا تھا۔

روایت ہے کہ سلطان ادھم نے کئی سال تک عدل و انصاف اور پاکبازی کے ساتھ حکومت کی۔ اُس کے عہد اقتدار میں بلخ و بخارا کے باشندے پرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ اچانک سلطان ادھم نے ایک دن اپنے وزراء اور امراء کو طلب کر کے کہا۔

”میرا دل اس فانی دنیا سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ اس لئے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔“

سلطان ادھم کی بات سن کر اراکین سلطنت پریشان ہو گئے۔ ”شہنشاہ! بلخ و بخارا کے عوام کسی دوسرے شخص کی امارت پر راضی نہیں ہوں گے۔ وہ آپ کے انتظامات اور اندازِ حکمرانی سے اس قدر مطمئن ہیں کہ کسی دوسرے فرمانروا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں نے بہت چاہا کہ میں اس آواز کو نظر انداز کر کے دن رات تمہاری خدمت میں مشغول رہوں۔ مگر اب مجھے اپنے ارادوں پر کوئی اختیار نہیں رہا۔“ سلطان ادھم نے امراء سلطنت کی درخواست کے جواب میں کہا۔ ”وہ آواز مجھے پیہم بلا رہی ہے۔“

”وہ کس کی آواز ہے جس نے شہنشاہ کے سکون کو منتشر کر دیا ہے؟“ وزراء اپنے فرمانروا کی گفتگو کا

مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔

”تم اس آواز کو نہیں پہچان سکتے۔“ سلطان ادھم نے کہا۔ ”مجھے جانا ہی ہو گا اور اسی میں میری سلامتی ہے۔“

اس کے بعد سلطان ادھم اپنے چچا زاد بھائی کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ پھر اُس نے درویشانہ لباس پہنا اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کی تلاش میں بلخ و بخارا کی حدود سے نکل کھڑا ہوا۔ ظاہر پرستوں نے اسے بادشاہ کا دماغی خلل سمجھا..... مگر سلطان ادھم بہت دانا اور ذہین تھا۔ وہ اپنی دنیا فروخت کر کے آخرت خریدنا چاہتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ سلطان ادھم، حضرت لال شہباز قلندرؒ کی جستجو میں در در بھٹکتا رہا۔ چہرہ موسم کی سختیوں سے جھلس گیا اور پاؤں آبلوں سے بھر گئے مگر بخارا کے بادشاہ نے ایک قلندر کی تلاش نہیں چھوڑی۔ آخر ایک دن وہ بامراد ہوا اور اُس نے سہون پہنچ کر اپنا سر نیاز حضرت لال شہباز قلندرؒ کے قدموں پر رکھ دیا۔ ”سلطان! کیسے ہو؟“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنا دست مہربان والی بخارا کے سر پر رکھ دیا۔ ”شیخ! بہت مضطرب ہوں۔ دل کی خلش چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔“ سلطان ادھم اپنے آنسوؤں سے قلندر کے پائے مبارک کو بھگوتا رہا۔

”اگر سلطانی چھوڑ کر فقیری مل جائے تو یہ بہت سستا سودا ہو گا۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ”شیخ! میں تو نجات کا طالب ہوں۔“ سلطان ادھم کی گریہ وزاری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ”اس سے مانگتے رہو۔ نجات بھی مل جائے گی۔“ حضرت قلندرؒ نے فرمایا۔

اس کے بعد حضرت لال شہباز قلندرؒ نے سلطان ادھم کو اپنے حلقہ بیعت میں شامل کر لیا۔ پھر طویل ریاضت و مجاہدات کے بعد پیر و مرشد کے حکم سے سلطان ادھم خیر پور کی پہاڑی پر چلے کش ہو گئے۔ آپؒ نے باقی عمر یہیں گزاری اور وفات کے بعد اسی مقام پر آسودہ خاک ہوئے۔ سلطان ادھم کا مزار مبارک آج بھی خیر پور میں موجود ہے۔

بعض تذکروں میں حضرت سلطان ادھم کو ”گودڑ شاہ“ کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ”گدڑی“ پہننے کی وجہ سے لوگ آپؒ کو گودڑ شاہ کے نام سے یاد کرنے لگے ہوں گے۔ برصغیر کے لوگوں کا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے حقیقی نام گم ہو گئے ہیں اور ان ناموں کی جگہ عقیدت مندوں کے وضع کردہ ”القاب و خطاب“ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بزرگ اپنی سواری کے لئے گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ نتیجتاً چاہنے والوں نے انہیں ”گھوڑا شاہ“ کے نام سے مشہور کر دیا۔ ایک اور بزرگ رنگین قبا پہنتے تھے جس پر نسوانی لباس کا گمان ہوتا تھا، انجام کار وہ بزرگ ”سدا سہاگن“ کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ شاید یہی صورت حال سلطان ادھم کے ساتھ بھی پیش آئی ہوگی۔ بہر کیف حضرت لال شہباز قلندرؒ نے سلطان ادھم سے اپنا نصف حصہ اس طرح وصول کیا کہ ان کی آدھی زندگی فقیری میں بسر ہوئی۔ یہ حضرت قلندرؒ کی بڑی کرامت ہے۔



جس زمانے میں حضرت لال شہباز قلندر گرنار میں مقیم تھے، آپ کے گرد حاجت مندوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ یہ زمانے بھر کے ستائے ہوئے، بیمار اور مفلس انسان تھے جنہیں حضرت قلندر کے تسکین آمیز کلمات جینے کا حوصلہ دیتے تھے۔ گرنار میں ایک دل گرفتہ شخص بھی رہتا تھا جس کا جوان لڑکا گم ہو گیا تھا۔ بیٹے کی جدائی میں اُس شخص کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ دن رات روتا رہتا تھا۔ عزیز واقارب اور یار دوست اُسے صبر کی تلقین کے ساتھ بیٹے کی موت کا یقین دلانے کی کوشش بھی کرتے تھے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور لوٹ کر آتا۔ یا تو کسی شخص نے اُسے قتل کر دیا ہو گا یا پھر جنگلی جانور کھا گئے ہوں گے۔ غرض جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ غم زدہ باپ، بیٹے کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی کبھی کبھی اُمید کی ایک لہر اُٹھتی تھی اور وہ اپنی بیوی سے کہتا تھا۔

”میرا بیٹا زندہ ہے۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن وہ آئے گا اور زندہ درگور باپ کے سینے پر سر رکھ دے گا اور ہمارے تاریک مکانوں میں خوشیوں کے چراغ جل اُٹھیں گے۔“

شکستہ ماں کیا جواب دیتی؟ اُس کی حالت تو شوہر سے بھی بدتر تھی۔ بس خاموش نظروں سے اپنے شریک زندگی کی طرف دیکھتی اور آنسو بہانے لگتی۔

پھر جب حضرت لال شہباز قلندر گرنار تشریف لائے اور آپ کے کمالات روحانی کی شہرت عام ہوئی تو ایک دن اُس شخص کے دوست نے کہا۔ ”تم بھی اپنے گم شدہ بیٹے کی بازیابی کے لئے دعا کراؤ۔ بہت سے لوگ اس مرد خدا کی دعاؤں سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔“

غم زدہ باپ کو یوں محسوس ہوا جیسے حق تعالیٰ نے اس کی مدد کے لئے ان بزرگ کو گرنار بھیجا ہے۔ پھر وہ حضرت لال شہباز قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا تو زار و قطار رو رہا تھا۔ ”شیخ! میرا بیٹا مجھے دے دو۔“

”تیرے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟“ حضرت لال شہباز نے غم زدہ باپ کو اپنے قریب بٹھایا اور نہایت شفقت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”اگر میں جانتا تو آپ کے پاس کیوں حاضر ہوتا؟“ شکستہ دل باپ نے عرض کیا۔ ”زمانے ہو گئے۔ ایک دن وہ گھر سے گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گیا مگر میرا دل کبھی کبھی گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

حضرت لال شہباز قلندر نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار کیا۔ پھر فرمایا۔ ”تیرے دل کی گواہی سچی ہے۔ وہ زندہ ہے اور بہت اچھے حالوں میں ہے۔“

یہ نوید جاں فزا سن کر فراق کی آگ میں جلنے والے باپ کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب اچانک ملنے والی خوشی کی تند و تیز لہر کا اثر کچھ کم ہوا تو اس نے حضرت لال شہباز قلندر کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ”شیخ! اس بدنصیب باپ پر رحم کرو۔ اب مجھے تابِ جدائی نہیں۔“

”تو بدنصیب نہیں، ایک خوش قسمت باپ ہے۔ اللہ کا شکر ادا کر!“ حضرت قلندر نے فرمایا۔

”اب تو اس راحتِ جاں کو دیکھ کر ہی اللہ کا شکر ادا کروں گا۔“ بیٹے کی زندگی کی خبر سن کر وہ شخص پہلے سے زیادہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ”وہ کب آئے گا میرے پاس؟“

”وہ خود نہیں آئے گا، اسے جا کر لانا پڑے گا۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

پھر دوسرے دن حضرت قلندرؒ اُس شخص کو لے کر روانہ ہوئے۔ پورا دن چلتے رہے، یہاں تک کہ شام ہو گئی اور آپؒ نے ایک گھنے جنگل میں قیام فرمایا۔ وہ شخص تھک کر چور ہو چکا تھا مگر حضرت قلندرؒ کے چہرہ مبارک پر تھکن کے ہلکے سے آثار تک نہیں تھے۔

”شیخ! اب مجھ سے چلا نہیں جاتا۔“ اُس شخص نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”چلو گے نہیں تو منزل تک کس طرح پہنچو گے؟ بس اب تم سکون سے سو جاؤ۔ انشاء اللہ! صبح تمہیں

تمہاری منزل مل جائے گی۔“ یہ کہہ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ عبادت میں مشغول ہو گئے اور وہ شخص کچھ سنان جگہ کی وجہ سے اور کچھ بیٹے سے ملاقات کے شوق میں رات بھر نہیں سو سکا۔

پھر صبح ہوئی تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا..... مگر یہ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ جنگل کے آخری کنارے پر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہاں کچھ لوگ نظر آئے جو اپنے لباس سے خانہ بدوش دکھائی دیتے تھے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کو دیکھتے ہی وہ خانہ بدوش باادب کھڑے ہو گئے۔

حضرت قلندرؒ نے غم زدہ باپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ”تم یہیں ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر حضرت لال شہبازؒ جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ دراصل وہ جھونپڑی ایک خانقاہ تھی جہاں سات درویش مراقبہ میں مشغول تھے..... اور جو خانہ بدوش باہر بیٹھے تھے، وہ ان درویشوں کے خدمت گار تھے۔

جب حضرت لال شہباز قلندرؒ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو ساتوں درویش استغراق کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت قلندرؒ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان درویشوں کے قریب پہنچے اور پھر آپؒ نے ایک درویش کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔

”تم یہاں سکون سے بیٹھے ہوئے ہو اور کوئی تمہارے فراق کی آگ میں جل کر راکھ ہوا جا رہا ہے۔“

حضرت قلندرؒ کی آواز میں بڑا جلال تھا۔ نو جوان درویش نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کی آواز سن کر دوسرے درویش بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ ایک قلندر کو اپنے سامنے پا کر سارے درویش احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حضرت لال شہبازؒ نے انہیں اپنی دعاؤں سے فیض یاب کیا اور نو جوان درویش کو اپنے ساتھ لے کر جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔

نو جوان درویش نے باپ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔

”تمہارا بیٹا گم نہیں ہوا تھا۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اس باپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جسے

آپؒ کے طفیل اس کی کھوئی ہوئی دولت مل گئی تھی۔ ”یہ دنیا کے قابل نہیں اور دنیا اس کے لائق نہیں ہے۔“

”میرا بے قرار دل سکون پا گیا اور پیاسی آنکھیں سیراب ہو گئیں۔“ اس شخص نے حضرت قلندرؒ کا

شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرا بیٹا دنیا کے قابل نہیں ہے تو پھر آپ اسے اپنے قدموں میں جگہ

دیجئے۔“

پھر وہ نو جوان درویش، ماں باپ کی اجازت سے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں مشغول ہو

گیا اور ایک دن منصب ولایت پر فائز ہوا۔



حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک اور کرامت بھی مشہور ہے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت قلندرؒ مستقل طور پر سہون میں قیام پذیر تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اتفاق سے قاضی شہر کا گزر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ اپنی خانقاہ کے دروازے پر بیٹھے روٹی پکا رہے تھے۔ قاضی شہر کو قلندرؒ کے اس عمل پر بہت تعجب ہوا۔ وہ ٹھہر گیا اور اس نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”شیخ! آپ رمضان المبارک کے مہینے میں روٹی پکا رہے ہیں؟“

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے قاضی شہر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”معاف کرنا قاضی صاحب! ہم بھول گئے تھے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔“ اتنا کہہ کر حضرت قلندرؒ نے کچی روٹی آگ میں دبا دی۔ پھر اپنے چہرہ مبارک پر چادر ڈال لی اور ذکر الہی میں مشغول ہو گئے۔

قاضی شہر، علمائے طاہر میں سے تھے اور درویشوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی لئے قاضی صاحب نے حضرت لال شہباز قلندرؒ پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ رمضان کے مہینے میں بھی روٹی پکا رہے ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فرقہ ملامتیہ کے بزرگ نفس کشی کے لئے انتہائی دُشوار گزار راستے اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ حقیقتاً روزے سے ہوتے ہیں مگر اہل دنیا پر کچھ اور ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بھی قاضی شہر کے سامنے کچھ ایسا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

پھر رمضان المبارک کا پورا مہینہ گزر گیا اور عید آگئی۔ قاضی شہر، ایک قلندر کی عید کا منظر دیکھنے کے لئے خانقاہ کی طرف سے گزرے اور حیرت زدہ رہ گئے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ اسی طرح چہرہ مبارک پر چادر ڈالے ہوئے مشاہدہ قدرت میں گم تھے۔ قاضی شہر، حضرت قلندرؒ کے پاس پہنچے اور اعتراضاً کہا۔ ”شیخ! رمضان کا مہینہ ختم ہو گیا۔ آج تو عید کا دن ہے۔“

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے چادر ہٹائی اور قاضی شہر کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”قاضی صاحب! آپ کو عید مبارک ہو۔ اب ہماری روٹی بھی پک گئی ہوگی۔“ یہ کہہ کر آپؒ اپنی نشست سے اٹھے اور چولہے کے قریب پہنچے۔ قاضی شہر نے حیرت سے دیکھا۔ آگ اسی طرح جل رہی تھی۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنا دست مبارک بڑھا کر آگ میں دبی ہوئی روٹی نکال لی۔ یہ منظر دیکھ کر قاضی شہر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ روٹی پک کر تیار ہو چکی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ بے اختیار قاضی شہر کی زبان سے نکلا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ناقابل فہم اور ناقابل یقین۔“ قاضی شہر ایک ولی کی کرامت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے چلے گئے۔

ہمارے قارئین کے لئے بھی یہ واقعہ ناقابل فہم ہوگا۔ ان کے ذہنوں میں مختلف سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں بجھ جانے والی آگ اتنے دن تک کیسے جلتی رہی اور پھر اس میں دبی ہوئی روٹی جل کر راکھ کیوں نہیں ہوئی۔ ان سوالات کی حیثیت اپنی جگہ مگر معجزہ اور کرامت اسی کا نام ہے کہ انسان

کی ظاہری آنکھ اور عقل ان باتوں کو سمجھنے سے عاجز آجائے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے ایک شعر میں اولیاء کی روحانی طاقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

اولیاء راست قدرت از الہ

تیر جستہ باز گرداندز راہ

(اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت بخشی کی گئی ہے کہ وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس

لا سکتے ہیں)

جب سمجھنے والے حضرت مولانا رومؒ کے اس شعر کا حقیقی مفہوم سمجھ لیں گے تو پھر ان پر یہ راز بھی منکشف ہو جائے گا کہ وہ آگ اتنے دن تک کیسے روشن رہی۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی رونی جل کر راکھ کیوں نہیں ہوئی؟



سندھ کے عوام میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک اور کرامت بھی بہت زیادہ مشہور ہے۔ مختلف روایات کے مطابق جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تھے تو آپؒ کے گلے میں مستقل طور پر پتھر کا ایک گلوبند پڑا رہتا تھا۔ اس گلوبند میں چھوٹے چھوٹے پتھر شامل تھے جنہیں بڑی خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی ایک خاص عادت تھی کہ آپؒ راستہ چلتے وقت ہمیشہ سر جھکائے رہتے تھے۔ اسی طرح جب آپؒ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو گردن خم کئے رہتے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ محلہ ”کانوگن“ کے قریب ایک گلی میں اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ اسی محلے میں ”کانوگا“ ایک مشہور ہندو خاندان تھا۔ یہ لوگ پردے کے سخت پابند تھے۔ اس خاندان کی عورتیں ڈولی میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ کانوگا خاندان کی ایک عورت حضرت لال شہباز قلندرؒ سے بے حد عقیدت رکھتی تھی۔ جب بھی آپؒ گلی میں آ کر بیٹھتے، وہ عورت بھی کھڑکی میں چلی آتی اور گھنٹوں حضرت قلندرؒ کی طرف دیکھتی رہتی۔ ہندو عورت کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح حضرت لال شہباز قلندرؒ کا دیدار کر لے مگر آپؒ ہمیشہ سر جھکا کر بیٹھتے تھے، اس لئے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ایک دن ہندو عورت کی وحشت اس قدر بڑھی کہ اُس نے شوق دیدار میں کھڑکی سے چھلانگ لگا دی اور حضرت لال شہباز قلندرؒ کے قدموں میں جاگری۔ اونچائی سے گرنے کے سبب ہندو عورت شدید زخمی ہو گئی تھی۔ اُس نے ایک نظر حضرت قلندرؒ کے چہرہ مبارک کو دیکھا اور دنیا سے رخصت ہو گئی۔

جب محلے کے لوگوں کو معلوم ہوا تو ہر طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ مرنے والی ہندو عورت کے رشتے دار اس کی لاش اٹھانے کے لئے حضرت لال شہباز قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

”اگر آپ اجازت دیں تو اس بدنصیب عورت کو لے جائیں اور اس کی آخری رسوم ادا کر دیں۔“ کانوگا خاندان کے لوگوں نے حضرت قلندرؒ سے اجازت اس لئے چاہی تھی کہ مرنے کے بعد بے

پردگی کے خیال سے حضرت قلندرؒ نے اُس کے جسم پر اپنی چادر ڈال دی تھی..... اور یہ بات بھی خاندان میں مشہور ہو چکی تھی کہ ہندو عورت، لال شہبازؒ سے بے حد عقیدت رکھتی تھی۔

”میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے ان لوگوں کی درخواست سن کر فرمایا۔ ”تمہاری امانت ہے، جہاں چاہو لے جاؤ۔“

حضرت قلندرؒ کی اجازت کے بعد ہندو عورت کے رشتے داروں نے اُس کی لاش اٹھانے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے لاش بہت زیادہ وزنی ہو گئی ہو۔ پھر دوسرے عزیزوں کو بلایا گیا مگر پندرہ بیس افراد مل کر بھی ایک کمزور سی عورت کو نہ اٹھا سکے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ لاش زمین سے چپک گئی ہو۔

”اگر تم پورے شہر کے ہندوؤں کو بھی جمع کر لو گے تو یہ لاش نہیں اٹھ سکے گی۔“ ان لوگوں کو حیران و پریشان دیکھ کر حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

حضرت قلندرؒ کی بات سن کر کانوگا خاندان کے لوگوں پر وحشت طاری ہو گئی۔ ”آخر اس بد نصیب عورت سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے؟“ خاندان کے بوڑھے افراد نے حضرت لال شہبازؒ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”گناہ و ثواب کی بات نہیں ہے۔“ حضرت قلندرؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ”اس عورت کی قسمت میں جلنا نہیں ہے۔“

”پھر ہم کیا کریں؟“ اس عجیب و غریب صورت حال سے اہل ہنود بہت پریشان تھے۔

”اگر تم اسے دفن کرنے کا وعدہ کرو تو لاش اٹھ جائے گی۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ ہندو عورت کی ارتھی اٹھنے کی بجائے جنازہ اٹھا اور اُسے مسلمانوں کے طریقے پر دفن کیا گیا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کی یہ کرامت دیکھ کر کانوگا خاندان کے کئی ہندو آپ کے دست مبارک پر ایمان لے آئے۔

اس عورت کی قبر آج بھی سہون میں موجود ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے عرس کے موقع پر اسی قبر سے ”مہندی“ اُٹھتی ہے..... اور وہ مہندی مختلف علاقوں سے گزر کر حضرت لال شہبازؒ کی درگاہ پر لائی جاتی ہے۔

یہ واقعہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اہل اللہ کی محبت رنگ لاتی ہے اور یہ اسی محبت کا ایک ہلکا سا رنگ ہے۔



”تحفۃ الکرام“ کے مطابق، حضرت لال شہباز قلندرؒ کی آمد سے پہلے سہون میں چٹھہ امرانی ایک درویش رہا کرتا تھا۔ یہ راجہ دکورا کا چھوٹا بھائی تھا مگر بچپن سے مذہب اسلام کے لئے اپنے دل میں انتہائی نرم گوشہ رکھتا تھا۔ پھر یہ دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ چٹھہ امرانی بت پرستی سے بیزار ہو گیا اور

مسلمانوں کی صحبت میں رہنے لگا۔ اہل خاندان نے چٹھہ امرانی سے نفرت کا اظہار کیا تو وہ کسی دوسرے شہر میں چلا گیا اور مذہب اسلام قبول کر کے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ پھر وہ حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہوا اور اُس نے مکہ معظمہ میں رہنے والی ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی۔ چٹھہ امرانی نے ایک طویل عرصہ عرب میں گزارا اور مختلف بزرگوں سے فیض روحانی حاصل کیا۔

پھر جب وہ اپنی بیوی کے ہمراہ لوٹ کر سہون آیا تو اُس کے خلاف نفرتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ راج گھرانے نے چٹھہ امرانی کو اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ اُسے جان سے مارنے کی دھمکیاں تک دی گئیں مگر اُس کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ چٹھہ امرانی نے خونی رشتے سے مجبور ہو کر اپنے بڑے بھائی راجہ دکورا اور دوسرے رشتہ داروں کو قبول اسلام کی دعوت دی اور موثر الفاظ میں عذابِ آخرت سے ڈرایا..... مگر وہ سب کے سب بہرے ہو چکے تھے اور ان کے دلوں پر قفل لگائے جا چکے تھے۔ نتیجتاً تمام لوگوں نے چٹھہ امرانی کی دعوت اسلام کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

چٹھہ امرانی ذہنی طور پر پہلے ہی راج محل سے ترک تعلق کر چکا تھا، اب جسمانی طور پر بھی اپنے عزیزوں سے الگ ہو گیا۔ امیرانہ طرز زندگی چھوڑ کر فقیرانہ روش اپنالی اور شریک حیات کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہنے لگا۔ چٹھہ امرانی کا بڑا بھائی راجہ دکورا ایک سنگدل اور اوباش حاکم تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو تبدیلی مذہب کی سزا دینے کے لئے ایک شرم ناک منصوبہ بنایا۔ راجہ دکورا، چٹھہ امرانی کی بیوی کو بے آبرو کرنا چاہتا تھا..... مگر وہ اپنی ناپاک کوششوں میں ناکام رہا۔ پھر ایک دن چٹھہ امرانی کی بددعا سے پورا خاندان تباہ و برباد ہو گیا۔ خوفناک زلزلہ آیا اور پھر آن کی آن میں وہ بدکار حاکم اپنے ہم نواؤں کے ساتھ زمین کی خوراک بن گیا۔

اس واقعے کو چٹھہ امرانی کی کرامت سے تعبیر کیا گیا اور سہون کے بہت سے لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے چٹھہ امرانی کی اس کرامت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ اپنا چراغ تیل کی بجائے پانی سے جلایا کرتا تھا۔ لوگوں نے بارہا پانی کی آزمائش کی مگر اس میں تیل کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں تھا۔ بعض راویوں نے اسے شعبدہ بازی سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال چٹھہ امرانی کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔

پھر جب حضرت لال شہباز قلندرؒ سہون میں تشریف لائے تو چٹھہ امرانی نے اپنے ایک خدمت گار کے ذریعے دودھ سے بھرا ہوا پیالہ حضرت قلندرؒ کی خدمت میں بھیجا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے دودھ سے لبریز پیالے کو بغور دیکھا اور اپنے پیرہن کی جیب سے سرخ گلاب کا ایک پھول نکال کر پیالے میں ڈال دیا۔

پھر جب چٹھہ امرانی کا خدمت گار واپس چلا گیا تو حضرت لال شہباز قلندرؒ کے خادم درویشوں نے عرض کیا۔ ”شیخ! یہ کیا راز ہے؟“

جواب میں حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ”یہاں ایک درویش رہتا ہے۔ اس نے اشارتاً ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دودھ کے پیالے کی طرح یہ شہر اولیاء سے بھرا ہوا ہے۔“

”دودھ کے پیالے میں پھول ڈالنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ حضرت قلندرؒ کے دوسرے خادم نے عرض کیا۔

”ہم نے درویش کو جوابی پیغام بھیج دیا ہے کہ ہم گلاب کے پھول کی طرح اس شہر میں رہیں گے۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے اپنے عمل کی وضاحت فرمائی۔

اس کے بعد چٹھہ امرانی حضرت قلندرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے آنے کا انداز نیاز مندانہ تھا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بھی چٹھہ امرانی کا والہانہ استقبال کیا۔ پھر دونوں بزرگوں میں بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں حضرت قلندرؒ نے فرمایا۔

”درویش! اپنی روحانی قوتوں کا بہت مظاہرہ کر چکے۔ بس اب اس چراغ کو بجھا دو۔“
 ”شیخ! کوئی اپنے چراغ کو بھی بجھاتا ہے؟“ چٹھہ امرانی نے کہا۔ ”اگر چراغ بجھ گیا تو اندھیرا نہیں پھیل جائے گا؟“

”پانی کے چراغ کو بجھا کر تیل کے چراغ کو روشن کر لو۔“ حضرت لال شہباز قلندرؒ نے فرمایا۔ ”اگر تمہارا چراغ اسی طرح پانی سے جلتا رہا تو چودھویں صدی کے لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔“
 چٹھہ امرانی نے حضرت قلندرؒ کی بات مانتے ہوئے اپنے چراغ کو بجھا دیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت لال شہباز قلندرؒ سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ آئندہ آپ کے عنایت کردہ تیل سے میرا چراغ جلے گا۔
 پھر دونوں بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ روایت برقرار ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی درگاہ کے تیل سے چٹھہ امرانی کا چراغ جلتا ہے۔



بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ آخری عمر میں حضرت لال شہباز قلندرؒ پر جذب و سکر کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور آپؒ نے ”قلندریہ“ مشرب اختیار کر لیا تھا۔ تصوف میں دو حالتیں اور کیفیتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ”صحو“ جس کا مطلب ہے، روحانیت کے انتہائی مدارج طے کرنے کے باوجود صوفی کا ہوش میں نہ رہنا۔ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت لال شہبازؒ ابتداء ہی سے قلندرانہ مسلک رکھتے تھے۔ رہی حالت و کیفیت، تو آپؒ عہد شباب میں بھی جذب و کیف کی منزلوں سے گزرتے تھے مگر آخری ایام میں آپؒ پر مدہوشی کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا تھا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ملفوظات عام طور پر مشہور نہیں، اس لئے آپؒ کے نظریات کا صحیح اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت قلندرؒ، شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی طرح ”وحدت الوجود“ کے قائل تھے۔ یہ تصوف کی مشہور ترین اصطلاح اس نظریے کے مطابق دنیا کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا وجود جلوہ گر ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ بھی اسی نظریے پر کاربند تھے۔ آپؒ کی شاعری سے سوزِ عشق، وارفتگی، جاں نثاری اور بے خودی کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت قلندرؒ کی اسی سرمستی نے اہل سندھ کو متاثر کیا جس کے مظاہرے آج بھی مکلی آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ نے طویل عمر پائی۔ اکثر روایتوں کے مطابق 21 شعبان 673ھ کو آپؒ دنیا سے رخصت ہوئے۔ بظاہر عشق کا نغمہ گر خاموش ہو گیا مگر اس کے نغموں کی گونج آج بھی پاکستان کے طول و عرض میں سنائی دیتی ہے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں سہون کے حاکم ملک اختیار الدین نے حضرت لال شہباز قلندرؒ کا مزار مبارک تعمیر کرایا۔ یہ 757ھ کا زمانہ تھا۔

اس کے بعد مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد اقتدار میں ”ترخانی“ خاندان کے آخری حکمران مرزا جانی بیگ نے حضرت قلندرؒ کے روضے کی توسیع و ترمیم کرائی۔ اس کے بعد 1009ھ میں مرزا جانی بیگ ترخان کے بیٹے مرزا غازی بیگ نے مزار کی عمارت میں دوبارہ ترمیم کرائی۔

1173ھ میں سندھ کے کلہوڑہ حکمران میاں غلام شاہ نے خانقاہ میں پتھر کا فرش لگوایا اور بلند دروازہ تعمیر کرایا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ کو اس عالم فانی سے رخصت ہوئے سات سو چالیس سال ہو چکے ہیں مگر آپؒ کا فیض روحانی آج بھی جاری ہے۔ ”ماثر الکرام“ کے مؤلف میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنی ذات کے حوالے سے ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب ربیع الاول 1143ھ کی دسویں تاریخ کو راقم الحروف سیوستان (سہون) کے شہر پہنچا تو میر سید محمد خان نے بخشی گری اور وقائع نگاری کی خدمت میرے سپرد کی اور خود بلگرام روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد میری ملازمت ختم ہو گئی جس کا کوئی ظاہری سبب موجود نہیں تھا۔ اس واقعے کا مجھے بے حد صدمہ ہوا اور میں دن رات پریشان رہنے لگا۔ ملازمت کی بحالی کے لئے ذاتی طور پر سارے تعلقات آزما لئے مگر کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ آخر ایک رات دل پر یہی بوجھ لئے ہوئے سو گیا۔ اچانک میں نے خواب میں دیکھا کہ شہر کی ایک گلی سے گزر رہا ہوں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے یہ گلی ختم ہو گئی ہے اور آگے راستہ بند ہے۔ میں کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر گیا۔ یکایک ایک شخص سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ پھر جب وہ شخص میرے قریب پہنچا تو میں نے اُس سے دریافت کیا۔

”یہ گلی بند ہے یا آگے بھی جاتی ہے؟“

”آگے چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں کچھ لوگ ملیں گے۔“ اُس شخص نے عربی زبان میں جواب دیا اور

آگے بڑھ گیا۔

میں جھکتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مجھے ایک جگہ تین بزرگ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان بزرگوں کی وضع قطع سندھیوں جیسی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا اور ایک بزرگ کے سامنے دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھ گیا۔ یہ بزرگ ان دونوں بزرگوں کے پیشوا تھے۔

”کیسے آئے ہو؟“ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد پیشوا بزرگ نے مجھ سے پوچھا۔

”شیخ! میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔“ میں نے عرض کیا۔ ”مجھے سرکاری ملازمت سے سبکدوش کر

دیا گیا ہے۔ کیا میں دوبارہ اپنے عہدے پر بحال کر دیا جاؤں گا؟“

میری درخواست سن کر بزرگ پیشوا مراقبے میں چلے گئے۔ پھر پورے ایک پہر کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر فرمایا۔ ”تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی ملازمت مل جائے گی۔“
بزرگ کی زبان سے یہ نوید سن کر میں کچھ بے قرار سا ہو گیا۔ ”کیا واقعی ایسا ہی ہو گا؟“ میں نے دوبارہ عرض کیا۔

بزرگ نے فرمایا۔ ”میں کہہ تو رہا ہوں۔“
اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک سال بعد میری ملازمت بحال ہوئی اور خواب میں نظر آنے والے شیخ کا قول سچ ثابت ہوا۔ بعد میں مجھے یوں لگا جیسے بشارت دینے والے بزرگ حضرت مخدوم لال شہباز قلندرؒ تھے..... اور پورے ایک پہر کا مراقبہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مجھے میرے مقصد کے حصول میں ایک سال کا عرصہ درکار ہو گا۔“

ایک میر غلام علی آزاد بلگرامی پر کیا منحصر ہے؟ ایسے بے شمار واقعات ہیں جو آئے دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ہر شخص کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ اگر تمام مشاہدات و تجربات کو قلمبند کیا جائے تو یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا۔ اللہ اسی طرح اولیاء کی شان بڑھاتا ہے۔ بے شک! وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔



حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

565ھ (ملتان)

ولادت

666ھ (ملتان)

وفات

خاندانی نام بہاء الدین..... والد محترم کا اسم گرامی کمال الدین علی شاہ۔ آپ کا تعلق قریش کے قبیلے ”بہای اسد“ سے ہے۔ یہ قبیلہ دوسری صدی ہجری میں مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے پہلے خوارزم آیا، پھر مستقل طور پر ملتان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ”نہایت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ ہی کے دم سے برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ سہروردیہ کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔“

شہاب الدین غوری کے بعد اس کا غلام قطب الدین ایک منصب اقتدار تک پہنچا اور تاریخ کے دفتر نے ”خاندانِ غلاماں“ کے بانی کی حیثیت سے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ پھر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا محبوب داماد اور غلام شمس الدین التمش اقتدار کا وارث قرار پایا۔ اگرچہ قطب الدین ایک کا دوسرا داماد ناصر الدین قباچہ بھی حکمرانی کی صلاحیت رکھتا تھا مگر سلطان شمس الدین التمش، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید تھا اور دیگر اولیائے کرام کی دعاؤں کے زیر سایہ تھا، اس لئے کارزارِ حیات میں مظفر و منصور ٹھہرا اور یادگار فتوحات حاصل کیں۔

مرتے وقت سلطان قطب الدین ایک نے اپنے دونوں دامادوں کو وصیت کی تھی۔

”التمش میرا دایاں بازو ہے اور ناصر الدین قباچہ بایاں بازو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے دونوں بازو سلامت رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اگر کوئی ایک بازو بھی کمزور ہوا تو اسلامی سلطنت کا توازن بگڑ جائے گا۔ میری روح کو تکلیف پہنچے گی اور اسلامیانِ ہند نئی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔“

سلطان شمس الدین التمش نے اپنے خسر کی اس وصیت کا بے شمار مواقع پر احترام کیا اور سیاسی حکمتِ عملی سے بہت سی بغاوتوں کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔ مگر قطب الدین ایک کا دوسرا داماد ناصر الدین قباچہ اقتدار کی اس تقسیم پر بظاہر مطمئن تھا مگر دلی طور پر رضامند نہیں تھا۔ وہ پنجاب کا حاکم تھا اور اس کا ہم زلف شمس الدین التمش مملکت کا سلطان۔ ”حاکم“ اور ”سلطان“ کے منصب و اختیارات میں بڑا فرق تھا..... اور ناصر الدین قباچہ اس فرق کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اب برابری کی ایک ہی صورت تھی کہ سلطنتِ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے یا پھر ناصر الدین قباچہ، سلطان شمس الدین التمش کے خلاف اعلانِ بغاوت بلند کر کے خود مختار بن جائے اور پھر دوسرے مرحلے میں التمش کو شکست دے کر ”سلطان“ کے لقب کو اپنے نام کا حصہ بنا دے۔

بہر حال بوئے اقتدار نے ناصر الدین قباچہ کے دماغ کو پراگندہ کر دیا اور وہ زیر زمین بغاوت کے جال پھیلانے لگا۔

پنجاب کے ایک درویش کو اس خفیہ منصوبے کی خبر ملی تو اُس مردِ حق پرست نے سلطان شمس الدین کے نام ایک خط تحریر کیا۔

”یہ فقیر اس حقیقت سے باخبر ہے کہ سلطان کے شب و روز بندگانِ خدا کی خدمت میں صرف ہوتے ہیں۔ اس لئے فقیر کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ فرمانروائے ہند کے حق میں دعائے خیر کرے اور سلطان کو بدخواہوں کی فتنہ انگیزیوں کی اطلاع دے۔ پنجاب کے حاکم ناصر الدین قباچہ کی موجودہ سرگرمیاں سلطنتِ اسلامیہ کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ نادان شخصِ مرکز کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس لئے سلطان کو چاہئے کہ وہ اپنے عہد کی گرفت کریں اور مخلوقِ خدا کو تباہی و بربادی سے بچائیں۔“

درویش نے اپنے معمر اور ذمہ دار خادم کو یہ خط دے کر دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط ملتان کے قاضی شرف الدین نے بھی والی ہندوستان کے نام تحریر کیا۔ اپنے مکتوب میں قاضی صاحب نے سلطان شمس الدین سے درخواست کی تھی کہ وہ جلد از جلد باغیوں کا محاسبہ کریں ورنہ خوفناک خونریزی کا خدشہ ہے۔ قاضی شرف الدین ایک نہایت عالم اور دیندار شخص تھے۔ آپ نے اپنے غیر جانبدارانہ رویے اور منصفانہ فیصلوں کے ذریعے مسندِ عدالت کو رونق بخشی اور اہالیانِ ہند کو اسلامی عدل سے روشناس کرایا۔

اس قدر نازک لمحات میں دونوں بزرگوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری کر دی تھیں مگر بد قسمتی سے یہ دونوں خط سلطان شمس الدین التمش تک نہ پہنچ سکے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ناصر الدین قباچہ کے جاسوس بہت زیادہ ہوشیار اور سرگرم عمل تھے۔ جب دونوں قاصد پنجاب کی سرحد کے قریب پہنچے تو جاسوسوں نے انہیں پکڑ لیا اور پھر ایک ہی لمحے کی تاخیر کے بعد انہیں ناصر الدین قباچہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قباچہ نے ملتان کے گوشہ نشین درویش اور قاضی شرف الدین کے خطوط پڑھے اور پھر جیسے ہی وہ آخری سطر تک پہنچا، غضب ناک ہو کر چیخنے لگا۔

”میری مملکت میں رہتے ہیں، میرا نمک کھاتے ہیں اور میرے ہی خلاف سلطان کو ورغلاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ناصر الدین قباچہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ درویش اور قاضی ملتان کو اس کے دربار میں پیش کیا جائے۔

درویش اور قاضی شہرِ دربار میں بے نیازانہ داخل ہوئے۔ ناصر الدین نے درویش کو اپنے دائیں جانب بٹھایا اور قاضی شہر کو شرف الدین کے سامنے۔ دونوں بزرگ صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ اس سے پہلے بھی ناصر الدین قباچہ دونوں بزرگوں کو دربار میں آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ ان ملاقاتوں میں انتظامی امور زیرِ بحث آئے تھے۔ پھر یہ دونوں بزرگ اپنی رائے اور مشورے دے کر رخصت ہو جاتے تھے..... مگر اس بار صورتِ حال بہت سنگین تھی۔

ناصر الدین قباچہ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے قاضی شرف الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”قاضی صاحب! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“
 ”ذاتی طور پر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ قاضی شرف الدین نے عالمانہ وقار کے ساتھ جواب دیا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ اچانک ناصر الدین قباچہ کا لہجہ ناشائستہ ہو گیا۔
 ”اللہ حاضر و ناظر ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔“ قاضی شرف الدین نے اس الزام تراشی پر نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ”اگر میں جھوٹ بولوں گا تو عدالت کی آبرو کیسے برقرار رہے گی؟“
 ”پھر یہ کیا ہے؟“ ناصر الدین قباچہ نے قاضی شرف الدین کا لکھا ہوا خط ان کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ سارا خط میری برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔“

قاضی شرف الدین نے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ یہ ان کی اپنی وہی تحریر تھی جس کے ذریعے سلطان شمس الدین التمش کو ناصر الدین قباچہ کی بغاوت کے بارے میں خبر دی گئی تھی۔ قاضی شرف الدین نے خاموشی اختیار کر لی۔

حاکم پنجاب ناصر الدین قباچہ نے قاضی صاحب کے سکوت کو اعترافِ جرم سے تعبیر کیا اور اسی وقت جلاد کو طلب کر کے اس مردِ پاسبان کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اصولی طور پر حکومت کے مجرموں کو سرِ مقتل سزا دی جاتی ہے مگر ناصر الدین قباچہ نے قاضی شرف الدین کو سرِ دربار قتل کر دیا تاکہ ملتان کے درویش پر اقتدار کی ہیبت طاری ہو جائے۔ پھر جب قاضی شرف الدین کا جسم ساکت ہو گیا تو خدمت گاروں نے اس شخص کے خون سے دربار کے فرش کو صاف کر دیا جو نہایت متقی اور منصف تھا۔
 درویش کے چہرے پر رنج و الم کے سائے نمایاں تھے۔ ایک مردِ حق کو ایک مردِ عادل کے گزر جانے کا بہت قلق تھا۔ ناصر الدین قباچہ نے درویش کی یہ کیفیت دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی ہے۔ پھر اس نے درویش سے بھی وہی سوال کیا جو کچھ دیر پہلے مقتول و مظلوم قاضی سے کیا جا چکا تھا۔

”شیخ! کیا آپ کو بھی مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“

”میرے اور آپ کے درمیان کوئی محاصمت نہیں ہے۔“ درویش نے قلندرانہ لہجے میں جواب دیا۔

”پھر یہ کیا ہے؟“ ناصر الدین قباچہ نے دوسرا خط درویش کی طرف بڑھا دیا۔

درویش نے ایک نظر اس خط کو دیکھا جو سلطان شمس الدین التمش کے نام تحریر کیا گیا تھا۔ ”ہاں! یہ میرا ہی مکتوب ہے۔“ درویش کی پُر جلال آواز دربار میں گونجنے لگی۔ ”اس کا ایک ایک لفظ میں نے اپنے ارادے سے نہیں، خدا کے حکم سے لکھا ہے۔ اس مالک کے حکم سے جو مالک الملک ہے اور جس کے آگے بڑے بڑے زور آور بے دست و پا اور ناتواں ہیں۔ میں یہ تحریر لکھنے پر مجبور تھا اور تم اسے پڑھنے پر مجبور ہو۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

درویش کی حق گوئی اور جرأتِ گفتار نے اہل دربار پر لرزہ طاری کر دیا۔ خود ناصر الدین قباچہ کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ درویش کے سامنے دم تک نہ مار سکا۔ اس نے سر جھکا لیا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔

”شیخ! معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔“

درویش نے سر دربار قاضی شرف الدین کے حق میں دعائے مغفرت کی اور حاکم پنجاب کے دربار سے نکل کر اپنی خانقاہ کی طرف چلے گئے۔

یہ درویش، سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ تھے جن کی راست گوئی اور بے باکی کی تاریخ ہند کے اوراق پر اس طرح ثبت ہے کہ صدیوں کا غبار بھی اسے دھندلا نہیں سکا ہے۔

قاضی شرف الدین حق کے راستے میں قربان ہو گئے مگر ان کا خون ناحق ایسا رنگ لایا کہ ناصر الدین قباچہ کی داستانِ حیات بھی سرخ ہو گئی۔

614ھ میں دریائے چناب کے کنارے سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ قباچہ کو شکست ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ پھر اُس کے اور التمش کے درمیان کئی خوں رنگ معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ بھکر سے بھاگ کر دریا عبور کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت دریا میں شدید طغیانی آئی ہوئی تھی۔ انجام کار ناصر الدین قباچہ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ جانے والے جانتے ہیں کہ یہ قاضی شرف الدین کے قتل کا عذاب تھا جو کئی سال تک قباچہ پر نازل ہوتا رہا..... اور یہ موجِ عذاب اس وقت رُکی جب ناصر الدین قباچہ ذلت و بربادی کی موت سے ہمکنار ہو گیا۔



حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ 565ھ میں پیدا ہوئے۔ ارضِ ملتان کو آپؒ کا مقام ولایت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا قریشی الاصل تھے۔ آپؒ کے خلیفہ سید جلال الدین سرخ بخاریؒ اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میرے پیر و مرشد کے آباؤ اجداد عرب کے امراء اور شرفاء میں سے تھے اور قریش کے ممتاز قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ میرے شیخ کا یہ نسب نامہ قصی کے حوالے سے رسالتِ پناہ ﷺ کے نسب مبارک سے مل جاتا ہے۔ قصی کے دو فرزند تھے۔ ایک عبید مناف جو سرکارِ دو عالم ﷺ کے جدِ امجد ہیں۔ اور دوسرے عبدالعزیٰ جو میرے شیخ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔“

بعض محققین کی رائے کے مطابق ہبار بن اسود، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ہبار بن اسود نے شروع میں رسول کریم ﷺ کی مخالفت کی تھی مگر فتح مکہ کے بعد ایمان لے آئے تھے اور پھر احکامِ دین کی اطاعت میں بہت مستقل مزاج ثابت ہوئے تھے۔ حضرت ہبارؒ بہت مالدار انسان تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ کی تجارت کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ بیک وقت کئی تجارتی قافلے شام اور مصر جایا کرتے تھے۔ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی کی روایت ہے کہ حضرت ہبارؒ کے فرزندوں کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ”الجبال“ کا علاقہ جاگیر میں مرحمت فرمایا تھا جو بعد میں خوارزم کے نام سے موسوم ہوا۔ حضرت ہبار بن اسود قبولِ اسلام کے بعد بھی مستقل طور پر مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور اپنی

ساری زندگی جوارِ کعبہ میں گزار دی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا خاندان نہ صرف علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا بلکہ کئی پشتوں تک اسی خاندان کے افراد کوٹ کروڑ (سندھ) کے منصبِ قضا پر فائز رہے تھے۔ حضرت شیخ کے بزرگوں میں سے جو بزرگ سب سے پہلے ملتان تشریف لائے تھے، وہ حضرت کمال الدین علی شاہؒ تھے۔ مشہور سیرت نگار مولانا سید سلطان ندویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا قبیلہ دوسری صدی ہجری میں سندھ آکر آباد ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ خاندان سکھر کے علاقے میں ”محمد تور“ نامی قصبے میں جا بسا۔ پھر پانچویں صدی ہجری کی ابتداء میں یہ لوگ وہاں سے نقل مکانی کر کے ملتان چلے آئے۔

شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ کا بیان ہے:

”مجھے خود حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شاہ رکن عالمؒ نے بتایا تھا کہ ان کے بزرگ سندھ سے ملتان تشریف لائے تھے۔“

ابن بطوطہ کے علاوہ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ اور نامور سیاح صوفی حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کی روایت ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بزرگوں میں سے تاج الدین المطرف خوارزم آئے اور جب سندھ پر ہباریوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو تاج الدین المطرف کی اولاد بھی المنصور منتقل ہو گئی۔ پھر جب قرامطہ نے ہباریوں پر غلبہ حاصل کر لیا تو سلطان محمد غزنوی طوفانِ بلا خیز کی طرح سندھ پہنچا اور قرامطہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اپنی اس جنگی مہم کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے کے بعد فاتح سومنات حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مورث اعلیٰ حضرت کمال الدین علی شاہؒ کو ملتان لے آیا۔ کچھ عرصہ آپؒ وہاں مقیم رہے اور پھر سلطان کے حکم سے کوٹ کروڑ (سندھ) میں منصبِ قضا پر فائز ہوئے۔ کمال الدین علی شاہؒ کے بعد شیخ جلال الدینؒ اور پھر ان کے صاحبزادے شیخ ابوبکرؒ اس اہم عہدے پر فائز ہوئے۔

حضرت شیخ ابوبکرؒ کے صاحبزادے مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ تھے۔

سیر العارفین کی روایت کے مطابق مولانا حسام الدین ترمذیؒ نے فتنہ تاتار کے سبب ہجرت کی اور ہندوستان آکر کوٹ کروڑ میں سکونت اختیار کی۔ مولانا حسام الدینؒ کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا عقد مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ سے ہوا اور ان ہی پاکباز خاتون کے بطن سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ پیدا ہوئے۔ بعض محققین نے 27 رمضان المبارک 566ھ کو حضرت شیخ کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔



حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ آپؒ پیدائشی ولی تھے۔ بیشتر تذکرہ نویس اس ذیل میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شیرخواری کے زمانے میں جب بھی رمضان کا مقدس مہینہ آتا تھا، حضرت شیخ دن کے وقت دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔

آپؐ کے پیدائشی ولی ہونے کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب آپؐ کے والد محترم مولانا وجیہ الدینؒ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔ بعض دنیا پرست اس قسم کی روایتوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ روحانیت سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے سلسلوں کو شہرت دینے کے لئے اس انداز کے افسانے تراش لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ انتہائی کم نظری اور بے خبری کی علامت ہے۔ جو ذات پاک کروڑوں انسانوں میں سے اپنے رسول اور نبی کا انتخاب کرتی ہے، وہی ذات بے نیاز بے شمار آدم زادوں میں سے اپنے ولی کو بھی منتخب کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گہوارے میں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو نہایت کم سنی میں رسالت اور نبوت عطا کی گئی تھی۔ اب اگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کو گہوارے میں ولایت عطا کر دی گئی تو عقل کے شعبہ بازوں اور تہذیب کے کوچہ گردوں کو حیرت کیوں ہے؟



ابھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بہت چھوٹے تھے کہ آپؐ کے والد محترم نے آپؐ کو ابتدائی تعلیم کے لئے مولانا نصیر الدین بلخیؒ کے مکتب میں داخل کر دیا۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف ساتوں قرأتوں کے ساتھ حفظ کیا۔ یہ انسانی حافظے اور ذہنی رسائی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ حفظ کلام الہی کے بعد حضرت شیخؒ درسی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

ابھی آپؐ کی عمر صرف گیارہ سال تھی کہ ایک جانگداز واقعہ پیش آیا۔ 577ھ میں حضرت شیخؒ کے والد محترم مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ کا انتقال ہو گیا۔ ایسے مرحلے میں ایک شفیق باپ کی جدائی اولاد کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے مگر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے اس صدمہ عظیم کو صابرین کی طرح برداشت کیا کہ آگے چل کر آپؐ کو بہت سے بار گراں اٹھانے تھے۔

مہربان چچا شیخ احمد غوثؒ نے آپؐ کے سر پر دستار باندھی اور آباؤ اجداد کی مسند پر بٹھا دیا۔ علماء، مشائخ اور اس علاقے کے زمینداروں نے حاضر خدمت ہو کر رسم تعزیت ادا کی۔ خدمت گار، ملازم اور نوکر سلام کو حاضر ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق خزانے کے نگران نے درخواست کی کہ موجودہ رقوم اور دیگر حسابات کی جانچ پڑتال کی جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ کے والد محترم ایک مالدار شخص تھے۔

”جائیداد کے سارے انتظامات آپ سنبھالیں۔“ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے عم محترم کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا۔ ”والد محترم کے بعد آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔“ یہ سن کر حضرت شیخ احمد غوثؒ آبدیدہ ہو گئے۔

”بس میری ایک درخواست ہے کہ مجھے تحصیل علم کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“ حضرت شیخ نے عرض کیا۔

”میرے عزیز بھائی کی نشانی! تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔“ شیخ احمد غوثؒ نے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔ ”تمہارے باپ کی طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ خداوند ذوالجلال تمہیں علم کی دولت سے مالا مال

کرے۔ یہ سیم وزر کے چند سکے تمہاری پہچان نہیں۔ تمہارا تخت مسندِ علم ہے، تمہارا تاج دستارِ فضیلت ہے اور یہی تمہاری شناخت ہے۔“

بھتیجے کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوتے ہی شیخ احمد غوثؒ نے بڑے بڑے علماء کو ”کوٹ کروڑ“ میں جمع کر دیا۔ مولانا عبدالرشید کرمانیؒ بھی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے اساتذہ میں شامل تھے۔ محلہ کڑہ (ملتان) کے اندر ایک مسجد کے جنوبی حجرے میں مولانا عبدالرشید کرمانیؒ کا مزارِ مبارک مرجعِ خلائق ہے۔



مقامی علماء سے اکتسابِ علم کرنے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے خراسان کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں خراسان کا شمار علومِ مشرقیہ کے بڑے مراکز میں ہوتا تھا۔ حضرت شیخؒ ایک قافلے کے ہمراہ خراسان پہنچے اور سات سال تک مختلف علماء اور مشائخ سے علومِ ظاہری حاصل کرتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا طریقِ کاریہ تھا کہ چند دن تک ایک استاد کی خدمت میں حاضر رہتے اور ان کے سینے میں جس قدر علم ہوتا اُس کا مکاشفہ کر لیتے۔ پھر دوسرے استاد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ اس طرح آپؒ نے چار سو چوالیس باکمال اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا اور سندِ فضیلت حاصل کی۔

کم نظر اور سطحی علم رکھنے والے حضرات اس روایت پر شکوک و شبہات کا اظہار کریں گے کہ ہفتہ دس دن کے مختصر عرصے میں ایک باکمال شخص کے علم کا احاطہ کرنا کس طرح ممکن ہے؟ دراصل ہمارے تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ وہ روایت بیان کرتے وقت اس کی وضاحت نہیں کرتے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ذہین ترین انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کی طبیعت اور ذہن میں ایک ایسی مقناطیسی صلاحیت رکھی تھی کہ اگر ایک بار کوئی نکتہ سن لیتے تو اس کے سارے معانی اور مفہیم آپؒ کے شعور میں جذب ہو کر رہ جاتے۔ ہفتہ دس دن میں کسی اہل کمال کا سارا علم حاصل کر لینا، اسی صلاحیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں علم کی ماڈی مقدار کا ذکر نہیں، علم کی روح مراد ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا یہی وصفِ خاص تھا کہ آپؒ اپنے اساتذہ کے ذہن رسا تک سفر کرتے تھے اور ان کے طرزِ استدلال اور نکتہ آفرینی کے جواہر اپنی ذات میں سمونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں یہ بات ہمارے قارئین کے علم میں اضافے کا سبب ہوگی کہ امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے چار ہزار اساتذہ سے علم حاصل کیا تھا۔ امامِ اعظمؒ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ آپؒ اپنے اساتذہ کے علم کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ علم الفاظ کے ذخیرے اور روایتوں کے انبار کا نام نہیں۔ حقیقی علم وہی ہے جو انسان کے فکری اور معاشرتی مسائل کو حل کر سکے۔

خراسان کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بخارا تشریف لے گئے۔ اس وقت بخارا، خراسان سے بھی بڑا علمی مرکز تھا۔ یہاں بھی حضرت شیخؒ کے پاس دو ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس زمانے میں جبکہ طباعت کا انتظام نہیں تھا، دو ہزار کتابوں کو بہت بڑا علمی خزانہ کہا جاتا

سکتا ہے۔

”تذکرۂ اولیائے کرام“ کے مؤلف کا بیان ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بخارا میں آٹھ سال قیام فرمایا۔ یہاں کے لوگ حضرت شیخؒ کے اوصاف حمیدہ سے یہاں تک متاثر ہوئے کہ آپؒ کو ”بہاء الدین فرشتہ“ کہہ کر پکارنے لگے۔



خراسان اور بخارا کی تمام درس گاہوں سے فیض یاب ہونے کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ تزکیہ نفس اور باطن کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؒ نے مسلسل بیس سال تک اس قدر سخت مجاہدات کئے کہ ان کی تفصیلات پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے۔ ”خلاصۃ العارفین“ کے مصنف ان ریاضتوں اور مجاہدوں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

”ایک بار کسی مرید یا عقیدت مند نے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے عرض کیا۔ ”شیخ! آپ اپنے مجاہدے کا کوئی واقعہ بیان فرمائیے۔“

خادم کی بات سن کر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے گریز اختیار کیا مگر جب اس شخص کا اصرار بہت زیادہ بڑھا تو آپؒ نے فرمایا۔

”فقیر کے لئے اپنے مجاہدے اور ریاضت کی کیفیت بیان کرنا مناسب نہیں کہ ایک طرف اس سے غرور کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف طالب کو خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اس کی محنت برباد نہ ہو جائے..... مگر پھر بھی اتنا سمجھ لو کہ یہ فقیر بیس سال تک ایک پیالہ پانی اور ایک چھٹا تک غذا پر روزہ افطار کرتا ہے..... اور یہ ایک ادنیٰ مجاہدہ ہے کہ جسے ہر مبتدی اپنی طبیعت اور نفس پر غلبہ پانے کے لئے آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد میں حج کی نیت سے ارض پاک کی طرف روانہ ہوا۔“

ایک اور موقع پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اپنے مجاہدات کے بارے میں فرماتے ہیں:

”میں نے یہ تمام تر مشقت اور ریاضت رب کعبہ کی رضا جوئی کے لئے کی۔ یہاں تک کہ ارض مقدس میں جا پہنچا، حج کیا اور عرفات کی پہاڑی پر حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوا۔ خداوند کریم کے فضل و احسان سے اس دوران میں نے بڑا فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد نیا احرام باندھ کر سرورِ کونین حضور اکرم ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا۔ پانچ سال مدینہ منورہ میں رہ کر رسالت پناہ ﷺ کے قدموں کی خاک پاک کے صدقے میں انوارِ الہی کا ظاہری اور باطنی مشاہدہ کیا۔“

حامد بن فضل اللہ جمالیؒ کا بیان ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ پانچ سال تک مدینہ منورہ میں قیام فرما رہے۔ اس زمانے میں حضرت مولانا کمال الدین محمد یمینیؒ جو اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے، حرم نبوی ﷺ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے..... اور طلباء کی اگلی صف میں استاد کے ساتھ بیٹھ کر حدیث پاک کا درس لینے لگے۔ حضرت شیخؒ، مولانا یمینیؒ کے ساتھ ہر سال حج پر جاتے تھے اور پھر مدینہ منورہ حاضر ہو جاتے۔ جب حدیث شریف کا سبق تمام ہو چکا تو رسمِ زمانہ کے مطابق حضرت مولانا کمال الدین محمد یمینیؒ